

الفیوضات النبویہ فی الفتاوی الحنفیہ

معروف بہ

فتاوی اتراکھنڈ

جلد ۲

مفتی محمد ذوالفقار خان نعیمی ککرالوی

نوری دارالافتاء مدینہ مسجد

محلہ علی خان کاشی پور اتراکھنڈ

الفیوضات النبویہ فی الفتاوی الحنفیہ

معروف بـــ

فتاوی اتراکھنڈ
جلد(۲)

محمد ذوالفقار خان نعیمی ککرالوی
نوری دار الافتاء مدینہ مسجد
محلہ علی خان کاشی پور اتراکھنڈ

تفصیلات

کتاب: الفیوضات النبویہ فی الفتاوی الحنفیہ معروف فتاوی اتراکھنڈ (جلد دوم)

مصنف: مفتی محمد ذوالفقار خان نعیمی ککرالوی، خلیفہ حضور تاج الشریعہ

نوری دارالافتاء مدینہ مسجد محلہ علی خاں کاشی پور اتراکھنڈ

نظر ثانی: مفتی محمد سلیمان نعیمی جامعہ نعیمیہ مرادآباد

مفتی محمد مقصود عالم فرحت ضیائی فخر ازہر دارالافتاء کرناٹک

رابطہ: نوری دارالافتاء مدینہ مسجد محلہ علی خاں کاشی پور اتراکھنڈ

ای میل: nooridarulifta786@gmail.com

موبائل: 9719620137.9759522786

صفحات: 440

ملنے کے پتے

الفلاح ریسرچ فاؤنڈیشن دہلی

مکتبہ نعیمیہ دہلی

مکتبہ نعیمیہ مرادآباد جامعہ نعیمیہ مرادآباد

تاج الشریعہ بک ڈپو، نزد مدینہ مسجد محلہ علی خاں کاشی پور

اجمالی فہرست

انتساب

فقیر اپنی اس کاوش کو

اپنے پیر و مرشد، مرشد برحق، آبروئے اہل سنت، وقار خاندان اعلیٰ حضرت غواص بحر طریقت تاج شریعت، حضرت علامہ

مفتی محمد اختر رضا خان قادری، نوری ازھری بریلوی قدس سرہ

کی بابرکت بارگاہ سے معنون و منسوب کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

جن کی ایک نگاہ فیض سے نہ جانے کتنے گم گشتہ راہ ہدایت پا جاتے تھے۔

جن کے روئے انور کو دیکھ کر نہ جانے کتنے روتے چہرے ہنسنے لگتے تھے۔

جن کی تبسم ریزی بے چین دلوں کو چین و قرار بخشتی تھی

جن کی بولی نہ جانے کتنوں کو بولنے کا سلیقہ سکھاتی تھی

درسگاہ میں ایک ماہر مدرس تھے۔ دارالافتاء میں ایک مکمل مفتی تھے۔ وہ خود میں ایک انجمن تھے۔ ایک ادارہ تھے۔

ایک دارالافتاء تھے

اعلائے کلمۃ الحق بلاخوف لومۃ لائم آپ کا وطیرہ خاص تھا

خطیب ایسے کہ بڑے بڑے خطبا جن کی خطیبانہ شان کے مداح تھے

مصنف ایسے کہ مشہور اصحاب قلم بھی داد دئے بغیر نہ رہتے۔

قادرالکلام شاعر تھے

دنیا کی مختلف زبانوں پر عبور حاصل تھا

قرآن کی تلاوت کرتے تو لحن داؤدی کا اثر محسوس ہوتا

نعت شریف پڑھتے تو سامعین پر بے خودی طاری ہو جاتی

باتیں کرتے تو اہل مجلس محو ہو جاتے

فقیر نے جب پہلی بار زیارت کی تب سے اب تک چہرہ آنکھوں میں ایسا بسا ہوا ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ حضرت اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ اور خدا سے یہی ایک دعا ہے بزبان مفتی اعظم

کچھ ایسا کر دے مرے کردگار آنکھوں میں
ہمیشہ نقش رہے روئے یار آنکھوں میں

اللہ پاک حضرت کے فیضان سے مجھے اور میرے اہل خانہ کو مستفیض فرمائے۔ آمین

گدائے تاج الشریعہ

محمد ذوالفقار خان نعیمی ککرالوی غفرلہ ولوالدیہ

عرض حال

فضل خداوندی شامل حال ہو تو ہر مشکل کام آسان ہو جاتا ہے۔ فقہ و فتاوی مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ اور یہ بغیر فضل خداوندی ممکن نہیں ہے۔ ۱۴۳۲ھ سے کاشی پور شہر میں مستقل و باضابطہ فتوی نویسی کا کام فقیر نے شروع کیا۔ بہت دشواریاں ہوئیں، مشکلیں اور الجھنیں در پیش ہوئیں مگر اس مبارک کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ یہ اسی رفتار سے چلتا رہا اور اب تک چل رہا ہے جس رفتار سے شروع کیا تھا۔ یقیناً یہ فضل خداوندی ہی ہے۔ میرے والد محترم میرے بچپن میں فرمایا کرتے تھے کہ ارادہ اگر نیک ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔ یقیناً ان کی اس بات کو میں اب محسوس کرتا ہوں۔

نوری دارالافتاء مدینہ مسجد محلہ علی خاں کاشی پور اترا کھنڈ کے زیر اہتمام یہ مبارک کام فقیر کے ذریعہ جاری ہے۔ دارالافتاء کا کوئی مقرر وقت نہیں ہے چوبیس گھنٹہ میں جس وقت فتوی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ضرورت مند حضرات فقیر سے رابطہ کر لیتے ہیں۔ جہاں تک مسئلہ کی بات ہوتی ہے تو انہیں مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور حسب ضرورت ہی فتوی لکھ کر دیا جاتا ہے۔ اور جہاں تک بغیر فتوی صرف سمجھانے سے ہی کام چل رہا ہوتا ہے تو فتوی لکھنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں فیس بک، ٹیلی گرام اور وہاٹس ایپ پر چوبیس گھنٹہ ملک و بیرون ملک سے سوالات ہوتے رہتے ہیں جن کے جوابات بھی حتی الامکان دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور اگر بشکل استفتا مطالبہ ہوتا ہے تو اسے بھی فتوی لکھ کر پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آنلائن سوالات و جوابات اگر اکھٹے کرتا رہتا تو یقیناً وہ بھی کئی سو صفحات ہو جاتے۔ مگر عدیم الفرصتی کے سبب اس طرف توجہ نہیں دے سکا۔ ان شاءاللہ آئندہ اس کا بھی کچھ بندوبست کروں گا۔ اس وقت فقیر کے چند سالہ فتاوی کا مجموعہ ”فتاوی اترا کھنڈ جلد دوم“ احباب کے پیش نظر ہے۔ فتاوی اترا کھنڈ کی پہلی جلد ۲۰۱۳ء میں ہند و پاک سے چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے۔ اور علما و ارباب ذوق سے شرف قبولیت حاصل کر چکی ہے۔

اور اب یہ دوسری جلد ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ دو سال قبل فقیر کے لیپ ٹاپ میں وائرس آگیا، فقیر چوں کہ لکھائی کا سارا کام لیپ ٹاپ پر ہی کرتا ہے، جس کے سبب بہت سے فتاوی ضائع ہو گئے۔ کچھ قیمتی کتابیں، کچھ نایاب تحریریں ضائع ہو گئیں۔ حوصلہ پست ہو گیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا۔ کچھ فتاوی جی میل آئی ڈی وغیرہ میں محفوظ تھے وہ نکالے، کچھ پرنٹ کر کے جس کی ایک کاپی رکھ لی تھی وہ اکھٹے کر لیے تھے، کچھ لیپ ٹاپ کے علاوہ کبھی ایکسٹرینل ہارڈ ڈسک میں فائلیں محفوظ کر لی تھیں اس میں مل گئے۔ تو اس طرح یہ چار سو صفحات سے زائد فتاوی کا مجموعہ تیار ہو گیا الحمدللہ۔

ان فتاوی میں جو بھی کچھ ہے وہ میرے اساتذہ و کرم فرما علما و فقہا کی نوازشات کا ماحصل ہے۔ میرا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تو بس ایک معمولی سا طالب علم ہوں۔ والدین، بہن، اساتذہ، اور کرم فرماؤں کی دعاؤں نے مجھے اس لائق بنا دیا کہ میں اس خدمت میں حصہ لے سکا ہوں۔ ورنہ میرا معاملہ تو بس من آنم کہ من دانم والا ہے۔

اس مجموعہ فتاوی میں فقیر نے حتی الامکان تصحیح کی کوشش کی ہے پھر بھی غلطی کا امکان ہے۔احباب جہاں کہیں کوئی غلطی پائیں فقیر کو آگاہ فرمائیں ۔اس فتاوی کے مجموعہ کی کمپوزنگ،ترتیب،سیٹنگ کا کام بھی چوں کہ فقیر نے خود ہی کیاہے توصد فی صد امکان ہے کہ معنوی اغلاط کے ساتھ لفظی غلطیاں بھی درآئی ہوں گی اس لیے احباب طعن وتشنیع اور بے جا تنقید سے بچتے ہوئے اصلاح کی مبارک سعی فرمائیں۔ تاکہ فقیر کی اصلاح بھی ہو جائے اور آئندہ ایڈیشن میں اس کا ازالہ بھی ہو جائے۔

دعاہے اللہ پاک فقیر کی اس ادنیٰ سی کاوش کو اپنی بارگاہ پاک میں شرف قبولیت عطافرمائے۔اوراس کو میرے اور میرے والدین،بہن اوران کے اہل خانہ اور میرے بیوی بچوں اور میرے معاونین ومحبین کے لیے ذریعہ مغفرت بنائے۔

آمین بجاہ النبی الامین الکریم علیہ الصلاۃ والتسلیم۔

نیاز مند:احقر العباد محمد ذوالفقار خان نعیمی ککرالوی غفرلہ ولوالدیہ

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

فقیر اپنی کتابیں بیچتا نہیں۔ کتابوں سے آج تک کبھی ایک روپیہ بھی کماکر نہیں کھایا۔ کسی کتب خانہ سے دس بیس کتابیں بک بھی گئیں تو ان کی رقم اب تک موصول نہیں ہوئی جسے کتابوں کی طباعت میں لگا دیا جاتا۔ ایسی صورت حال میں مزید کسی کتاب کی اشاعت کس قدر دشوار ترین ہے اس کا اندازہ ارباب علم ودانش کو بخوبی ہو گا۔ مگر یہ بات بھی سو ٹکا سچ ہے کہ اگر ارادہ نیک ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔ اور فقیر کی بھی منزل آسان ہوئی۔ کئی کرم فرما حضرات نے اس فتاوی کی اشاعت میں حصہ لیا۔ مگر ان کرم فرماؤں نے اس قدر مہلت بھی نہ دی کہ ان کا ذکر خیر کھل کر کر دیا جاتا۔ ان سے اجازت طلب کی کہ ان کا نام شامل کتاب کر لیا جائے مگر واہ رے خلوص انہیں اس قدر گوارا نہیں کہ وہ کوئی مذہبی کام لوجہ اللہ کریں اور اس کا پرچار ہو۔

ہاں البتہ ایک مقام سے ہمارا تعاون ہوا انہوں نے نام کی صراحت کے بغیر مطلقا اپنی مبارک تنظیم کا ذکر خیر کرنے کی مہلت عطا فرمائی۔ اس فتاوی کی اشاعت میں جماعت رضائے مصطفی انگلینڈ (یوکے) کا بھی تعاون شامل ہے۔ ہم اپنے تمام کرم فرماؤں کے جنہوں نے فتاوی کی اشاعت میں مالی، لفظی، تحریری جیسا بھی تعاون فرمایا تہ دل سے شکر گزار اور ممنون ہیں۔

اللہ پاک ان کے اس مخلصانہ تعاون کو بارگاہ مقدسہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے۔ اور ان کے لیے اس ہدیہ کو ذریعہ مغفرت فرمائے۔ اور اپنی رضا وخوشنودی عطا فرمائے۔

کراچی کے محمد بلال رضا سلمہ کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے کتاب کی سیٹنگ میں میرا تعاون کیا۔ ایم ایس آفس ورڈ مجھے بہت کم آتا تھا مگر یہ کتاب میں نے ورڈ فائل میں تیار کی۔ جس میں موصوف سلمہ نے میرا خاصہ تعاون کیا جب کوئی بات سمجھ نہیں آتی تو میں ان سے وہاٹس ایپ کے ذریعہ معلوم کر لیتا تھا اور وہ بغیر کسی تاخیر کے فوراً مجھے بتا دیا کرتے تھے۔ اللہ پاک موصوف کو اس کا بہتر اجر دنیا وآخرت میں عطا فرمائے۔

علاوہ ازیں میں ان تمام مشفق وکرم فرما علمائے کرام کا مشکور وممنون ہوں جنہوں نے فقیر کے فتاوی کو ملاحظہ فرمایا اور اپنے قیمتی تاثرات اور دعائیہ جملوں کے ذریعہ فقیر کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

نیز اپنے تمام احباب کا خاص کر اراکین نوری دارالافتاء کاشی پور کا بھی مشکور ہوں جن کی محبتوں کے سہارے میں اپنا قلمی کام بلا روک ٹوک کر تا رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میرے اساتذہ، کرم فرماؤں کا سایہ مجھ پر دراز فرمائے۔ اور میرے احباب کی محبتوں کا بہتر صلہ عطا فرمائے۔ آمین بجاہ النبی الکریم علیہ الصلاۃ والتسلیم

نیاز مند: محمد ذوالفقار خان نعیمی ککرالوی غفرلہ والوالدیہ

دعائیہ کلمات

جامع معقول و منقول حاوی فروع واصول نمونہ اسلاف استاد گرامی حضرت علامہ مولانا
مفتی محمد شبیر حسن رضوی دامت معالیہم
شیخ الحدیث جامعہ روناہی فیض آباد

۷۸۶

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی لاسیما حبیبہ المصطفی منبع الجود والعطاء دافع المرض والبلاء والوباء

امابعد پیش نظر کتاب مستطاب مجموعہ فتاوی معروف بہ فتاوی اتراکھنڈ عزیز القدر ومحبم حضرت مولانا مفتی محمد ذوالفقار خان سلمہ المولی المنان کی تصنیف و تالیف ہے۔ عزیزم ایک ذی علم عالم دین ہیں اور باوقار مدرس ہیں۔

فقہ وفتاوی کی مستند و معتمد علیہ کتابوں کی روشنی میں یہ مجموعہ فتاوی قوم کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

فتوی نویسی وکار افتاء بہت ہی مشکل کام ہے جس میں موصوف سلمہ نے بہت ہی محنت ومشقت عرق ریزی سے کام لیا ہے۔

احقاق حق وابطال باطل میں کوئی رعایت نہیں کی ہے۔ یہی علمائے ذوی الاحترام مخلصین مفتیان عظام کی شان ہوتی ہے۔ یہ سب حضور صدرالافاضل ومفتی اعظم ہند وسرکار اعلیٰ حضرت علیہم الرحمۃ والرضوان کی نسبت کی برکت اوران بزرگوں کا فیضان خاص ہے۔ ذلك فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔

اور موصوف سلمہ بہت سی کتابوں کے مولف ومرتب ومصنف بھی ہیں۔ اس رضوی فقیر کی دعا ہے کہ مولی تعالیٰ ان کے علم وعمل میں مزید برکتیں بخشے۔ اوران کے علمی فیضان کو عام وتام فرمائے۔ اوران کی کتابوں خصوصاً مجموعہ فتاوی سے عوام وخواص کو مستفید و مستفیض فرمائے۔ آمین بجاہ حبیب الکریم علیہ التحیۃ والتسلیم۔

فقط محتاج وگدا باب رضا
شبیر حسن رضوی خادم الجامعۃ الاسلامیہ روناہی فیض آباد

تقریظ جلیل

عمدۃ الفقہا استاذی واستاذ العلما حضرت علامہ مولانا مفتی محمد سلیمان صاحب قبلہ دامت بالمفاخر
زیب مسند افتاء و تدریس جامعہ نعیمیہ مرادآباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی حبیبہ الکریم

صوبہ اتراکھنڈ کے بلاد میں سے ایک مشہور و معروف شہر کاشی پور ضلع اودھم سنگھ نگر ہے۔اس میں بہت سے علماء کرام و قراء عظام و حفاظ کرام ہوئے ہیں۔ جنہوں نے اپنی پوری زندگیاں تعلیم دین متین و اشاعت اسلام میں وقف کردیں۔ لیکن مفتیان کرام کی بہت کمی تھی، بلکہ کالعدم تھی۔ اللہ رب العزت نے اپنے محبوب اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقہ و طفیل اہل سنت وجماعت پر خصوصی کرم فرمایا کہ اب چند مفتیان کرام سرزمین کاشی پور و قرب وجوار کے علاقوں میں کار افتاء میں مشغول و مصروف ہیں۔

اور نئے مسائل جو عوام و مسلمین کے درمیان میں لاینحل تھے ان کو بتانے اور لکھنے میں مشغول ہیں۔اور عوام مسلمین کی سچائی کے ساتھ رہنمائی فرمارہے ہیں ۔ جن کی قوم مسلمین ایک مدت سے ضرورت محسوس کررہے تھی۔ لیکن افتاء کے لیے مفتی کا اجتہاد کی ایک گونہ صلاحیت سے متصف ہونا لازمی ہے۔ اسی لیے یہ کام تمام دینی خدمات میں بہت زیادہ دشوار ہے۔ ترتیب یوں ہے کہ ان میں سب سے زیادہ آسان ہے تقریر، اس سے مشکل ہے تدریس اور تدریس سے مشکل ہے تصنیف و تالیف اوراس سے بھی مشکل ہے افتاء۔ کیوں کہ فتوی معلوم کرنے والے عبادات اور معاملات وغیرہ کے بہت سے نوپیدا امور سے متعلق بھی ہر طرح کے سوالات کرتے رہتے ہیں اور مفتی کو ان کے جواب دینے پڑتے ہیں ، اسی لیے اس میں بیدار مغزی، ذہانت وفطانت ، معاملہ فہمی اور تبحر علمی کے ساتھ ایک طرح قوت اجتہاد بھی ضروری ہے۔ حضرت علامہ شامی قدس سرہ السامی تحریر فرماتے ہیں:

’’التحقیق ان المفتی فی الواقع لابدلہ من ضرب اجتہاد معرفۃ احوال الناس‘‘[ردالمحتار، جلد ثانی صفحہ ۳۹۸]

یعنی نوپید مسائل کو حل کرنے کے لیے مفتی کو ایک طرح کے اجتہاد سے متصف اور لوگوں کے احوال سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ جب کہ فی زماننا لوگ اس فن کو بہت آسان سمجھنے لگے ہیں اور غلط فتوی دے کر اور لکھ کر مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں اور خود آسمان وزمین کے فرشتوں کی لعنت کے مستحق ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

''من افتی بغیرعلم لعنته ملائکة السموات والارض ''، یعنی جو بغیر علم کے فتوی دے اس پر آسمان وزمین کے فرشتوں کی لعنت ہے۔(کنزالعمال)

بلکہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تحریر فرماتے ہیں:

آج کل درسی کتابیں پڑھنے پڑھانے سے آدمی فقہ کے دروازے میں داخل نہیں ہوتا''[فتاوی رضویہ جلد چہارم]

اور تحریر فرماتے ہیں:

''علم الفتوی پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ مدتہا طبیب حاذق کا مطب نہ کیا ہو(فتاوی رضویہ جلد اول)

لیکن اسی شہر کاشی پور میں ایک مفتی محب گرامی وقار حضرت علامہ مولانا ذوالفقار صاحب نعیمی فاضل جامعہ نعیمیہ مرادآباد کی ذات ہے جو اپنے تبحر علمی کا لوہا اپنے شہر وقرب وجوار میں منوا چکے ہیں ۔جن کے بہت سے فتاوی منظرعام پر آچکے ہیں اور فتاوی اترا کھنڈ کے نام سے چھپ کر عوام وخواص میں دادو تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اور عوام المسلمین کے لیے مشعل راہ ہدایت بن چکے ہیں۔ اب یہ دوسرا مجموعہ فتاوی تیار ہے۔ جس میں بہت سے مسائل جدیدہ کے محققانہ جوابات تحریر کئے ہیں۔ اور بالخصوص علم میراث سے متعلق بہت تحقیقی جوابات موجود ہیں ۔جن کو میں نے بالاستیعاب پڑھا۔ماشاء اللہ بہت تحقیقی پایا۔ اور مطابق مسلک اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پایا۔ میری دعاہے کہ اللہ رب العزت اپنے محبوب کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقہ وطفیل اس مجموعہ فتاوی کو بھی مقبول عوام وخواص بنائے۔ اوراس سے استفادہ کی توفیق رفیق عطا فرمائے۔ اور مفتی صاحب کی عمرو عمل وعلم میں برکتیں فرمائے۔ اوراجر جزیل وصلہ وافر عطا فرمائے۔ اور مزید تالیف کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین علیہ التحیة والتسلیم

راقم الحروف

محمد سلیمان النعیمی البرکاتی عفی عنہ

خادم الافتاء والتدریس جامعہ نعیمیہ دیوان بازار مرادآباد

مورخہ ۲۹/جمادی الثانی ۱۴۴۰ھ

مطابق ۷/مارچ ۲۰۱۹ء(بروز پنجشنبہ)

تقریظ جمیل

تاج الفقہاحضرت علامہ مولانا مفتی محمد اختر حسین قادری صاحب قبلہ دام ظلہ
زیب مسند افتاء وتدریس دارالعلوم جمد اشاہی بستی

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

امابعد! ارشادباری تعالیٰ ہے:

''یُّؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا ؕ وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ

اللہ حکمت دیتاہے جسے چاہے اور جسے حکمت ملی اُسے بہت بھلائی ملی اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے

[ترجمہ قرآن کنزالایمان: پارہ ۳ سورہ بقرہ،آیت ۲۶۹]

اورارشادرسالت ہے:ومن یرداللہ بہ خیریفقہ فی الدین''

اس کی روشنی میں مانند آفتاب واضح ہے کہ حکمت ودانائی اوردین کی فقہ اور سمجھ اللہ جل مجدہ کا عظیم عطیہ اور بے بہا تحفہ ہے۔اورجسے اس گنج گراں مایہ سے کچھ حصہ مل جائے وہ بڑابلند اقبال اورفیروزبخت ہے۔عزیز مکرم جناب مفتی محمد ذوالفقار خان نعیمی صاحب زید مجدہ نسل نومیں بہت سی خوبیوں کی بناپر اپناالگ نشان عزت و قارر کھتے ہیں ۔اور حرکت وعمل ،جہد مسلسل ،سعی پیہم اور متواتر کوشش وجانفشانی کے اعتبارسے ایک مینارر کھتے ہیں ۔حسن صوری ومعنوی کاخوشمناگلدستہ ہیں ،علم وحلم اورتونگری وتواضع کابہتر امتزاج موصوف کی شکل میں دیکھاجاسکتاہے۔مختصر وقت میں نوع بنوع تحریروں کی خوشبوسے اہل علم کی مشام جاں کومشکبار کر دینافضل خداوندی اور عنایت یزداتی سے ہی ہوسکتاہے۔

ای سعادت بزوربازونیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

عزیز محترم نے مختلف جہات سے دینی ومذہبی خدمات کے ساتھ ہی فقہ وفتاوی جیسی مشکل اورخاردارودشوار گزار گھاٹی کی بھی جادہ پیمائی شروع کررکھی ہے۔اورجدیدوقدیم مسائل کو فقہی کلیات وجزئیات کی روشنی میں حل کرکے امت مسلمہ کی رہنمائی کافریضہ اپنے کندھے پرلے رکھاہے۔فقیرنے موصوف کے بعض فتاوی دیکھے جس سے آپ کی فقہی بصیرت ، جزئیات فقہ پر نظر،وسعت مطالعہ اورعلمی گیرائی وگہرائی کے ساتھ ذوق تحقیق کااندازہ ہوا۔آپ کے فتاوی کی دوسری جلد منظرعام پرآرہی ہے دعاہے دیگر تصانیف کی طرح آپ کی یہ علمی وفقہی کاوش بھی قبول انام کاشرف پائے اورآپ کے علمی کارناموں سے دنیامستفید ہوتی رہے۔فقط

دعاجوودعاگو محمد اختر حسین قادری غفرلہ

تاثر گرامی

الماس ملت حضرت علامہ مفتی محمد مقصود عالم صاحب

خلیفہ حضور تاج الشریعہ، مفتی فخر ازھر دارالافتاوالقضاو سرپرست اعلیٰ جماعت رضائے مصطفی

برانچ ھاسپیٹ بلہاری کرناٹک الھند

شمع بزم فقہ وافتاء نیر فلک تصنیف و تالیف آفتاب علم وادب مہتاب لوح و قلم نجم فکر و فن بادشاہ کرسئ وعظ وخطابت ترجمان مسلک اعلیٰ حضرت محب گرامی وقار مفتئ اعظم اتراکھنڈ حافظ و قاری حضرت علامہ مولانا مفتی محمد ذوالفقار صاحب نعیمی قادری برکاتی رضوی نوری ازہری زیدت معالیہ کی ذات بابرکات گوناگوں خوبی و کمال کی مالک ہے۔ اور اپنے ہم عمر معاصرین میں اپنی مثال آپ رکھتی ہے۔ جس پر اکابرین ملت اور اساطین امت کے تاثرات شاہد ہیں جس کا مطالعہ ان کی تصانیف جمیلہ انیقہ منفردہ میں کیا جاسکتا ہے۔ اس مقام پر کمالات و محاسن کے بحر بیکراں میں غوطہ زنی سے اجتناب کرتے ہوئے اجمالا تعارفی خاکہ کی تذکرہ نگاری پر انحصار کیا جاتا ہے۔

پیدائش: مفتئ اعظم اتراکھنڈ مفتی محمد ذوالفقار خان صاحب نعیمی قادری رضوی نوری ازہری ککرالوی ابن محمد انصار علی خان صاحب کی ولادت باسعادت علمی وادبی تقدس مآب وپربہار، رونق افزاونور بار قصبہ ککرالہ ضلع بدایوں شریف کی علمی وادبی تقدس مآب وپربہار، رونق افروزونور بار سرسبز وشاداب سرزمین پر 19 جون 1986 میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت: ابتدائی تعلیم قصبہ ککرالہ میں حاصل کی اور فکری تربیت سے آراستہ ہوکر شعور وآگہی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ دس سال کی عمر میں حفظ قرآن کی تکمیل کے نور سے اپنے قلب و جگر کو نیر بار بنالیا۔ فن تجوید کے جام لبالب سے دارالعلوم وارثیہ لکھنؤ میں خوب سیر اب ہوئے اور اسی مخزن حدر وترتیل سے دستار قرآت وسند قرآت سے نوازے گئے۔ سر چشمۂ علم وادب جامعہ اسلامیہ روناہی فیض آباد میں درس نظامی کی ابتدا تا سادسہ تعلیمی مراحل طے کئے اور فکری وفنی، علمی و ادبی شعور میں بالیدگی پیدا کی۔ مرکز فہم وفراست۔، گہوارہ علم وحکمت، مصدر فکر وتدبر، منبع عقل و دانش جامعہ نعیمیہ مراد آباد سے فضیلت وافتاء کی تکمیل کا زریں تاج زیب سرہوا۔

اساتذہ کرام: اساتذہ کرام کی ایک لمبی فہرست ہے اس مقام پر مخصوص اساتذہ کا اسم بامسمی کا اظہار مقصود ہے۔ جامع معقولات ومنقولات حضرت علامہ مولانا مفتی شبیر حسن رضوی صاحب شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ روناہی فیض آباد۔

حبر العلم والادب حضرت علامہ مولانا مفتی محمد سلیمان صاحب نعیمی برکاتی جامعہ نعیمیہ مراد آباد۔

ماہر علم وفن حضرت علامہ رفاقت حسین صاحب نعیمی ککرالوی کا نام نامی اسم گرامی سرفہرست ہے۔

تدریسی خدمات: قصبہ پیپل سانہ مرادآباد اور کاشی پور کے دو مدرسوں میں رہ کر تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اور علم وفن کی جوت جگاتے رہے۔ تشنگان علوم نبویہ علیہ التحیتہ والثناء کی تشنہ لبی کا خوب خوب ازالہ فرماتے رہے۔ جہاں درس و تدریس میں بھی سکہ رائج الوقت کی حیثیت سے جانے جاتے رہے۔

قلمی خدمات: قلمی خدمات کا دامن بہت وسیع ہے۔ دراصل فکر و شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی قلم دوست بن گئے۔ اور اسی علمی ایام طفلی سے قلمی نگارشات کا گلشن سجنے لگا۔ جب درجہ فضیلت میں سکونت پذیر ہوئے تو لوح و قلم کو اپنی حیات کا قیمتی سرمایہ بنالیا۔ اور انہیں ایام میں مضمون و مقالہ نگاری کی دنیاں آباد کرنے کی سعئ اجمل کردی۔ رفتہ رفتہ اس میدان کے شہسوار بن گئے۔ اب تک ہندوستان و پاکستان کے مشہور و معروف رسائل و جرائد میں تقریبا چالیس مضامین سے زائد چھپ کر شائع ہو چکے ہیں اور ہنوز اس کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔

امامت و خطابت: سن 1432 کی دہائی سے شہر کاشی پور اتراکھنڈ کی مشہور مسجد "مدینہ مسجد" میں فرائض امامت و خطابت انجام دیرہے ہیں اور گم گشتگان راہ کو اس کی منزل کا پتہ بتارہے ہیں۔

تصنیفات و تالیفات: مفتیٔ اعظم اتراکھنڈ تقریبا بیس (۲۰) کتابوں کے مصنف ہیں۔ کئی کتابیں احقر کے مطالعہ میں رہی ہیں جس میں اسلوبی کمال، فنی ندرت، ادبی جمال، حسن سنجیدگی، ژولیدہ بیانی، لسانی مہارت، تحقیقی انداز، تنقیدی جوہر، تبصراتی ملکہ کثرت حوالجات آفاقیت کی حامل ہیں۔ موصوف جب جماعت ثالثہ میں زیر تعلیم تھے اس علمی وادراکی کم سنی میں سب سے پہلی کتاب "معراج المومنین" رقم کی جس پر فقیہ زمن، علامۃ الدہر حضرت علامہ مولانا مفتی قاضی شہید عالم صاحب رضوی دام ظلہ النورانی شیخ الحدیث جامعہ نوریہ رضویہ بریلی شریف کی تقریظ اجمل ہے۔ جس سے موصوف کے قلمی استعداد کی گہرائی وگیرائی کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ ابتک ھندوستان سے تقریبا ۲۰ کتابیں چھپ کر منظر شہود پر آچکی ہیں اور اپنی علمی وادبی، فنی و تحقیقی معیار عظمی کالوہامنوا چکی ہیں۔ پاکستان سے تقریباً آٹھ کتابیں چھپی ہیں اور عالم وجود کو مرغ زار ولالہ زار بنارہی ہیں۔ جس نے آسمان علم وادب میں چار چاند لگار کھاہے اور چند چھپ کر منظر نامے پر آنے کو پر تول رہی ہیں۔

فتوی نویسی: مفتیٔ اعظم اتراکھنڈ نے سینکڑوں لاینحل مسائل کا جواب دے کر ضرورت مندوں کی شرعی حاجت کی تکمیل کی ہے موجودہ دور میں کار افتاء جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل ہے نئی نئی ایجادات نے نت نئے مسائل قوم وملت کے سامنے لاکر مشکلات و ترددات کی دیواریں کھڑی کردی ہیں جس کا ظہور آئے دن کثرت سے ہوتا رہتا ہے جس کے حل کیلئے فقہی جزئیات و کلیات کا ایک بحر بیکراں کا سطح ذہن و فکر پر جاری ہونا لازم ہے۔ موصوف ان خصوصیات کے کامل حامل ہیں جو ان کے جوابات فقیہ سے ظاہر و باہر ہے۔ آپ نے 1432 کی دہائی سے فتوی نویسی کا آغاز کیا جس کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ چار سال قبل فتاوے کے مجموعہ کی پہلی جلد بنام فتاوی اتراکھنڈ ہند و پاک کے نامور و مشاہیر مفتیان کرام کی تقریظات انیقہ وجمیلہ کی طلعت باریوں میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے جس کے باعث فقہی کائنات میں آپ کی ذات بابرکات محتاج تعارف نہیں۔ دوسری جلد بھی عنقریب ہی تبسم ریز ہونے کو ہے۔

مصروفیات: مفتیٔ اعظم اتراکھنڈ کی شخصیت بڑی مصروفیت کی حامل ہے کبھی منصب امامت پر نیر باریاں کرتے ہیں تو کبھی دارالافتاء میں بیٹھ کر لاینحل مسائل فقہ کی گھتیاں سلجھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی تصنیف و تالیف کا بازار گرم رہتا ہے تو کبھی مضمون و مقالہ نگاری کے پر کیف و روح پرور چمن کی سیر ہوتی ہے۔ کبھی وعظ و نصیحت کی محفلیں جمتی ہیں تو کبھی جلسہ و جلوس کی کرسئ خطابت پر باران نور بن کر برستے ہیں۔ کبھی ضرورت مندوں کی حاجت روائی تعویذ و عملیات کے ذریعے

کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی رزم گاہ حق و باطل میں ذوالفقار حیدری چمکاتے دکھائی دیتے ہیں۔ موصوف جواں سال و جفاکش ہیں تو یہ کمال و جمال تمام امور میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ آپ کی مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ ساری دنیارات کو سوتی ہے تو آپ شب باشی فرماتے ہیں اور قوم وملت کی ضرورت پوری کرتے ہیں زندگی کس قدر مصروف ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بیعت وخلافت: غوث زماں ، قطب عالم ، فخر ازھر ،غسال کعبہ ، محقق اعظم ، شیخ الکل ، قاضی القضاۃ فی الھند ، بدر طریقت تاج الشریعۃ حضرت علامہ مولانا مفتی الشاہ محمد اسماعیل رضاخان المعروف محمد اختر رضاخان الملقب بہ ازھری میاں قادری برکاتی رضوی نوری بریلوی قدس سرہ جانشین مفتی اعظم ہند کے دست حق پرست پر بیعت و ارادت سے سرفراز ہوئے۔

مفتی اعظم اتراکھنڈ کی علمی و عملی، فقہی وفنی، ادبی و قلمی، شعری و سخن پروری، ملی ودینی، تحریکی و تنظیمی، سیاسی و سماجی، تقریری و تحریری، کمال و خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہندو پاک کی چھ نامور و قد آور شخصیات نے تمغہ خلافت سے بہرہ مند فرمایا جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) حضور تاج الشریعہ علامہ مفتی اختر رضاخان رضی اللہ تعالیٰ عنہ
(2) شیخ الاسلام، حضرت علامہ مدنی میاں اشرفی الجیلانی دام ظلہ النورانی
(3) ممتاز الفقہاء، محدث کبیر حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ امجدی دامت برکاتہم القدسیہ
(4) حضرت علامہ سید وجاہت رسول صاحب قادری دام ظلہ النورانی
(5) قاضئ شہر رامپور حضرت علامہ مفتی سید شاھد میاں صاحب نوری دام ظلہ النورانی
(6) منان ملت حضرت منان میاں صاحب قادری بریلوی دام ظلہ النورانی

وعظ وخطابت: مفتی اعظم اتراکھنڈ وعظ وخطابت کی دنیا میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں، علمی واستدلالی فکری و تحقیقی اور علمی وادبی خطابت کی نیر باریوں سے جہان کفر وضلالت، گمراہیت وبدعت اور فسق وغلاظت کے تیرو تار وادی کو ضیابار بناتے ہیں۔ احقاق حق وابطال باطل کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ترجمان مسلک اعلیٰ حضرت کی حیثیت سے کائنات خطابت میں اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ایوان باطل میں ذوالفقار حیدری ہیں تو اہل حق کے انجمن میں شمع جمال ہوتے ہیں۔ موصوف عبادت وریاضت کے خوگر ہیں۔ بڑے ملنسار و پاک باز ہیں۔ عمدہ خصائل، نیک سیرت، خوش مزاج اور بے شمار خصوصیات کے مالک ہیں۔

ارباب علم ودانش کے تاثرات:

فقہ وفتاوی کے حوالے سے ملک کے معتمد ومستند علماء کرام وفقہاء عظام کا آپ کو اعتماد حاصل ہے۔ فتاوی اتراکھنڈ کی پہلی جلد اور دوسری جلد میں شامل کئی قد آور ونامور شخصیات کے تاثرات اس پر شاھد ہیں انہیں تاثراتی گلستان سے چند علماء متبحرین کے اہم اقتباسات ہم یہاں نقل کر دیرہے ہیں تاکہ موصوف کی علمی وقعت، ادبی گہرائی، فقہی بصیرت، فنی ندرت، سخن پروری، احقاق حق وابطال باطل کی طلعت باری اور قلمی نگارشات وخدمات کے آفتاب عالم تاب کا ادراک ہوسکے۔

جامع معقول ومنقول حضرت علامہ مفتی شبیر حسن رضوی شیخ الحدیث جامعہ روناہی فیض آباد

”فتاوی اتراکھنڈ عزیز القدر ومحبم حضرت مولانا مفتی محمد ذوالفقار خان سلمہ المولیٰ المنان کی تصنیف وتالیف ہے۔ عزیزم ایک ذی علم عالم دین ہیں۔ فتوی نویسی وکارافتاء بہت ہی مشکل کام ہے جس میں موصوف سلمہ نے بہت ہی محنت ومشقت عرق ریزی سے کام لیاہے۔ احقاق حق وابطال باطل میں کوئی رعایت نہیں کی ہے۔ یہی علمائے ذوی الاحترام مخلصین مفتیان عظام کی شان ہوتی ہے۔

مقدام العلماحضرت علامہ سید شاہد میاں قاضی شہر رامپور

محب محترم ذی المجد والکرم ذی الطبع السلیم والفکر القویم اخی فی الدین حضرت مولانا مفتی محمد ذوالفقار خان نعیمی سلمہ المنان وحفظہ الرحمن اہلسنت وجماعت کی ایک عظیم مرکزی درسگاہ جامعہ نعیمیہ دیوان بازار مرادآباد کے ہونہار، ہوشیار، ذی شعور وباکردار، وقت اور حالات کے نباض احوال زمانہ سے واقف کار، نوجوان عالم وفاضل ہیں، ساتھ ہی محقق ومدقق، مؤرخ ومفکر، ادیب وصحافی، مصنف ومؤلف، خطیب ومناظر، صالح مصلح ہادی ومہدی اور ذی استعداد وباصلاحیت مستند ومعتمد مفتی بھی ہیں۔ نعیمیات پر زبردست کام کررہے ہیں اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں پر اچھاعبور ہے۔ ان کا علمی اور تحقیقی کام دیکھ کر دل مسرور ہوتا ہے۔ موصوف کا علم حاضر، ذہن رساں، دماغ تازہ اور قلم رواں دواں ہے۔

استادالاساتذہ حضرت علامہ مفتی صالح صاحب قبلہ شیخ الحدیث جامعۃ الرضابریلی شریف

”حضرت مولانا مفتی ذوالفقار صاحب نعیمی ایک اچھے عالم دین ووقیع مفتی ہیں اور بڑی علمی عملی خوبیوں کے جامع ہیں گویاجواں سالی میں شیخ کبیر ہیں۔ حسن افتا، کثرت مطالعہ، زودنویسی، ملت کی خیرخواہی وغیرہ صفات حمیدہ سے متصف ہیں۔“

ماہر علم وفن حضرت علامہ مفتی محمد سلیمان صاحب قبلہ زیب مسند افتاء جامعہ نعیمیہ مرادآباد

”حضرت علامہ مفتی محمد ذوالفقار خاں نعیمی فاضل جامعہ نعیمیہ دیوان بازار مرادآباد نے درجۂ تخصص سے اعلیٰ کامیابی جامعہ سے حاصل کی۔ اوراوّل نمبر پر دستارِ افتاء سے نوازے گئے۔

ماہر اصول وفروع حضرت علامہ قاضی شہید عالم صاحب قبلہ شیخ الحدیث جامعہ نوریہ رضویہ بریلی شریف

فاضل نوجوان حضرت مولانا مفتی ذوالفقار خان صاحب نعیمی ایک بالغ نظر عالم، باریک بیں مفتی اور کثیر المطالعہ فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی فعال اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ موصوف کے فتاویٰ کا مجموعہ باصرہ نواز ہوا- دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، اس نوعمری میں ہی موصوف نے اس منزل کو پالیاہے جہاں تک پہنچنے کے لئے کسی ماہر فقیہ کے زیر سایہ ایک طویل مدت تک مشاقی کی ضرورت پڑتی ہے۔

تاج الفقہاحضرت علامہ مفتی اختر حسین صاحب قبلہ زیب مسند افتاءو تدریس دارالعلوم جمداشاہی بستی

عزیز مکرم جناب مفتی محمد ذوالفقار خان نعیمی صاحب زید مجدہ نسل نو میں بہت سی خوبیوں کی بناپر اپناالگ نشان عزت و قار رکھتے ہیں۔ اور حرکت وعمل، جہد مسلسل، سعی پیہم اور متواتر کوشش وجانفشانی کے اعتبار سے ایک مینار رکھتے ہیں۔
حسن صوری ومعنوی کاخوشنماگلدستہ ہیں، علم وحلم اور تونگری وتواضع کابہتر امتزاج موصوف کی شکل میں دیکھاجاسکتاہے۔

ماہر درسیات حضرت علامہ مولانا عاقل صاحب صدر المدرسین منظر اسلام بریلی شریف

محب مکرم فاضل نوجوان حضرت مولانا محمد ذوالفقار صاحب نعیمی دام ظلہ دینی لگن، مذہبی حمیت، علمی فکر جیسے اوصاف جلیلہ میں اپنے ہم عصر نوجوان علماء میں انفرادی شخصیت کے حامل ہیں۔ مولانا موصوف کا کردار و عمل اور ان کی مسلکی خدمات کا وسیع دائرہ ان کے لئے مشعل راہ ہے، یہ جہاں رہتے ہیں دینی کام میں لگے رہتے ہیں بلکہ شب و روز ان کی انتھک کوششوں سے میدان عمل ہموار کرتے ہیں، ان کی تمام تر کدو کاوش، محنت و جانفشانی کا محور مسلک اعلیٰ حضرت کی نشر و اشاعت ہے۔

یہ چند تاثرات تھے جن سے موصوف کی شخصیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

رب قدیر بطفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مزید قلمی توانائی، فکری بالیدگی، اشاعتی جولانی، فہمی طغیانی، دائمی صحت و سعادت مندی اور نیک بختی کی دولت لازوال سے مالامال فرمائے۔ اور موصوف کی ساری تصنیفات بالخصوص اس تصنیف انیق کو مقبولیت آفاقی سے ہمکنار فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

محمد مقصود عالم فرحت ضیائی

خادم: فخر ازھر دارالافتاوالقضاو سرپرست اعلیٰ جماعت رضائے مصطفی

برانچ ھاسپیٹ بلہاری کرناٹک الھند

نوجوان علما میں آپ کو ممتاز مقام حاصل ہے

عمدۃ العلما حضرت مفتی محمد راحت خاں قادری صاحب قبلہ دام ظلہ
سرپرست اعلیٰ دار العلوم فیضان تاج الشریعہ، بریلی شریف

افتا کی ذمہ داری کو کما حقہ پورا کرنا کتنا مشکل امر ہے اِس کا ٹھیک اندازہ تو وہی شخص لگا سکتا ہے جو اس دشوار کن راہ سے کسی طرح سے تعلق رکھتا ہو کبھی کبھی ایک مسئلہ تلاش کرنے میں بہت وقت لگ جاتا ہے لیکن جس کو بھی اس کام کی صحیح لگن ہو جائے وہ جب تک اپنے مطلوبہ مسئلہ کا حل تلاش نہیں کرلیتا اس کو کھانا پینا کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ آج بھی ہندوستان میں بہت سے ایسے ادارے قائم ہیں کہ جہاں سے بلامعاوضہ فتاوی کی خدمات انجام دی جاتی ہیں میدانِ فتوی نویسی میں بریلی شریف کو نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے یہاں فتوی نویسی کی تاریخ تقریباً دوصدیوں کو محیط ہے جو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کے ذکر کے بغیر ناقص وادھوری ہے۔ ہندوپاک اور بنگلہ دیش میں بہت سے ایسے مراکز قائم تھے جہاں سے فی سبیل اللہ بلامعاوضہ فتوی نویسی کی خدمات انجام دی جاتی تھیں جو آج بھی اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔ خدائے تبارک وتعالیٰ اہلِ سنت وجماعت کے ایسے مراکز کو مزید استحکام عطا فرمائے۔ اِس زمانہ میں ہر چیز کو دنیاوی مفاد سے جوڑ دیا گیا ہے۔ تربیت وتدریس، تحریر وصحافت، امامت وخطابت، آذان ودعا، قرآن خوانی ونعت خوانی، فاتحہ خوانی ومزارات پر حاضری، پیری ومریدی وغیرہ جس شعبہ کو بھی آپ غور سے دیکھو گے وہاں آپ کو دنیاوی لالچ کی شکایتوں کا ایک ایسا انبار ملے گا کہ جس کا خاتمہ بہت مشکل ہو گا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ اور ان کے خلفا کا طریق کار میدانِ افتا میں یہ تھا کہ وہ اس خدمت کو مکمل طرح سے بلامعاوضہ اور خالصۃً لوجہ اللہ پیش کیا کرتے تھے آج برصغیر کے تمام مراکز میں بعینہٖ اسی طرز کی خدمات شاید ہی کہیں نظر آئیں بلکہ اب ملازمت کا طریقہ رائج ہو چکا ہے الاماشاء اللہ۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ اور ان کے خلفا کے طریقہ کو اپناتے ہوئے نوجوان محقق حضرت مولانا مفتی محمد ذوالفقار خاں نعیمی دامت برکاتہم العالیہ نے فتوی نویسی کی خدمت کو ملازمت کے راستہ سے الگ ہٹ کر، دنیاوی مفاد سے بچ کر خالصۃً لوجہ اللہ انجام دینا شروع کیا جو مکمل جانفشانی وذمہ داری کے ساتھ جاری وساری ہے۔ مفتی صاحب قبلہ مختلف گوناگوں علمی واخلاقی محاسن وکمالات کے ساتھ سرعتِ تحریر، کثیر جزئیات کا استحضار اور وسعتِ مطالعہ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ مختلف موضاعات پر آپ کی گراں قدر خدمات علماو محققین اور اصحاب قرطاس وقلم سے داد وتحسین حاصل کرچکی ہیں۔ میدانِ افتا میں بھی آپ کو نوجوان علما میں ممتاز مقام حاصل ہے، آپ کے فتاوی تحقیقی وتفصیلی ہوتے ہیں جس موضوع پر لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں فتاوی میں جزئیات کی کثرت ہوتی ہے، اگر مسئلہ مختلف فیہ ہو تو جانبین کے دلائل دینے کے بعد اپنے موقف کو اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ جس کو پڑھ کر عام قاری بھی اس کی حقانیت پر یقین کیے بغیر نہیں رہ سکتا، آپ کے نوکِ قلم سے صادر شدہ فتاوی کی جلد اول ہندوپاک سے شائع ہو چکی ہے جس کو اربابِ علم ودانش اور علماومفتیانِ کرام نے خوب سراہا اب جلدِ دوم طباعت کے مرحلہ میں ہے اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور مقبول انام بنائے۔ آمین۔

محمد راحت خاں قادری
خادم دار العلوم فیضان تاج الشریعہ، بریلی شریف

فقہ و فتاوی کی اہمیت وافادیت

جامع معقول و منقول مقدام العلماوالفقہاحضرت مفتی شبیر حسن رضوی دامت معالیھم
شیخ الحدیث جامعہ روناہی فیض آباد

ایک بندہ مومن کے لیے اس سے بڑھ کر سعادت مندی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو علم دین جیسی بیش بہادولت میسر آجائے اوراس میں بھی اللہ تعالیٰ اگر اس کو علم فقہ و فتاوی عطافرمادے تو زہے نصیب۔علم فقہ و فتاوی ملنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ بھلائی کاارادہ فرمایاہے کیوں کہ حضوراکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من یردالله به خیریفقه فی الدین" (اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کاارادہ فرماتاہے اسے دین میں سمجھ عطافرمادیتاہے)توجس کے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی آجائے اس کی دنیا بھی روشن وتابناک ہو جاتی ہے اور یقینی طور پر آخرت بھی سنور جاتی ہے ایک دوسرے موقع پر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

''من تفقه فی دین الله کفاه الله همه و رزقه من حیث لایحتسب''

(جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین کافقیہ بن گیااللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کے غم اوراس کی روزی کے لیے کافی ہو گیاجہاں وہ گمان نہیں کرے گا)علم فقہ کی فضیلت میں بہت حدیثیں آئی ہوئی ہیں جن سے اس علم کی فضیلت آفتاب نیم روزسے بھی زیادہ عیاں ہے۔اس علم کے اٹھنے کو قرب قیامت کی نشانیوں سے شمار کیاگیاہے۔چنانچہ مخبر صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قیامت کی نشانیوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''إن الله لایقبض العلم انتزاعاینتزعه من العباد، ولکن یقبض العلم بقبض العلماء، حتی إذالم یبق عالما اتخذ الناس رؤسا جهالا، فسئلوا، فأفتوا بغیرعلم، فضلوا وأضلوا''

(اللہ تعالیٰ لوگوں سے یک دم علم نہ اٹھائے گالیکن علماکے فوت کرنے سے علم اٹھائے گا یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہے گاتولوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے۔ان سے مسائل پوچھے جائیں گے وہ علم کے بغیر فتوی دیں گے وہ خود گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو گمراہ کریں گے۔)

فقہ کالغوی معنی

کسی چیز کاجانناور سمجھناہے۔مگر صوفیائے کرام نے علم فقہ کی تعریف یوں کی ہے "وہ احکام شریعت کو عمل میں لاناہے۔اسی لیے سیدناامام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۹۳ھ۔۱۷۹ھ) نے فرمایا:

"من تفقه ولم یتصوف فقدتفسق ومن تصوف ولم یتفقه فقدتزندق''یعنی جس نے عالم شریعت ہونے کے ساتھ،ساتھ طریقہ صوفیاکی پیروی نہ کی وہ بے عمل ٹھہرا۔اور جس نے صرف زہداختیار کیااور علم شریعت سے بے بہرہ رہااس کے ایمان کاکوئی بھروسہ نہیں۔اور علمائے اصول فقہ کے نزدیک علم فقہ "وہ علم ہے جس میں احکام شرعیہ فرعیہ کاعلم ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ حاصل کیاجائے"

اسی لیے ان حضرات کے نزدیک فقیہ و مفتی حقیقت میں مجتہد ہی ہو سکتا ہے۔ صاحب فتح القدیر نے باب القضایا میں فرمایا: اصولین مضبوطی کے ساتھ یہ رائے رکھتے ہیں کہ مفتی کا درجہ صرف مجتہد کو حاصل ہوتا ہے جو شخص مجتہد نہیں ہے لیکن اسے مجتہد کے اقوال زبانی یاد ہیں وہ مفتی نہیں ہے اس سے جب مسئلہ دریافت کیا جائے تو اسے بطور نقل وحکایت کسی مجتہد کا قول جواب میں بتانا چاہئے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہمارے زمانہ میں (یعنی زمانہ مصنف فتح القدیر میں) جو علما فتوی دیتے ہیں حقیقت میں وہ فتوی نہیں ہے بلکہ اصل میں کسی مفتی کا قول ہے جو نقل کر دیا گیا ہے تاکہ مستفتی اس پر عمل کرے مجتہد سے اس کا قول نقل کرنے کے دو طریقے ہیں: اول یہ کہ یا تو وہ قول اس کے پاس کسی سند سے پہنچا ہو۔

دوم یہ کہ اس نے مجتہد کا قول کسی ایسی مشہور کتاب سے لیا ہو جو دیگر علما کے ہاتھوں میں رہتی ہو، جیسے امام محمد بن حسن کی کتابیں اور ایسے ہی دیگر کتب فقہیہ جو اپنی روایت واسناد کے اعتبار سے خبر متواتر یا خبر مشہور کے درجے میں ہیں۔ (عمدۃ الرعایہ ص ۱۱)

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت فقیہ اعظم امام احمد رضا خاں قادری علیہ رحمۃ الباری اپنے رسالہ مبارکہ "اجلی الاعلام ان الفتوی مطلقا علی قول الامام" میں چند بنیادی مقدمات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"چوتھا مقدمہ فتوی کی دو قسمیں ہیں: عرفی اور حقیقی تو حقیقی یہ ہے کہ دلیل تفصیلی کی معرفت کے بعد فتوی دیا جائے یہی وہ لوگ ہیں جن کو اصحاب فتوی کہا جاتا ہے، کہتے ہیں یہی فتوی دیا ہے فقیہ ابو جعفر، فقیہ ابو اللیث اور ان کے امثال نے۔ اور عرفی فتوی یہ ہے کہ عالم لوگوں کو امام کے اقوال بتادے۔ وہ دلیل کو نہ جانتا ہو محض تقلید کے طور پر ایسا کرے جیسے کہا جاتا ہے کہ فتاوی ابن نجیم، فتاوی غزی، فتاوی طوری اور فتاوی خیریہ وغیرہ اور بعد کے زمانے میں فتاوی رضویہ ہے۔"

(فتاوی رضویہ مترجم: ج ا ص ۱۰۹)

افتا کا لغوی معنی

مطلقا جواب دینا یا کسی مشکل حکم کا جواب دینا۔ اور اصطلاح شرع میں افتا کے معنی: حکم شرعی بیان کرنا اور فیصلہ سنانا ہے۔ علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۲۵۲ھ) فرماتے ہیں: "الافتاء فانه افادة الحکم الشرعی" "فتوی دینے کا مطلب حکم شرعی سے آگاہ کرنا ہے۔

علامت سنیت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری علیہ رحمۃ الباری (۱۲۷۲ھ۔ ۱۳۴۰ھ) فرماتے ہیں:

"انما الافتاء ان تعتمد علی شیء وتبین لسائلك ان هٰذا حکم شرعی" (فتاوی رضویہ جلد اول، ص ۱۰۲)

یعنی فتوی دینے کا معنی پورے اعتماد کے ساتھ سائل کو اس کے سوال کا حکم شرعی بتانا ہے۔

قرآن حکیم میں لفظ افتا اور استفتا مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ درج ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۔ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ

اور تم سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں تم فرمادو کہ اللہ تمھیں ان کا فتویٰ دیتا ہے۔

[ترجمہ قرآن کنزالایمان: سورہ نساء آیت ۱۲۷]

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۔ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ

اے محبوب تم سے فتوی پوچھتے ہیں تم فرمادو کہ اللہ تمہیں کلالہ میں فتوٰی دیتا ہے۔

[ترجمہ قرآن کنزالایمان: سورہ نساء آیت ۱۷۶]

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ فِیْۤ اَمْرِیْ

بولی اے سردارو! میرے اس معاملہ میں مجھے رائے دو۔[مرجع سابق: سورہ نمل آیت ۳۲]

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا۔ اے یوسف اے صدیق ہمیں تعبیر دیجئے[مرجع سابق:سورہ یوسف آیت ۴۶]

ان آیات میں لفظ افتااوراستفتا حکم دینے، تحقیق چاہنے، خواب کی تعبیر بتانے، جواب مانگنے اور مشورہ دینے کے معنی میں آیاہے۔ اورپر کی دوآیتوں میں اللہ تعالیٰ نے فتوی کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ جس سے افتا کی عظمت ورفعت کا پتہ چلتاہے کہ یہ بڑا عظیم و بابرکت کام ہے۔ مگر افتااوراس کے وہ اصول و قواعد جو فقہائے کرام کی کتابوں میں مرقوم ہیں ان سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ یہ کام انتہائی دشوار و مشکل اور ذمہ داری کا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضاخان قادری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فقہ یہ نہیں کہ کسی جزئیہ کے متعلق کتاب سے عبارت نکال کر اس کالفظی ترجمہ سمجھ لیا جائے یوں تو ہر اعرابی ہر بدوی فقیہ ہوتا کہ ان کی مادری زبان عربی ہے بلکہ فقہ بعد ملاحظہ اصول مقررہ وضوابط محررہ ووجوہ تکلم وطرق تفاہم و تنقیح مناط ولحاظ انضباط و مواضع یسر واحتیاط و تجنب تفریط وافراط وفرق روایات ظاہرہ ونادرہ وتمیز درآیات غامضہ وظاہر ومنطوق ومفہوم وصریح ومحتمل وقول بعض وجمہور ومرسل ومعلل ووزن الفاظ مفتیین وسیر مراتب ناقلین وعرف عام وخاص وعادات بلاد واشخاص وحال زمان ومکان واحوال رعایاوسلطان وحفظ مصالح دین ودفع مفاسدین وعلم وجوہ تجریح واسباب ترجیح ومناہج توفیق ومدارک تطبیق و مسالک تخصیص ومناسک تقیید ومشارع قیود وشوارع مقصود وجمع کلام ونقد مرام فہم مراد کانام ہے کہ تطلع تام واطلاع عام ونظر دقیق وفکر عمیق وطول خدمت علم وممارست فن وتیقظ وافی وذہن صافی معتاد تحقیق مؤید بتوفیق کاکام ہے"[فتاوی رضویہ جدید:ج۱۶ص۳۷۷۔۳۷۸]

علامہ مفتی شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:"فتوی لکھنے میں یہ چند چیزیں ضروری ہیں:

(۱)سوال کا کماحقہ سمجھنا(۲)سوال کے لب ولہجہ سیاق وسباق سے یہ پہچان لینا کہ سائل کا منشا کیاہے یہ سب سے اہم کام ہے جو شخص بہت دقیق تنقیدی نظر نہ رکھتاہو وہ اس کو شاید یہ جان سکے یہ بہت ماہر حاذق کاکام ہے۔(۳)مفتی مخلص ہو۔

(۴)انتہائی ذہین وفطین ہو۔(۵)زبان عربی کا پوراپوراماہر ہو عبارت النص، دلالت النص، اشارۃ النص، اقتضاء النص وغیرہ کے ذریعہ فقہی عبارتوں کے جملہ معانی سمجھنے کا ملکہ رکھتاہو۔(۶)متداول کتب فقہ کا کامل مطالعہ کئے ہوئے ہو اوراس کے حافظہ میں فقہ کے اکثر کلیات وجزئیات محفوظ ہوں۔(۷)کسی سے مرعوب نہ ہو۔(۸)اتنا جری ہو کہ بلاخوف لومۃ لائم حق بات کہنے کی جرات رکھتاہو، مزاج پر غصہ غالب ہو اورنہ لینت(نرمی)۔(۹)سوال کے بارے میں جب تک پورا اطمینان خاطر نہ ہو جائے حکم صادر نہ کرے۔(۱۰)جو بھی حکم دے اس کی قوی دلیل پہلے ذہن نشین کرلے۔

(۱۱)تشابہ مسائل میں امتیاز پر قادر ہو وغیرہ وغیرہ"(فتاوی برکاتیہ ص۱۳۔۱۴]

انہیں سب باریکیوں کے پیش نظر زمانہ رسالت میں فتوی رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے لیاجاتا تھاپھر آفتاب رسالت کے روپوش ہونے کے بعد ہر صحابی فتوی نہیں دیتا تھابلکہ خلفائے راشدین اور دیگر اجلہ صحابہ کرام اس فریضہ کو انجام دیتے تھے اوراگر کسی غیر مجتہد صحابی سے فتوی پوچھا بھی جاتا تووہ دوسرے صحابی کے پاس بھیج دیتے اوراسی طرح تیسرے کے پاس۔

حضرت عبدالرحمن بن ابی لیلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک سوبیس ایسے انصاری صحابہ کرام کی زیارت سے مشرف ہواہوں کہ جب ان میں سے کسی سے فتوی مانگاجاتا تووہ استفتا کواپنے دوسرے ساتھی کی طرف تفویض کردیتے اوروہ دوسرے کی طرف ،یہاں تک کہ گھوم پھر کرپہلے والے شخص کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ان حضرات کے فتوی نہ دینے کامطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ یہ حضرات مسائل شرعیہ سے آگاہ نہیں تھے بلکہ یہ لوگ اس میں مجتہدانہ شان نہیں رکھتے تھے اس لیے یہ لوگ ان لوگوں کی طرف استفتا کوروانہ کردیتے تھے جواس شان کے مالک تھے۔علاوہ ازیں ان کے سامنے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان عالی شان بھی تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اجرؤکم علی الفتیااجرؤکم علی النار''یعنی تم میں جوفتوی دینے پرزیادہ جری ہے وہ آتش دوزخ پرزیادہ جرات رکھتاہے۔پھرجب خلافت راشدہ اوراس کے بعد اسلامی فتوحات کادائرہ وسیع ہوتارہااورنئی آبادیوں میں اسلام کی روشنی پہنچی توفقہ وافتاکے مختلف جگہوں پرمراکز قائم کیے گئے۔جن میں سے یہ پانچ مراکز بہت مشہور ہیں۔مدینہ منورہ،مکہ مکرمہ،کوفہ مطہرہ،شام شریف اوریمن شریف۔جن میں فتوی دینے والے جلیل القدر صحابہ کرام اور تابعین عظام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین موجود تھے۔

مفتیان مدینہ منورہ

یہ فقہ وافتاکاسب سے پہلا اورسب سے بڑامرکزہے۔جہاں سے پوری اسلامی دنیامیں فتوی پہنچتاتھا یہاں کے مندرجہ ذیل مفتیان کرام بہت مشہورومعروف ہیں:

خلیفۃ الرسول سیدناابوبکرصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (متوفی ۱۳ھ)۔امیرالمومنین سیدناعمرفاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (شہید ۲۳ھ)۔جامع القرآن کامل الحیاءوالایقان امیرالمومنین سیدناعثمان ابن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ (شہید ۳۵ھ) مولائے کائنات باب العلم سیدناعلی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ (شہید ۴۰ھ)۔اورصاحب النعلین والوسادۃ سیدناعبداللہ بن مسعود (متوفی ۳۲ھ)۔سیدناابی بن کعب،سیدنازیدبن ثابت،ام المومنین سیدتناعائشہ صدیقہ (متوفی ۵۷ھ) سیدناعبداللہ ابن عمر (متوفی ۷۳ھ) سیدناعبداللہ بن عباس (متوفی ۶۸ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنھم۔

مفتیان مکہ مکرمہ

جب مکہ مکرمہ فتح ہواتورسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت معاذبن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ (متوفی ۱۸ھ) کوکچھ وقت کے لیے یہاں کامعلم ومفتی مقرر فرمایاتھا۔پھررئیس المفسرین سیدناعبداللہ ابن عباس (متوفی ۶۸ھ) نے اپنی حیات مستعار کے آخری ایام یہیں بسر فرمائے یہاں کے لوگ آپ کے علم الفقہ والقرآن سے خوب مستفیض ہوئے۔

تابعین میں:سیدنامجاہدبن جبیر (متوفی ۱۰۳ھ) سیدناعکرمہ مولی ابن عباس (متوفی ۱۰۷ھ) سیدناعطابن ابی رباح رضی اللہ عنھم

مفتیان کوفہ

صحابہ میں سیدناعبداللہ بن مسعود (متوفی ۳۲ھ) سیدنا علی بن ابی طالب (شہید ۴۰ھ) تابعین میں سیدناعلقمہ بن قیس (متوفی ۶۲ھ) سیدنامسروق بن اجدع (متوفی ۶۳ھ) سیدناعبیدہ بن عمر سلیمانی (متوفی ۹۲ھ) سیدنااسود بن یزید نخعی (متوفی ۹۵ھ) سیدنا قاضی شریح بن حارث کندی (متوفی ۹۵ھ) سیدناسعید بن جبیر (شہید ۹۵ھ) سیدنا عمر بن شرحبیل (متوفی ۱۰۴ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

مفتیان بصرہ

حضرت ابوموسی اشعری (متوفی ۵۲ھ) حضرت انس بن مالک (متوفی ۹۳ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

تابعین میں: حضرت ابوالعالیہ رافع بن مہران (متوفی ۹۰ھ) حضرت ابوالشعثاجابر بن یزید (متوفی ۹۳ھ) حضرت امام محمد بن سیرین (متوفی ۱۳۱ھ) حضرت قتادہ بن دعامہ (متوفی ۱۱۸ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

مفتیان شام

حضرت عبدالرحمن بن غنم اشعری (متوفی ۷۸ھ) حضرت ابوادریس خولانی (متوفی ۸۰ھ) حضرت قبیصہ بن ذویب (متوفی ۸۱ھ) حضرت رجاءبن حیات کندی (متوفی ۱۱۲ھ) حضرت عمر بن عبدالعزیز اموی (متوفی ۱۰۱ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

مفتیان مصر

حضرت عبداللہ بن عمر عاص (متوفی ۶۵ھ) حضرت ابوالخیر مرشد بن عبداللہ (متوفی ۹۰ھ) حضرت یزید بن ابی حبیب (متوفی ۱۲۸ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

مفتیان یمن

حضرت علی ابن ابی طالب (شہید ۴۰ھ) حضرت معاذ بن جبل (متوفی ۸۰ھ) حضرت ابوموسی اشعری (متوفی ۵۲ھ) حضرت طاؤس بن کیسان جندی (متوفی ۱۰۶ھ) حضرت وہب بن منبہ صنعانی (متوفی ۱۱۴ھ) حضرت یحییٰ بن کثیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین وارضاھم عنا۔

تخریج مسائل میں اختلاف اور ضرورت تدوین فقہ

دین اسلام بڑی تیزی کے ساتھ دنیائے انسانیت کو اپنے دامن امن وسلامتی میں جگہ دے رہاتھااور ہر طرف سے ہر رنگ نسل کے لوگ جوق درجوق اسلام کے سایہ کرم میں آکر چین وسکون محسوس کررہے تھے۔ دوسری طرف اجلہ مجتہدین صحابہ کرام وتابعین عظام دنیاسے کوچ کر چکے تھے اور جو صحابہ کرام باقی تھے وہ بھی سامان سفر آخرت باندھے بس کوچ کے نقارے کی آواز کی طرف کان لگائے ہوئے تھے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت کچھ جاچکے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

گویا کہ وہ ایک ایک کرکے صبح کے ستاروں کی مانند روپوش ہورہے تھے جب کہ دیگر مسلمانوں کی جماعت بڑھنے کے ساتھ ساتھ حوادث وواقعات کا بھی ایک نہ تھمنے والا سلسلہ بہت تیزی سے چل رہاتھا بہت سے ایسے سوالات جن کا حل کتاب وسنت اوراکابر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی سیرت سے مل جاتااور کتنے ایسے نت نئے واقعات ہوتے جن میں انہیں

خود اجتہاد و استنباط کی ضرورت پیش آتی مثلاً کسی نے غلطی سے نماز میں کوئی عمل چھوڑ دیا تو یہ بحث سامنے آتی کہ اس کی نماز ہوئی یا نہیں؟ اس بحث کے پیدا ہو جانے کے بعد یہ تو ممکن نہیں تھا کہ نماز میں جتنے افعال واشغال ہیں سب کو فرض قرار دے دیا جائے یا کسی کو بھی ضروری قرار نہ دیا جائے۔ اس لیے صحابہ کرام اور تلامذہ صحابہ کرام کو تفریق کرنی پڑی کہ نماز کے ایسے امور فرض ہیں جن کے چھوٹنے سے نماز ہی جاتی رہتی ہے۔ یہ امور واجبات نماز سے ہیں جن کے بھول کر چھوٹنے پر سجدہ سہو سے تلافی ہو سکتی ہے۔ اور یہ امور سنن و مستحبات سے ہیں جن کے ترک پر نفس نماز میں تو کوئی خلل واقع نہیں ہوتا البتہ بلا عذر چھوڑنے یا عادت بنالینے کی صورت میں کمال نماز جاتا رہتا ہے اور کراہت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دیگر اعمال اسلام مثلاً: روزہ، زکاۃ، حج، جہاد، نکاح و طلاق اور بیع و شرا وغیرہ کا معاملہ تھا جن کے مسائل آئے دن پوچھے جاتے تھے۔

تفریق امور کے لیے جنہیں اصول قرار دیا جا سکتا تھا ان پر صحابہ کرام اور تلامذہ صحابہ کرام کا اتفاق بھی ناممکن امر تھا کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اگر کبھی ایک رکن کے ترک پر کسی کے عمل کی نکیر فرمائی تو کبھی شرط وواجب، سنن و مستحبات کے چھوٹنے پر اس عمل کی نفی فرمادی۔ جس پر وہ یہی سمجھا کہ یہ امر اس فعل میں ضروری تھا جس کی بنیاد پر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نکیر فرمائی۔ اس وجہ سے بھی اختلاف واقع ہوا۔ اور کچھ ایسے مسائل تھے جن کا زمانہ رسالت پناہی اور دور صحابہ کرام میں کچھ پتہ ہی نہ تھا تو ان میں اہل علم حضرات کو حمل النظیر علی النظیر اور قیاس سے کام لینا پڑا۔ اور ان میں بھی ان کے اصول یکساں نہیں تھے اس لیے بھی ان کے درمیان اختلاف ہوا۔ اس کے علاوہ بعض مسائل میں اہل علم صحابہ کا مخصوص علم بھی مختلف تھا کیوں کہ پورے ۲۳؍ سال میں دین کی تکمیل ہوئی جن میں حسب مواقع احکام دین میں تغیر و تبدل ہوتا رہا اور خدمت نبوی میں تمام صحابہ کرام کا ہمیشہ موجود رہنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس لیے تمام صحابہ کو ہر امر کا علم ہو یہ بھی ممکن نہیں تھا یہ بھی اختلاف کی وجہ ہوئی۔ نیز احادیث کریمہ میں کثرت کی وجہ سے ان میں ترجیح کی نوعیت میں اختلاف اور اوامر و نواہی کے صیغوں سے احکام کی کیفیت و حیثیت کے معلوم کرنے میں اختلاف۔

الغرض دوسری صدی ہجری کا ربع اول وہ زمانہ تھا کہ مسائل اور ان کے اصول میں کثرت سے اختلافات واقع ہوئے۔ جن سے بعض دنیادار امرا اور حکام فائدہ اٹھا کر قاضیوں سے اپنی منشا کے مطابق فیصلے کروا لیتے تھے جن سے عوام مسلمین کو کافی بے چینی اور بے اطمینانی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ تمدنی مسائل کی وسعت الگ تدوین احکام کی متقاضی تھی کہ تحفظ احکام اسلامی کی غرض سے فقہ اور اصول فقہ کی باضابطہ تدوین کی جائے جن کو اپنا کر اس وقت کے تمام مسائل اور آنے والے زمانے کے تمام مسائل کو حل کیا جا سکے۔ اور وہ تمام بلاد و امصار میں نافذ ہو سکیں۔ اس کار خیر کی طرف جس شخصیت نے پہلی فرمائی عالم اسلام اسے امام الائمہ، کاشف الغمہ، سراج الامہ، شیخ الاسلام والمسلمین، امام المجتہدین، مجتہد علی الاطلاق امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت (۸۰ھ۔ ۱۵۰ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام نامی سے یاد کرتا ہے۔ آپ نے اپنے ارشد تلامذہ کی جماعت کو لے کر اس عظیم کام کا آغاز کیا اور دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے پہلے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ الحمد للہ علی ذلک۔ پھر آپ کے بعد دوسرے ائمہ مجتہدین نے اپنے اپنے علاقوں میں اس کام کی طرف توجہ مبذول فرما کر فقہ کی تدوین کی مدینہ منورہ میں حضرت امام مالک بن انس (۹۳ھ۔ ۱۷۹ھ) مصر میں حضرت امام شافعی (۱۵۰ھ۔ ۲۰۴ھ) بغداد میں حضرت امام احمد بن حنبل (۱۶۴ھ۔ ۲۴۱ھ)

کوفہ میں حضرت سفیان ثوری(متوفی۱۶۱ھ)مصر میں حضرت امام لیث(متوفی۱۷۵ھ)بغداد میں امام ثوری(متوفی ۲۴۰ھ)رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے یہ عظیم کارنامہ انجام دیا۔لیکن آگے چل کر بہت سارے فقہی مذاہب غروب ہوگئے صرف چار مسلک کو فروغ حاصل ہوا۔ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی۔ان ہی مذاہب کے مطابق عوام وخواص نے اسلامی احکام پر عمل شروع کر دیا۔انہیں کی روشنی میں اسلامی عدالتوں میں فیصلے ہونے لگے۔شروع میں تو کسی ایک امام کی پیروی ضروری نہیں قرار دی گئی تھی ایک شخص ایک وقت میں ایک امام کی فقہ کے مطابق اسلامی کام کو انجام دے لیتا اور دوسرے وقت میں دوسرے امام کی پیروی کرلیتا تھا۔ مگر زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ خواہشات نفس غالب ہوئیں اور احکام شرع کی پابندیوں میں کمیاں آنا شروع ہوئیں تو نفس کی پیروی ہونے لگی۔تو حالات کو دیکھتے ہوئے علمائے اہل سنت نے ایک امام کی پیروی کو ضروری قرار دے دیا۔یہاں تک کہ اپنے علم و عقل پر بھروسہ کرتے ہوئے براہ راست اصول اسلام قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس سے مسائل استنباط سے منع کر دیا اور مسلمانان اہل سنت کو حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی میں منحصر فرما دیا۔اور فرمایا: جو ان مذاہب اربعہ کی اتباع سے باہر ہوگا اس کو اہل سنت وجماعت سے خارج مانا جائے گا۔جیسا کہ حضرت علامہ احمد بن محمد خلوتی صاوی مصری مالکی (متوفی۱۲۴۱ھ)حاشیہ صاوی علی تفسیر جلالین میں فرماتے ہیں:

’’ولایجوز تقلید ماعدا المذاهب الاربعة ولو وافق قول الصحابة والحديث الصحيح والآية فالخارج عن المذاهب الاربعة ضال مضل و ربما اداه ذلك للكفر لان الاخذ بظواهر الكتاب والسنة من اصول الكفر‘‘(ج۴ص۱۵)

یعنی چاروں مذاہب کے علاوہ کسی کی تقلید جائز نہیں ہوگی، اگرچہ وہ قول صحابہ اور صحیح حدیث اور آیت کے موافق ہی ہو۔اور جو ان چاروں مذہبوں سے خارج ہے وہ گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے کیوں کہ حدیث و قرآن کے محض ظاہری معنی لینا کفر کی جڑ ہے۔

فقہ حنفی کے چار ستون

ان چاروں فقہی مذاہب میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت فقہ حنفی کو ملی اور اس کے پیروکار بنسبت تینوں مذہبوں کے زیادہ ہوئے۔کیوں کہ اس کو بام شہرت تک پہنچانے اور اس کو آراستہ و پیراستہ کرنے میں امام اعظم علیہ الرحمہ کے شاگردوں کی انتھک کوششیں شامل رہیں۔یہ اور بات ہے کہ ان میں آپ کے چار شاگردوں کو ان سب پر فوقیت و برتری حاصل ہے۔

(۱)حضرت امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری(۱۱۳ھ۔۱۸۳ھ)(۲)حضرت امام محمد بن فرقد شیبانی(۱۳۲ھ۔۱۸۹ھ) (۳)حضرت امام زفر بن زہل بن قیس کوفی(۱۱۰ھ۔۱۵۸ھ)(۴)حضرت حسن بن زیاد لؤلؤی(متوفی ۲۰۴ھ)یہ چاروں ائمہ حنفیہ فقہ حنفی کے چار ستون اور چار عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔اگرچہ حنفی مذہب امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ان کی مجتہدانہ عظمت وشان کے پیش نظر منسوب ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان چاروں حضرات اور ان کے شیخ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قیاس واجتہادات کے مجموعہ کا نام فقہ حنفی ہے۔

ماہرین فقہ نے فقہائے کرام کے سات طبقات بیان فرمائے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱)مجتہد فی الشرع(۲)مجتہد فی المذہب(۳)مجتہد فی المسائل(۴)اصحاب تخریج(۵)اصحاب ترجیح(۶)اصحاب تمیز(۷) مقلد محض۔

(۱) مجتہد فی الشرع

اس طبقہ میں سب سے اعلیٰ درجہ کے فقہا آتے ہیں جو مجتہد مطلق کہلاتے ہیں جیسے: امام اعظم ابو حنیفہ، حضرت امام محمد بن ادریس شافعی، حضرت امام مالک بن انس، حضرت امام احمد بن حنبل، حضرت امام سفیان ثوری، حضرت امام لیث، حضرت اما ابو ثور (متوفی ۲۴۰ھ) حضرت امام عبد الرحمن بن عمر دمشقی اوزاعی (۸۸ھ۔۱۵۷ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

(۲) مجتہد فی المذہب

اس طبقہ میں بھی مجتہدین آتے ہیں مگر یہ مجتہدین درجے میں مجتہد فی الشرع سے کم ہوتے ہیں۔ اصول فقہ میں یہ مجتہد فی الشرع کے تابع ہوتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے اصول کی روشنی میں مسائل کا استنباط کرتے ہیں گویا کہ یہ اصول میں مقلد اور فروع میں مجتہدانہ شان کے مالک ہوتے ہیں۔ جیسے حضرت امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری، حضرت امام محمد بن فرقد شیبانی، حضرت مام زفر بن زہل بن قیس کوفی، حضرت حسن بن لؤلؤی، حضرت امام عبد اللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ) وغیر ہم رضی اللہ عنہم۔ یہاں یہ ذکر کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہو گا کہ علمائے احناف روایات ظاہرہ میں جن مسائل میں متفق ہیں فتوی یقیناً انہیں پر ہو گا لیکن اگر روایات ظاہرہ میں ہمارے علما کا اتفاق نہیں تو اصح یہ ہے کہ فتوی علی الاطلاق امام اعظم کے قول پر دیا جائے گا۔ اور اگر اس مسئلہ میں کوئی روایت آپ سے نہ ملے تو پھر فتوی امام ابو یوسف کے قول پر دیا جائے گا۔ اور اگر اس مسئلہ میں امام ابو یوسف کا بھی قول نہ ملے تو پھر امام محمد کے قول پر فتوی دیا جائے گا۔ اور اگر ان تینوں میں سے کسی سے بھی کوئی روایت منقول نہیں تو پھر امام زفر کے قول پر اور پھر حسن بن زیاد کے قول پر فتوی دیا جائے گا۔ علامہ شامی فرماتے ہیں علمائے کرام نے بیان کیا ہے کہ عبادات میں مطلقا فتوی قول امام اعظم پر ہے مسائل ذوی الارحام میں فتوی قول امام محمد پر ہے۔ اور مسائل قضا میں فتوی امام ابو یوسف پر ہے۔

(۳) مجتہد فی المسائل

یہ فقہائے کرام اصول و فروع دونوں میں مجتہد مطلق کے تابع و پیروکار ہوتے ہیں یہ لوگ ایسے مسائل کا استنباط جن کے بارے میں کوئی روایت صاحب مذہب سے نہیں ملتی اپنے ائمہ کرام کے وضع کردہ اصول و قواعد کے مطابق کرتے ہیں۔ جیسے: حضرت امام ابو بکر خصاف (متوفی ۲۶۱ھ) حضرت امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی (متوفی ۳۲۱ھ) حضرت امام ابو الحسن کرخی (متوفی ۳۴۰ھ) حضرت امام شمس الائمہ حلوانی (متوفی ۴۵۶ھ) حضرت امام شمس الائمہ سرخسی (متوفی ۵۰۰ھ) حضرت فخر الاسلام بزدوی (متوفی ۴۸۲ھ) حضرت امام فخر الدین قاضی خاں (متوفی ۵۹۳ھ) رضی اللہ عنہم۔

(۴) اصحاب تخریج

اس طبقہ میں وہ فقہائے کرام آتے ہیں جو اجتہاد تو بالکل نہیں کر سکتے ہاں ائمہ کرام میں سے کسی کے مجمل قول کی تفصیل کرنے کی ضرور صلاحیت رکھتے ہیں جیسے: حضرت امام ابو بکر احمد بن علی رازی (متوفی ۳۷۰ھ) ہیں۔ جو اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۵) اصحاب ترجیح

وہ فقہائے کرام کہلاتے ہیں جو امام اعظم علیہ الرحمہ کی چند روایات میں سے بعض کو ترجیح دے سکتے ہیں یعنی اگر کسی مسئلہ میں

امام سے چند قول مروی ہیں ان سے میں کس کو ترجیح دیں وہ یہ حضرات کرسکتے ہیں۔اسی طرح جہاں امام اعظم اور صاحبین کا اختلاف واقع ہے تو یہ ان میں سے ھٰذا اولی، ھٰذا اصح، ھٰذا اوضح اور ھٰذا اوفق للقیاس جیسے صیغے استعمال کر کے ایک کو ترجیح دے سکتے ہیں۔اس گروہ میں صاحب قدوری علامہ ابوالحسین قدوری (متوفی ۴۲۸ھ) صاحب ہدایہ علامہ ابوالحسن علی ابن ابی بکر فرغینانی مرغینانی (متوفی ۵۹۳ھ) شمار ہوتے ہیں۔

(۶) اصحاب تمیز

یہ وہ فقہائے کرام ہیں جو ظاہر مذہب اور روایات نادرہ اسی طرح قول ضعیف اور قوی اور اقوی میں فرق کرسکتے ہیں۔ کہ اقوال مردودہ اور روایات ضعیفہ کو ترک کر کے صحیح روایت اور قول معتبر کو لے لیں۔اصحاب تمیز میں صاحب کنز الدقائق علامہ حافظ الدین عبداللہ بن احمد نسفی (متوفی ۷۱۰ھ) اور دیگر اصحاب المتون ہیں۔

(۷) مقلد محض

جن علمائے کرام میں ان مذکورہ اوصاف میں سے کوئی بھی وصف نہ ہو جیسے ہمارے زمانے کے فقہائے کرام ان کا صرف یہی کام ہے کہ یہ کتب متداولہ و معتبرہ سے مسائل دیکھ کر مستفتی کو بتادیں۔

درجات کتب فقہ

فقہائے کرام نے ائمہ فقہ کی کتب کی بھی درجہ بندی کی تو ان کے تین درجے کیے۔

(۱) کتب اصول (۲) کتب نوادر (۳) کتب واقعات، جن کی قدرے تفصیل یہ ہے:

(۱) کتب اصول

کتب اصول ہی کو ظاہر الروایہ بھی کہتے ہیں۔ان کتابوں میں وہ مسائل ہیں جو اصحاب المسائل سے مروی ہیں جیسے حسن بن زیادوغیرہ۔اوروہ حضرات جنہوں نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ، حضرت امام ابویوسف بن یعقوب بن ابراہیم انصاری، حضرت امام محمد بن فرقد شیبانی، سے روایت کی۔لیکن مشہور اغلب ظاہر روایت کے بارے میں یہ ہے کہ ظاہر الروایہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ، ابویوسف اور امام محمد بن فرقد شیبانی رضی اللہ تعالیٰ عنھم کے اقوال ہی کو کہتے ہیں۔ظاہر الروایہ کا اطلاق محرر مذہب حنفی حضرت امام محمد بن فرقد شیبانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ان چھ کتابوں پر ہوتا ہے:

(مبسوط (۲) جامع صغیر (۳) (جامع کبیر (۴) زیادات (۵) سیر صغیر (۶) سیر کبیر۔ان کو ظاہر الروایہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتابیں آپ سے بہ تواتر ثابت مشہور ہیں۔

(۲) کتب نوادر

حضرت امام محمد بن فرقد شیبانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کتابیں (۱) کیسانیات (۲) ہارونیات (۳) جرجانیات (۴) رقیات ہیں۔یہ آپ کی وہ کتابیں ہیں جن کے مسائل کے راوی تو مذکورہ بالا حضرات ہی ہیں مگر یہ مسائل ان کتابوں میں نہیں ہیں جن کو ظاہر الروایہ کہا جاتا ہے آپ کی ان کتابوں کو غیر ظاہر الروایہ کہا جاتا ہے۔ان کو غیر ظاہر الروایہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ امام محمد علیہ الرحمہ سے ایسی روایات صحیحہ ثابتہ اور ظاہرہ سے مروی نہیں ہیں جیسی کہ پہلی چھ کتابیں ہیں۔

(۳) کتب واقعات

ان کتابوں میں وہ مسائل ہیں جن کو بعد کے مجتہدین نے جمع کیا ہے۔ جو کہ امام ابویوسف اور امام محمد علیہما الرحمہ کے تلامذہ ہیں ۔یا ان کے تلامذہ کے تلامذہ ہیں۔ ایسے مجتہدین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کیوں کہ امام محمد علیہ الرحمہ نے بیس سال کی عمر میں درس دینا شروع کر دیا تھا اور آپ کے درس کا شہرہ سن کر ہزاروں تشنگان علوم نبویہ آپ کے درس میں شریک ہو کر اکتساب فیض کرتے تھے۔ آپ کے مشہور تلامذہ میں مجتہد علی الاطلاق حضرت امام محمد بن ادریس شافعی، حضرت امام محمد بن سماعہ (۱۳۰ھ۔ ۲۳۱ھ) حضرت امام ابو سلیمان موسیٰ بن سلیمان جرجانی (متوفی ۲۰۱ھ) علیھم الرحمہ جیسے لوگ شامل ہیں۔ ان حضرات نے اپنے قوی دلائل وبراہین کی بنا پر اصحاب مذہب کے خلاف کئی مسائل ثابت کئے ہیں۔ کتب واقعات یہ فتاوی کے مجموعے ہیں۔ فتاوی میں جو کتاب سب سے پہلے منظر عام پر آئی وہ فقیہ ابو اللیث سمرقندی علیہ الرحمہ کی ”کتاب النوازل“ ہے ان کے بعد دیگر مفتیان کرام کے فتوی کے مجموعے معرض وجود میں آئے۔ جیسے مجموع النوازل، واقعات الناطفی اور واقعات صدر شہید وغیرہ۔

درمیانی فقہائے کرام نے کتب فقہ حنفی کی ایک دوسری طرح سے تقسیم کی ہے۔ (۱) متون (۲) شروح (۳) فتاوی اس تقسیم میں متون کو سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ان کو ظاہر الروایہ کے ساتھ لاحق کیا گیا ہے۔ اسی بنا پر مشہور ہے کہ ”ان المتون کالنصوص“ یعنی متون نصوص واصول کی طرح ہیں۔ متون میں یہ متون بہت معروف ومستند ہیں۔

(۱) مختصر امام طحاوی (۲) مختصر امام کرخی (۳) مختصر قدوری (۴) کنز الدقائق (۵) وافی (۶) مختار (۷) وقایہ (۸) مجموع البحرین (۹) منتقی (۱۰) مواہب الرحمن۔ تلک عشرۃ کاملۃ۔

شروحات

تو ان کو دوسرا مقام حاصل ہے۔ اور یہ کتب فتاوی سے اولیٰ ہیں۔ چند مشہور ومستند شروح درج ذیل ہیں:

(۱) شروحات اصول ستہ (۲) بدائع الصنائع (۳) تبیین الحقائق (۴) فتح القدیر (۵) غنیۃ المستملی (۶) غایۃ البیان (۷) درایہ (۸) نہایہ (۹) کفایہ (۱۰) درر الاحکام، وغیرہ

کتب فتاوی

تیسرے مقام پر ہیں مجموعہ فتاوی کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جن میں یہ چند مستند ومشہور ہیں۔

(۱) فتاوی قاضی خاں (۲) بزازیہ (۳) ولوالجیہ (۴) ظہیریہ (۵) واقعات صدر شہید (۶) نوازل فقیہ (۷) فصول عمادی (۸) جامع صغار (۹) فتاوی کبریٰ (۱۰) فتاوی تاتارخانیہ (۱۱) ذخیرہ (۱۲) فتاوی عالمگیری (۱۳) العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ (۱۴) فتاوی امجدیہ (۱۵) فتاوی فیض الرسول (۱۶) فتاوی عزیزیہ (۱۷) فتاوی فرنگی محل (۱۸) فتاوی مفتی اعظم ہند (۱۹) فتاوی بحر العلوم (۲۰) فتاوی اجملیہ (۲۱) فتاوی حامدیہ (۲۲) فتاوی شارح بخاری، وغیرہ۔

دعا گو محمد شبیر حسن رضوی غفرلہ
الجامعۃ الاسلامیہ روناہی فیض آباد یوپی
۲۵ر شوال المکرم ۱۴۳۷ھ

فہرست فتاوی

احکام ایمان وکفر

احکام نماز

احکام جنائز

شمار | صفحہ

احکام روزہ واعتکاف

شمار | صفحہ

احکام حج وعمرہ

احکام نکاح، طلاق، خلع، مہر، عدت وغیرہ

احکام تجارت

احکام وقف، مسجد، مدرسہ، قبرستان

شمار — احکام قربانی — صفحہ

شمار — حظر و اباحت — صفحہ

شمار — احکام وراثت — صفحہ

احکام ایمان و کفر

فتوی ۱ کیا صفات باری تعالیٰ کا عکس انسان میں پایا جاتا ہے؟

مسئولہ: محمد انیس رضوی نوری رٹائرڈیڈ ہیڈ ماسٹر ادیب عالم، یوپی بورڈ

معتمد حضور مجاھد ملت وامین شریعت (علیہما الرحمہ) نورنگ پور اڈیشا۔ ۱۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۰ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے متعلق

(۱) زید نے اپنی کتاب "نوری رہنما" میں یہ جملہ اقتباس کیا "اللہ تعالی کی ہر قدرت کی صفت کا عکس ہمارے اندر پایا جاتا ہے" اس کائنات پر غور کریں تو ہم اللہ کی بعض صفات دیکھتے ہیں دریاؤں میں پانی بہ رہاہے، کھیتوں میں سبزیاں اگ رہی ہیں، کانوں میں ہیرے موتی چمک رہے ہیں، یہ صفات ہم میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اگر پانی بہنے کی صفات تلاش کرنا چاہیں تو ہم اسے اپنی رگوں میں بہتے خون کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں۔ اگر ہم اگتی سبزیوں کی صفت کو تلاش کرنا چاہیں تو یہ ہمیں اپنے اگتے بالوں کی صورت میں ملے گی۔ اور سیپوں میں چمکتے موتیوں کی طرح ہم اپنی آنکھوں کو ان کے خول چمکنے کی حالت میں دیکھ سکتے ہیں تو گویا اللہ تعالیٰ کی ہر صفت کا عکس ہمارے اندر ہے۔ یہی وجہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سورہ بقرہ (آیت نمبر ۳۰)

واذقال ربك للملائكة انى جاعل فى الارض خليفة''

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔

خلیفہ وہ ہوتا ہے جو اپنے مالک کے پیچھے اس کی جگہ سنبھالتا ہے۔

(تبلیغ اسلام کے اصول از مبلغ اسلام حضرت علامہ عبدالعلیم صدیقی علیہ الرحمہ وتفسیر نعیمی)

(۲) قارئین کرام نفس کی پیروی میں اگر ہمارا دل مریض بنا ہے اور اس کا اصلی رنگ وروپ نفسانی میل سے میلا ہو چکا ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ جیسے سنار سونے کو صاف کرنا چاہے تو اس کو آگ ہی میں جلائے گا اسے ہتوڑے سے پیٹے گا تب جاکر سونا اپنے اصل روپ میں نظر آئے گا۔ اسی طرح عاشق نبی بن کر احکام نبی یعنی شریعت کی بھٹی میں مریض کو دل جلانا ہو گا دنیاوی مصروفیات میں پھنس کر دل ٹیڑھا ہو اتو حکم نبی کے ہتوڑے سے اسے پیٹ کر سیدھا کرنا ہو گا اور اس کا طریقہ یہ کہ اقیموا الصلوۃ۔"

دریافت طلب امر یہ ہے کہ بکر کا خلیفہ کی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہنا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے خلیفہ ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام اپنے مالک خدا کے پیچھے خدا کی غیر موجودگی میں اللہ کی جگہ سنبھالنے والے ہیں۔ کیا بکر کی وضاحت درست ہے کیا اس وضاحت کی بنا پر زید کی تکفیر درست ہے؟

بصورت دیگر بکر کے لیے حکم شرع شریف کیا ہے؟ دریاؤں کے متعلق جملے کی وضاحت پر اعتراض کرتے ہوئے بکر یہ کہتا ہے کہ "اللہ کے صفات قدیم ہیں اور بندوں کے صفات اور تمام اشیاء حادث ہیں "تو زید کا قول "اللہ تعالی کی ہر قدرت کی صفت کا عکس ہمارے اندر پایا جاتا ہے" کفر ہوا۔ کیا بکر کا اسے کفر بتانا درست ہے۔؟ آپ کی بارگاہ میں گزارش ہے کہ مذکورہ عبارات میں حکم شرع کیا ہے اور مصنف پر کیا حکم ہے اور معترض کے لیے کیا حکم ہے بیان فرمائیں۔ اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

بعون الملك الوهاب

بسم الله الرحمٰن الرّحیم　　　نحمده ونصلّی علیٰ حبیبه الکریم

(۱) زید کی کتاب "نوری رہنما" کے درج بالا اقتباسات پڑھے۔ان میں کوئی ایسی شرعی قباحت نہیں ہے جس کی بنیاد پر زید کی تکفیر کی جائے۔ مخلوقات میں اللہ کی قدرت کا عکس بتا کر یہ کہنا کہ ہمارے اندر بھی رب کی صفات پائی جاتی ہیں۔یہ بات موجب کفر نہیں ہے۔زید کے کہنے کا منشا یہ ہے کہ اللہ کی مخلوقات اللہ کی صفات کا مظہر ہیں۔اس کی بعض صفات جن کا انسان اہل ہے وہ انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ شیخ محقق علی الاطلاق محدث دہلوی اپنی کتاب "تکمیل الایمان" میں لکھتے ہیں:

"این صفات در مخلوقات وی پیدا است اگر در وی نباشد از کجا پیدا شد"

یعنی اس کی قدرت، علم، ارادہ وغیرہ، صفات اس کی مخلوقات میں بھی پائی جاتی ہیں۔اگر یہ صفات اس میں نہ ہوتیں تو ان کو ان صفات سے کیسے فیضیاب فرماتا۔[تکمیل الایمان،فارسی:صفحہ۔۱۵]

زید کے جملوں کی مکمل وضاحت حضور اعلیٰ حضرت کے درج ذیل ملفوظات میں ملاحظہ کریں:

عرض: وحدۃ الوجود کے کیا معنی ہیں؟

ارشاد: وجودِ ہستی بالذات، واجب تعالیٰ کے لئے ہے، اُس کے سوا جتنی موجودات ہیں اُسی کی ظل پر تَو (یعنی عکس) ہیں تو حقیقتاً وجود ایک ہی ٹھہرا۔

عرض: اِس کا سمجھنا تو کچھ دُشوار نہیں پھر یہ مسئلہ اِس قدر کیوں مشکل مشہور ہے؟

ارشاد: اس میں غور و تامل یا موجبِ حیرت ہے یا باعثِ ضلالت۔اگر اس کی تھوڑی بھی تفصیل کروں تو کچھ سمجھ میں نہ آئے گا بلکہ اوہامِ کثیرہ پیدا ہو جائیں گے۔

(اس کے بعد کچھ مثالیں بیان فرمائیں، ان میں سے ایک یاد رہی) مثلاً روشنی بالذات آفتاب و چراغ میں ہے، زمین و مکان اپنی ذات میں بے نور ہیں مگر بالعرض۔ آفتاب کی وجہ سے تمام دنیا منوّر اور چراغ سے سارا گھر روشن ہوتا ہے۔اِن کی روشنی اُنہیں کی روشنی ہے۔اُن کی روشنی اِن سے اٹھالی جائے تو وہ ابھی تاریکِ محض رہ جائیں۔

عرض: یہ کیوں کر ہوتا ہے کہ ہر جگہ صاحبِ مرتبہ کو اللہ ہی اللہ نظر آتا ہے؟

ارشاد: اِس کی مثال یوں سمجھئے کہ جو شخص آئینہ خانہ میں جائے وہ ہر طرف اپنے آپ ہی کو دیکھے گا، اس لئے کہ یہی اصل ہے اور جتنی صورتیں ہیں سب اسی کے ظِل ہیں مگر یہ صورتیں اُس کی صفاتِ ذات کے ساتھ متصف نہ ہوں گی مثلاً سننے والی دیکھنے والی وغیرہ وغیرہ نہ ہوں گی۔اِس لئے کہ یہ صورتیں صرف اُس کی سطح ظاہری کی ظل ہیں، ذات کی نہیں اور سمع و بصر ذات کی صفتیں ہیں سطح ظاہر کی نہیں۔ لہٰذا جو اثر ذات کا ہے وہ ان ظلال میں پیدا نہ ہو گا بخلاف حضرتِ انسان کہ یہ ظلِ ذاتِ باری تعالیٰ ہے لہٰذا اظلالِ صفات سے بھی حسبِ استعداد بہرہ وَر ہے۔.......

عرض: ذاتِ باری کے پرتَو تو صرف حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ شیخ محدِّث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

''مدارج النبوۃ'' جلد ثانی کے خاتمہ میں فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مظہرِ صفاتِ الٰہیہ ہیں اور عامہ مخلوق مظہرِ اسمائے الٰہیہ ہے۔"و سیّدِ کُل مظہرِ ذاتِ حق ست و ظہورِ حق دروے بالذات ست"

(یعنی حضور سیّدِ عالَم صلی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہٖ وسلم ذاتِ حق کے مظہر ہیں اور ظہورِ حق آپ میں بالذات ہے۔

تو تمام مخلوق ظلالِ ذات کس طرح ہو گی؟

ارشاد: اَسماء مظہرِ صفات ہیں اور صفات مظہرِ ذات اور مظہر کا مظہر مظہر ہے۔ تو سب خَلق مظہر ذات ہے۔ اگر چہ بواسطہ یا بوسائط۔ شیخ کا کلام مظہر ذات بلاواسطہ میں ہے، وہ نہیں مگر حضور مظہر اول صلی اللہ علیہ وسلم۔ اُن کے لفظ دیکھئے کہ "ظہورِ حق دروے بالذات ست"(یعنی حضور جانِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہٖ وسلم بلاواسطہ مظہر حق ہیں)

[الملفوظ: حصہ اول۔ص ۸۲: ۸۱، ۸۰]

فتاوی رضویہ میں ہے:

''نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تجلی ذات اور انبیاء واولیاء وسائر خلق اللہ تجلی اسماء وصفات ہیں''

[فتاوی رضویہ جدید: ج ۳۰ ص ۲۸۶]

بالجملہ: اللہ کی صفات کے معاملہ میں زید کی تحریر کردہ باتیں ایسی نہیں جس کی بنیاد پر حکم کفر لگایا جائے۔ البتہ اس طرح کی باتیں عوام الناس کے سامنے بیان کرنے سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سے اسی طرح کا ایک سوال ہوا جس کے جواب میں آپ نے عدم تکفیر کا حکم بیان کیا۔ سوال وجواب دونوں ملاحظہ ہو:

''سوال: چہ می فرمائند در مسئلہ وحدت الوجود دہر کہ عاقل وبالغ ومسلمان در شریعت نبوی ایں اعتقاد می کند و می گوید ہمہ اوست یعنی خدائے تعالیٰ ہمہ اشیا شدہ است۔ ایں کلام کفر است یا نہ؟

یعنی وحدت الوجود کے مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ جو مسلمان عاقل، بالغ یہ اعتقاد رکھے اور کہے کہ سب اللہ ہی ہے۔ یعنی تمام چیزیں اللہ ہو گئی ہیں۔ یہ کلام کفر ہے یا نہیں؟

جواب: ظاہر معنی ایں کلام خلاف شرع است گر گویندہ ایں کلام حلول حق تعالیٰ را در اشیا یا اتحاد اشیا باآں ذات مقدس اعتقاد می نماید پس کفرست۔ واگر می گوید کہ مراد من آنست کہ در ہر چیز ظہور صفات اوست مثل ظہور صورت رای در مراۃ پس کفر نیست۔ لیکن ترویج ایں کلام کہ موہم خلاف شریعت است در مجالس ومحافل خصوصاً در مجمع عوام کہ بغور سخن نمی رسند بسیار مذموم وقبیح است۔''

یعنی اس کلام کا ظاہری مفہوم خلاف شرع ہے۔ اگر کہنے والا اشیا میں اللہ کے حلول یا ان اشیا کے ساتھ اللہ کے پائے جانے کا عقیدہ کی بنیاد پر یہ کہتا ہے تو یہ کفر ہے۔ اور اگر کہنے والے کی مراد یہ ہے کہ ہر چیز میں اللہ کی صفات کا ظہور ہے۔ جس طرح کوئی شخص جب آئینہ دیکھتا ہے تو اس کو اپنی صورت والی صفات اس میں نظر آتی ہیں۔ تو یہ کفر نہیں ہے۔ البتہ اس طرح کی باتیں جن کے خلاف شرع ہونے کا وہم ہو تا ہو مجلسوں، محفلوں خاص کر عوام کے درمیان کہ وہ اس طرح کی باتوں میں غور نہیں کرتے، بیان کرنا نہایت ہی برا ہے۔ [فتاوی عزیزی: جلد ۱ ص ۲۸]

اور زید کا حضرت آدم کے خلیفہ ہونے سے متعلق وضاحت پیش کرنا اور کہنا کہ ”خلیفہ وہ ہوتا ہے جو اپنے مالک کے پیچھے اس کی جگہ سنبھالتا ہے۔“ یہ جملہ محتمل تاویل ہے اور موہم خلاف شرع ہے لیکن اس پر حکم کفر لگانا بڑی جسارت ہے۔
بکر نے لفظ پیچھے سے عدم موجودگی کا جو مفہوم نکالا ہے یہ ضرور کفر ہے۔ اور اگر زید نے یہی مراد لیا ہے تو زید پر بھی حکم کفر ہوگا۔ حالانکہ ایسا ہے نہیں۔ زید کی عبارت کا سیاق وسباق بتارہا ہے کہ اس کی مراد یہ نہیں ہے بلکہ وہی جو علما لکھتے آئے ہیں کہ حضرت آدم خلیفہ ہیں جو رب اور بندوں کے درمیان اللہ کی نیابت کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہاں پیچھے سے مراد اتباع بھی لیا جاسکتا ہے اور اس کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رب اور بندوں کے مابین جو حجاب عظمت ہے اس کے پیچھے سے اللہ کی خلافت کا حق ادا کرتے ہیں۔

(۲) زید نے لوگوں کو اتباع شریعت کی ترغیب میں شریعت کی بھٹی میں جلنے کی جو تمثیل بیان کی ہے اس میں بھی کوئی بات خلاف شرع نہیں ہے۔

الحاصل: زید سے متعلق استفتا میں درج باتیں موجب کفر وضلالت نہیں ہیں۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ حکم ہوگا کہ اس طرح کی باتیں عوام میں نہ کی جائیں کہ ان کے ذہن ان باریک باتوں کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس سے مروی ہے:

أمرنا أن نكلم الناس على قدر عقولهم

یعنی ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کریں۔“ [کنز العمال: ۱۰/۲۴۲]

اور بکر کا زید کی باتوں پر حکم کفر لگانا یقیناً شریعت پر بڑی جرأت ہے اگر بکر مفتی ہے تو اس طرح کے مسائل میں غور کرنے کے بعد ہی حکم شرع بیان کیا کرے۔ اور مفتی یا عالم نہیں ہے تو یقیناً یوں ہی کسی کو کافر کہہ دینا بڑا جرم ہے۔ بلکہ زید کی باتوں کے کفر نہ ہونے کی بنیاد پر خود بکر پر حکم کفر عود کرے گا اور بکر خود ہی کافر ہو جائے گا۔
علاوہ ازیں بکر نے جو مفہوم بیان کیا ہے اور اس مفہوم کی بنیاد پر کافر کہا ہے تو بکر پر حکم کفر تو نہیں ہوگا۔ لیکن رجوع وتوبہ لازم ہے۔ هٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم

فتویٰ ۲ — اللہ پاک مکان سے منزہ ہے

مسئولہ: محمد سلطان نعیمی، بھاگلپور بہار۔ ۲۵ر شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں
زید جو سنی صحیح العقیدہ مسلمان عالم خطیب ہے انہوں نے اپنے ایک خطاب میں درج ذیل باتیں کہیں
1۔ جب ظلم بڑھا آتنکواد پھیلا تب آکاش پر براجمان (آسمان پر بیٹھا) اللہ نے نورانی جماعت کو بھیجا
2 جب فرعون کا ظلم بڑھا تو حضرت موسی علیہ السلام کو بھیجا جب نمرود کا ظلم بڑھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا اسی طرح جب راون کا ظلم بڑھا تو پرشوتم رام کو بھیجا۔ عرض تحریر یہ ہے کہ ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کو نوری جماعت کہنا از روئے شرح

کیسا ہے؟ اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے لفظ آکاش پر براجمان خدا کہنا کیسا ہے؟

ایسے خطیب کی تقریر سننا اسکے پیچھے نمازیں پڑھنا اس سے مرید ہونا کیسا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر ہمارے ایمان و عقیدہ کی حفاظت فرما کر عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور ہوں۔

الجواب

اللہ پاک مکان سے پاک ہے۔ اس کے لیے مکان ماننا کفر ہے۔ زید کے درج بالا الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ زید نے اللہ تعالیٰ کے لیے مکان مانا ہے۔ کیوں کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹھنے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لفظ براجمان معاشرہ میں بیٹھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مطلب زید نے اپنی تقریر میں اللہ تعالیٰ کے لیے مکان ثابت مانا اور اللہ کے لیے مکان ماننا شرعاً کفر ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''کفر بإثبات المكان لله تعالى فلو قال: از خدا هيج مكان خالى نيست يكفر ولو قال: الله تعالى فى السماء فإن قصد به حكاية ما جاء فيه ظاهر الأخبار لا يكفر، وإن أراد به المكان يكفر، وإن لم تكن له نية يكفر عند الأكثر، وهو الأصح وعليه الفتوى. ويكفر بقوله الله تعالى جلس للإنصاف، أو قام له بوصفه الله تعالى بالفوق والتحت كذا فى البحر الرائق ولو قال: مرا بر آسمان خداى است وبر زمين فلان يكفر كذا فى فتاوى قاضى خان''

یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے مکان ثابت ماننا کفر ہے تو اگر کسی نے کہا کہ خدا سے کوئی جگہ خالی نہیں تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔ اور اگر کہا کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے تو اگر احادیث میں جو وارد ہے اس کی حکایت مقصود تھی تو تکفیر نہ ہوگی۔ اور اگر اس سے مکان کا ارادہ تھا تو کافر قرار دیا جائے گا۔ اور اگر اس کی کوئی نیت ظاہر نہ ہو تو بھی اکثر فقہا کے نزدیک اس کی تکفیر ہوگی اور یہی صحیح ہے اور اسی پر فتوی ہے۔ اور جس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ انصاف کے لیے بیٹھا ہے اور کھڑا ہے تو اس کی بھی تکفیر ہوگی اس لیے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو اوپر نیچے (مکان) سے متصف کیا۔ ایسا ہی بحر الرائق میں ہے۔ اور اگر کہا کہ میرا آسمان پر خدا ہے اور زمین پر فلاں تو بھی تکفیر ہوگی۔ ایسا ہی فتاوی قاضی خاں میں ہے۔

[فتاوی عالمگیری: ج ۲ ص ۲۵۹۔ کتاب السیر، باب احکام المرتدین]

فتاوی عالمگیری کی عبارت سے بھی صاف ہو گیا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے لیے اوپر نیچے بیٹھنے کے الفاظ استعمال کئے اس کی تکفیر ہوگی۔ لہٰذا زید کے درج بالا الفاظ کفریہ ہیں۔ زید پر توبہ، تجدید ایمان، تجدید نکاح لازم وضروری ہے۔

کفار و مشرکین کو نوری جماعت کہنا اور انہیں انبیائے کرام کی طرح ظلم کے خلاف رب کی جانب سے بھیجا ہوا ماننا انہیں انبیائے کرام کے برابر ٹھہرانا ہے اور یہ بات سراسر گمراہی و کفر پر مبنی ہے۔ مشرکین تو خود ظالم ہیں جیسا کہ قرآن میں رب نے فرمایا:

''إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ'' بے شک شرک بڑا ظلم ہے۔ [ترجمہ کنز الایمان: پارہ ۲۱۔ سورہ لقمان، آیت ۱۳]

تو انہیں ظلم کے خلاف بھیجنے کا کیا مطلب ہوا؟ اور رام جس کی تعریف میں زید نے اس قدر کفر آمیز مبالغہ کیا ہے اس کا تو وجود بھی ثابت نہیں ہے، جیسا کہ اعلیٰ حضرت نے لکھا ہے:

''قرآن عظیم یا حدیث کریم میں رام و کرشن کا ذکر تک نہیں۔ ان کے نفس وجود پر سوائے تواتر ہنود ہمارے پاس کوئی دلیل

نہیں کہ یہ واقع میں کچھ اشخاص تھے بھی یا محض انیاب اغوال ورجال بوستان خیال کی طرح اوہام تراشیدہ ہیں، تواتر ہنود اگر حجت نہیں تو ان کا وجود ہی ناثابت اور اگر حجت ہے تو اسی تواتر سے ان کا فسق وفجور ولہو ولعب ثابت، پھر کیا معنی کہ وجود کے لئے تواتر ہنود مقبول اور احوال کیلئے مردود مانا جائے۔ اور انھیں کامل ومکمل بلکہ ظنا معاذاللہ انبیاء ورسل جانا مانا جائے"

[فتاوی رضویہ قدیم، ۱۴۲/۶]

علاوہ ازیں زید کے الفاظ رام کی تعریف میں ہیں اور یہ خود میں ایک کفر ہے۔ کیوں ان الفاظ سے کفار کے مذہبی دیوتا کی تعظیم ظاہر ہو رہی ہے اور ان کی تعظیم عند الفقہا کفر ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"مگر کفار کے مذہبی جذبات اور ان کے دیوتاؤں اور پیشواؤں کو عزت دینا صریح کلمہ کفر ہے، قال اللہ تعالیٰ:

وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لایعلمون۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا عزت تو خاص اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے لئے ہے مگر منافقوں کو خبر نہیں۔

ان کے دیوتاؤں اور پیشواؤں اور مذہبی جذبات کا اعزاز درکنار جو ان کے کسی فعل کی تحسین ہی کرے باتفاق ائمہ کافر ہے۔

غمز العیون والبصائر میں ہے:

من استحسن فعلا من افعال الکفار کفر باتفاق المشائخ، جس نے کافر کے کسی عمل کو اچھا جانا وہ باتفاق مشائخ کافر ہے۔

ان لوگوں پر فرض ہے کہ ایسی باتوں سے توبہ کریں، تجدید اسلام کریں، تجدید نکاح کریں"

[فتاوی رضویہ قدیم: ج ۶ صفحہ ۱۲۵، ۱۲۶]

الغرض: زید کا اپنی تقریر میں خدا کے لیے لفظ براجمان استعمال کرنا۔ مشرکین کے دیوتاؤں کو نوری جماعت کہنا اور انہیں انبیائے کرام میں زمرے میں شامل کرنا سراسر کفر ہے۔ زید پر لازم ہے کہ توبہ کرے اور تجدید ایمان، تجدید نکاح اور اگر کسی سنی صحیح العقیدہ پیر سے مرید ہو تو تجدید بیعت کرے۔ اور جب تک زید اپنے اقوال سے علی الاعلان توبہ نہ کرلے تب تک اس کی تقریر سننا اس کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز وحرام ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

فتوی ۳ — دین اسلام کو گالی دینا کفر ہے

مسئولہ: محمد وسیم رضا ساؤتھ افریقہ، ۲۵/ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۰ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں

زید نے دین اسلام کو گالی بکی تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب

زید نے دین اسلام کو گالی بکی اس کی تین صورتیں ہیں۔

مطلقا مذہب اسلام کو گالی بکی کہ اس سے مذہب کی ہی توہین مقصود تھی۔

کسی مسلمان کے برے اعمال کے سبب اس کے دین کی طرف اضافت کرکے گالی بکی

یا کسی سے بحث و مباحثہ کے دوران اسلام پر کلام کرتے ہوئے بلانیت اسلام کو گالی بکی
ان تینوں صورتوں میں سے پہلی صورت میں زید کی ضرور تکفیر ہو گی۔
باقی دو صورتوں میں تاویل کا امکان ہے اس وجہ سے تکفیر تو نہ ہو گی البتہ احتیاطاً تجدید ایمان کا حکم دیا جائے گا۔
فتاوی شامی میں لکھا ہے:

'' مطلب فی حکم من شتم دین مسلم ثم إن مقتضی کلامهم أیضا أنه لا یکفر بشتم دین مسلم: أی لا یحکم بکفره لإمکان التأویل. ثم رأیته فی جامع الفصولین حیث قال بعد کلام أقول: وعلی هذا ینبغی أن یکفر من شتم دین مسلم، ولکن یمکن التأویل بأن مراده أخلاقه الردیئة ومعاملته القبیحة لا حقیقة دین الإسلام، فینبغی أن لا یکفر حینئذ، والله تعالی أعلم اهـ وأقره فی [نور العین] ومفهومه أنه لا یحکم بفسخ النکاح، وفیه البحث الذی قلناه. وأما أمره بتجدید النکاح فهو لا شك فیه احتیاطا خصوصا فی حق الهمج الأرذال الذین یشتمون بهذه الکلمة فإنهم لا یخطر علی بالهم هذا المعنی أصلا''

یعنی جس شخص نے کسی مسلمان کے دین کو گالی دی تو اس پر تاویل کی گنجائش کے سبب حکم کفر نہ ہو گا۔ میں نے جامع الفصولین میں اس بحث کو دیکھا جہاں اس کے بعد کہا کہ میں کہتا ہوں اور اس طور پر ضروری ہے کہ دین مسلم کو گالی دینے والے کی تکفیر کی جائے البتہ تاویل ممکن ہے، وہ یہ کہ گالی دینے والے کی مراد مسلمان کا برا اخلاق اور اس کا گھٹیا معاملہ ہو نہ کہ حقیقتاً دین اسلام۔ تو مناسب یہ ہے کہ اس وقت اس کی تکفیر نہ کی جائے۔ اور اللہ تعالی بہتر جانتا ہے۔ اسی کو ''نور العین'' میں باقی رکھا۔ اور اس کا مفہوم یہ کہ اس گالی کے سبب فسخ نکاح کا حکم نہیں دیا گیا۔ اور اس میں وہی بحث ہے جو ہم کہہ چکے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ اسے احتیاطاً تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا۔ خاص کر ایسے بے وقوف ذلیل لوگوں کے حق میں جو اس کلمہ کے ذریعہ گالی بکتے ہیں۔ [ردالمحتار علی الدرالمختار: باب المرتد، ج ۴ ص ۲۳۰]

دین اسلام کو برا کہنے اور گالیاں دینے والے سے متعلق ایک استفتا کے جواب میں حضور تاج الشریعہ مفتی محمد اختر رضا خاں قدس سرہ فرماتے ہیں:

''وہ شخص مسلمان نہیں اس پر توبہ تجدید ایمان لازم ہے۔ جب تک کہ سرے سے کلمہ پڑھ کر اور رجوع لا کر مسلمان نہ ہو اس سے اور اس کے ہمنواؤں اور شرکائے حال سے پرہیز ضروری ہے۔'' [فتاوی تاج الشریعہ: ج ۲ ص ۴۸]

الحاصل: اگر زید نے اسلام کو گالی بکی ہے تو وہ یقیناً کافر ہے۔ اس پر توبہ تجدید ایمان، تجدید نکاح، لازم و ضروری ہے۔ اور اگر اس نے مذکورہ بالا دو صورتوں میں گالی بکی تو حکم کفر تو نہیں ہو گا البتہ توبہ، تجدید ایمان وغیرہ کا حکم دیا جائے گا۔

در مختار مع فتاوی شامی باب المرتد میں ہے:

مایکون کفرا اتفاقا یبطل العمل والنکاح واولاده اولاد زنا، ومافیه خلاف یؤمر بالاستغفار والتوبة (أی تجدید الاسلام وتجدید النکاح'' متفق علیہ کفر سے عمل اور نکاح باطل ہو جاتا ہے اور اس حالت میں جو اولاد ہو گی وہ اولادِ زنا ہو گی اور جس کے کفر ہونے میں اختلاف ہو اس میں توبہ تجدید اسلام و تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا۔

[ردالمحتار علی الدرالمختار: باب المرتد، ج ۶ ص ۳۹۱]

اور جب تک زید حکم شرع پہ عمل نہ کرے اس وقت تک اس کے ساتھ مسلمان تعلقات نہ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ''

(اور جو کہیں تجھے شیطان بھلادے تو یاد آنے پر ظالموں کے پاس نہ بیٹھ۔)

[کنزالایمان پارہ ۲۸، سورہ انعام آیت ۶۸]

ھٰذا ماعندی والعلم اتم عنداللہ تعالیٰ

فتوی ۴ — رام کتھامیں شرکت کرنے والے اوراس میں خلاف شرع بولنے والے خطیب کا حکم شرعی

مسئولہ: عبید الرحمن صابری، لال باغ مراد آباد یوپی۔ ۲۵؍ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ

حضرت مفتی صاحب قبلہ آپ کی خدمت میں ایک استفتا حاضر ہے محقق ومدلل جواب سے شاد کام فرمائیں اور اجر عظیم کے حقدار بنیں۔ زید ایک خطیب ہے اور اس نے ایک ہندو پنڈت کے یہاں منعقدہ 'رام کتھا' کی محفل میں شرکت کی اور خطاب کرتے ہوئے یہ جملے کہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) میں نے بحیثیت AS,A ایزاے مسلمان رام کو کس طرح دیکھا، شری رام کا وجود ایسا پاک اور پوتر وجود ہے، ان کا کریکٹر اتنا نرالا، پیارا اور بے مثال ہے، جو انٹلیکچول (دانشور) کلاس ہے.... وہ شری رام کو امام ہند مانتا ہے، رام نام ہے سچائی کا جو جھوٹ کو پراجت کرتا ہے، رام نام ہے مظلوم اور دکھی لوگوں کی حمایت کا جو ظلم کی گردن پکڑتا ہے، رام نام ہے سورج کی اس روشنی کا جس کے ذریعے اندھیرے دور ہوتے ہیں، رام نام ہے اس چاندنی کا جس کے ذریعے لوگوں کو سکون ملتا ہے، رام نام ہے اس ٹھنڈی ہوا کا جو جھلساتی ہوئی دھوپ میں انسان کے لیے چھتر چھایا بن جاتی ہے، میں اسی رام کو جانتا ہوں جس نے نفرت کا سندیش انسانیت کو نہیں دیا، نفرت کے مقابلے میں محبت کے بادل برسائے، انسان کی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس کروایا۔''

(ب) سیتاجی کے ساتھ ایک آتنک وادی نے آتنکت کرنے کی گھٹنا کی تھی ہم اسے راون کے نام سے جانتے ہیں، اس آتنک واد کے خلاف شری رام نے جہاد چھیڑا تھا۔

ایک چیز ہے آتنک واد جس سے ہمارا پورا ملک پیڑت (متأثر) ہے، ہمارا ملک ہی نہیں پورا سنسار پیڑت ہے۔ کسی کو آتنکت کرنا یہی تو ہے آتنک واد، اور جو ایسا کرتب کرے وہی ہے آتنک وادی، ایسے آتنک واد کے خلاف لڑنے کا نام نام عربی زبان میں جہاد ہے۔ اس لفظ جہاد کو اتنا اَپوِتر (ناپاک) کرکے رکھا ناپاک لوگوں نے کہ جو لڑائی آتنک واد کے خلاف لڑنے کا ہتھیار تھا اسی ہتھیار کو آج آتنک کا نام دے دیا گیا.... اس عظیم نام کو لیتے ہی نفرت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جہاں وہ نام لیا جائے اور وہاں بھی سماج میں نفرت موجود ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم شری رام کا نام زبان سے تو لیتے ہیں، اپنے عمل، اپنے کرتب، اپنے سنسکار میں داخل نہیں کرتے''

(د)"میں جب آیا تو میری بیگم نے بھی مجھ سے کہا کہ میں جب بھی (ہندو پنڈت) مراری باپو کو ٹی وی پر دیکھتی ہوں تو جب تک ان کا پورا پروچن (مذہبی بیان) نہیں سن لیتی بند نہیں کرتی ہوں، میری طرف سے بھی انہیں آپ آداب کہیے گا اور اگر موقع ملے تو مراری باپو کو سلام کرنے کے لیے ایک سیکنڈ کا وقت نکال کر اپنا ٹیلیفون دے دیجئے گا تاکہ ان سے بات کرنے کا سوبھاگیہ (خوش نصیبی) ہمیں بھی حاصل ہو جائے"

یہ زید کی تقریر کے اہم اقتباسات ہیں۔ زید کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ اس 'رام کتھا' میں خیر سگالی کے جذبے کے تحت شامل ہوا تھا۔ لہٰذا آپ شریعت کی روشنی میں حق وانصاف پر مبنی جواب مرحمت فرمائیں کہ اب اس کی تقریر سننا اور کسی سنی ادارے کا رکن بنانا کیسا ہے؟ اس کی تقریری گفتگو جائز، حرام، گمراہی یا کفر، کس زمرہ کی ہے؟

الجواب

سوال میں درج ایمان سوز باطل افروز اقوال خبیثہ کا قائل بلاشبہ وادی کفر میں داخل ہو چکا ہے۔ قائل نے کافر ومشرک بلکہ مشرکوں کے معبود باطل (رام) کی بے جا حمایت اس کی تعریف وتحسین اور قرآنی بولی

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ،

کے برخلاف مشرک کی عزت افزائی میں جہاں بھر کے قلابے ملانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ نیز قرآنی حکم "إِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ" "مشرک ناپاک ہیں۔ کے بجائے اس کے وجود کو پاک وپوتر مانا ہے یہی نہیں بلکہ قرآن کی رو سے "إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" "شرک سب سے بڑا ظلم ہے گویا مشرک سب سے بڑا ظالم ہے۔ مگر قائل نے اسے ظالم کی صف سے نکال کر مظلوموں کا حامی قرار دے کر قرآنی تعلیمات کی کھلی خلاف ورزی کی ہے۔

قائل کی زبان سے نکلا ہر جملہ رام کی صداقت کی گواہی دے رہا ہے۔ قائل نے اپنے جملوں سے رام کی صداقت اس کی پاکی اس کی عظمت وبرتری کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ یوں کہا جائے کہ قائل نے رام کی تعظیم وتوقیر تعریف وتوصیف میں اسلامی حدود سے تجاوز کر کے خود کو رام کے معتقدین ومحبین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ ایسے میں کون سی دلیل قائل کو کفر کی زد سے بچا سکے گی۔ شریعت میں فاسق کی تعظیم کو حرام بلکہ قریب الکفر قرار دیا گیا تو بھلا کافر ومشرک بلکہ معبود باطل کی تعریف کے کفر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

"إذا مدح الفاسق غضب الرب تعالى واهتزله العرش"

جب کسی فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ عزوجل غضب فرماتا ہے اور اس کی وجہ سے عرش الٰہی کانپ جاتا ہے۔

[شعب الایمان للبیہقی ج۴ ص ۲۳۱، باب فی حفظ اللسان]

حدیث مذکور کی تشریح میں ملا علی قاری رحمہ اللہ الباری رقم طراز ہیں:

"وقال الطيبي: اهتزاز العرش عبارة عن وقوع أمر عظيم وداهية دهياء لأن فيه رضا بما فيه سخط الله وغضبه، بل يقرب أن يكون كفرا ..... وإذا كان هذا حكم من مدح الفاسق، فكيف بمن مدح الظالم"

طیبی نے کہا عرش کا ہلنا کنایہ ہے بڑے واقعہ اور سخت مصیبت سے اس لئے کہ اس میں ایسی چیز سے راضی ہونا ہے جس میں اللہ

کی ناراضگی اوراس کا غضب ہے بلکہ قریب ہے کہ وہ کفر ہو.... اور جب فاسق کی تعریف کرنے والے کا یہ حکم ہے تو پھر ظالم کی تعریف کرنے والے کا حکم کیسا ہو گا؟۔

[مرقاۃ المفاتیح، کتاب الآداب، باب حفظ اللسان، ۸۹/۹]

شیخ محقق علی الاطلاق حضرت عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ القوی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

”چوں مدح کردہ میشود درخشم می آید پروردگار تعالیٰ واهتزله العرش ومی جنبد ومی لرزد از جهت مدح فاسق عرش واهتزاز عرش یا محمول بر ظاهر است یا کنایت است از وقوع امر عظیم زیرا که مدح فاسق راضی شدن است بچیزی که در وی ناخوشنودی وبے رضائے حق است تعالیٰ بلکه نزدیك است که موجب کفر باشد“

جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اور اس کا عرش کانپ جاتا ہے فاسق کی تعریف سے عرش کا ہلنا یا تو ظاہر پر محمول ہے یا یہ کسی بڑی بات کے واقع ہونے سے کنایہ ہے اس لئے کہ فاسق کی تعریف پر راضی ہونا ایسی چیز ہے جس میں اللہ پاک کی عدم رضا اور ناراضگی ہے بکہ قریب ہے کہ یہ موجب کفر ہو۔

[اشعۃ اللمعات فارسی، باب حفظ اللسان والغیبت ج ۴ ص ۴۴]

ملا علی قاری اور شیخ محقق کے نزدیک فاسق کی تعظیم قریب الکفر ہے تو بھلا کافر کی تعظیم کیوں کر کفر نہ ہو گی۔ اسی لئے فقہائے کرام نے کافر کی تعظیم کو کفر لکھا ہے۔ الاشباہ والنظائر لابن نجیم میں ہے:

’’تبجیل الکافر کفر، فلو سلم علی الذمی تبجیلا کفر، ولو قال للمجوسی یا أستاذی تبجیلا کفر. کذا فی صلاۃ الظهیریة‘‘

[الاشباہ والنظائر باب الردۃ: ج ۱ ص ۱۵۸]

جابجا کتب فقہیہ میں مصرح ہے کہ کفار کی مشرکانہ رسوم وافعال کی تحسین کفر ہے۔ تو پھر جن معبودان باطلہ کے لئے کفار ومشرکین کی یہ رسمیں ہیں ان کی تحسین و تعظیم کفر کیوں کر نہ ہو گی۔ علت دونوں جگہ ایک ہے خواہ عبادت کی تعظیم و تحسین ہو یا معبود کی، حکم ایک ہی ہو گا۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”کفار ومشرکین کی ایسی تعظیمیں کفر ہیں، ان کی جے پکارنا، ان کے مرنے یا جیل جانے پر ہڑتال اور اس پر وہ اصرار، اور جو مسلمان نہ مانے اس پر وہ ظلم واضرار کمال تعظیم کفار اور باعث دخول نار وغضبِ جبار، وحسب تصریحاتِ ائمہ موجب کفر و اکفار، فتاوٰی ظہیریہ واشباہ والنظائر وتنویر الابصار ودر مختار میں ہے:

لوسلم علی الذمی تبجیلا یکفر لان تبجیل الکافر کفر‘

(اگر کسی نے ذمی کو احتراماً سلام کہہ دیا تو یہ کفر ہے کیوں کہ کافر کی تعظیم کفر ہوتی ہے)

فتاوٰی امام ظہیر الدین ومختصر علامہ زین مصری وشرح تنویر مدقق علائی میں ہے:

لوقال لمجوسی یا استاذ تبجیلا کفر (اگر کسی نے مجوسی کو تعظیماً "یا استاد" کہا تو اس سے وہ کافر ہو جائے گا)“

[فتاوی رضویہ قدیم ۱۰/۶]

اور فرماتے ہیں: ”مگر کفار کے مذہبی جذبات اور ان کے دیوتاؤں اور پیشواؤں کو عزت دینا صریح کلمہ کفر ہے، قال اللہ تعالیٰ:

وﷲ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لایعلمون۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا عزت تو خاص اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے لئے ہے مگر منافقوں کو خبر نہیں۔

ان کے دیوتاؤں اور پیشواؤں اور مذہبی جذبات کا اعزاز درکنار جو ان کے کسی فعل کی تحسین ہی کرے باتفاق ائمہ کافر ہے، غمز العیون والبصائر میں ہے:

من استحسن فعلا من افعال الکفار کفر باتفاق المشائخ، جس نے کافر کے کسی عمل کو اچھا جانا وہ باتفاق مشائخ کافر ہے۔

ان لوگوں پر فرض ہے کہ ایسی باتوں سے توبہ کریں، تجدید اسلام کریں، تجدید نکاح کریں"

[فتاوی رضویہ قدیم ۱۲۶/۶، ۱۲۵]

قائل رام کی تعریف میں اتنا کچھ کہہ گیا کہ اسے اپنا مسلمان ہونا بھی یاد نہیں رہا۔ اگر واقعی قائل رام کی عقیدت میں غرق نہ ہو گیا ہوتا تو اسے ضرور یاد ہوتا کہ رام میں یہ خوبیاں تو درکنار خوبی نام کی کوئی چیز ہی نہ تھی بلکہ تواتر سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ ایک شریف آدمی بھی نہیں تھا چہ جائے کہ پاک پوتر محافظ معزز و مکرم وغیرہ۔

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"قرآن عظیم یا حدیث کریم میں رام و کرشن کا ذکر تک نہیں۔ ان کے نفس وجود پر سوائے تواتر ہنود ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ یہ واقع میں کچھ اشخاص تھے بھی یا محض انیاب اغوال ورجال بوستان خیال کی طرح اوہام تراشیدہ ہیں، تواتر ہنود اگر حجت نہیں تو ان کا وجود ہی ناثابت اور اگر حجت ہے تو اسی تواتر سے ان کا فسق و فجور ولہو ولعب ثابت، پھر کیا معنی کہ وجود کے لئے تواتر ہنود مقبول اور احوال کیلئے مردود مانا جائے اور انھیں کامل و مکمل بلکہ ظنا معاذ اللہ انبیاء ورسل جانا مانا جائے"

[فتاوی رضویہ قدیم، ۱۴۲/۶]

رام کتھا جو ہنود کی مذہبی محفل ہے قائل کا اس میں شرکت کرنا نیز اس میں ان کے معبود کی تعریف وتوصیف کے ذریعہ ان کی مذہبی شان وشوکت بڑھانا بھی کفر ہے۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"فعل کفر میں جو دل سے شریک ہو وہ ظاہراً باطناً کافر ہے، اور جو اکراہ واضطرار و مجبوری محض سے بظاہر شریک ہو اسے معافی ہے۔ مگر اکراہ صحیح شرعی درکار ہے، کسی کی خاطر وغیرہ سے مجبور ہونا شرعی مجبوری نہیں اور بلا اکراہ شرعی شرکت کفر پر بھی شریعت مطہرہ لزوم کفر و تجدید اسلام و تجدید نکاح کا حکم دے گی۔"

[فتاوی رضویہ قدیم ۱۱۴/۶]

مزید فرماتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: من سود مع قوم فھو منھم "جو کسی قوم کے جتھے میں شامل ہوا وہ انہیں میں سے ہے۔ دوسری حدیث میں ہے: من کثر سواد قوم فھو منھم، جو کسی قوم کا مجمع بڑھائے وہ انہیں میں سے ہے۔

تیسری حدیث میں ہے: من جامع المشرك وسكن معه فانه مثله، جو مشرک کے ساتھ آئے اور اس کے ساتھ رہے وہ بیشک اسی کے مثل ہے"[فتاوی رضویہ قدیم ۹۳/۶]

صدر الشریعہ فرماتے ہیں:

"کفار کے میلوں تہواروں میں شریک ہو کر ان کے میلے اور جلوس مذہبی کی شان و شوکت بڑھانا کفر ہے"

[بہار شریعت حصہ ۹ ج ۱۸۴]

شارح بخاری مفتی شریف الحق امجدی فرماتے ہیں:

"ان کے مذہبی میلوں میں شرکت تکثیر سواد ہے اور کفار کے جتھا کو بڑھانا بحکم حدیث کفر۔ جیسا کہ فرمایا گیا:
من کثرسوادقوم فھومنھم اگرچہ جب اس کی نیت محض لہو و لعب کی ہے تکثیر سواد کی نہیں تو بر بنائے تحقیق کفر نہیں مگر ظاہر حال کے اعتبار سے کفر ہے جس کی مؤید روایت فقہیہ بھی ہے۔"[فتاوی شارح بخاری، ۵۴۶/۲]

مزید براں قائل کارام کے ایک دنیاوی عمل کو جہاد جیسے اسلامی شعار سے تشبیہ دینا قائل کو گمراہی کے غار عمیق میں ڈبونے کے لئے بہت ہے۔ اور قائل کی بیوی کی ایک پنڈت سے اس درجہ محبت کہ اس کے مذہبی بیان کو سنے بغیر ٹی وی نہیں بند کرتی، یقیناً تعظیم کافر و کفر دونوں کی موجب ہے، نیز قائل کا بطور فخر اس کو بر سر مجمع بیان کرنا بھی رضا کی دلیل ہے۔

الحاصل: قائل کے مندرجہ بالا جملے صاف طور پر مذہب باطل اور معبود باطل کی طرف قائل کے قلبی میلان کا اعلان کر رہے ہیں اور کفر و کفار سے متعلق قرآنی تعلیمات کے برخلاف قائل کے جملے تخفیف اسلام کے مورث ہیں۔ اس لئے قائل پر بحکم شرع کفر عائد ہوتا ہے۔ اس پر لازم ہے کہ فوراً توبہ، تجدید ایمان اور تجدید نکاح کرے نیز کسی پیر کامل سے مرید ہو تو از سر نو بیعت بھی کرے۔ در مختار مع فتاوی شامی باب المرتد میں ہے:

مایکون کفرًا اتفاقاً یبطل العمل والنکاح واولادہ اولاد زنا، ومافیہ خلاف یؤمر بالاستغفار والتوبۃ (أی تجدید الاسلام وتجدید النکاح"

متفق علیہ کفر سے عمل اور نکاح باطل ہو جاتا ہے اور اس حالت میں جو اولاد ہو گی وہ اولادِ زنا ہو گی۔ اور جس کے کفر ہونے میں اختلاف ہو اس میں توبہ تجدید اسلام و تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا۔

[ردالمحتار علی الدرالمختار: باب المرتد، ج ۶ ص ۳۹۱]

اور لوگوں کے لئے ایسے شہرت پسند ہوس پرست، اسلامی روش کے خلاف لفاظی کرنے والے پیشہ ور مقرر کی تقریر سننا اسے جلسوں میں بلانا اس کی تعظیم کرنا سب کچھ حرام ہے۔ اور جب تک قائل حکم شرع پر عمل نہ کرلے مسلمانوں کو اس سے کسی طرح کا تعلق رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ"

(اور جو کہیں تجھے شیطان بھلادے تو یاد آنے پر ظالموں کے پاس نہ بیٹھ۔)

[کنزالایمان پارہ ۲۸، سورہ انعام آیت ۶۸]

ھٰذا ماعندی والعلم اتم عنداللہ تعالیٰ

فتوی ۵

کافروں کے مذہبی پروگرام میں شرکت اور پرماتما کے نام پر دیا جلانے کا شرعی حکم

مسئولہ: محمد شبیر حسین رنگریز کانکیر چھتیس گڑھ انڈیا۔۶ر ربیع النور ۱۴۴۰ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہ
ہندوں عورتوں نے ایک اپنا مذہبی پروگرام کیا انہوں نے اپنے عقیدے کے مطابق پرماتما کے نام پر دئے جلائے یعنی پوجا کی اس میں زید نے شرکت کی۔ اور باقاعدہ دیا روشن کیا۔ دوسرے دن اخبار میں یہ خبر زید کے فوٹو کے ساتھ شائع ہوئی۔ جس میں زید سب کے ساتھ دیا روشن کرتا ہوا نظر آرہا ہے۔ کیا ایسا شخص کسی دینی جماعت یا انجمن یا مسجد کمیٹی کا صدر ہو سکتا ہے۔ برائے کرم جواب عنایت فرمائیں۔ نوازش ہو گی۔

الجواب

ہنود کے مذہبی معاملات میں شرکت عند الشرع کفر ہے۔ بشرطیکہ کوئی شرعی مجبوری نہ ہو۔ صورت مسئولہ میں زید کا ہنود کے مذہبی پروگرام میں شریک ہونا اور ان کے شعار مذہبی یعنی "پرماتما کے نام پر دیا جلانا" پر خود بھی عمل کرنا، ازروئے شرع کفر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: من سود مع قوم فھو منھم جو کسی قوم کے جتھے میں شامل ہوا وہ انہیں میں سے ہے۔

دوسری حدیث میں ہے: من کثر سواد قوم فھو منھم، جو کسی قوم کا مجمع بڑھائے وہ انہیں میں سے ہے۔
تیسری حدیث میں ہے:
من جامع المشرك وسكن معه فانه مثله جو مشرک کے ساتھ آئے اور اس کے ساتھ رہے وہ بیشک اسی کے مثل ہے"
[فتاوی رضویہ قدیم ۶/۹۳]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:
"فعل کفر میں جو دل سے شریک ہو وہ ظاہراً باطناً کافر ہے، اور جو اکراہ واضطرار ومجبوری محض سے بظاہر شریک ہو اسے معافی ہے۔ مگر اکراہ صحیح شرعی درکار ہے، کسی کی خاطر وغیرہ سے مجبور ہونا شرعی مجبوری نہیں اور بلا اکراہ شرعی شرکت کفر پر بھی شریعت مطہرہ لزوم کفر وتجدید اسلام وتجدید نکاح کا حکم دے گی۔" [فتاوی رضویہ قدیم ۶/۱۱۴]
صدر الشریعہ فرماتے ہیں:
"کفار کے میلوں تہواروں میں شریک ہو کر ان کے میلے اور جلوس مذہبی کی شان وشوکت بڑھانا کفر ہے"
[بہار شریعت حصہ ۹ ج ۱۸۴]
شارح بخاری مفتی شریف الحق امجدی فرماتے ہیں:
"ان کے مذہبی میلوں میں شرکت تکثیر سواد ہے اور کفار کے جتھا کو بڑھانا بحکم حدیث کفر جیسا کہ فرمایا گیا" من کثر سواد قوم

فھومنھم'' اگرچہ جب اس کی نیت محض لہوولعب کی ہے تکثیر سواد کی نہیں توبربنائے تحقیق کفرنہیں مگر ظاہر حال کے اعتبار سے کفر ہے جس کی مؤید روایت فقہیہ بھی ہے۔''

[فتاوی شارح بخاری، ۵۴۶/۲]

الحاصل: زید ہنود کے مذہبی جلسہ میں شریک ہونے اوران کے مذہبی شعار (دیاجلانے) پر عمل پیرا ہونے کے سبب دائرہ اسلام سے خارج ہے۔زیدپرلازم ہے کہ توبہ کرے اور تجدید ایمان، تجدید نکاح کرے اوراگرکسی پیرسے مرید ہوتو تجدید بیعت بھی کرے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختاراوراس کے حاشیہ ردالمختار میں ہے:

مایکون کفرااتفاقایبطل العمل والنکاح واولادہ اولادزنا، ومافیہ خلاف یؤمربالاستغفار والتوبۃ (ای تجدید الاسلام) وتجدید النکاح۔ متفق علیہ کفرسے عمل اور نکاح باطل ہوجاتاہے اوراس کی حالت میں جواولاد ہوگی وہ اولادزناہوگی اور جس کے کفرہونے میں اختلاف ہواس میں توبہ، تجدید اسلام اور تجدید نکاح کاحکم دیاجائے گا۔

[الدرالمختارمع ردالمحتار: باب المرتد، ۳۹۱/۶]

اورجب تک توبہ وغیرہ نہ کرلے زیدکوکسی مسجد مدرسہ یادینی ورفاحی تنظیم کاصدرومتولی یاذمہ داربناناجائزنہیں ہے۔

ردالمحتار میں اسعاف کے حوالے سے ہے ''ولایولی الاامین'' متولی ومنتظم صرف اسی کوبنایاجائے گاجوامین ہو۔

[ردالمحتار: ۵۷۸/۶]0

حضوراعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''متولی رہے گاجب تک کہ اس کی خیانت یاعجزیافسق ظاہر نہ ہوورنہ اس سے ولایت لے لی جائے گی اگرچہ متولی خود واقف ہی ہو، درمختار میں ہے: وینزع وجوبا لوکان المتولی غیرمامون او عاجزاً وظھربہ فسق وان شرط عدم نزعہ او ان لاینزعہ قاض ولاسلطان لمخالفتہ حکم الشرعی فیبطل کالوصی، اور متولی غیر معتمد علیہ ہو، یانالائق ہو، یااس کافسق ظاہر ہوچکاہوتواس کو معزول کرناضروری ہے اگرچہ معزول نہ کرنے کی شرط کی ہو، یایہ کہ قاضی اور سلطان بھی نہ معزول کرے گا، توشرع کے مخالف ہونے کی وجہ سے یہ شرط باطل ہے''

[فتاوی رضویہ قدیم۔ج ۶ ص ۳۳۸]

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۶ ایک خطیب کی گمراہ کن باتوں پرشرعی گرفت

مسئولہ: محمد عقیل رضوی کرنتی، دھوبی گلی ۲۵۵، مالیگاؤں ضلع ناسک مہاراشٹر انڈیا۔ ۱۲/ر صفرالمظفر ۱۴۳۹ھ

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین

زید جوکہ ایک پیشہ ورمقرر ہے آئے دن اپنی تقریروں میں خلاف اہل سنت نظریات بیان کرتارہتاہے۔اہل تشیع کی مخترعہ روایات بیان کرتاہے۔زید کی چند تقریروں میں انبیائے کرام وفرشتگان عظام سے متعلق توہین آمیز فقرات فی الحال سوشل

میڈیا پر کافی گردش میں ہیں ۔ ہم نے بھی ان موضوع روایات ، توہین آمیز فقرات کو سنا ہے ۔ زید کی ان تقریروں میں سے درج ذیل چند ہفوات سے متعلق ہمیں حکم شرعی درکار ہے ۔ امید ہے جواب دے کر ممنون فرمائیں گے ۔ اور عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہوں گے ۔

سوالات

(۱) الفاظ مقرر ۔ علامہ ابن عساکر فرماتے ہیں ایک دن اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا یا رسول اللہ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام تشریف لائے کتنے آئے ؟ ایک لاکھ چوبیس ہزار آئے ۔ وہ کیوں آئے ان کے آنے کا مقصد کیا تھا تو میرے رسول فرماتے ہیں : ان کے آنے کا مقصد یہ تھا دو ایک تو وہ میری نبوت کا اعلان کرے ۔ دوسرا یہ کہ وہ علی کی ولایت کا اعلان کرے ۔ ان کا مقصد تو توحید تھا ہی اور اللہ سے جوڑنا تھا ہی **لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ بے نیاز ہے اس نے اپنے نبیوں کو اس مقصد کے لئے بھیجا کہ جاؤ میرے محبوب کی نبوت کے ڈنکے بجاؤ اور میرے علی کی ولایت کے ڈنکے بجاؤ ۔ ولایت مطلب مولائیت وہ انبیاء علی کی مولائیت کے ڈنکے بجانے آئے تھے ۔**

(شہادت مولا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم، ۹ جولائی ۲۰۱۵، مالیگاؤں، مہاراشٹرا)

(۲) ارشاد ہوا : **آدم ! ان پانچوں کے نام یاد کر لے کام آجائیں گے ۔** ان پانچوں کے نام یاد کر لے کام آجائیں گے ۔ ان پانچوں کے نام یاد کر لے کام آجائیں گے ۔ **اللہ میں تیری شان کے قربان کہ تو اپنا نام یاد کرنے کی بات نہیں کرتا ۔ تو آدم کو پانچ نام یاد کراتا ہے ۔ کیوں کہ قدرت کے علم میں یہ بات ہے میرا نام اسی کو فائدہ دے گا جو یہ پانچ نام والا ہو گا ۔ آدم پانچ نام یاد کر ۔**

(محفل یوم مباہلہ و شب اعلان ولایت مولائے کائنات : تعزیہ کمیٹی مالیگاؤں، ۹ ستمبر ۲۰۱۷)

☆ آدم تین سو سال یا دو سو سال تک دعا کرتے رہے جواب نہیں آیا ۔ ایک دن کہا اے اللہ وہ پنجتن کا واسطہ ۔ (سبحان اللہ سبحان اللہ) یہ ہیں پنجتن ۔

(محفل یوم مباہلہ و شب اعلان ولایت مولائے کائنات : تعزیہ کمیٹی مالیگاؤں، ۹ ستمبر ۲۰۱۷)

☆ آدم کی پریشانی کو کوئی مجبوری کا نام دے کر یہ نہ سوچے کہ معاذ اللہ آدم نے یوں ہی لے لیا تھا ۔ آج آدم نے لیا ہے اور دور رسالتِ ختمی مرتبت کے اندر محبوب کو اس شان کے ساتھ لے جانے کا حکم دوں گا کہ پہلے حسن کا دامن ، انگلی محمد عربی نے پکڑی ہوئی ہے بلکہ پکڑائی ہوئی ہے ۔ ہاتھ میں حسین کو لیا ہوا ہے ۔ حسین کو لیا ہوا ہے ۔ پیچھے فاطمۃ الزہراء ہے ، بعد میں علی مرتضیٰ ہے ۔ یہ چل رہا ہے ۔ گویا کہ نبی بتا رہے ہیں **کہ آدم نے جو وسیلہ لیا تھا یہ یوں ہی نہیں لیا تھا بلکہ اس وقت تو یہ پنجتن آدم کی ضرورت تھے** اور آج یہ پنجتن اللہ کے دین کی ضرورت ہیں ۔ (سبحان اللہ ، سبحان اللہ) ۔ یہ ہیں پنجتن ۔

(محفل یوم مباہلہ و شب اعلان ولایت مولائے کائنات : تعزیہ کمیٹی مالیگاؤں، ۹ ستمبر ۲۰۱۷)

(۳) **الفاظ مقرر :** توجہ ہے آپ کی ؟ علی کی شان جاننا ہے بیٹھے ہو نا تو سن لو ! علی کو نہلا کون رہا ہے ؟ حضور ، حضور کے ہاتھ ہیں ۔ آپ قرآن سے پوچھو یہ نبی کے ہاتھ کس کے ہاتھ ہیں ؟ سبحان اللہ قرآن سے پوچھو نبی کا ہاتھ کس کا ہاتھ ہے ؟ قرآن کہتا ہے ید اللہ فوق ایدیھم اے نبی یہ تیرا ہاتھ نہیں خدا کا ہاتھ ہے ، سبحان اللہ ۔ کونسا ہاتھ نہلا رہا ہے علی کو ؟

خدا کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں اور نہلا کون رہا ہے؟ محبوبِ خدا دستِ رسول نہلا رہے ہیں **اگر یہ کہوں کہ دستِ مصطفی میں دستِ خدا کام کررہاہے تو یہ میری عقیدت کا غلو نہیں بلکہ حقیقت ہے۔**

(سیرت علی بن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم، ۱۹جولائی ۲۰۱۴، مالیگاؤں، مہاراشٹرا)

(۴) الفاظ مقرر: فاطمۃ الزھراء وہ **فاطمہ ہے کہ جس کے دروازہ پر بھیک مانگنے والا جبرائیل ہے (واہ!واہ) جب اسی طرح کی باتیں ہوتی ہے تو لوگوں کو تکلیف ہوتی جبرائیل کو بھکاری کہہ دیا کہتے ہیں۔** قرآن اٹھاکہ دیکھ کبھی مسکین بن کر، کبھی یتیم بن کر، کبھی اسیر بن کر (واہ!واہ) کوئی آنے والا آتا ہے تو افطار کے وقت بھیک مانگتاہے، صدا لگاتا ہے۔

(تاجدار کربلا کانفرنس۔ سنی دعوت اسلامی اجتماع: ۲۲/ستمبر ۲۰۱۷ء)

الفاظ مقرر: اور مریم کے گھر میں جبرائیل بیٹا دینے آتا ہے اور فاطمہ کے گھر میں **جبرائیل بھیک مانگنے آتا ہے** (ذکر تاجدر کربلا نعرئہ تکبیر نعرئہ رسالت شان اہل بیت ذکر تاجدار کربلا۔ یہ میری زور خطابت نہیں ہے **یہ میری زور خطابت نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے** ورنہ قرآن اٹھاکر دیکھ لو ایک دن میں مسکین ہوں دوسرے دن آیا میں فقیر ہوں میں اسیر ہوں تیسر دن آیا اور اس کے بعد فاطمہ بھیک دیتی ہے جب یہ انداز گزر گیا آقا نے کہا علی فاطمہ تمہارے گھر تین دن سے فقیر اسیر بھیک مانگنے آرہا تھا وہ کون تھا عرض کی حضور آپ بتائیں کون تھا؟ آقا فرماتے ہیں مکہ مدینہ کا یا صحرائے عرب کا کوئی بدو نہیں تھا **جو بھیک لینے آیا تھا وہ بلبل سدرہ تھا جو تیری چوکھٹ پہ مانگنے آیا تھا۔**

(دوسرا دن محرم ۲۰۱۳)

(۵) فاطمہ کون ہے؟ فاطمہ کون ہے؟ جو پنجتن میں پانچواں تن ہے۔ بلکہ یہ کہوں کہ پنجتن میں پہلا تن ہے، پنجتن میں پہلا تن فاطمہ۔ لیکن میں نے چونکہ عورت ہونے کے حساب سے پانچواں بیان کیا۔ ترتیب کے اعتبار سے تو وہ پہلی ہے لیکن میں نے پانچویں نمبر پہ بیان کیا۔ یہ فاطمہ کون ہے؟ فاطمہ کون ہے؟ ایک جملہ میں منقبتِ فاطمہ۔

(محفل یوم مباہلہ وشب اعلان ولایت مولائے کائنات: تعزیہ کمیٹی مالیگاؤں، ۸ستمبر ۲۰۱۷)

(۶) کائنات کو دینے والا رسول، کائنات کو دینے والا رسول حجرہ فاطمہ میں ہاتھ پھیلا کر یوں داخل ہوتا ہے۔

(ذکر حسین وفضائل اہلبیت: مالیگاؤں۔ ۷/اکتوبر ۲۰۱۶ء)

(حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امام الانبیاء ومالک کل ہونے کے باوجود فقر کی وجہ بیان کرتا ہے) کیوں کہ جس کے سر سے اتارا جاتا ہے اتارا اس کے ہاتھ میں نہیں دیا جاتا بلکہ قلاش، فقیر اور محتاج کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے۔

☆ قدرت نے اپنے خانہ خدا سے ایک بارات نکالی وہ معراج کے دولہے کی بارات تھی۔ زمین سے لے کر آسمان تک عرش سے لے کر فرش تک شرق سے لے کر غرب تک پوری کائنات لے رکھ کر محمد پہ یوں صدقہ کیا (نعرہ رسالت) (وارنے کا اشارہ) محمد سے یوں نثار کیا، یوں نثار کیا یوں نثار کیا اور جو ضرورت مند کھڑے تھے سب کی جھولی بھر دی داؤد وسلیمان کو بادشاہ بنادیا کسی کو تاجدار بنادیا ان کے ہاتھ میں رکھتا تو یہ محبت کی غیرت کے خلاف تھا اس لئے ان کو وہ نہیں دیا کیوں کہ صدقہ جس کا ہے اس کو ہاتھ میں نہیں دیا جاتا۔ (ذکر حسین وفضائل اہلبیت: مالیگاؤں۔ ۷/اکتوبر ۲۰۱۶ء)

☆حضور وہ ہیں حسن یوسف جس کے دروازہ پر کاسئہ گدائی، لحن داؤدی بھیک مانگے آدم کی صفوت و سطوت اس کے دروازے پہ خیرات مانگے۔

(یوم مباہلہ و یوم اعلان ولایت مولائے کائنات۔مالیگاؤں۔۸/ستمبر ۲۰۱۷)

(۷) علی کعبہ میں پیدا ہوئے آج تک اندر پیدا ہونے کا شرف حاصل ہو صرف تنہا اس میں مولائے کائنات شیر خدا علی مرتضیٰ کی ذات ہے۔

☆پوری کائنات میں ایک بندہ ہے جس کو کعبہ میں پیدا ہونے کا شرف حاصل ہے۔☆یہ قدرت کے فیصلے تھے جس میں مولودِ کعبہ کی عظمت کو ظاہر کرنا تھا۔☆اس سے پہلے سنایا جا چکا ہے اس سے پہلے معلوم ہو چکا ہے یہ بات پتہ ہے کہ مریم کعبہ کے اندر رہتی تھی۔ توجہ فرمائیں مریم بتول کنواری پاک دامن جس کی پاکی کا اعلان قرآن کر رہا ہے وہ مریم بیت المقدس میں رہتی تو اس **کنواری مریم کو جب بچہ کی پیدائش کا وقت آیا تو اللہ کے منادی نے اعلان کیا مریم تو بچپنے سے لے کر آج تک تو مسجد میں رہی لیکن اب بچے کی ولادت کا وقت ہے خبر دار مسجدوں میں بچے پیدا نہیں ہوتے بچے کی پیدائش کا وقت ہے۔تو باہر آ، تو مریم جو مسجد میں رہتی تھی اس کو باہر نکلنے کا حکم ہوا اور مریم باہر نکلی تو جناب عیسیٰ کی ولادت ہوئی** لیکن قربان جائیں ہم غیر نبی کو نبی کے برابر کا درجہ نہیں دیتے افضل تو دور کی بات ہے لیکن جب مریم کا بچہ پیدا ہونے کا وقت آتا ہے تو اللہ اکبر مسجد میں رہنے والی مریم کو باہر نکالا جاتا ہے لیکن جب علی کی ولادت کا وقت آتا ہے تو باہر رہنے والی فاطمہ بنت اسد کو اندر بلایا جاتا ہے۔

(جشن ولادت علی، سنی دعوت اسلامی اجتماع، ۲ مئی ۲۰۱۵ء ٹیپو سٹانڈ، ڈونگری، ممبئی)

الفاظ مقرر: کائنات انسانی میں دو بتول ہیں ایک مریم ایک فاطمہ اللہ نے فاطمہ کو شوہر والی بنایا اور بچے عطا کئے لیکن مریم کو شوہر والی نہیں بنایا بغیر شوہر کے بچہ دیا اللہ تیری حکمتوں پہ قربان۔ تجھ پہ اعتراض تو کوئی نہیں کر سکتا۔ اعتراض کرے وہ مومن نہیں رہ جاتا۔ مولی اگر تونے مریم کو وہ شوہر دے دیا ہوتا تو مریم پر زنا کا الزام نہ لگتا بتول پر یہ الزام لگا دینا تھا بتول پہ زنا کا الزام لگا اس لئے کہ تونے شوہر کے بغیر بچہ اسے عطا کیا۔ جبرئیل کی پھونک سے عطا کیا جبریل کے دم سے عطا کیا۔ مولی شوہر دے دیتا تو زنا کا، جب تونے بتول ہی بنانا تھا الزام سے بچ جاتی۔ حالانکہ تونے قرآن اتار کر تونے الزام دور کر دیا لیکن اتنے دنوں تک مریم کو گالیاں پڑتی رہیں **عیسی کو گالیاں پڑتی رہیں مولی شوہر دیتا تو اچھا ہوتا۔** قدرت کا نقیب آواز دے گا نا ادان صرف دو ہی تو بتول بنایا ہے۔ ایک مریم ایک فاطمہ مریم کا شوہر علی ہے۔ معاف کیجئے فاطمہ کا شوہر علی ہے فاطمہ کا شوہر علی ہے مریم کو شوہر دیتا نا اگر مریم کو شوہر دیتا تو انسان ہی ہوتا مریم کا شوہر بھی انسان ہی ہوتا۔ وہ کھڑے ہو کر سینہ تان کر محشر میں کہتا کہ علی کی بیوی بھی بتول ہے۔ اور میری بیوی بھی بتول ہے اور میں علی کے برابر ہوں **اللہ نے فرمایا اگر مریم پہ الزام لگے گا قرآن نازل کر کے دور کر دوں گا لیکن علی کی برابری کی کسی کو اجازت نہیں دوں گا۔**

(دوسرا دن محرم ۲۰۱۳)

(۸) **الفاظ مقرر:** تم خود آؤ ہم خود آتے ہیں آقا نے کہا علی تم بھی چلو علی تم بھی چلو کیوں چلو اس میں بظاہر علی کا ذکر نہیں تو گویا کہ قرآن بتا رہا ہے "انفسنا" کہ **یعنی ہم خود ہم خود میں علی اور محمد عربی یہ دو نہیں ہیں ایک ہی ذات ہے۔**

گویا کہ اللہ انفسنا کہہ کر بتا رہا ہے کہ قالب تو دو ہیں اور روح ایک ہے اس دو قالب کا نام ایک کا علی اور دوسرے کا محمد ہے اور اس ایک روح کا نام علی مرتضیٰ ہے۔ انفسنا یہ دو جسم ایک جان جو کہتے ہیں اسی کا نام محمد و علی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے ہم یہ نہیں کہتے کہ علی رسول ہے یا رسول علی ہے ہم حلول کے قائل نہیں لیکن آپ نے کہا ہے کہ نہ کہ محبت ایسی ہوتی ہے کہ تو من شدی تو من شدی من تو شدم۔ تو تن ہو جائیں جان ہو جاؤں تو من ہو جائیں جان ہو جاؤں پھر کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ تو الگ ہے اور میں الگ ہو اگر میں اس فنائیت کا جلوہ دیکھتا ہے تو قرآن کہتا ہے انفسنا علی کو رسول اللہ کی ذات میں وہ فنائیت حاصل تھی کہ اللہ نے حسین کا ذکر الگ کیا ہے سیدہ کا ذکر الگ کیا ہے اور علی اور رسول اللہ کا ذکر ایک ساتھ کیا یہ مولائے کائنات کی شان ہے یہ علی مرتضیٰ کا مرتبہ ہے۔

(شہادت مولا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم، ۹ جولائی ۲۰۱۵، مالیگاؤں، مہاراشٹرا)

الفاظ مقرر: علی کو کس حیثیت سے؟ انفسنا۔ **علی کو گویا کہ نبی نے نفسِ رسول قرار دیا۔** نفس رسول آپ سمجھتے ہیں ؟ نفسِ رسول سمجھتے ہیں ؟ اور نفسِ رسول، نفس رسول کا مطلب کیا ہے ؟ نفس رسول کا مطلب کیا ہے ؟، **تو میں اور میں تو۔ اسی کو کہتے ہیں نفس۔** اسی کو کہتے ہیں نفس۔ میں تو، تو میں۔

☆ حضور فرماتے ہیں: **علی! علی! اَنْتَ مِنِّی وَاَنَا مِنْہُ۔ دَمُّکَ دَمِّی، لَحْمُکَ لَحْمِی۔ تو مجھ سے ہے، میں تجھ سے ہوں۔ تیرا خون، میرا خون ہے اور تیرا گوشت میرا گوشت ہے۔** (سبحان اللہ، سبحان اللہ)۔

☆ **تو پتہ چلا جو قد نبی کا تھا وہی قد علی کا تھا۔ اور جو توازن نبی کے جسم کا تھا وہی علی کے جسم کا تھا۔**

(یوم مباہلہ و یوم اعلان ولایت مولائے کائنات، مالیگاؤں، ۸/ ستمبر ۲۰۱۷ء)

(۹) الفاظ مقرر: جب آیۂ تطہیر نازل ہوئی تو حضور نے اپنی کمبل کو حضور نے اپنی نوری چادر کو اللہ اکبر پھیلایا اور پھیلانے کے بعد کہا علی آجاؤ، فاطمہ آجاؤ، حسن آجاؤ، حسین آجاؤ، اور چاروں تن کو لے کر آقا نے چاروں تن کو لے کر ایک تن حضور کا ہے توجہ فرمائیں ایک تن حضور کا ہے توجہ آپ کی ایک تن حضور کا ہے دو تن حسنین کے ہیں دو تن علی و فاطمہ کے ہیں اس طرح یہ ہے پنجتن یہ پنجتن ہے یہ عبا کے اندر ہے انھیں چار تن کے ساتھ انھیں چار تن کو آل عبا کہتے ہیں اور یہ چار تن ہیں آپ غور فرمایئے چار تن کو ساتھ لیا ام سلمہ وہ بھی آیۂ تطہیر میں شامل ہیں۔ آیۂ تطہیر ان کے گھر میں داخل ہوئی لیکن ام سلمہ نے چادر لیا اور اندر داخل ہونے کی کوشش کی آقا نے چادر کھینچ لی اور کہا ام سلمہ تم خیر پر ہو آیت کی برکت تمہیں بھی ملے گی لیکن چادر میں آنا نہیں کیوں کیوں؟ حالانکہ آیت ان ہی کے گھر نازل ہوئی ہمارا عقیدہ ہے آیت تطہیر میں امہات المومنین اول درجہ پر ہے اس کے بعد ہے قربان جایئے حضور نے چار تن کو لیا پانچواں تن نبی کا تھا نبی بتا رہے ہیں **اس چادر کے اندر تن پانچ ہے لیکن روح ایک ہے** (سبحان اللہ سبحان اللہ) اسی ئے تو کہتے ہیں "**بے دم یہی تو پانچ ہے مقصودِ کائنات، مقصودِ کائنات، مقصودِ کائنات" آقا سے اللہ نے فرمایا ہے حبیب تجھے پیدا کرنا نہ ہو تا تو کائنات کو پیدا نہ کرتا اگرچہ یہ چار تن الگ ہیں لیکن ان میں روح، روحِ مصطفی ہے روح مصطفی ہے** (سبحان اللہ سبحان اللہ) (دوسرا دن محرم ۲۰۱۳)

(۱۰) الفاظ مقرر: ۱۰ ھجری میں ۱۸ تاریخ یعنی یہی جو کل کا دن آنے والا ہے اعلان کس نے کیا؟

اعلان کرنے والا نبی کس کی ولایت کا اعلان ہوا؟ علی مرتضیٰ کی۔ اب سب سے پہلے منانے والا کون؟ سب سے پہلے ولایتِ علی منانے والا کون؟ غدیر خم پر مبارک باد دینے والا کون؟

(یوم مباہلہ ویوم اعلان ولایت مولائے کائنات، مالیگاؤں، ۸/ستمبر ۲۰۱۷ء)

الفاظ مقرر: میں وہ کہہ رہا تھا نہ کہ سنی تعزیہ کمیٹی کو کوئی طعنہ نہ دے کہ یہ کیا ہو گیا؟ اور ولایتِ علی تو رافضی مناتے ہیں۔ **اچھا! کب سے مناتے یہ؟ جن کو تم رافضی کہتے ہو؟ ذرا بتانا کب سے مناتے ہیں؟ نبی نے اعلان کیا تبھی تو کوئی منائے گا۔** پہلے اعلان کس نے کیا؟ اعلان کرنا نبی کی سنت ہے اور سب سے پہلے ولایتِ علی منانے والوں کے نام حدیث کی روشنی میں پیش کرتا ہوں یارو! آپ کو پتا نہیں ہے آپ بھکوں میں الجھ گئے ہیں۔ **ذرا اصل کی طرف آیئے۔ حقیقی سنیت کی طرف آیئے** (سبحان اللہ، سبحان اللہ) حقیقی سنیت کی طرف آیئے آپ۔

(یوم مباہلہ ویوم اعلان ولایت مولائے کائنات، مالیگاؤں، ۸/ستمبر ۲۰۱۷ء)

الفاظ مقرر: جب یہ اعلان نبی نے کیا سب سے پہلے ابو بکر صدیق اٹھ کر کھڑے ہوئے اور کہنے لگے علی مبارک ہو، مبارک ہو، تو میرا بھی مولا ہے اور سارے مومنین کا مولا ہے۔ پھر اس کے بعد عمر ابن خطاب کھڑے ہوئے اور کہنے لگے علی مبارک ہو مبارک ہو تو میرا بھی مولا ہے سارے مومنوں کا مولا ہے۔ پتا چلا ولایتِ علی منانا رافضیت نہیں ہے صدیقیت اور فاروقیت ہے صدیقیت اور فاروقیت ہے۔

(یوم مباہلہ ویوم اعلان ولایت مولائے کائنات، مالیگاؤں، ۸/ستمبر ۲۰۱۷ء)

الفاظ مقرر: نبی نے اعلان کیا تبھی تو کوئی منائے گا۔ اعلان کرنا نبی کی سنت۔

(یوم مباہلہ ویوم اعلان ولایت مولائے کائنات، مالیگاؤں، ۸/ستمبر ۲۰۱۷ء)

الفاظ مقرر: اور ہم **یہ یوم مباہلہ منا کر، یا شب اعلانِ ولایتِ علی منا کر، ہم دو ثبوت دے رہے ہیں۔ ایک تو اپنے حلالی ہونے** کا، اور ایک تو اپنے ایمان والا ہونے کا۔ (نعرۂ حیدری! یا علی یا علی، نعرۂ حیدری! یا علی یا علی، نعرۂ رسالت! یا رسول اللہ۔ سبحان اللہ سبحان اللہ، حق ہے، سبحان اللہ

(یوم مباہلہ ویوم اعلان ولایت مولائے کائنات، مالیگاؤں، ۸/ستمبر ۲۰۱۷ء)

الجواب

سوالات مذکورہ میں درج باتیں اگر واقعی مقرر موصوف نے کہیں ہیں تو یقیناوہ ازروئے شرع سخت مجرم ہے۔ اس پر توبہ، تجدید ایمان، تجدید نکاح، تجدید بیعت لازم وضروری ہے۔ ہم پہلے یہاں بالترتیب سوالات کے جوابات پیش کرتے ہیں اور مقرر موصوف کی گمراہ کن عبارات کا شرعی حکم نقل کرتے ہیں ملاحظہ کریں:

(۱) انبیائے کرام کو اللہ پاک نے اپنے دین کی تبلیغ کے لئے مبعوث فرمایا نہ کہ حضرت علی کی ولایت کے ڈنکے بجانے کے لئے اس میں حضرات انبیائے کرام کی سراسر توہین ہے۔ اس میں انبیائے کرام کے مبعوث ہونے کے اصل مقصد کا انکار بھی لازم آرہا ہے۔ اور اس میں بظاہر انبیائے کرام پر حضرت علی کی برتری بھی ثابت ہو رہی ہے۔

حالانکہ اہل سنت وجماعت کا اس پر اجماع ہے کہ کسی غیر نبی کو نبی پر فضیلت دینا ہر گز ہر گز جائز نہیں ہے۔ بلکہ کفر ہے۔
حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:
"غیر نبی را بر نبی تفضیل کفر است اگر فضل جزئی مراد دارد نیز بے ادب وبد زبان وبدخواہ مسلم انان وبرہم زن دین وایمان ست وتجاوز از حد ظلم ست۔ غیر نبی کو نبی پر فضیلت دینا کفر ہے اگر جزئی فضیلت مراد ہو تو یہ بے ادبی، بد زبانی اور مسلمانوں کی بدخواہی اور دین وایمان کو جلانا ہے اور حد سے تجاوز کرنا ظلم ہے"

[فتاوی رضویہ قدیم، ۱۳۱/۶]

شارح بخاری ایک مقام پر دو شعروں سے متعلق حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:
"یہ اشعار کفریہ ہیں۔ اس میں تمام انبیائے کرام حتی کہ سید الانبیاء علیہ الصلاۃ والتسلیم پر حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی برتری ظاہر کی گئی ہے اور کسی بھی امتی کو کسی نبی سے افضل بتانا کفر ہے چہ جائیکہ تمام انبیاے کرام پر۔ اس قائل پر توبہ تجدید ایمان و تجدید نکاح لازم ہے۔"

[فتاوی شارح بخاری، ۵۶۴/۱]

علاوہ ازیں یہ عقیدہ و نظریہ اہل تشیع کا ہے۔ تحفہ اثنا عشریہ میں اہل تشیع کے ہفوات کے تحت چھٹا ہفوہ بیان کرتے ہوئے شاہ عبد العزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں:
ہفوہ چھٹا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء اور رسولوں کو حضرت علی کی ولایت کے لئے بھیجا تھا در پردہ تمام نبیوں کے ساتھ تھے اور ظاہراً محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو اس کا انکار کرے وہ کافر ہو جاتا ہے ابن طاؤس اور دوسروں نے اس کا ذکر کیا ہے۔" اس ہفوات کو بیان کرنے کے بعد ان ہفوات کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:
"یہ تمام ہفوات تمام شریعتوں کے مخالف، نصوص قرآنیہ کی تکذیب کرنے والے اور کفر وزندیقیت کی جڑ اور بنیاد ہیں۔"

[تحفہ اثناعشریہ، ۵۷۸]

الغرض: مقرر موصوف کی تقریر کے مذکورہ الفاظ سے ظاہری طور پر انبیائے کرام کی تنقیص شان اور غیر نبی کا ان سے برتر واعلیٰ اور افضل ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ اور اس بات کے کفر ہونے میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہئے۔ تو اس لحاظ سے مقرر موصوف پر شرعاً حکم کفر عائد ہوتا ہے۔

(۲) پنجتن کے نام کی برکتیں الگ البتہ یہ کہنا کہ ان کے نام کے بغیر اللہ کا نام بھی فائدہ نہ دے گا شریعت پر افتراء ہے۔ اللہ کا نام بالذات موثر ہے۔ فائدہ پہنچانے میں کسی نام کا محتاج نہیں ہے۔ اس طرح کا جملہ بلاشبہہ بارگاہ الٰہی کے تقدس کے خلاف ہے۔ نیز حضرت آدم بحیثیت نبی کسی غیر نبی کے وسیلہ کے محتاج نہیں ہیں۔ انداز بیان سے حضرت آدم علیہ السلام پر حضرت علی حضرت فاطمہ اور حسنین کریمین رضی اللہ عنھم کی فضیلت ظاہر ہو رہی ہے اور صاف پتہ چل رہا ہے کہ حضرت آدم معاذ اللہ ان چاروں نفوس قدسیہ کے محتاج ہیں۔ اور مقرر کا یہ جملہ بھی اس کی وضاحت کر رہا ہے "آدم نے جو وسیلہ لیا تھا یہ یوں ہی نہیں لیا تھا بلکہ اس وقت تو یہ پنجتن آدم کی ضرورت تھے" اور اس میں یقیناً حضرت آدم کی تنقیص شان

ظاہر ہے۔ اور کسی نبی کی توہین و تنقیص ازروئے شرع کفر ہے۔ حضور اعلیٰ حضرت ذخیرۃ العقبی کے حوالے سے فرماتے ہیں:

”قد اجمعت الامۃ علی ان الاستخفاف بنبینا صلی اللہ علیہ وسلم وبای نبی کان علیہم الصلوۃ والسلام کفر سوا فعلہ علی ذلك مستحلا ام فعلہ معتقد الحرمۃ ولیس بین العلماء خلاف فی ذلك ومن شك فی کفرہ وعذابہ کفر۔

یعنی بیشک تمام امت مرحومہ کا اجماع ہے کہ حضور انور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم خواہ کسی نبی کی تنقیص شان کرنے والا کافر ہے، خواہ اسے حلال جان کر اس کا مرتکب ہوا ہو یا حرام جان کر، بہر حال جمیع علما کے نزدیک کافر ہے اور جو اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر۔“ [فتاوی رضویہ قدیم، ۴۱/۶]

(۳) مقرر موصوف نے حضرت علی کو نہلانے میں نبی کے ہاتھ کے ساتھ خدا کے ہاتھ کا ذکر کیا اور آیت تشابہ کو متدل بناتے ہوئے آیت کو ظاہری معنی پر محمول کیا ہے جس پر لفظ حقیقت صاف دال ہے۔ حالانکہ آیات تشابہ کے ظاہری معانی مراد لینا بالکل روا نہیں ہیں اور وہ بھی ایسے معانی جن سے خدا کی ذات پاک و منزہ ہے بلاشبہ کھلی گمراہی بلکہ کفر ہے۔

حضور سیدی اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”ارشاد: جس آیت کو اس کے ظاہر معنی پر حمل کرنے (یعنی ظاہری معنی مراد لینے) سے کوئی عقلی اِستِحالہ (یعنی اس کا عقلا محال ہونا) لازم آتا ہو وہ "تشابہ" ہے۔ ید اللہِ فوق ایدیہم

ترجمہ کنز الایمان: ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے، کے معنی ظاہر اگر لیں تو اس کا ہاتھ مانا اور جب ہاتھ ہوا تو جسم بھی ہوا اور ہر جسم مرکب اور مرکب اپنے وجود میں اپنے ان اجزا کا محتاج ہے جن سے وہ مرکب ہے، جب تک وہ موجود نہ ہولیں یہ موجود نہیں ہو سکتا تو خدا کا محتاج ہونا لازم آیا، اور ہر محتاج حادِث اور کوئی حادث قدیم نہیں اور جو قدیم نہ ہو خدا نہیں ہو سکتا تو سرے سے الوہیت ہی کا انکار ہو گیا، اس لیے ثابت ہوا کہ "" محکم نہیں تشابہ ہے“ [الملفوظ: حصہ ۴ ص ۵۱۳]

فتاوی رضویہ میں ہے:

”اکثر نے فرمایا جب یہ ظاہری معنی قطعا مقصود نہیں اور تاویلی مطلب متعین و محدود نہیں تو ہم اپنی طرف سے کیا کہیں، یہی بہتر کہ اس کا علم اللہ پر چھوڑیں ہمیں ہمارے رب نے آیاتِ تشابہات کے پیچھے پڑنے سے منع فرمایا اور ان کی تعیین مراد میں خوض کرنے کو گمراہی بتایا“ [فتاوی رضویہ جدید، ۱۲۳/۲۹]

حاشیہ طحطاوی میں ہے: ”قال للہ ید و رجل کالعباد کافر“ کہا کہ اللہ کے ہاتھ اور پیر ہیں بندوں کی طرح تو وہ کافر ہے۔

[حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، فصل فی بیان احق الامامۃ،]

مفتی حبیب اللہ نعیمی علیہ الرحمہ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

”اہل سنت و جماعت کے عقیدہ میں حق تعالیٰ جسم و شکل و صورت اور ہاتھ پاؤں آنکھ ناک کان منہ سارے اعضاء و جوارح سے پاک و منزہ ہے۔ جو ان میں سے کسی چیز کو بروجہ جسم و تشبیہ ثابت کرے گا وہ فرقۂ مجسمہ میں داخل ہو جائے گا۔ اور اہل سنت و جماعت سے خارج ہو جائے گا۔ بلکہ کافر و مرتد ہو جائے گا۔ فتاوی عالمگیری مطبوعہ کلکتہ جلد ثانی ص ۲۶۳ میں ہے:

یکفر اذا وصف اللہ بما لا یلیق بہ

اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو ایسے وصف کے ساتھ متصف کرے جو اس کی شان کے لائق نہیں اس کی تکفیر کی جائے گا۔"

[فتاوی حبیب الفتاوی، ج ۱ ص ۱۷]

(۴) مقرر موصوف کے یہ جملے سخت قبیح و شنیع ہیں۔ حضرت جبریل کو بھکاری کہنا جبریل جیسے مقدس فرشتہ کی ہتک شان اور توہین ہے۔ اور فرشتوں کی تنقیص شان کا مرتکب عند الفقہاء کافر ہے۔

شارح بخاری فتاوی عالمگیری کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"ملائکہ کی شان میں ادنی گستاخی بھی کفر ہے۔ فتاوی ہندیہ میں ہے:

"قال ابوذر الاستخفاف بالملك كفر" فرمایا حضرت ابوذر نے کہ فرشتہ کی توہین کفر ہے۔

[فتاوی شارح بخاری، ۱/۲۶۲]

(۵) مقرر کے ان جملوں سے حضرت فاطمہ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تقدم ثابت ہو رہا ہے، حالانکہ یہ سراسر گمراہی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے تن ہیں۔ ذاتی اعتبار سے سب سے اول ہیں۔ جیسا کہ حدیث پاک:

"کنت نبیا وآدم بین الماء والطین" اس پر شاہد ہے۔ اور جسمانی اعتبار سے بھی فاطمہ سے اول ہیں۔ کیوں کہ آپ فاطمہ کے والد ہیں۔ اس کا ظاہری مفہوم منجر الی الکفر ہے۔ تاویل بعید سے گنجائش بھی نکال لی جائے تب بھی مقرر موصوف عند الفقہاء توبہ، تجدید ایمان وغیرہ کے حکم سے نہیں بچ سکیں گے۔ شارح بخاری فرماتے ہیں:

کلمات اور افعال دو قسم کے ہیں ایک وہ جو کفر میں متعین ہیں جن میں کوئی پہلو قریب یا بعید اسلام کا نہیں۔ دوسرے جن کا ظاہر کفر اگرچہ کسی تاویل بعید سے وہ کفر نہ ہو۔ جمہور فقہاء ثانی صورت پر حکم کفر دیتے ہیں ....اسی طرح جو افعال یا اقوال جمہور فقہاء کے نزدیک کفر ہیں ان کے قائل اور مرتکب پر بھی توبہ تجدید ایمان و نکاح کا حکم ہے۔

[فتاوی شارح بخاری:، ۲/۵۴۵]

(۶) معاذاللہ، مقرر کے ان جملوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیائے کرام کی بارگاہوں کا تقدس مجروح ہوتا نظر آرہا ہے۔ نبی کریم اور دیگر انبیائے کرام کے لئے اس طرح کے توہین آمیز جملے گستاخانہ انداز کے ساتھ بیان کرنا کسی مومن کی شان سے بعید ہے۔ کسی نبی کو فقیر محتاج قلاش بھکاری ہاتھ پھیلانے والا کہنا بلاشبہہ توہین ہے اس میں کسی طرح کی تاویل کفر کو فروغ دینے کے مترادف ہوگی۔ نبی کے لئے اس طرح کے نازیبا کلمات کے تعلق سے حضور اعلیٰ حضرت نسیم الریاض کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

"الانبیا علیهم الصلوة والسلام لایوصفون بالفقر ولایجوز ان یقال لنبینا صلی الله علیه وسلم فقیر"

(تمام انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کو فقر کے ساتھ متصف نہیں کیا جاسکتا، ہمارے نبی وآقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فقیر کہنا جائز نہیں"

مزید اس کا حکم بیان فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اقول وباللہ التوفیق، توفیق جامع و تحقیق لامع یہ ہے کہ ان اوصاف کا اطلاق بروجہ تقریر و اثبات خواہ حکم قصدی میں ہو یا

وصف عنوانی میں اگر قول قائل کے سیاق یاسباق یا سوق یامساق سے طرز تنقیص ظاہر وثابت ہو یقینا کفر ہے، اور اگر ایسا نہیں اور قائل جاہل ہے اور اس سے صدور نادر ہوا اور وہ اس پر غیر مصر تو ہدایت وتنبیہ وزجر وتہدید کریں۔ اور حاکم شرع اس کے مناسب حال تعزیر دے کہ وہ ضرور سزاوار سزا ہے۔ اور اگر قائل مدعی علم ہے یا ایسے کلمات کا عادی یا بعد تنبیہ بھی ان پر مصر تو مریض القلب بددین گمراہ ومستحق عذاب شدید ہے، سلطان اسلام اسے قتل کرے گا اور زمین کو اس کی ہستی ناپاک سے پاک اور عام مسلمانوں کو اس کی صحبت ومجالست سے احتراز لازم اور اسے واعظ یا امام نماز بنانا اس کا وعظ سننا اس کے پیچھے نماز ممنوع وحرام"

[فتاوی رضویہ قدیم، ۱۲۷/۶، ۱۲۶]

(۷) اس روایت میں مجموعی طور پر جھوٹ افترا اور حضرت مریم کی توہین کے ساتھ حضرت عیسی کی توہین بھی لازم آرہی ہے۔ مقرر موصوف کا یہ کہنا کہ "اللہ کے منادی نے اعلان کیا" یہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ اور اللہ پاک پر افترا ہے۔ نیز یہ جملہ "آج تک تو مسجد میں رہی لیکن اب بچے کی ولادت کا وقت ہے خبر دار مسجدوں میں بچے پیدا نہیں ہوتے بچے کی پیدائش کا وقت ہے" پیغمبر کی پیدائش پر مسجد سے یہ کہہ کر نکالنا کہ مسجد میں بچے پیدا نہیں ہوتے اس کا ظاہری مفہوم نبی کی توہین کا موجب ہے۔ علی کی ولادت کے وقت کعبہ میں داخل ہونے کا حکم دینا اور حضرت عیسی پیغمبر کی ولادت کے وقت مسجد سے نکالا جانا کہ مسجد میں بچے پیدا نہیں ہوتے کیا اس میں حضرت علی کی حضرت عیسی پر برتری نہیں ہے؟ بلاشبہ ہے۔

یہ پوری روایت حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی توہین پر مشتمل ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ یہ روایت شیعہ نظریات سے ماخوذ ہے۔ شیعہ مذہب میں حضرت عیسی پر حضرت علی کی برتری وافضلیت ثابت کرنے کے لئے حضرت حلیمہ کے حوالہ سے ایک روایت بیان کی جاتی ہے جو قدرے طویل ہے لیکن یہاں بالضرورت نقل کی جاتی ہے۔ ملاحظہ کریں تحفہ اثنا عشریہ میں شاہ عبدالعزیز رقم طراز ہیں:

"حلیمہ نے کہا کہ حجاج ایک دوسرا نکتہ بھی سن (حضرت عیسی پر حضرت علی کی برتری سے متعلق) کہ مریم بنت عمران کو جب دردزہ لاحق ہوا تو وہ بیت المقدس میں تھیں۔ حکم الٰہی پہنچا کہ فوراً جنگل کا رخ کر اور وہاں کسی خشک کھجور کے درخت کے نیچے وضع حمل کر تا کہ تیرے نفاس کی گندگی سے بیت المقدس ناپاک نہ ہو حالانکہ علی کی والدہ کو جو بنت اسد تھیں جب دردزہ لاحق ہوا تو ان کو وحی الٰہی پہنچی کہ کعبہ میں جا اور میرے گھر کو اس مبارک بچے کی پیدائش سے شرف یاب کر۔ اب ذرا انصاف کر ان میں کون سا بچہ افضل واشرف ہے؟ حجاج نے حلیمہ کے حق میں دعائے خیر کی اور عزت واحترام سے ان کو رخصت کیا۔"[تحفہ اثناء عشریہ: مترجم، ۱۱۳] اس روایت پر تبصرہ فرماتے ہوئے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رقم طراز ہیں:

"حضرت عیسیٰ کی ولادت کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا گیا وہ محض لچر اور تاریخ کے لحاظ سے سراسر بے اصل ہے۔

کیوں کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت میں بہت بڑا اختلاف ہے بعض کے نزدیک فلسطین میں ہوئی بعض مصر میں مانتے ہیں اور بعض دمشق میں۔ مگر مشہور قول یہ ہے کہ آپ کی ولادت بیت اللحم میں ہوئی۔ لیکن کسی مورخ نے یہ نہیں لکھا کہ حضرت مریم کو بیت المقدس میں دردزہ لاحق ہوا۔ اور اگر بالفرض ایسا ہوا بھی تو یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ ان کو مسجد سے نکالا گیا بلکہ عبارت

قرآنی صاف بتاتی ہے کہ ان کو دردزہ کی وجہ سے سخت بے چینی لاحق ہوئی انہوں نے چاہاکہ کسی چیز سے ٹیکالیں اس لئے ویرانے کی طرف نکل کھڑی ہوئیں چوں کہ بغیرباپ کے حضرت عیسیٰ کاعلوق قرارپایاتھا۔اس لئے شرماتی تھیں لامحالہ جنگل کاراستہ لیاایسی حالت میں جنگل کی طرف جانااوربغیرکسی کی مدد کے وضع حمل کرناچوں کہ بہت دشوارتھااس لئے بے اختیار موت کی آرزو کرنے لگیں جیساکہ فرمایا:

فاجاء ھاالمخاض الیٰ جذع النخلۃ قالت یلیتی مت قبل ھٰذاو کنت نسیامنسیا۔

اب یہ جو کہاہے کہ فاطمہ بنت اسد کووحی آئی کہ خانہ کعبہ میں جاکروضع حمل کریں یہ درحقیقت ایک بے لطف جھوٹ ہے۔ اس لئے فرق اسلامیہ میں سے کوئی فرقہ ان کی نبوت کا قائل نہیں۔پھرحجاج نے اس کوکیسے تسلیم کیایہ قابل تعجب ہے!

مشہورروایت میں یوں آیاہے کہ ایام جاہلیت میں یہ معمول تھاکہ رجب کی پندرھویں تاریخ کعبہ کے دروازے کھولتے اوراس مبارک گھرکی زیارت کے لئے اندرجاتے اورحضرت عیسی کی پیدائش بھی اسی روزہوئی تھی۔اس لئے اس دن کویوم الاستفتاح یاروزمریم کہتے ہیں .....یہ رسم تھی کہ اس دن سے ایک دوروزپہلے عورتیں زیارت کعبہ کرتیں۔اتفاق سے ایک انہیں عورتوں کی زیارت کے ایام میں فاطمہ بنت اسدنے بھی زیارت کاارادہ کیااگرچہ مدت حمل پوری ہوچکی تھی چوں کہ یہ دن سال میں ایک ہی مرتبہ آتاتھااس لئے ایسے دنوں میں حرکت دشوارہونے کے باوجودرنج ومشقت سے خودکوکعبہ کے دروازے تک پہنچایا۔اس زمانہ میں کعبہ کادروازہ زمین سے قدآدم اونچاتھااب بھی اگرچہ ایساہی ہے مگراس زمانے میں سیڑھی کازینہ بھی تھااب تولکڑی کازینہ بچوں کی گاڑی کی شکل کابنالیاہے بوقت ضرورت اس کودہلیزکعبہ سے لگادیتے ہیں۔چنانچہ اس سخت حرکت سے دردزہ اٹھ کھڑاہواحضرت فاطمہ نے سوچاکچھ دیربعدجاتارہے گامیں زیارت کعبہ سے کیوں محروم ہوں۔

جیسے ہی وہ دروازے میں داخل ہوئیں درد کی شدت نے طول کھینچااورپھرحضرت علی پیداہوئے....درد کی شدت اوراس کی مدت کھچ جانے سے اورکچھ مایوسی پیداہونے کے سبب ابوطالب بطلب شفاان کوکعبہ میں لے گئے۔اللہ تعالیٰ نے فضل فرمادیاکہ جلدولادت ہوگئی.....خلاصہ کلام یہ کہ اگرخانہ کعبہ میں پیداہونے سے حضرت امیرحضرت عیسی سے افضل ہوجائیں تووہ خودپیغمبرعلیہ السلام سے بھی افضل ہوں گے۔حالانکہ شیعہ وسنی ہردوفریق میں سے کوئی اس کاقائل نہیں۔

اورصحیح تاریخوں میں ایساثابت ہے کہ حکیم بن حزام بن خویلدام المومنین حضرت خدیجہ کے بھتیجے بھی کعبہ میں پیداہوئے۔

(مسلم شریف میں ہے:''قال مسلم بن الحجاج ولدحکیم بن حزامفی جوف الکعبہ''

یعنی حکیم بن حزام کعبہ کے اندرپیداہوئے۔مسلم شریف،کتاب البیوع،باب الصدق فی البیع والبیان۔نعیمی غفرلہ)

توچاہئے کہ وہ بھی حضرت عیسیٰ بلکہ تمام پیغمبروں سے افضل ہوں حالانکہ اس کی برائی کسی پرپوشیدہ نہیں۔''

[تحفہ اثناء عشریہ مترجم، ۱۲۰]

(۸) مقررموصوف کواہل تشیع کی روایات اوران کے باطل وگمراہ کن عقائدونظریات کافی حدتک ازبرہیں۔

مقررموصوف کاعلی کونفس رسول قراردینااوریہ کہناکہ ''گویاکہ اللہ انفسنا کہہ کربتارہاہے کہ قالب تودوہیں اورروح ایک ہے اس دوقالب کانام ایک کاعلی اوردوسرے کامحمدہے اوراس ایک روح کانام علی مرتضیٰ ہے''گمراہ کن جملہ ہے۔

اور اس جملہ سے کفریہ عقیدہ حلول کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے۔ یہ عقیدہ و نظریہ بھی اہل تشیع کا ہے۔
حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اس شیعہ عقیدہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
"شیعہ اس آیت سے تمسک اس طرح کرتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری:

فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر نکلے اور علی فاطمہ حسن اور حسین کو اپنے ہمراہ لیا تو معلوم ہوا کہ ابناء سے مراد حسن حسین اور انفس سے مراد حضرت امیر ہیں۔ جب حضرت امیر نفس رسول ٹھہرے اور نفس کے حقیقی معنی تو ظاہر ہے مراد لینا محال ہے۔ لامحالہ مساوی کے معنی ہوں گے اب جو پیغمبر زمان کے مساوی ہو وہ ضرور ہے کہ دوسروں سے افضل واولیٰ بالتصرف ہو گا اس لئے کہ افضل واولیٰ بالتصرف کا مساوی بھی افضل واولیٰ بالتصرف ہو گا تو وہ امام ہو گا کیوں کہ امام وہی تو ہے جو افضل واولیٰ بالتصرف ہو۔" [تحفہ اثناء عشریہ، مترجم، ۳۲۳]

حضرت شاہ صاحب نے اس کے جواب میں تفصیلی بحث فرمائی ہے ہم بس مطلوبہ عبارات نقل کرنے پر اکتفا کریں گے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"اور شیعہ کے اس تمسک میں بہت سی قابل گرفت باتیں ہیں۔ اول یہ کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ انفسنا سے مراد حضرت امیر ہیں بلکہ خود پیغمبر علیہ السلام بنفس نفیس مراد ہیں۔ (اس پر شاہ صاحب نے کافی دلیل دیں اور پھر فرمایا) پھر یہ بھی ہے کہ اگر جناب پیغمبر علیہ السلام کی جانب انفسنا سے مراد حضرت امیر لیں تو کفار کی طرف انفسکم کا مصداق کس کو بنائیں گے؟ حالانکہ ندع میں وہ بھی شریک ہیں۔ یہ معنی ہیں نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اور ان کے بیٹوں کو بلائیں جب کہ آپ تعالوا کہہ چکے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت امیر ابنائنا میں داخل ہیں۔ جس طرح حسنین اس میں حکماً داخل ہوئے گو حقیقۃً وہ بھی داخل نہیں اور عرف میں داماد کو بھی بلا شبہہ بیٹا ہی شمار کرتے ہیں۔ اور نفس بمعنی قریب اور شریک نسب دین اور ملت بھی آیا ہے..... تو اگر آپ کو اپنے نفس سے تعبیر کیا تو یہ کیا بعید بات ہے اس سے مساوات کب لازم آتی ہے۔ جس طرح ان آیات میں نہیں آتی۔ دوسرے یہ بھی ہے کہ مساوات اگر تمام صفات میں مراد لیں تو لازم آتا ہے کہ حضرت امیر تمام خصوصیات پیغمبری میں آپ کے ساتھ شریک ہوں مثلاً نبوت، رسالت، خاتمیت بعثت تمام مخلوق کی طرف، چار بیویوں سے زائد نکاح کا جائز ہونا، قیامت کے روز بلند درجہ حاصل ہونا شفاعت کبریٰ نصیب ہونا مقام محمود ملنا، وحی کا اترنا وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ اس میں شرکت بالاجماع باطل ہے اور اگر بعض صفات میں مساوات مراد لیں تو اس سے مقصد حل نہیں ہوتا کیوں کہ افضل واولیٰ بالتصرف کے ساتھ بعض صفات میں مساوات افضل واولیٰ بالتصرف نہیں بناتی۔ یہ بالکل ظاہر ہے۔"

[تحفہ اثناء عشریہ، مترجم، ۳۲۵،۳۲۴]

(۹) یہ نظریہ بھی رفض زدہ اور کفر و ضلالت کی طرف منجر ہے۔ فرقہ خمسیہ کے بارے میں شاہ صاحب تحفہ اثناعشریہ میں لکھتے ہیں: "یہ کہتے ہیں کہ پانچوں در حقیقت شخص واحد ہیں کہ ایک ہی روح سب میں حلول کئے ہوئے ہے"

[تحفہ اثناء عشریہ مترجم، ۱۹]

(۱۰) مقرر کی درج بالا ہفوات و مزخرفات یقیناً شیعہ مذہب کی طرف مائل ہونے کی گواہی دے رہی ہیں۔ عید غدیر خم کبھی نہ صحابہ نے منائی نہ کسی تابعی نے نہ کسی امام مجتہد نے نہ کسی عالم وفقیہ نے اور نہ کہیں اہل سنت مناتے ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ یہ عید غدیر خم اہل تشیع کا شعار ہے۔ اہل سنت کا نہیں۔ یوم غدیر اہل تشیع کی عید اکبر ہے۔ اوراس کو وہ خاص اس لئے مناتے ہیں کہ ان کے مطابق اس دن حضرت علی کو خلافت بلا فصل ملی تھی بلکہ امامت کے بھی قائل ہیں۔ نیز یہ بھی مشہور ہے کہ اس دن چوں کہ حضرت عثمان غنی کی شہادت ہوئی تھی اس لئے وہ اس دن جشن مناتے ہیں۔ یہ ساری وجوہات ہوسکتی ہیں البتہ اصل وجہ حضرت علی کی خلافت بلا فصل اور امامت ہے۔ اس عید غدیر کا بانی عراقی شیعہ حاکم معزالدین احمد بن ابویہ دیلمی ہے۔ سب سے پہلے اسی نے رافضیوں کے ساتھ ۱۸/ ذی الحجہ ۳۵۲ھ کو بغداد میں عید غدیر منائی۔ علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے:

''ثم دخلت سنة ثنتين وخمسين وثلاثمائة...... وفي ثامن عشر ذي الحجة منها أمر معز الدولة بإظهار الزينة ببغداد وأن تفتح الأسواق بالليل كما في الأعياد، وأن تضرب الدبادب والبوقات، وأن تشعل النيران بأبواب الأمراء وعند الشرط، فرحا بعيد الغدير- غدير خم- فكان وقتا عجيبا ويوما مشهودا، وبدعة ظاهرة منكرة''

سن ۳۵۲ ہجری ۱۸/ ذی الحجہ کو معزالدولہ نے شہر بغداد سجانے اور رات کو عیدوں کی راتوں کی طرح بازار کھولنے کا حکم دیا۔ اور باجے اور بگل بجاگے گئے۔ اور حکام کے دروازوں اور فوجیوں کے پاس چراغاں کیا گیا۔ عید غدیر کی خوشی میں تو وہ وقت عجیب اور دیکھنے کا دن تھا اور ظاہری بری بدعت کا دن تھا۔''

[البداية والنهاية، لابن الكثير ۱۵ /۲۶۱]

امام ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:۔

''وفيها في الثامن عشر ذي الحجة، أمر معز الدولة بإظهار الزينة في البلد، وأشعلت النيران بمجلس الشرطة، وأظهر الفرح، وفتحت الأسواق بالليل، كما يفعل ليالي الأعياد فعل ذلك فرحا بعيد الغدير، يعني غدير خم، وضربت الدبادب والبوقات، وكان يوما مشهودا''

اور سن ۳۵۲ ہجری ۱۸/ ذی الحجہ کو معزالدولہ نے شہر سجانے کا حکم دیا۔ اور درباریوں کی مجلس میں چراغاں کیا گیا اور خوشی کا اظہار کیا گیا اور بازار کھولے گئے رات کو جس طرح عیدوں کی راتوں کو کھولے جاتے، خوب خوشی منائی گئی عید غدیم خم میں۔ اور باجے اور بگل بجائے گئے اور وہ دیکھنے کا دن تھا۔'' [الكامل في التاريخ، ۷/ ۲۴۶]

امام ذہبی لکھتے ہیں:

''سنة اثنتين وخمسين وثلاث مأة وفيها يوم ثامن عشر ذي الحجة، عملت الرّافضة عيد الغدير، غدير خمّ، ودقت الكوسات وصلّوا بالصحراء صلاة العيد''

یعنی سن ۳۵۲ ہجری ۱۸/ذی الحجہ کو روافض (ابتداء میں معزالدین کا ذکر ہے) نے عید غدیر منائی۔ ڈھول بجائے گئے۔ اور میدان میں نماز عید پڑھی۔'' [العبر في خبر من غبر، ۲/ ۹۰]

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں:

''عید غدیر نکال بیٹھے ہیں، ذی الحجہ کی اٹھارویں تاریخ اس کو مناتے ہیں، عید الفطر و عید الاضحیٰ ہر دو پر اس کو فضیلت دیتے ہیں اس لئے عید اکبر اس کا نام رکھا ہے۔ یہ حکم بھی شریعت کے صریح مخالف ہے۔[تحفہ اثناء عشریہ، ۳۹۰]

الحاصل:۔ عید غدیر اہل تشیع کا مذہبی شعار ہے اور کسی کافر قوم کے مذہبی شعار کو اپنانا یقینا تشبہ کے درجہ میں آتا ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''من تشبہ بقوم فھومنھم''

جس نے کسی قوم سے مشابہت کی وہ انہیں میں سے ہے۔''[سنن ابوداؤد، کتاب اللباس، ۲۰۳/۲]

البتہ اگر ان کے عقائد و نظریات کو مان کر ہے تو تشبہ التزامی ہے۔ اور اگر ان کے عقائد سے تو اتفاق نہیں بلکہ اپنے طور پر ہی منانا ہے لیکن ان کا مذہبی شعار ہونے کے سبب تشبہ پایا جارہا ہے تو تشبہ لزومی ہے۔ پہلی صورت میں کفر ہے کیوں کہ تشبہ کے سبب کفریہ عقائد پر رضا شامل ہے۔ اور دوسری صورت میں کم از کم تشبہ کے سبب حرمت و ممانعت ضرور ہے۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: ''تشبہ دو وجہ پر ہے: التزامی و لزومی۔

التزامی یہ ہے کہ یہ شخص کسی قوم کے طرز و وضع خاص اسی قصد سے اختیار کرے کہ ان کی سی صورت بنائے ان سے مشابہت حاصل کرے حقیقۃً تشبہ اسی کا نام ہے..... اور لزومی یہ کہ اس کا قصد تو مشابہت کا نہیں مگر وہ وضع اس قوم کا شعار خاص ہو رہی ہے کہ خواہی نخواہی مشابہت پیدا ہوگی..... اس قوم کو محبوب و مرضی جان کر اُن سے مشابہت پسند کرے یہ بات اگر مبتدع کے ساتھ ہو بدعت اور کفّار کے ساتھ معاذاللہ کفر''[فتاوی رضویہ جدید، ۵۳۰/۲۴]

مزید فرماتے ہیں:

''نہ تو انہیں اچھا جانتا ہے نہ کوئی ضرورت شرعیہ اس پر حامل ہے بلکہ کسی نفع دنیوی کے لئے یا یوہیں بطور ہزل واستہزاء اس کا مرتکب ہوا تو حرام و ممنوع ہونے میں شک نہیں۔ اور اگر وہ وضع ان کفار کا مذہبی دینی شعار ہے جیسے زنّار، قشقہ، چُٹیا، چلیپا، تو علماء نے اس صورت میں بھی حکم کفر دیا کما سمعت اٰنفا۔ اور فی الواقع صورت استہزاء میں حکم کفر ظاہر ہے کما لایخفی۔

اور لزومی میں بھی حکم ممانعت ہے جبکہ اکراہ وغیرہ مجبوریاں نہ ہوں جیسے انگریڑی منڈا، انگریزی ٹوپی، جاکٹ، پتلون، اُلٹا پردہ، اگرچہ یہ چیزیں کفار کی مذہبی نہیں مگر آخر شعار ہیں تو ان سے بچنا واجب اور ارتکاب گناہ''

[فتاوی رضویہ جدید، ۵۳۲/۲۴]

حضور اعلیٰ حضرت ملا علی قاری کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''انا ممنوعون من التشبیہ بالکفرۃ واھل البدعۃ المنکرۃ فی شعارھم'' ''ہمیں کافروں اور منکر بدعات کے مرتکب لوگوں کے شعار کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے۔''[فتاوی رضویہ جدید، ۵۳۳/۲۴]

مقرر موصوف کا عید غدیر وغیرہ منانے پر یہ کہنا کہ ہم اپنے حلالی ہونے کا اور ایمان والا ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اہل سنت کے بے شمار علما و فقہا اولیاء کو گالی دینے کے مترادف ہے۔ اور یہ ایک کھلی گمراہی بلکہ موجب کفر ہے۔

الغرض: سوالات میں مندرج عبارات میں اکثر عبارات رفض زدہ ہیں۔ اور سخت ضلالت و کفر پر مشتمل ہیں۔ اور دو عبارات میں تاویل بعید کا احتمال ہے لیکن اس کے ظاہری پہلو پر نظر کرتے ہوئے اسے بھی کفر مانا جائے گا جیسا کہ ہم پیچھے لکھ آئے ہیں

لہٰذا مقرر موصوف پر لازم ہے کہ توبہ، تجدید ایمان، تجدید نکاح اور تجدید بیعت کرے۔ اور جس طرح ان جملوں کو استعمال کیاہے اسی طور توبہ بھی کرے۔ مطلب اگر اعلانیہ ان جملوں کا ارتکاب کیاہے ظاہر ہے تقریر ہے تو اعلانیہ ہی کیا ہو گا تو اسی طرح اعلانیہ توبہ لازم ہے۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"اور جس طرح اس مذہب خبیث کا اعلان کیاہے ویسے ہی توبہ و رجوع کا صاف اعلان کریں کہ توبہ نہاں کی نہاں ہے اور عیاں کی عیاں۔ حضور پر نور سید یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اذا عملت سیئة فاحدث عندها توبة السر بالسر والعلانیة بالعلانیة،

(جب تو کوئی گناہ کرے تو فورا توبہ کر، پوشیدہ کی پوشیدہ اور ظاہر کی ظاہر)..... اس سب کے بعد اپنی عورتوں سے تجدید نکاح کریں کہ کفر خلافی کا حکم یہی ہے، علامہ حسن شرنبلالی شرح وہانیہ پھر علامہ علائی شرح تنویر میں فرماتے ہیں: مایکون کفرا اتفاقا یبطل العمل والنکاح واولادہ اولاد زنی وما فیه خلاف یؤمر بالاستغفار والتوبة وتجدید النکاح۔

جو بالاتفاق کفر ہو اس سے اعمال، نکاح باطل ہو جاتے ہیں تمام اولاد، اولاد زنا قرار پاجاتی ہے اور جس میں اختلاف ہو وہاں استغفار، توبہ اور تجدید نکاح کروایا جائے گا۔" [فتاوی رضویہ قدیم،۲۷۲/۶]

اور جب تک زید توبہ، تجدید ایمان وغیرہ نہ کرلے تب تک لوگ اس سے مذہبی سماجی ہر طرح کا بائیکاٹ رکھیں۔ اسے کسی جلسہ میں مدعو نہ کریں اس کی تقریر نہ سنیں۔ اللہ فرماتاہے:

''وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ''

(اور جو کہیں تجھے شیطان بھلادے تو یاد آنے پر ظالموں کے پاس نہ بیٹھ۔)[کنز الایمان پارہ ۲۸، سورہ انعام آیت ۶۸]

علاوہ ازیں خطیب موصوف کو مشورہ دیں کہ اہل تشیع کی کتابوں کا مطالعہ ہر گز ہر گز نہ کرے اہل سنت کی تصانیف جلیلہ مطالعہ میں رکھے تاکہ خود بھی گمراہی سے محفوظ رہے اور عوام کو بھی محفوظ رکھ سکے۔

تنبیہ: مقرر موصوف کی تقریروں کے جو ویڈیو اور آڈیو مجھے بھیجے گئے ان میں سے جس قدر بھی سن سکا اس سے یہ اندازہ لگایا کہ مقرر موصوف کی تقریریں رافضیت زدہ ،ہوتی ہیں ۔ شیعی روایات کی اس قدر بھرمار ہے کہ کہیں کہیں یہ اندازہ لگا پانا مشکل ہے کہ مقرر موصوف اہل سنت سے ہیں یا کسی غیر مذہب سے۔

موضوع و من گھڑت واقعات وروایات یا متنازعہ فیہا مسائل مقرر موصوف کی تقریر کا اصل چربہ ہے۔ علما و فقہا کے اجماع واتفاق سے ہٹ کر موصوف اختراعی باتیں بیان کرنے میں جری معلوم ہوئے۔ اور اس طرح کی تقریریں یقینا مسلمانوں کے ایمان کے لئے خطرہ ہیں۔ اس لئے مسلمانان اہل سنت پر لازم ہے کہ اس طرح کی تقریریں نہ سنیں اور نہ کسی کو سننے دیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب، وھو یھدی الی الحق والصراط المستقیم

تصدیقات

تصدیق فتوی بقلم مفتی جامعہ نعیمیہ مرادآباد
مفتی محمد سلیمان صاحب دامت معالیھم جامعہ نعیمیہ مرادآباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

زید سے متعلق جو سوالات کئے گئے اوران کے تفصیلی وتحقیقی جوابات حضرت مفتی محمد ذوالفقار نعیمی فاضل جامعہ نعیمیہ زید علمہ نے دئے وہ قرآن وحدیث واقوال فقہاء کی روشنی میں اتم ہیں۔اور براہین ودلائل سے مملوومزین ہیں۔اہل حق پر لازم ہے کہ وہ عمل کریں اور زید پلید کو جب تک توبہ وتجدید ایمان وتجدید نکاح وتجدید بیعت نہ کرے اپنی محافل دینی ودنیاوی سے دور رکھیں ۔اور خود بھی دور رہیں ۔اور فرمان رسول علیہ الصلاۃ والسلام پر عمل پیرا رہیں ۔ایاکم وایاھم لایضلونکم ولایفتنونکم کے مصداق بنیں ۔کہ اسی میں سعادت دارین ہے اور الحب للہ والبغض فی اللہ کو اپنائیں اور مسلک اہل سنت (مسلک اعلیٰ حضرت) پر گامزن رہیں۔فالاجوبۃ کلھاصحیحۃ والمجیب الفاضل مصیب ومثاب

محمد سلیمان نعیمی برکاتی

خادم الافتاءوالتدریس جامعہ نعیمیہ دیوان بازار مرادآباد یوپی

مورخہ ۱۵ر صفر المظفر ۱۴۳۹ھ مطابق ۵ر نومبر ۲۰۱۷ء (بروز یکشنبہ)

(مہر،جامعہ نعیمیہ مرادآباد)

علامہ ہاشم صاحب قبلہ پروفیسر معقولات جامعہ نعیمیہ مرادآباد کی تصدیق

(دستخط) ہاشم نعیمی

غدیر خم کے حوالے سے ایک خطیب کے چند گمراہ کن نظریات کا شرعی حکم

فتوی ۷ مسئولہ: محمد عبدالعزیز خان قادری،ناگپور۔۲ر محرم الحرام ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین مسئلہ مندرجہ کے متعلق

کہ ناگپور کے تاج آباد شریف درگاہ کے سامنے میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔اور اس جلسے میں جو مقرر خصوصی مدعو کئے گئے شاید وہ اہل تشیع حضرات کے عقائدِ باطلہ سے بہت متاثر تھے۔تو حضرت موصوف نے یوم علی رضی اللہ عنہ کے موضوع پر اہلسنت و الجماعت پر طعن لعن کرتے ہوئے تمام مجمع کو یوم غدیر منانے کی نصیحت دے ڈالی۔نیز غدیر خم کا واقعہ بیان کیا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ اٹھا کر کہا تھا کہ جس کا میں مولیٰ اس کا علی مولیٰ۔

اور غلط بیانی کرتے ہوئے کہا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو اس روز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں خلافت دے دی تھی اور پھر بات بدلتے ہوئے کہا کہ ولایت عطا فرمائی تھی۔

اور انھوں نے لفظ ''مولیٰ'' کا معنی خلیفہ کے کئے۔جبکہ مشکوۃ شریف میں کتاب الکرامات میں حضرت سفینہ کے متعلق جو واقعہ

ہوا کہ وہ افریقہ کے جنگل میں اپنے وقف کے ساتھ کھو گئے اور اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ جنگل کا شیر سامنے آگیا اور جب شیر آیا تو آپ ڈرے نہیں بھاگے نہیں بلکہ شیر کی طرح اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور جب شیر ان پر حملہ آور ہوا تو انہوں نے کہا "یا ابا الحارث انا مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

تو اس متن کا ترجمہ تمام اہلسنت کی شرح میں کہیں بھی خلیفہ یا ولایت نہیں ہیں۔ اور عید غدیر خاص حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے شہادت کے دن منائی جاتی ہے۔ لہٰذا آپ شرعی رہنمائی فرمائیں کہ

(1) اہلسنت والجماعت کا یومِ عیدِ غدیر منانا کیسا؟

(2) کیا غدیر خم کا واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت ملنے پر دلالت کرتا ہے؟

(3) کیا غدیر خم کے موقع پر حضرت رضی اللہ عنہ کو ولایت عطا کی گئی تھی یا پہلے سے یا کس وقت ملی؟

(4) کیا دیگر خلفائے راشدین کو ولایت حاصل نہیں ہوئی تھی؟

(5) اور جو اہلسنت کے افراد علماء ایسے جلسوں میں شرکت کریں یا جو ایسے جلسے منعقد کریں ان پر ازروئے شرع کیا حکم ہے؟

قرآن واحادیث کی روشنی میں مدلل جواب عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

استفتاء کے مندرجات دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مقرر خصوصی اہل تشیع کے عقائد و نظریات سے متاثر ہیں اور اہل سنت کے عقائد و نظریات سے ناواقف۔ اہل سنت پر طعن و تشنیع نہ کرے گا مگر وہ جو مخالفِ اہل سنت ہے۔

مقرر خصوصی کا عید غدیر منانے کا حکم دینا یقیناً شیعہ مذہب کی پیروی کی طرف غماز ہے۔ یوم غدیر اہل تشیع کی عید اکبر ہے۔ اور اس کو وہ خاص اس لئے مناتے ہیں کہ ان کے مطابق اس دن حضرت علی کو خلافت بلافصل ملی تھی بلکہ امامت کے بھی قائل ہیں۔ نیز یہ بھی مشہور ہے کہ اس دن چوں کہ حضرت عثمان غنی کی شہادت ہوئی تھی اس لئے وہ اس دن جشن مناتے ہیں۔ یہ ساری وجوہات ہو سکتی ہیں البتہ اصل وجہ حضرت علی کی خلافت بلافصل اور امامت ہے۔

اس عید غدیر کا بانی عراقی شیعہ حاکم معزالدین احمد بن ابویہ دیلمی ہے۔ سب سے پہلے اسی نے رافضیوں کے ساتھ ۱۸ / ذی الحجہ ۳۵۲ھ کو بغداد میں عید غدیر منائی۔ علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے:

"ثم دخلت سنة ثنتين وخمسين وثلاثمائة.... وفي ثامن عشر ذي الحجة منها أمر معز الدولة بإظهار الزينة ببغداد وأن تفتح الأسواق بالليل كما في الأعياد، وأن تضرب الدبادب والبوقات، وأن تشعل النيران بأبواب الأمراء وعند الشرط ؛ فرحا بعيد الغدير۔ غدير خم۔ فكان وقتا عجيبا ويوما مشهودا، وبدعة ظاهرة منكرة۔"

سن ۳۵۲ ہجری ۱۸ / ذی الحجہ کو معزالدولہ نے شہر بغداد سجانے اور رات کو عیدوں کی راتوں کی طرح بازار کھولنے کا حکم دیا۔ اور باجے اور بگل بجائے گئے۔ اور حکام کے دروازوں اور فوجیوں کے پاس چراغاں کیا گیا، عید غدیر کی خوشی میں، تو وہ وقت عجیب اور دیکھنے کا دن تھا۔ اور ظاہری بری بدعت کا دن تھا۔" [البداية والنهاية، لابن الكثير ۲۶۱/۱۵]

امام ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:

''وفيها في الثامن عشر ذي الحجة، أمر معز الدولة بإظهار الزينة في البلد، وأشعلت النيران بمجلس الشرطة، وأظهر الفرح، وفتحت الأسواق بالليل، كما يفعل ليالي الأعياد فعل ذلك فرحا بعيد الغدير، يعني غدير خم، وضربت الدبادب والبوقات، وكان يوما مشهودا''

اور سن ۳۵۲ ہجری ۱۸/ ذی الحجہ کو معزالدولہ نے شہر سجانے کا حکم دیا۔ اور درباریوں کی مجلس میں چراغاں کیا گیا اور خوشی کا اظہار کیا گیا اور بازار کھولے گئے رات کو جس طرح عیدوں کی راتوں کو کھولے جاتے خوب خوشی منائی گئی عید غدیر خم میں۔ اور باجے اور بگل بجائے گئے اور وہ دیکھنے کا دن تھا۔'' [الکامل فی التاریخ، ۲۴۶/۷]

امام ذہبی لکھتے ہیں:

''سنة اثنتين وخمسين وثلاثمائة. وفيها يوم ثامن عشر ذي الحجة، عملت الرّافضة عيد الغدير، غدير خمّ، ودقت الكوسات وصلّوا بالصحراء صلاة العيد''

اور سن ۳۵۲ ہجری ۱۸/ ذی الحجہ کو روافض (ابتداء میں معزالدین کا ذکر ہے) نے عید غدیر منائی ڈھول بجائے گئے۔ اور میدان میں نماز عید پڑھی۔'' [العبر فی خبر من غبر، ۹۰/۲]

الغرض: عید غدیر اہل تشیع کا تیوہار ہے۔ اہل تشیع کے نزدیک جس کی اصل بنیاد یوم غدیر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مولی علی کو خلافت وامامت دینا ہے۔ حالانکہ یہ سراسر جھوٹ اور فریب ہے۔

واقعہ غدیر خم سے مولی علی کی خلافت وامامت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ حدیث غدیر خم سے مولی علی کی فضیلت اجاگر ضرور ہوتی ہے لیکن اس سے خلافت وامامت مراد لینا جہالت ہے۔ حالانکہ اس سے قبل بھی متعدد مقامات پر مولی علی کو اسی طرح نبی کریم کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نوازا مگر اس دن کو عید کا دن کیوں نہیں قرار دیا جاتا ہے؟

اہل تشیع واقعہ غدیر خم کے جن الفاظ کو اپنے مقصد پر استدلال کرتے ہیں وہ

''من كنت مولاه فعلي مولاه'' ہے۔

مقرر خصوصی نے بھی اپنی تقریر میں سبقاً اس کا اظہار کیا ہے۔ حالانکہ اس جملہ سے کسی طرح بھی خلافت وامامت کا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا ہے۔ مولی کے معنی خلیفہ یا امام کے کہیں نہیں آتے بلکہ اس کے متعدد معانی میں سے ایک اہم معنی جو یہاں مراد ہے وہ ہے ناصر ومددگار۔ خلیفہ یا امام کا مفہوم محض فاسد ہے۔

ہم یہاں لفظ مولیٰ پر شارحین حدیث کے بیانات قلمبند کرتے ہیں: تاکہ مفہوم واضح ہو جائے۔

ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''من كنت مولاه فعلي مولاه''قيل، معناه: من كنت أتولاه فعلي يتولاه من الولي ضد العدو أي: من كنت أحبه فعلي يحبه، وقيل معناه: من يتولاني فعلي يتولاه، كذا ذكره شارح من علمائنا''

جس کا میں مددگار ہوں اس کے علی مددگار ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی جس سے میں دوستی رکھتا ہوں اس سے علی دوستی رکھتے ہیں۔ دوست بمقابلہ دشمن، یعنی جس سے میں محبت کرتا ہوں اس سے علی محبت کرتے ہیں۔ اور یہ معنی بھی اس کے کئے

گئے ہیں کہ جس شخص نے مجھ سے دوستی رکھی تو علی اس سے دوستی رکھتے ہیں۔ ہمارے شارحین علمانے ایسا ہی ذکر کیا ہے۔"
آگے اس کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں"
وقیل: سبب ذلك أن أسامة قال لعلی: لست مولای إنما مولای رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال صلی الله علیه وسلم من کنت مولاه فعلی مولاه"
اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت اسامہ نے کہا کہ علی میرے مولی نہیں ہیں میرے مولیٰ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ میں جس کا مولیٰ ہوں اس کے علی مولیٰ ہیں۔"
اوراس حدیث سے مولیٰ علی کی امامت پر استدلال کرنے والے شیعہ کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:
قالت الشیعة: هو متصرف، وقالوا: معنی الحدیث أن علیا ۔ رضی الله عنه ۔ یستحق التصرف فی کل ما یستحق الرسول صلی الله علیه وسلم ۔ التصرف فیه، ومن ذلك أمور المؤمنین فیکون إمامهم أقول: لا یستقیم أن تحمل الولایة علی الإمامة التی هی التصرف فی أمور المؤمنین، لأن المتصرف المستقل فی حیاته هو هو — صلی الله علیه وسلم لا غیر فیجب أن یحمل علی المحبة وولاء الإسلام ونحوهما.
شعیہ نے کہا کہ وہ متصرف ہیں اور کہا کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ علی ہر اس معاملہ میں تصرف کا حق رکھتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تصرف کا حق رکھتے ہیں۔ اورانہیں میں سے مسلمانوں کے معاملات ہیں پس وہ ان کے امام ہوئے۔ میں کہوں گا کہ ولایت کو اس امامت پر جو مومنین کے معاملہ میں تصرف ہے، محمول کرنا درست نہیں اس لئے کہ مستقل متصرف اپنی حیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں کوئی غیر نہیں۔ تو واجب ہے کہ اسے محبت اوراسلام کی ولاء اوران دونوں کے مثل پر محمول کیا جائے۔" [مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، کتاب المناقب، ۲۴۷/۱۱]
حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:
"بداں کہ ایں اقوی چیزیست کہ تمسک کردہ اند شیعہ درادعای ایشاں نص تفصیلی بخلافت علی مرتضی رضی اللہ ومیگویند کہ مولی اینجا بمعنی اولیٰ بامامت است۔ ما میگوییم بشیعہ بطریق الزام کہ ایشان اتفاق کردہ ندبراعتبار تواتر دلیل امامت وگفتہ اند کہ تاحدیث متواتر نباشد بداں استدلال برصحت امامت نتواں کرد ویقین است کہ ایں حدیث متواتر نیست"
یعنی جان لو کہ یہ سب سے طاقت ور دلیل ہے جس سے اپنے دعوی پر شیعہ استدلال کرتے ہیں۔ کہ یہ حضرت علی کی خلافت میں یہ تفصیلی نص ہے اور کہتے ہیں کہ اس جگہ مولی کے معنی اولیٰ بالامامت ہے۔ ہم بطورالزام شیعہ سے کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک امامت کی دلیل میں بالاتفاق تواتر معتبر ہے اوران لوگوں نے کہاہے کہ جب تک حدیث متواتر نہ ہو اس سے امامت کے صحیح ہونے پر استدلال نہیں کرسکتے۔ اور یقینی بات ہے کہ یہ حدیث متواتر نہیں ہے۔"
[اشعۃ اللمعات فارسی، ۳۷۲/۴،باب مناقب علی]
علامہ ابن حجر ہیتمی نے الصواعق المحرقہ میں لفظ مولیٰ وغیرہ سے خلافت وامامت مراد لینے پر شیعوں کی جانب سے دئے گئے دلائل کا تفصیلی جواب دیا ہے۔ یہ مقام اس تفصیل کا متحمل نہیں ہے۔ ہم بس لفظ مولی کے امام یا خلیفہ مراد لئے جانے پر دئے

گئے جواب کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:
''زعموا أن من النص التفصيلي المصرح بخلافة علي قوله صلى الله عليه وسلم يوم غدير خم موضع بالجحفة مرجعه من حجة الوداع''
اہل تشیع نے گمان کیا کہ خلافت علی پر نص مصرح تفصیلی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول (یعنی جس کا میں مولی ہوں اس کے علی مولی ہیں) ہے جو غدیر خم کے روز مقام جحفہ میں حجۃ الوداع سے لوٹتے وقت فرمایا تھا۔" [الصواعق المحرقہ، ص ۶۵]
اس پر اہل تشیعنے جو دلیل دی ہے اس کے جواب میں لکھتے ہیں::
''لا نسلم أن معنى الولي ما ذكروه بل معناه الناصر..... على أن كون المولى بمعنى الإمام لم يعهد لغة ولا شرعا''
ہم یہ نہیں مانتے ہیں ولی کا وہ معنی جو انہوں نے ذکر کیا ہے ہم نہیں مانتے ہیں۔ بلکہ اس کا معنی مددگار کے ہیں.... اس بنیاد پر کہ مولی کے معنی امام ہونا لغت اور شرع کے اعتبار سے معہود نہیں ہے۔" [مرجع سابق: ص ۶۶، ۶۵]
حکیم الامت مفتی احمد یار خاں نعیمی فرماتے ہیں:
"مولیٰ کے بہت معنی ہیں دوست، مددگار، آزاد کرنے والا مولیٰ۔ اس کے معنی خلیفہ یا بادشاہ نہیں۔ یہاں بمعنی دوست محبوب ہے۔ یا بمعنی مددگار۔ اور واقعی حضرت علی مسلمانوں کے دوست بھی ہیں اور مددگار بھی۔ اس لیے آپ کو مولیٰ علی کہتے ہیں۔
رب فرماتا ہے: ''فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ مَوْلٰہُ وَ جِبْرِیْلُ وَ صٰلِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ''
شیعہ کہتے ہیں کہ مولا بمعنی خلیفہ ہے اور اس حدیث سے لازم ہے کہ بجز حضرت علی کے خلیفہ کوئی نہیں آپ خلیفہ بلا فصل ہیں مگر یہ غلط ہے چند وجہ سے:
ایک یہ کہ مولیٰ بمعنی خلیفہ یا بمعنی اولی بالخلافہ کبھی نہیں آتا۔ بتاؤ اللہ تعالیٰ اور حضرت جبریل کس کے خلیفہ ہیں حالانکہ قرآن مجید میں انہیں مولیٰ فرمایا: ''فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ مَوْلٰہُ وَ جِبْرِیْلُ''
دوسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے خلیفہ نہیں پھر من کنت مولاہ کے کیا معنی ہوں گے۔
تیسرے یہ کہ حضرت علی حضور کی موجودگی میں خلیفہ نہ تھے حالانکہ حضور نے اپنی حیات شریف میں یہ فرمایا پھر مولیٰ بمعنی خلیفہ کیسے ہوگا۔
چوتھے یہ کہ اگر مان لو کہ مولیٰ بمعنی خلیفہ ہی ہو تو بھی بلا فصل خلافت کیسے ثابت ہوگی۔ واقعی آپ خلیفہ ہیں مگر اپنے موقعہ اپنے وقت میں۔
پانچویں یہ کہ اگر یہاں مولیٰ بمعنی خلیفہ ہوتا تو جب سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار سے حضرت صدیق اکبر نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، الخلافۃ فی القریش خلافت قریشی میں ہے۔ تم لوگ چونکہ قریش نہیں لہذا تم امیر نہیں بن سکتے، وزیر بن سکتے ہو۔ اس وقت حضرت علی نے یہ واقعہ لوگوں کو یاد کیوں نہ کرادیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو مجھے خلافت دے گئے میرے سوا کوئی خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ آپ خاموش رہے اور تینوں خلفاء کے ہاتھ پر باری باری بیعت کرتے رہے۔

معلوم ہوا کہ آپ کی نظر میں بھی یہاں مولیٰ بمعنی خلیفہ نہ تھا۔
چھٹے یہ کہ حضور کے مرض وفات میں حضرت عباس نے جناب علی سے کہا کہ چلو حضور سے خلافت اپنے لیے لے لو حضرت علی نے انکار کیا کہ میں نہیں مانگوں گا ورنہ حضور مجھے ہرگز نہ دیں گے۔ اگر یہاں مولیٰ بمعنی خلیفہ تھا تو یہ مشورہ کیسا۔
ساتویں یہ کہ خلافت کے لیے روافض کے پاس نص قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت چاہیے یہ حدیث نہ تو قطعی الثبوت ہے کہ حدیث واحد ہے نہ قطعی الدلالت کہ مولیٰ کے بہت معنی ہیں اور مولیٰ بمعنی خلیفہ کہیں نہیں آتا"

[مراۃ المناجیح شرح مشکاۃ المصابیح، ج۸/۴۲۵]

الغرض:۔ حدیث غدیر خم میں لفظ مولی کے معنی مددگار کے ہیں سوائے اہل تشیع کے کسی نے بھی مولی کے معنی خلافت، امامت یا ولایت معروفہ نہیں لئے ہیں۔
لہٰذا مقرر خصوصی کا اس معنی سے خلافت یا ولایت بمعنی امامت یا ولایت معروفہ مراد لینا غلط ہے۔ بلکہ خلافت مراد لینے میں اہل تشیع کے باطل عقیدہ کی ترجمانی ہے۔ جو یقیناً گمراہی ہے۔ کیوں کہ حضرت علی کو اس حدیث کی روشنی میں اہل تشیع خلیفہ بلافصل تسلیم کرتے ہیں۔ اور خلفائے ثلاثہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی خلافت کو باطل مانتے ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر ضلالت و گمراہی بلکہ کفر ہے کیوں کہ خلفائے اربعہ کی خلافت پر اجماع امت ہے۔ اور اجماع امت کا انکار کفر ہے۔ شارح بخاری، مفتی شریف الحق امجدی فرماتے ہیں:
"رافضیوں کا یہی عقیدہ ہے کہ خلیفہ بلافصل حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں خلفائے ثلاثہ کی خلافت باطل ہے۔ اور وہ غاصب تھے۔ ان کا یہ عقیدہ باطل ہے۔"[فتاوی شارح بخاری، ۲/۲۴]
فقیہ ملت، مفتی جلال الدین امجدی فرماتے ہیں:
"بعض شیعہ صاحبان نے اس موقع پر لکھا ہے کہ
"غدیر خم" کا خطبہ یہ "حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی خلافت بلافصل کا اعلان تھا" مگر اہل فہم پر روشن ہے کہ یہ محض ایک "تک بندی" کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کیوں کہ اگر واقعی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے خلافت بلافصل کا اعلان کرنا تھا، تو عرفات یا منیٰ کے خطبوں میں یہ اعلان زیادہ مناسب تھا۔ جہاں ایک لاکھ سے زائد مسلمانوں کا اجتماع تھا۔ نہ کہ غدیر خم پر جہاں یمن اور مدینہ والوں کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔"[سیرت مصطفی، ص ۵۳۵]
حکیم الامت فرماتے ہیں:
"شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت قطعی اور منصوص ہے کہ غدیر خم پر حضور انور نے انہیں اپنا خلیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اس صورت میں شیعہ حضرات کی یہ توجیہ درست نہیں۔"[مراۃ المناجیح شرح مشکاۃ المصابیح، ج۸/۲۹۶]
حضور صدر الافاضل فرماتے ہیں:
"علاوہ بریں اس خلافتِ راشدہ پر جمیع صحابہ اور تمام امت کا اجماع ہے۔ لہٰذا اس خلافت کا منکر شرع کا مخالف اور گمراہ بد دین ہے"[سوانح کربلا، ص۴۲]

حضور اعلیٰ حضرت فتح القدیر اور فتاوی بزازیہ کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''فی الروافض من فضل علیا علی الثلاثۃ فمبتدع و ان انکر خلافۃ الصدیق او عمر رضی اللہ عنہما فھو کافر''

رافضیوں میں جو شخص مولیٰ علی کو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے افضل کہے گمراہ ہے۔ اور اگر صدیق یا فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خلافت کا انکار کرے تو کافر ہے۔ وجیز امام کردری میں ہے:

من انکر خلافۃ ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فھو کافر فی الصحیح و من انکر خلافۃ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فھو کافر فی الاصح

خلافتِ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا منکر کافر ہے، یہی صحیح ہے، اور خلافتِ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا منکر بھی کافر ہے، یہی صحیح تر ہے'' [فتاوی رضویہ جدید، ۲۵۰/۱۴]

رہا معاملہ کہ مولی علی کو ولایت کب حاصل ہوئی تو اس کی کہیں تصریح نہیں ہے ہر صحابی ولی ہوتا ہے، حسب مراتب۔ خلفائے راشدین اولیائے کرام کی صف اول میں داخل ہیں۔ اولیاء غیر صحابہ سے بدرجہا افضل و ارفع ہیں۔

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''صحابہ کرام سب اولیائے کرام تھے..... صحابہ کرام میں سب سے افضل و اکمل و اعلیٰ و اقرب الی اللہ خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھے اور انکی افضلیت ولایت بترتیبِ خلافت، یہ چاروں حضرات سب سے اعلیٰ درجے کے کامل مکمل ہیں۔ اور دارائے نیابت نبوت ہونے میں شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا پایہ ارفع ہے اور دارائے تکمیل ہونے میں حضرت مولا علی مرتضیٰ شیر خدا مشکل کُشا کا رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین۔ [فتاوی رضویہ قدیم، ۷۰/۱۲]

مزید فرماتے ہیں:

''اور تحقیق یہ ہے کہ تمام اجلّہ صحابہ کرام مراتبِ ولایت میں اور خلق سے فنا اور حق میں بقا کے مرتبہ میں اپنے ماسوا تمام اکابر اولیاء عظام سے وہ جو بھی ہوں افضل ہیں۔ اور ان کی شان ارفع و اعلیٰ ہے اس سے کہ وہ اپنے اعمال سے غیر اللہ کا قصد کریں۔ لیکن مدارج متفاوت ہیں اور مراتب ترتیب کے ساتھ ہیں اور کوئی شے کسی شے سے کم ہے اور کوئی فضل کسی فضل کے اوپر ہے۔ اور صدیق کا مقام وہاں ہے جہاں نہایتیں ختم اور غایتیں منقطع ہو گئیں''

[فتاوی رضویہ جدید، ۶۸۴/۲۴، ۶۸۳]

الحاصل:۔ مقرر خصوصی کا یوم غدیر منانے کی ترغیب دینا، اہل تشیع کے باطل و گمراہ کن نظریات کی تشہیر و ترویج کرنا ہے۔ جو یقیناً گناہ بلکہ گمراہی و کفر پر مدد ہے۔ یوں ہی ایسے جلسوں میں شرکت کرنا جہاں اہل تشیع کے باطل و فاسد کفریہ عقائد کی تشہیر ہو، حرام بلکہ ان کے کفریہ عقائد پر راضی ہونے اور ان کی تشہیر میں مدد کرنے کے سبب کفر ہے۔

بالجملہ: یوم غدیر کو عید مانا اگر اہل تشیع کے باطل نظریات سے متفق ہوئے بغیر بھی ہو تب بھی گناہ پر مدد کرنے کا الزام رہے گا۔ اور چوں کہ عید غدیر کی بنیادی وجہ حضرت علی کی خلافت بلافصل اور خلفائے ثلاثہ کی خلافت کا انکار ہے جو بلاشبہہ کفر ہے۔ تو اس طرح کفر پر مدد کرنا ہے۔ لہٰذا گناہ پر مدد گناہ کبیرہ اور کفر پر مدد کفر ہے۔ بنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

''الإعانة علی المعاصی و الفجور و الحث علیها من جملة الکبائر''

گناہوں اور برائیوں پر مدد کرنا اور اس پر ابھارنا گناہ کبیرہ ہے۔" [البنایة شرح الهدایة، ۱۴۸/۹]

فتاوی شامی میں ہے:

" فلا تجوز الإعانة علی تجدید الکفر فیها.... وأن من ساعد علی ذلك فهو راض بالکفر والرضا بالکفر کفر "

تجدید کفر پر مدد جائز نہیں ہے اور جس شخص نے کفر میں کوشش کی تو وہ کفر پر راضی ہوا اور کفر پر راضیہونا کفر ہے۔"

[ردالمحتار، ۲۰۵/۴]

حضور اعلیٰ حضرت طحطاوی علی الدر کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"التفرج علی المحرم حرام (حرام پر خوشی بھی حرام ہے) ایسے جلسوں میں شرکت گناہ کبیرہ ہے۔

قال اللہ تعالیٰ فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظلمین۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: پس نصیحت و یاد دہانی کے بعد ظالموں کے پاس مت بیٹھو....

قال اللہ تعالیٰ: ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان

اللہ تعالیٰ کا فرمان مبارک ہے: گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔"

[فتاوی رضویه جدید، ۱۰۲/۱۵، ۱۰۱]

علاوہ ازیں عید غدیر منانا اہل تشیع کا مذہبی شعار ہے اور کسی کافر قوم کے مذہبی شعار کو اپنانا یقیناً تشبہ کے درجہ میں آتا ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" من تشبه بقوم فهو منهم " جس نے کسی قوم سے مشابہت کی وہ انہیں میں سے ہے۔"

[سنن ابوداؤد، کتاب اللباس، ۲۰۳/۲]

البتہ اگر ان کے عقائد و نظریات کو مان کر ہے تو تشبہ التزامی ہے۔ اور اگر ان کے عقائد سے تو اتفاق نہیں بلکہ اپنے طور پر ہی مناتا ہے لیکن ان کا مذہبی شعار ہونے کے سبب تشبہ پایا جارہا ہے تو تشبہ لزومی ہے۔ پہلی صورت میں کفر ہے کیوں کہ تشبہ کے سبب کفریہ عقائد پر رضا شامل ہے۔ اور دوسری صورت میں کم از کم تشبہ کے سبب حرمت و ممانعت ضرور ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"تشبہ دو وجہ پر ہے: التزامی و لزومی۔ التزامی یہ ہے کہ یہ شخص کسی قوم کے طرز و وضع خاص اسی قصد سے اختیار کرے کہ ان کی سی صورت بنائے ان سے مشابہت حاصل کرے حقیقۃً تشبہ اسی کا نام ہے..... اور لزومی یہ کہ اس کا قصد تو مشابہت کا نہیں مگر وہ وضع اس قوم کا شعار خاص ہو رہی ہے کہ خواہی نخواہی مشابہت پیدا ہو گی..... اس قوم کو محبوب و مرضی جان کر اُن سے مشابہت پسند کرے یہ بات اگر مبتدع کے ساتھ ہو بدعت اور کفّار کے ساتھ معاذ اللہ کفر"

[فتاوی رضویه جدید، ۵۳۰/۲۴]

مزید فرماتے ہیں:

"نہ تو انہیں اچھا جانتا ہے نہ کوئی ضرورت شرعیہ اس پر حامل ہے بلکہ کسی نفع دنیوی کے لئے یا یوہیں بطور ہزل و استہزاء اس

کا مرتکب ہوا تو حرام و ممنوع ہونے میں شک نہیں اور اگر وہ وضع ان کفار کا مذہبی دینی شعار ہے جیسے زنّار، قشقہ، چٹیا، چلیپا، تو علماء نے اس صورت میں بھی حکم کفر دیا کما سمعت اٰنفا۔ اور فی الواقع صورت استہزاء میں حکم کفر ظاہر ہے کمالایخفی۔

اور لزومی میں بھی حکم ممانعت ہے جبکہ اکراہ وغیرہ مجبوریاں نہ ہوں جیسے انگریزی منڈا، انگریزی ٹوپی، جاکٹ، پتلون، اُلٹا پردہ، اگرچہ یہ چیزیں کفار کی مذہبی نہیں مگر آخر شعار ہیں تو ان سے بچنا واجب اور ارتکاب گناہ"

[فتاوی رضویہ جدید، ۵۳۲/۲۴]

حضور اعلیٰ حضرت ملا علی قاری کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''انا ممنوعون من التشبیه بالکفرة واهل البدعة المنکرة فی شعارهم''

ہمیں کافروں اور منکر بدعات کے مرتکب لوگوں کے شعار کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے۔"

[فتاوی رضویہ جدید، ۵۳۳/۲۴]

اور فرماتے ہیں:

"اور اپنے لئے جو شعار کفر پر راضی ہو اس پر لزوم کفر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"من تشبه بقوم فهو منه'' جو کسی قوم سے مشابہت پیدا کرے وہ انہیں میں سے ہے۔

اشباہ والنظائر میں ہے: عبادة الصنم کفر ولا اعتبار فی قلبه وکذا لوتزنر بزنار الیهود والنصاری دخل کنیستهم اولم یدخل .... جامع الفصولین منح الروح الازہر میں ہے: من خرج الی السدة (قال القاری ای مجمع اهل الکفر) کفر لان فیه اعلام الکفر وکانه اعان علیه۔

جو کوئی (دارالاسلام کو چھوڑ کر) کفار و مشرکین کے مجمع میں جائے (السدۃ۔ محدث ملا علی قاری نے فرمایا: اس کا معنی مجمع اہل کفر ہے) تو وہ کافر ہو گیا کیوں کہ اس میں کفر کا اعلان ہے۔

گویا وہ کفر پر ان کی امداد کر رہا ہے.... اور کفر کے اہتمام میں شریک ہونا اور اس پر راضی ہونا کفر ہے الرضا بالکفر کفر (کفر پر راضی ہونا کفر ہے) وہ لوگ اسلام سے نکل گئے اور ان کی عورتیں ان کے نکاح سے۔"

[فتاوی رضویہ جدید، ج ۲۱ ص ۲۹۷، ۲۹۶]

الحاصل:۔ عید غدیر اہل تشیع کا مذہبی تہوار ہے۔ اہل سنت کا اس دن عید منانا اہل تشیع کے باطل افکار و عقائد کی تائید کا موجب اور ان کے اس باطل و کفریہ عقیدہ کو تقویت دینے کے مترادف ہے۔

لہٰذا مقرر خصوصی کا عید غدیر کی ترغیب دینا لوگوں کو کفر اور کم از کم گمراہی کی دعوت دینا ہے اور ساتھ ہی روافض کے باطل نظریات کو تقویت پہنچانا ہے۔ مقرر خصوصی کو چاہئے کہ توبہ کرے اور تجدید ایمان اور تجدید نکاح و بیعت کرے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب در مختار اور اس کے حاشیہ رد المحتار میں ہے:

مایکون کفرا اتفاقا یبطل العمل والنکاح واولاده اولاد زنا، ومافیه خلاف یؤمر بالاستغفار والتوبة (ای تجدید الاسلام) وتجدید النکاح۔ متفق علیہ کفر سے عمل اور نکاح باطل ہو جاتا ہے اور اس کی حالت میں جو اولاد ہو گی وہ

اولادزناہو گی اور جس کے کفر ہونے میں اختلاف ہو اس میں توبہ، تجدید اسلام اور تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا۔[الدرالمختارمع الردالمحتار:باب المرتد،۳۹۱/۶]

اوراگر مقرر خصوصی کا مقصد عید غدیر کو منانے سے فقط حضرت علی کی محبت ہی ہے۔یایوں ہی رسماًمنانا ہے۔

اوراہل تشیع کے افکارونظریات جواس غدیر سے وابستہ ہیں ان سے بالکلیہ متفق نہیں ہے بلکہ ان کوفاسدوباطل جانتااور مانتاہے۔تو یہ بھی تشبہ روافض کی وجہ سے حرام ہے۔جیسا کہ حضوراعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''جو بات کفار یا بدمذہباں اشرار یافسّاق فجّار کا شعار ہو بغیر کسی حاجت صحیحہ شرعیہ کے برغبت نفس اس کا اختیار ممنوع وناجائزو گناہ ہے۔اگرچہ وہ ایک ہی چیز ہو کہ اس سے اس وجہ خاص میں ضرور اُن سے تشبّہ ہو گا اسی قدر منع کو کافی ہے اگرچہ دیگروجوہ سے تشبّہ نہ ہو''[فتاوی رضویہ جدید،۵۳۵/۲۴]

لٰہذاایسی صورت میں مقرر خصوصی پر رجوع اور توبہ لازم ہے۔اورآئندہ اس طرح معمولات اہل سنت کے خلاف زبان درازی سے بازآناواجب وضروری ہے۔اوراگروہ اس پر عمل نہ کرے تومسلمانوں پرلازم ہے کہ وہ اس کابایکاٹ کریں اوراس سے ہر طرح کاتعلق ختم کرلیں۔قرآن پاک میں ہے:

''وَاِمَّا یُنْسِیَنَّکَ الشَّیْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ''

(اور جو کہیں تجھے شیطان بھلادے تو یادآنے پر ظالموں کے پاس نہ بیٹھ)[کنزالایمان پارہ ۲۸،سورہ انعام آیت ۶۸]

ھٰذاماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ

فتوی ۸ — غیر مسلم کو بھائی بنانااور ماتھے پر تلک لگانا اور شراب پلانے کے شرعی احکام

مسئولہ:حافظ شاکر حسین آقانگر۔۲/ربیع الغوث ۱۴۴۰ھ

کیافرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین مسئلہ ذیل میں زید کی بیوی نے ایک غیر مسلم کو دنیاوی بھائی بنالیا۔زید کی بیٹی کی شادی ہوئی غیر مسلم نے بھات وغیرہ دیا۔اس میں غیر مسلم نے کچھ ہندوؤں والی رسم کی جیسے آرتی وغیرہ اورزید کے ماتھے پر تلک لگادیازید کی مرضی نہیں تھی تلک وغیرہ لگانے کی۔پھرزید نے شادی میں غیر مسلموں کو چھپ کر شراب وغیرہ پلائی۔

اس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

مسجد کے امام صاحب نے زید کو ایمان سے خارج ہونے کا فتوی دے دیا۔اس کے بارے میں جواب عنایت فرمائیں۔فقط

الجواب

تلک ہنود کا مذہبی شعار ہے۔تلک لگانایالگوانادونوں حرام بلکہ اکراہ وغیرہ کی صورت نہ ہونے کی صورت میں کفر ہے۔

اس میں کفار سے مشابہت ہے۔اور تشبہ اگران کے مذہبی شعار میں کوئی کرے تو عندالشرع وہ بھی انہیں میں سے ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''من تشبہ بقوم فھومنھم''

جس نے کسی قوم سے مشابہت کی وہ انہیں میں سے ہے۔"[سنن ابو داؤد، کتاب اللباس، ۲/۲۰۳]

حضور اعلیٰ حضرت ملا علی قاری کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''انا ممنوعون من التشبیه بالکفرۃ واهل البدعة المنکرۃ فی شعارهم''

ہمیں کافروں اور منکر بدعات کے مرتکب لوگوں کے شعار کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے۔"

[فتاوی رضویہ جدید، ۲۴/۵۳۳]

مزید فرماتے ہیں: "تشبہ دو وجہ پر ہے: التزامی ولزومی۔

التزامی یہ ہے کہ یہ شخص کسی قوم کے طرز وضع خاص اسی قصد سے اختیار کرے کہ ان کی سی صورت بنائے ان سے مشابہت حاصل کرے حقیقۃً تشبہ اسی کا نام ہے۔.....اور لزومی یہ کہ اس کا قصد تو مشابہت کا نہیں مگر وہ وضع اس قوم کا شعار خاص ہو رہی ہے کہ خواہی نخواہی مشابہت پیدا ہو گی.....اس قوم کو محبوب و مرضی جان کر اُن سے مشابہت پسند کرے یہ بات اگر مبتدع کے ساتھ ہو بدعت اور کفّار کے ساتھ معاذاللہ کفر"[فتاوی رضویہ جدید، ۲۴/۵۳۰] مزید فرماتے ہیں:

"نہ تو انہیں اچھا جانتا ہے نہ کوئی ضرورت شرعیہ اس پر حامل ہے بلکہ کسی نفع دنیوی کے لئے یا یوہیں بطور ہزل واستہزاء اس کا مرتکب ہوا تو حرام وممنوع ہونے میں شک نہیں اور اگر وہ وضع ان کفار کا مذہبی دینی شعار ہے جیسے زنّار، قشقہ، چُٹیا، چلیپا، تو علماء نے اس صورت میں بھی حکم کفر دیا کما سمعت انفا۔ اور فی الواقع صورت استہزاء میں حکم کفر ظاہر ہے کمالایخفی۔

اور لزومی میں بھی حکم ممانعت ہے جبکہ اکراہ وغیرہ مجبوریاں نہ ہوں جیسے انگریڑی منڈا، انگریزی ٹوپی، جاکٹ، پتلون، اُلٹا پردہ، اگرچہ یہ چیزیں کفار کی مذہبی نہیں مگر آخر شعار ہیں تو ان سے بچنا واجب اور ارتکاب گناہ"

[فتاوی رضویہ جدید، ۲۴/۵۳۲]

شارح بخاری فرماتے ہیں:

"ماتھے پر ٹیکا لگانا کفر ہے۔ یہ خاص ہندوؤں کا مذہبی شعار ہے اور ہندو ہونے کی علامت ہے۔"[فتاوی شارح بخاری، ۲/۵۹۰]

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"ٹیکہ لگانا مشرکین کا خالص مذہبی شعار ہے۔ اس لیے ٹیکہ لگانے کی وجہ سے بکر مرتد ہو گیا۔ اسلام سے نکل گیا۔ اگر بیوی والا ہے تو اس کی جورو بھی اس کے نکاح سے نکل گئی۔ اس پر فرض ہے کہ ان سب حرکات سے توبہ کرے پھر سے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو بیوی والا ہے تو پھر سے نکاح کرے اور اروہ ایسا نہ کرے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس سے میل جول سلام کلام بند کریں اسی حالت میں اگر مر جائے تو نہ اسے مسلمانوں کی طرح غسل دینا جائز نہ بطریق مسنون کفن دینا جائز نہ اس کی نماز جنازہ جائز نہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جائز نہ مسلمانوں کی طرح دفن کرنا جائز۔"

[مرجع سابق: ۲/۵۹۲، ۵۹۱]

زید کا تلک لگوانا اور منع نہ کرنا رضا پر دال ہے۔ مرضی نہیں تھی پھر بھی نہ روکنا کفر پر راضی ہونا ہی ہے اور کفر پر راضی ہونا کفر ہے۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”فعل کفر میں جو دل سے شریک ہو وہ ظاہراً باطناً کافر ہے، اور جو اکراہ واضطرار و مجبوری محض سے بظاہر شریک ہوا سے معافی ہے۔ مگر اکراہ صحیح شرعی درکار ہے، کسی کی خاطر وغیرہ سے مجبور ہونا شرعی مجبوری نہیں اور بلا اکراہ شرعی شرکت کفر پر بھی شریعت مطہرہ لزوم کفر و تجدید اسلام و تجدید نکاح کا حکم دے گی۔“[فتاوی رضویہ قدیم ۱۱۴/۶]

اس لیے زید پر لازم ہے کہ توبہ کرے اور تجدید ایمان، تجدید نکاح، اوراگر کسی پیر سے بیعت ہو تو تجدید بیعت کرے۔ اور پھر اس کا شراب پینا بھی ایک بڑا اجرم و گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ

تم سے شراب اور جوئے کا حکم پوچھتے ہیں تم فرمادو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔

[ترجمہ کنزالایمان،پارہ ۲ سورہ بقرۃ آیت ۲۱۹]

دوسرے مقام پر ارشاد خداوندی اس طرح ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

اے ایمان والو شراب اور جوا اور بت اور پانسے ناپاک ہی ہیں شیطانی کام تو ان سے بچتے رہنا کہ تم فلاح پاؤ۔

[ترجمہ کنزالایمان،پارہ ۷ سورہ مائدۃ آیت ۹۰]

اور کفار و مشرکین سے تعلقات ورشتہ داری ان سے میل جول اور محبت بھی قطعاً ناجائز و حرام ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝

ان میں تم بہت کو دیکھو گے کہ کافروں سے دوستی کرتے ہیں کیا ہی بُری چیز اپنے لیے خود آگے بھیجی یہ کہ اللہ کا ان پر غضب ہوا اور وہ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور اگر وہ ایمان لاتے۔ اللہ اور ان نبی پر اور اس پر جو ان کی طرف اترا تو کافروں سے دوستی نہ کرتے مگر ان میں تو بہتیرے (اکثر) فاسق ہیں۔[القرآن، سورہ مائدہ آیت ۸۱،۸۰]

زید کی بیوی پر بھی لازم ہے کہ توبہ کرے اور ہندؤں سے رشتہ داری نہ کرے۔ اوراس گناہ کے سبب اس پر بھی توبہ لازم ہے۔

الحاصل: زید پر تلک لگوانے کے سبب از روئے شرع کفر لازم ہے۔ زید توبہ کے ساتھ تجدید ایمان وغیرہ کرے۔ اورآئندہ اس طرح کی حرکات سے باز رہے اوراپنی بیوی کو بھی خلاف شرع کاموں سے روکے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب در مختار اوراس کے حاشیہ ردالمحتار میں ہے:

مایکون کفرا اتفاقا یبطل العمل والنکاح واولادہ اولاد زنا، ومافیہ خلاف یؤمر بالاستغفار والتوبۃ (ای تجدید الاسلام) وتجدید النکاح۔ متفق علیہ کفر سے عمل اور نکاح باطل ہو جاتا ہے اوراس کی حالت میں جو اولاد ہوگی وہ اولاد زنا ہوگی اور جس کے کفر ہونے میں اختلاف ہو اس میں توبہ، تجدید اسلام اور تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا۔

[باب المرتد، ۳۹۱/۶]

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۹ مجبوری میں راکھی بندھوانے کا حکم

مسئولہ: محمد منور، محمد سلمان، محمد عثمان ہری دوار، محمد فائق بدایونی۔۱۹/ ذیقعدہ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان ذوی الاحترام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ

ایک ہندو کے مکان پر کرائے پر رہتے ہیں ۲۹، اگست کو ہمارے کرائے دار کی لڑکیوں نے ہمارے راکھی باندھی اور ہم نے اس کو پیسہ بھی دیا تو شریعت مطہرہ کی زد میں ہم تو نہیں آئے اس لئے کہ ہم مجبور تھے ورنہ وہ ہم کو گھر سے نکال دیتے۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

راکھی بندھن ہنود کا قومی شعار ہے اس میں شرکت بلاشبہ حرام ہے۔ کافروں کے ایام خوشی میں ان کو تحفہ دینا بھی جائز نہیں ہے۔ بلکہ اگر ان کے تہوار کی تعظیم مقصود ہو تو فقہائے کرام اسے کفر بتاتے ہیں۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

''ویکفر بخروجه إلى نيروز المجوس والموافقة معهم فيما يفعلونه في ذلك اليوم وبشرائه يوم نيروز شيئا لم يكن يشتريه قبل ذلك تعظيما للنيروز لا للأكل والشرب وبإهدائه ذلك اليوم للمشركين ولو بيضة تعظيما لذلك اليوم''

(مجوسیوں کے تہوار نوروز میں جانے اور اس دن ان کے افعال (شرکیہ) میں ان کی موافقت کے سبب اور نوروز کے دن کچھ خریداری کرنے جو اس دن کے علاوہ دنوں میں نہ کی جاتی ہو تعظیم کی نیت سے نا کہ کھانے پینے کے لئے اور اس دن مشرکوں کو تحفہ دینے سے اگرچہ ایک انڈا ہی ہو اس دن کی تعظیم کے طور پر ہو تو (مرتکب) کافر ہو جائے گا)

[مجمع الانہر: ۵۱۳/۲، کتاب السیر، باب المرتد]

ایسا ہی بحر الرائق (جلد ۵ ص ۱۳۳، باب احکام المرتدین) اور فتاوی عالمگیری (۲/ ۲۷۷، باب احکام المرتدین) میں ہے۔

صورت مسئولہ میں چونکہ تعظیم کا پہلو نہیں پایا جارہا ہے اس لئے کفر کا حکم تو نہیں ہو گا۔ البتہ صورت مذکورہ میں جو مجبوری بیان کی گئی ہے احقر کے نزدیک وہ معقول نہیں ہے گھر میں کرائے دار ہونے سے ان کے قومی یا مذہبی شعار میں شرکت کرنا پڑتی ہو تو ایسے گھر میں رہنا ہی کیا ضروری ہے کرایہ دے کر کہیں اور بھی رہا جاسکتا ہے۔ اور بچنے کی بھی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں اس لئے جن لوگوں نے راکھی باندھی اور ان لڑکیوں کو تحفہ دیا وہ بہر صورت خطا کے مرتکب ہیں انہیں چاہئے کہ توبہ کریں اور آئندہ ایسی حرکات قبیحہ سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

هٰذا ما عندي والعلم عند الله تعالىٰ

احکام نماز و ملحقات نماز

فتوی ۱۰ داڑھی منڈا فاسق ہے اس سے اذان نہ پڑھوائی جائے

مسئولہ: مصلیان مسجد مٹکے والی، پولیس چوکی ککرالہ بدایوں۔۳/ ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علماے دین اس مسئلہ میں

کہ زید اذان پڑھتاہے اورزید کی داڑھی نہیں ہے۔وقت ہونے پر کوئی دوسراپڑھ دیتاہے تولڑتاہے۔اگرچہ داڑھی والاہو۔اس مسئلہ کولے کر مسجد میں بڑا جھگڑاہے۔ایسے میں زید کااذان پڑھناجائزہے یانہیں ؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

داڑھی منڈاناحرام ہے۔اورمنڈانے والاازروئے شرع فاسق ہے۔

فتاوی رضویہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے حوالے سے ہے:

حلق کردن لحیہ حرام ست وروش افرنج وہنود وجوالقیان کہ ایشاں راقلندریہ نیز گویند وگزاشتن آں بقدر قبضہ واجب ست وآں کہ آنرا سنت گویند بمعنی طریقہ مسلوک در دین ست یابجہت آنکہ ثبوت آں بہ سنت ست چنانکہ نماز عیدراسنت گفتہ اند۔

داڑھی منڈاناحرام ہے، یہ افرنگیوں، ہندوؤں اور جوالقیوں کاطریقہ ہے جوقلندریہ بھی کہلاتے ہیں۔اور داڑھی بمقدار ایک مٹھی چھوڑناواجب ہے“[فتاوی رضویہ جدید، ۵۷۲/۲۲]

صدرالافاضل اپنے فتاوی میں فرماتے ہیں:

”داڑھی رکھناشعائر اسلام میں سے ہے اوراس کاکاٹناقدر قبضہ پہنچنے سے قبل حرام ہے....درمختار میں ہے:

’’یحرم علی الرجل قطع لحیتہ‘‘ جب ثابت ہوگیاکہ داڑھی ایک مشت سے کم کتروانایامنڈواناممنوع ہے تواس کاعامل اور مصر فاسق معلن ہوااورفاسق کی امامت مکروہ تحریمی۔کمافی عامۃ المتون والشروح والفتاوی من کراھۃ امامۃ الفاسق اورفاسق کوامام بناناگناہ ہے“[فتاوی صدرالافاضل، ۴۲۴]

لہٰذاداڑھی منڈانے والاجب فاسق ہے تواس کی اذان واقامت شرعاًمکروہ ہے۔فتاوی عالمگیری میں ہے:

یکرہ اذان الفاسق‘‘یعنی فاسق کی اذان مکروہ ہے۔[فتاوی عالمگیری، ۵۴/۱،الباب الثانی فی الاذان]

بحرالرائق میں ہے:

’’وصرحوا بکراھۃ أذان الفاسق من غیر تقیید بکونہ عالما أو غیرہ‘‘

یعنی فاسق عالم ہویاغیرعالم اس کی اذان مکروہ ہونے کی فقہانے صراحت فرمائی ہے“۔[بحرالرائق، ۲۶۸/۱]

اسی میں ہے:وصرح بکراھۃ أذان الفاسق ولا یعاد فالإعادۃ فیہ لیقع علی وجہ السنۃ

یعنی فاسق کی اذان کے مکروہ ہونے کی فقہانے صراحت کی ہے۔لیکن اعادہ ضروری نہیں ہاں البتہ لوٹالیاجائے تاکہ اذان سنت کے مطابق اداہوجائے۔[مرجع سابق، ۲۷۸/۱]

یعنی فاسق کی اذان مکروہ ہے مگر اس کا دہرانا واجب وضروری نہیں۔ البتہ بہتر و مستحب ہے کہ فاسق کی پڑھی ہوئی اذان دہرائی جائے۔ حضور اعلیٰ حضرت امام اہل سنت محدث بریلوی قدس سرہ فرماتے ہیں:

”فاسق کی اذان اگرچہ اقامتِ شعار کا کام دے مگر اعلام کہ اس کا بڑا کام ہے اُس سے حاصل نہیں ہوتا، نہ فاسق کی اذان پر وقتِ روزہ و نماز میں اعتماد جائز۔ لہٰذا مندوب ہے کہ اگر فاسق نے اذان دی ہو تو اس پر قناعت نہ کریں بلکہ دوبارہ مسلمان متقی پھر اذان دے، تو جب تک یہ شخص صدق دل سے تائب نہ ہو اُسے ہر گز مؤذن نہ رکھا جائے مسجد سے جُدا کر دینا ضرور ہے۔

در مختار میں ہے: جزم المصنّف بعدم صحة اذان مجنون ومعتوہ وصبی لایعقل، قلت وکافر وفاسق لعدم قبول قولہ فی الدیانات۔

مصنّف نے دیوانے، ناقص العقل اور ناسمجھ بچّے کی اذان کے بارے میں عدمِ صحت کا قول کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کافر و فاسق کا بھی یہی حکم ہے کیوں کہ امورِ دینیہ میں ان کا قول قابلِ قبول نہیں۔) ردالمحتار میں ہے:

المقصود الاصلی من الاذان فی الشرع الاعلام بدخول اوقات الصلاۃ، ثم صار من شعار الاسلام فی کل بلدۃ اوناحیۃ من البلاد الواسعۃ فمن حیث الاعلام بدخول الوقت وقبول قولہ لابد من الاسلام والعقل والبلوغ والعدالۃ فاذا اتصف المؤذن بھذہ الصفات یصح اذانہ والا فلا یصح من حیث الاعتماد علیہ، واما من حیث اقامۃ الشعار النّافیۃ للاثم عن اھل البلدۃ فیصح اذان الکل سوی الصبی الذی لایعقل، فیعاد اذان الکل ندبا علی الصح کما قدمناہ عن القھستانی اہ ملخصا۔

اذان کا مقصودِ اصلی شرع میں اوقاتِ نماز کے دخول کی اطلاع ہے پھر یہ تمام ممالک اور بڑے شہروں کے اطراف میں شعائر اسلام کا درجہ پاچکی ہے تو دخولِ وقت کی اطلاع اور اس کے قول کی مقبولیت کے لئے ضروری ہے کہ اس کا قائل مسلمان، عاقل، بالغ اور عادل ہو، اگر مؤذن ان صفات کے ساتھ متصف ہُوا تو اس کی اذان درست ہوگی۔ اور اگر اس میں یہ صفات نہیں تو اس پر اعتماد ہونے کی حیثیت درست نہ ہوگی۔ البتہ اس حیثیت سے کہ یہ ان شعائر میں سے ہے جو تمام شہر والوں کو گناہ سے بچاتی ہے تو یہ بچّے ناسمجھ کے علاوہ ہر کسی کی صحیح ہوگی۔ لہٰذا اصح یہ ہے کہ ان تمام کی اذان کا لوٹانا مستحب ہے جیسا کہ ہم نے قہستانی کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ اور جو اُس کی حمایت میں فضول حجت کرتے ہیں امر ناحق کے مددگار بنتے ہیں اُنہیں باز آنا چاہئے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے: ولاتکن للخائنین خصیما خیانت کرنے والوں کا وکیل نہ بن۔“

[فتاوی رضویہ جدید، ۳۷۸/۵، ۳۷۷]

الحاصل: داڑھی منڈا شخص شرعاً فاسق ہے اور فاسق کی اذان شریعت میں مکروہ و ناپسند قرار دی گئی ہے۔ اوراس کی دی ہوئی اذان کو لوٹانا فقہانے مستحب قرار دیا ہے۔ زید کو اگر واقعی اذان پڑھنے کا شوق ہے تو زید کو چاہئے کہ حد شرع کے مطابق داڑھی رکھے۔ ورنہ اذان پڑھنے سے بچے اور کسی باشرع شخص کو اذان پڑھنے دے۔ بے جا ہٹ دھرمی، فتنہ پروری اور لڑائی جھگڑا کر کے عذاب کا مستحق نہ بنے۔ زید کے ساتھ تمام نمازیوں کو بھی چاہئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان عالیشان پر عمل کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ نے ارشاد فرمایا: ”لیؤذن لکم خیارکم“ یعنی تم میں سے نیک لوگ اذان دیں۔

[سنن ابوداؤد، باب من أحق بالإمامة، ۱۶۱/۱]

دیوبندیوں سے میل جول رکھنے والے سے مسجد میں اذان واقامت پڑھوانا جائز نہیں
دیوبندیوں کو قربانی میں شریک کرنے سے کسی کی بھی قربانی نہیں ہوگی

فتوی ۱۱ مسئولہ: صفدر علی وجے نگر کاشی پور۔ ۹/ جمادی الاخری ۱۴۳۵ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ان مسائل میں

(۱) زید سنی ہے زید کا بیٹا دیوبندی ہے زید دیوبندی بیٹے کے گھر رہتا ہے کھاتا پیتا بھی ہے کبھی مسجد میں آکر اذان واقامت بھی پڑھتا ہے کبھی نماز بھی پڑھا دیتا ہے کیا یہ درست ہے؟

(۲) کیا دیوبندی کی شرکت قربانی میں جائز ہے۔؟ ہمارے سنی بھائی دیوبندیوں کے ساتھ قربانی کر رہے ہیں ان کے لئے کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

(۱) دیوبندی جماعت اپنے عقائد کفریہ خبیثہ باطلہ، مثلاً اللہ جھوٹ بول سکتا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی آسکتا ہے، امتی عمل میں نبی سے بڑھ سکتا ہے، نماز میں نبی کا خیال گدھے بیل کے خیال اور بیوی سے مجامعت کے خیال سے بدتر ہے، جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مالک ومختار نہیں، نبی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، نبی کی یوم پیدائش منانا کنہیا کے جنم کے مثل ہے، لاالہ الا اللہ اشرف علی رسول اللہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، انبیاء واولیاء ہر مخلوق چھوٹی بڑی اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی زیادہ ذلیل ہے، نبی کا علم شیطان سے کم اور جانوروں، پاگلوں، بچوں کے برابر ہے، صحابہ کو کافر کہنے والا کافر نہیں ہے، (معاذاللہ رب العلمین) وغیرہا بہت سے عقائد باطلہ کے سبب خارج از اسلام کافر ومرتد ہے۔

لہٰذا زید کا بیٹا اگر ان عقائد خبیثہ سے متفق ہے یا پھر ان عقائد خبیثہ سے واقف ہونے کے باوجود بھی قائلین ومصدقین اور مؤیدین کو مسلمان سمجھتا ہے۔ اور ان کو حق بجانب تسلیم کرتا ہے، تو وہ یقیناً خارج از اسلام ہے ایسی صورت میں زید کا اپنے بیٹے کے ساتھ کھانا پینا اور اس کے ساتھ تعلقات رکھنا شریعت کے بالکل خلاف ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان عالیشان ہے ''فلا تجالسوھم ولا تشاربوھم ولا تؤاکلوھم ولا تناکحوھم۔''

بدمذہبوں کے ساتھ نہ بیٹھو نہ ان کے ساتھ پیو نہ کھاؤ نہ ان کے ساتھ نکاح کرو۔ دوسری حدیث شریف میں ہے:

فلا تناکحوھم ولا تؤاکلوھم ولا تشاربوھم ولا تجالسوھم ولا تصلوا علیھم ولا تصلوا معھم۔

بدمذہبوں کے ساتھ نہ کھاؤ نہ پیو نہ بیٹھو نہ ان کی نماز جنازہ پڑھو نہ ان کے ساتھ نماز پڑھو۔

[کنزالعمال: ج ۱۱ ص ۵۲۹-۵۴۰]

لہٰذا زید جب تک اپنے بیٹے سے ترک تعلقات نہ کرے، اس سے اذان واقامت اور نماز پڑھوانا جائز نہیں، زید کو چاہئے اپنے بدمذہب بیٹے سے ترک تعلقات کرے توبہ کرے اور اپنے ایمان کو محفوظ کرے۔ زید فتوی شرعی سننے کے بعد بھی اپنے روش پر قائم رہے تو مسلمان ایسے شخص سے تعلقات ختم کر دیں۔ اور خود کو عذاب الٰہی اور قہر الٰہی سے بچائیں۔

حدیث پاک میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''إن الناس إذا رأوا المنكر لا يغيرونه، أوشك أن يعمهم الله بعقابه''

لوگ جب کوئی براکام دیکھیں اور اس سے نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اپنا عذاب بھیج دے۔

[سنن ابن ماجہ: باب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر ص ۸۹]

(۲) قربانی کے جانور میں کسی وہابی دیوبندی بدمذہب کی شرکت قربانی کو فاسد کردے گی اگر ایک بھی بدمذہب قربانی کے جانور میں شریک ہوا تو کسی کی بھی قربانی نہیں ہوگی، لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ دیوبندی وہابی کسی بھی بدمذہب کو قربانی میں شریک نہ کریں ورنہ سخت گنہگار ہوں گے۔ اور قربانی بھی ان سے ساقط نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ قربانی کے جانور میں اگر کوئی ایک شریک بھی کافرو مرتد و بدمذہب ہو تو اس کی طرف سے نیت تقرب حاصل نہیں ہوتی اور اگر شرکاء میں سے کوئی ایک بھی بنیت تقرب شریک نہ ہوا تو پھر کسی کی بھی قربانی نہیں ہوگی انہیں دوبارہ قربانی کرنا واجب ہوگا، ورنہ وہ گنہگار ہوں گے۔ ایسا ہی ہے عامہ کتب فقہیہ خاص کر فتاوی رضویہ، فتاوی عالمگیری و فتاوی شامی وغیرھا میں۔

ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ و رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم

فتوی ۱۲ اذان و اقامت میں شہادتین کے وقت انگلی کا اشارہ جائز ہے

مسئولہ: غلام شہنشاہ عالم ساکن بابر کھیڑا کاشی پور۔ یکم ربیع النور ۱۴۴۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں

ہمارے گاؤں میں عموماً لوگ اذان اور اقامت میں اشھد ان لاالہ الا اللہ، سنتے وقت کلمہ کی انگلی سے اشارہ کرتے ہیں اس طرح کہ ''اشھد ان لاالہ الا اللہ، کے ''لا'' پر سیدھے ہاتھ کی بیچ کی انگلی اور انگوٹھے کا حلقہ بناکر چھنگلیا یعنی چھوٹی انگلی اور اس کے پاس والی انگلی کو ہتھیلی سے ملاکر کلمہ کی انگلی اٹھاتے ہیں اور ''الا اللہ'' میں ''الا'' کے بعد انگلی گرادیتے ہیں۔ لوگوں کا یہ عمل ازروئے شرع کیسا ہے جواب مرحمت فرمائیں۔ اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

مذکورہ بالا عمل ازروئے شرع جائز ہے۔ البتہ اس کی صراحت احقر کو کتب احادیث وفقہ میں نظر نہیں آئی۔ لیکن اس عمل کا ثبوت حدیث وغیرہ میں نہ ہونا اس کے جواز کو مانع نہیں ہے۔ دراصل اذان وغیرہ میں شہادت کے دوران یہ عمل بیان توحید کے لئے ہوتا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے۔ نماز میں دوران تشہد اس اشارہ کا ثبوت حدیث میں موجود ہے اس لئے اس پر قیاس کرتے ہوئے بیان توحید کے لئے یہ اشارہ جائز بلکہ نیت کے اچھا ہونے کے سبب محمود و مستحسن ہے۔

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''جو مباح بہ نیت محمود کیا جائے شرعاً محمود ہو جاتا ہے جیسے مسی لگانا کہ عورت کو مباح ہے اور اگر شوہر کے لئے سنگار کی نیت سے لگائے تو مستحب کہ یہ نیت شرعاً محمود ہے'' [فتاوی رضویہ قدیم، ۹/۵۷] ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

فتوی ۱۳ جمعہ کی اذان خطبہ مسجد کے باہر دینا سنت ہے

مسئولہ: ناظم مشاہد رضوی، پیپل سانہ مراد آباد۔ ۲۹/ربیع النور، ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں

سرسادوراہے پر ایک مسجد ہے جس میں جمعہ کے دن خطبہ کی اذان مسجد کے اندر ہوتی چلی آرہی ہے، اب کچھ ہفتے سے خطبہ کی اذان مسجد کے باہر ہورہی ہے۔ جس پر کچھ لوگ اعتراض کررہے ہیں کہتے ہیں کہ اذان خطبہ مسجد کے اندر ہو یا باہر لیکن امام کے سامنے مؤذن کا ہونا شرط ہے، آپ سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں جو بھی شریعت کا حکم ہو اس سے آگاہ فرمائیں عنایت ہوگی۔

الجواب

اذان خطبہ ہو یا کوئی بھی اذان مسجد کے اندر جائز نہیں ہے، اور خطبہ کی اذان میں مؤذن کا امام کے سامنے ہونا خواہ وہ مسجد کے اندر ہی ہو یہ شرط غلط ہے۔ سنت یہ ہے کہ اذان مسجد کے باہر ہو اور امام کے سامنے ہو۔ مسجد کے اندر امام کے سامنے اذان پڑھنا جائز نہیں ہے اس لئے کہ اس سے دو خرابیاں لازم آرہی ہیں ایک تو مسجد کے اندر اذان کا پڑھنا جو جائز نہیں ہے۔ اور دوسرا مسجد سے باہر اذان ہونے والی سنت کا ترک کرنا۔ اذان خطبہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتی تھی وہ مسجد کے باہر ہوتی تھی، سنن ابوداؤ شریف میں ہے حضرت سائب بن یزید سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں:

''کان یؤذن بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا جلس علی المنبر یوم الجمعة علی باب المسجد''

(یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جمعہ کے روز منبر پر تشریف فرما ہوتے تو آپ کے سامنے مسجد کے دروازے پر اذان پڑھی جاتی تھی)

[ابوداؤدا/ ۲۸۵، باب النداء یوم الجمعۃ]

اس حدیث کے تحت فتح الباری شرح بخاری لابن رجب میں ہے:

''أن هذا الأذان لم يكن في نفس المسجد، بل على بابه، بحيث يسمعه من كان في المسجد ومن كان خارج المسجد، ليترك أهل الأسواق البيع ويسعوا إلى السعي إلى المسجد''

یعنی یہ اذان مسجد کے اندر نہیں ہوتی تھی بلکہ مسجد کے دروازے پر ہوتی تھی۔ تا کہ اسے مسجد کے اندر اور باہر والے سن لیں اور بازار والے سودے بازی چھوڑ کر مسجد میں آنے کی کوشش کریں۔

[فتح الباری: ۲۱۷/۸، باب الأذان یوم الجمعة]

حدیث مذکور اور اس کی شرح سے معلوم ہوا کہ اذان خطبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتی تھی مگر خارج مسجد۔ حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی الفلاح میں ہے: ''یکرہ أن یؤذن فی المسجد''، یعنی مسجد میں اذان دینا مکروہ ہے۔

[حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح: ۱۹۷/۱، باب الاذان]

فتاوی قاضی خاں میں ہے: ''یؤذن علی المئذنۃ اوخارج المسجد، ولایوذن فی المسجد''
(اذان منارہ پر یا خارج مسجد پڑھی جائے، مسجد کے اندر اذان نہ پڑھی جائے)

[فتاوی قاضی خاں، ۹۶/۱، باب الاذان]

حضور اعلی حضرت نے اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو فرمائی ہے اور نتیجتاً یہی فرمایا ہے کہ اذان خطبہ مسجد کے باہر ہو گی مسجد کے اندر اذان مکروہ و منع ہے۔ فرماتے ہیں:

''یہاں دو سنتیں ہیں ایک محاذات خطیب دوسرے اذان کا مسجد سے باہر ہونا جب ان میں تعارض ہو تو ارجح کو اختیار کیا جائے گا ... یہاں ارجح واقوی سنت ثانیہ (یعنی اذان کا مسجد سے باہر ہونا ہے)''

[فتاوی رضویہ قدیم، ۷۳۱/۳، ۷۳۰]

اور پھر اپنے اس دعوی پر دلائل کا انبار لگانے کے بعد بحث کا لب لباب پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ثابت ہوا کہ اذان بیرون مسجد ہونا ہی محاذات خطیب سے اہم واعظم واکد الزم ہے تو جہاں دونوں نہ بن پڑیں محاذات خطیب سے درگزریں اور منارہ یا فصیل وغیرہ پر یہ اذان بھی مسجد سے باہر ہی دیں۔'' [مرجع سابق]

الحاصل:۔ خطبہ کی اذان امام کے سامنے تب سنت ہے جب کہ مسجد کے باہر ہو اگر مسجد کے اندر ہو گی تو خلاف سنت ہو گی۔ اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ اذان خطبہ مسجد سے باہر ہونے دیں۔امام کے محاذات کے چکر میں اذان کے مسجد میں ہونے کی کراہت کے مرتکب نہ بنیں۔علاوہ ازیں شریعت کے معاملات میں دخل اندازی کر کے اپنی آخرت خراب نہ کریں۔

ھٰذا ماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ

اذان ثانی مسجد کے باہر ہی ہونا سنت ہے
اجماع سے متعلق مسائل
مائک میں بھی اذان دینے میں کانوں میں انگلیاں ڈالی جائیں اور سر گھمایا جائے

فتوی ۱۴

مسئولہ: محمد عبد الرشید قادری پیلی بھیتی۔ ۱۴/ جمادی الاولیٰ، ۱۴۴۰ھ

کیا فرماتے ہیں علماے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

(۱) جمعہ کی اذان خطبہ کہاں ہونی چاہئے؟ مسجد کے اندر سب سے اگلی صف میں یا خارج مسجد ممبر کے سامنے؟

(۲) حدیث وفقہ میں اس اذان کے مسجد کے اندر سب سے اگلی صف میں یا خارج مسجد ہونے کی کوئی صراحت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا؟

(۳) یہ اذان زمانۂ رسالت وزمانۂ خلفاے راشدین میں کہاں ہوتی تھی مسجد کے اندر سب سے اگلی صف میں یا باہر؟

(۴) اگر ان متبرک زمانوں میں یہ اذان باہر خارج مسجد ممبر کے سامنے ہوتی تھی تو مسجد کے اندر سب سے اگلی صف میں کب شروع ہوئی اور کس نے شروع کی اور اس کے شروع کرنے کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟

(۵) کیا اس اذان کے مسجد کے اندر سب سے اگلی صف میں ہونے پر امت کا اجماع ہو چکا ہے؟ اگر ہو چکا ہے تو یہ اجماع کب ہوا اور جمہور نے اس کو کس نظر سے دیکھا؟

(۶) اگر آج اس اذان خطبہ کے مسجد کے اندر سب سے اگلی صف میں ہونے پر اجماع کا دعوی کرے تو اس کا یہ دعوی شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

(۷) اجماع کب معتبر ہے؟ کس کا معتبر ہے؟ نیز اجماع کی کتنی قسمیں ہیں؟ اگر اجماع حدیث وفقہ کے خلاف ہو تو وہ قابل عمل ہو گا یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

(۸) چودہ سو سال میں کتنے مسائل پر امت کا اجماع ہوا؟ اس کی کوئی تفصیل کتب دینیہ میں موجود ہے یا نہیں؟

(۹) چودہ سو سال میں کتنی سنتیں مردہ ہوئیں اور ان کو کس کس نے زندہ کیا؟ تاریخ وسیر کی کتابوں میں اس کی کوئی تفصیلات ملتی ہیں یا نہیں؟ اگر ملتی ہیں تو کیا؟

(۱۰) فقہ کی کتابوں میں اذان کے وقت کانوں میں انگلیاں ڈالنے یا کانوں پر ہاتھ رکھنے کا حکم ہے اور حی علی الصلاۃ وحی علی الفلاح کہتے وقت داہنے بائیں منہ گھمانے کا حکم آیا ہے تو کیا اب زمانہ موجودہ میں لاوڈا سپیکر سے اذان ہونے کے سبب یہ حکم موقوف اور اس کی استحبابیت وضرورت ختم ہو گئی ہے؟ بارگاہ حضور میں گزارش ہے کہ جوابات صاف اور جامع الفاظ میں تحریر فرمائیں۔ مہربانی ہو گی۔

الجواب

(۱) جمعہ کی اذان خطبہ خارج مسجد، ممبر کے سامنے ہونی چاہئے۔

(۲) حدیث وفقہ میں کہیں بھی اذان خطبہ مسجد کے اندر اگلی صف میں ہونے کی صراحت نہیں ہے۔ ہاں البتہ اذان خطبہ کے مسجد کے باہر دروازہ پر ہونے سے متعلق حدیث وفقہ میں بہت سے دلائل صراحتاً ذکر ہیں۔ ہم یہاں دو چند ذکر کر دیتے ہیں۔

حدیث کی معتبر مستند کتاب ''سنن ابوداؤ شریف'' میں حضرت سائب بن یزید سے مروی، وہ کہتے ہیں:

''کان یؤذن بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا جلس علی المنبر یوم الجمعة علی باب المسجد''

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جمعہ کے روز منبر پر تشریف فرماہوتے تو آپ کے سامنے مسجد کے دروازے پر اذان پڑھی جاتی تھی۔ [سنن ابوداؤد: ۱/۲۸۵، باب النداء یوم الجمعة]

اس حدیث کے تحت فتح الباری شرح بخاری لابن رجب میں ہے

''أن هذا الأذان لم یکن فی نفس المسجد، بل علی بابه، بحیث یسمعه من کان فی المسجد ومن کان خارج المسجد، لیترك أهل الأسواق البیع ویسعوا إلی السعی إلی المسجد''

یعنی یہ اذان مسجد کے اندر نہیں ہوتی تھی بلکہ مسجد کے دروازے پر ہوتی تھی تاکہ اس کو مسجد والے اور مسجد سے باہر والے سنیں اور کاروباری لوگ کاروبار چھوڑ کر مسجد کی طرف آنے میں جلدی کریں۔ [۸/۲۱۷، باب الأذان یوم الجمعة]

حدیث مذکور اور اس کی شرح سے معلوم ہوا کہ اذان خطبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتی تھی مگر خارج مسجد۔

حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی الفلاح میں ہے:

''یکرہ أن یؤذن فی المسجد''، یعنی مسجد میں اذان دینا مکروہ ہے۔[۱/۱۹۷، باب الاذان]

فتاوی قاضی خاں میں ہے ''یؤذن علی المئذنۃ او خارج المسجد، ولا یوذن فی المسجد''

(اذان منارہ پر یا خارج مسجد پڑھی جائے، مسجد کے اندر اذان نہ پڑھی جائے)

[فتاوی قاضی خاں، ۱/۹۶، باب الاذان]

حضوراعلی حضرت نے اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو فرمائی ہے اور نتیجتاً یہی فرمایاہے کہ اذان خطبہ مسجد کے باہر ہوگی مسجد کے اندر اذان مکروہ و منع ہے۔ فرماتے ہیں:

''یہاں دو سنتیں ہیں ایک محاذات خطیب دوسرے اذان کامسجد سے باہر ہوناجب ان میں تعارض ہو تو ارجح کو اختیار کیا جائے گا ... یہاں ارجح واقوی سنت ثانیہ (یعنی اذان کامسجد سے باہر ہونا ہے)''[فتاوی رضویہ قدیم، ۳/۷۳۰۔۷۳۱]

اور پھر اپنے اس دعوی پر دلائل کا انبار لگانے کے بعد بحث کا لب لباب پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ثابت ہوا کہ اذان بیرون مسجد ہونا ہی محاذات خطیب سے اہم واعظم واکد الزم ہے تو جہاں دونوں نہ بن پڑیں محاذات خطیب سے در گزریں اور منارہ یا فصیل وغیرہ پر یہ اذان بھی مسجد سے باہر ہی دیں۔''[مرجع سابق]

(۳) زمانہ رسالت وصحابہ کرام میں اذان خطبہ مسجد سے باہر منبر کے سامنے ہوتی تھی۔

سنن ابو داؤد شریف میں سائب بن یزید سے مروی

''أن الأذان کان أوله حین یجلس الإمام علی المنبر یوم الجمعة فی عهد النبی صلی الله علیه وسلم، وأبی بکر، وعمر رضی الله عنهما، فلما کان خلافة عثمان، وکثر الناس أمر عثمان یوم الجمعة بالأذان الثالث، فأذن به علی الزوراء، فثبت الأمر علی ذلك''

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن منبر پر تشریف رکھتے تو حضور کے سامنے مسجد کے دروازے پر اذان ہوتی اور ایسا ہی ابو بکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانے میں۔

(۴) اذان خطبہ مسجد کے اندر کب کس نے شروع کی اور اس کی شرعی کیا حیثیت ہے اس کی تفصیل حضور اعلیٰ حضرت سے ملاحظہ کریں:

''صدر خلافت امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک وہی ایک اذان خطبہ تھی انھوں نے اذانِ اول زائد فرمائی مگر اذانِ خطبہ میں کوئی تبدیلی نہ کی، نہ کسی خلیفہ راشد سے اس میں کوئی تغییر منقول، ہاں امام ابن الحاج مکی نے مدخل میں ہشام بن عبد الملک بادشاہ مروانی کی نسبت لکھا کہ اس نے سنت کو بدلا اس کا زمانہ امیر المومنین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی (۸۰) برس بعد ہوا۔''[فتاوی رضویہ جدید، ۸/۴۰۲] مزید فرماتے ہیں:

''زمانہ اقدس حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں صرف ایک اذان ہوتی تھی جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوتے حضور کے سامنے مواجہہ اقدس میں مسجد کریم کے دروازے پر۔ زمانہ اقدس میں مسجد شریف کے صرف تین دروازے تھے ایک مشرق کو جو حجرہ شریفہ کے متصل تھا جس میں سے حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

مسجد میں تشریف لاتے اس کی سمت پر اب بابِ جبریل ہے، دوسرا مغرب میں جس کی سمت پر اب باب الرحمۃ ہے، تیسرا شمال میں جو خاص محاذیِ منبر اطہر تھا صحیح بخاری شریف میں انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے:

دخل رجل یوم الجمعة من باب کان وجاه المنبر، ورسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم قائم یخطب، فاستقبل رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم قائما، فقال یا رسول الله الحدیث۔

ایک شخص جمعہ کے دن اس دروازے سے داخل ہوا جو منبر کے سامنے ہے اور رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمارہے تھے تو وہ شخص آپ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو کر عرض کرنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ الحدیث۔ اس دروازے پر اذانِ جمعہ ہوتی تھی کہ منبر کے سامنے بھی ہوئی اور مسجد سے باہر بھی۔ زمانہ صدیق اکبر وعمر فاروق وابتدائے خلافتِ عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں یہی ایک اذان ہوتی رہی جب لوگوں کی کثرت ہُوئی اور شاہی حاضری میں قدرے کسل واقع ہوا۔ امیر المومنین عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک اذان شروع خطبہ سے پہلے بازار میں دلوانی شروع کی، مسجد کے اندر اذان کا ہونا ائمہ نے منع فرمایا اور مکروہ لکھا ہے اور خلافِ سنّت ہے، یہ نہ زمانہ اقدس میں تھا نہ زمانہ خلفائے راشدین نہ کسی صحابی کی خلافت میں۔ نہ تحقیق معلوم کہ یہ بدعت کب سے ایجاد ہوئی نہ ہمارے ذمہ اس کا جاننا ضرور، بعض کہتے ہیں کہ ہشام بن عبد الملک مروانی بادشاہ ظالم کی ایجاد ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

بہر حال جبکہ زمانہ رسالت وخلافت ہائے راشدہ میں نہ تھی اور ہمارے ائمہ کی تصریح ہے کہ مسجد میں اذان نہ ہو مسجد میں اذان مکروہ ہے۔ تو ہمیں سنّت اختیار کرنا چاہئے بدعت سے بچنا چاہئے اس تحقیقات سے پہلے کہ سنّت پہلے کس نے بدلی، اللہ تعالیٰ ہمارے بھائیوں کو توفیق دے کہ اپنے نبی کریم علیہ افضل الصلاۃ والتسلیم کی سنّت اور اپنے فقہائے کرام کے احکام پر عامل ہوں اور ان کے سامنے رواج کی آڑ نہ لیں" [فتاوی رضویہ جدید، ۵/۴۰۷، ۴۰۶]

(۵) احادیث وفقہ کی کتابوں میں جب اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اذان خطبہ خارج مسجد ہوتی تھی تو پھر اندرون مسجد اذان خطبہ کا اجماع بھلا کہاں سے ثابت ہو سکتا ہے۔ جس کا شرعاً کوئی وجود ہی نہیں ہے اس پر بھلا اجماع کہاں سے ہو گا اور جب اجماع ہوا نہیں تو پھر اس خیالی اجماع کی مخالفت کون اور کیوں کرے گا؟

(۶) اذان خطبہ اندرون مسجد ہونے پر اجماع کا دعوی سراسر نادرست ونامقبول ہے۔ کیوں کہ حدیث وفقہ کی کتابوں سے اندرون مسجد اذان کا مکروہ ہونا ثابت ہے۔ تو بھلا یہ اجماع کہاں سے ثابت ہے؟

(۷) ایک وقت کے تمام پرہیز گار، غیر فاسق مجتہدین جو اصول فقہ میں عبور رکھتے ہوں جب کسی مسئلہ پر متفق ہو جائیں تو یہ اجماع حجت ومعتبر ہو گا۔ اصول سرخسی میں ہے:

فاما المذهب عندنا ان الحجة اتفاق کل عالم مجتهد ممن هو غیر منسوب الی هوی ولا معلن بفسق فی کل عصر''

ہمارے مذہب میں ہر زمانے میں ہر عالم مجتہد جو فاسق معلن اور نفس پرستی کی طرف منسوب نہ ہو کا اتفاق واجماع حجت ہے۔

[اصول السرخسی: ج ۱ ص ۳۱۱]

اصول الشاشی میں ہے:

المعتبرفی ھٰذاالباب اجماع اھل الرای والاجتھاد فلایعتبربقول العوام والمتکلم والمحدث الذی لابصیرۃ لہ فی اصول الفقہ''،یعنی مجتہدین کا اجماع معتبر ہے عوام اور علم کلام والے اور محدث جو اصول فقہ سے واقف نہیں ان کا اجماع معتبر نہیں ہے۔[اصول الشاشی:الاصل الثالث،الاجماع۔ص ۷۹]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''اجماع میں ایک وقت کے تمام مجتہدین کا اتفاق درکار ہے ایک کے خلاف سے بھی اجماع نہیں رہتا اور کسی مجلس کے فیصلہ کو اجماع ٹھہرانا سخت سے سخت نادانی ہے، شہر بھر کے فقہاء کا اتفاق تو اجماع درکنار فقیہ کے مقابل اصلاً حجت نہیں ہوتا، نہ کہ اراکین مجلس کا فیصلہ جن میں اکثر بے علم ہوتے ہیں بلکہ بہت جگہ کل۔''[فتاوی رضویہ جدید:جلد ۱۸ ص ۴۹۳]

اوراجماع کی بنیادی دو قسمیں ہیں:

(۱)۲اجماع عزیمت جس کو اجماع اصلی بھی کہا جاتا ہے(۲)اجماع رخصت جسے اجماع سکوتی بھی کہا جاتا ہے۔

اجماع عزیمت کی دو قسمیں ہیں۔اجماع قولی(۲)اجماع فعلی

نقل کے اعتبار سے اجماع کی تین قسمیں ہیں:(۱)تواتر(۲)شہرت(۳)آحاد۔

اہل اجماع کے اعتبار سے اجماع کی چار قسمیں ہیں:

(۱)اجماع صحابہ(۲)صحابہ میں سے بعض کا اجماع بعض ک اس کوت(۳)اجماع تابعین(۴)اجماع متاخرین۔

حکم کے اعتبار سے اجماع کی دو قسمیں ہیں:(۱)اجماع قطعی(۲)اجماع ظنی۔

مزید تفصیل کے لیے،اصول الشاشی،وغیرہ اصول فقہ کی کتابیں دیکھیں۔

اور حدیث وفقہ کی مخالفت جو یقیناً گمراہی ہے اس پر اجماع شرعی کا تحقق محال شرعی ہے۔کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''إن أمتی لا تجتمع علی ضلالۃ''،یعنی میری امت کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی۔

[سنن ابن ماجہ:ج ۱۳۰۳/۲،باب السواد الاعظم]

اور فرمایا:''إن اللہ لا یجمع أمتی علی ضلالۃ''،یعنی اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا۔

[سنن ترمذی:ج ۴ص ۳۵۔باب ما جاء فی لزوم الجماعۃ]

اس لیے جو حدیث وفقہ کے خلاف ہو وہ اجماع نہیں ہو سکتا۔ہاں البتہ بعض امتیوں کا رواج وتوارث ہو سکتا ہے جسے انہوں نے اجماع کا نام دے دیا ہو۔تو اس کا حکم بھی یہی ہے کہ وہ حدیث وفقہ کے خلاف ہونے کے سبب خلاف شرع اور نا قابل قبول ہے۔اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''اور کچھ لوگوں کا توارث جب حدیث وفقہ کے خلاف ہو تو لائق استدلال نہیں ہوتا''[فتاوی رضویہ جدید:ج ۲۸ ص ۲۴۹]

مزید فرماتے ہیں:

''اس حدیث جلیل نے واضح کر دیا کہ اس روبروئے امام پیشِ منبر کے کیا معنی ہیں اور یہ کہ زمانہ رسالت وخلفائے راشدین کے کیا متوارث ہے،ہاں یہ کہئے کہ اب ہندوستان میں یہ اذان متصل منبر کہیں شائع ہو رہی ہے مگر نصِ حدیث سے جُدا،تصریحات

فقہ کے خلاف، کسی بات کا ہندیوں میں رواج ہو جانا کوئی حجت نہیں"[مرجع سابق:ج۸ص ۵۰۲]

(۸) اجماعی مسائل کی تعداد یقینی طور پر نہیں بتائی جاسکتی ہے۔البتہ بعض کتابوں میں اجماعی مسائل کی تعداد بیس ہزار سے زائد بتائی گئی ہے۔بحر المحیط للزرکشی میں ابو اسحاق اسفرائینی کے حوالے سے لکھا ہے:

''وقال الأستاذ أبو إسحاق الإسفرايينی فی شرح الترتيب نحن نعلم أن مسائل الإجماع أكثر من عشرين ألف مسألة''

یعنی استاد ابو اسحاق اسفرائنی نے اپنی کتاب "شرح ترتیب" میں فرمایا: ہم جانتے ہیں کہ اجماعی مسائل بیس ہزار سے زیادہ ہیں۔

[بحر المحیط للزرکشی:ج۶ص ۳۸۴]

یہ ایک اندازہ ہے ورنہ تو اجماعی مسائل کی حتمی تعداد کا پتہ لگانا قریب المحال ہے۔علامہ عبد العلی فرنگی محلی مسلم الثبوت کی شرح فواتح الرحموت میں لکھتے ہیں:

''ان العلم بالاجماع علی طریق النقل مستحیل او متعسر''یعنی بطور نقل اجماعی مسائل کا محال یاد شوار ہے۔

[فواتح الرحموت:ج۲ص ۲۶۱]

(۹) چودہ سو سالوں میں کس قدر سنتیں مردہ ہوئیں اور کتنی سنتوں کا احیا ہوا اس کا اندازہ لگا پانا مشکل امر ہے۔اس کی تفصیل فقیر کی نظر سے نہیں گزری۔ہاں البتہ اذان خطبہ جمعہ کا خارج مسجد ہونا سنت ہے اور یہ سنت درمیان میں مردہ ہو گئی تھی مگر الحمد للہ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے اس کا احیا فرمایا۔اعلیٰ حضرت خود فرماتے ہیں:

"الحمد للہ یہاں اس سنّت کریمہ کا احیاء رب عزوجل نے اس فقیر کے ہاتھ پر کیا، میرے یہاں مؤذنوں کی مسجد میں اذان دینے سے ممانعت ہے، جمعہ کی اذانِ ثانی بحمد اللہ تعالیٰ منبر کے سامنے دروازہ مسجد پر ہوتی ہے جس طرح زمانہ اقدس حضور پُر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وخلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ہوا کرتی تھی۔"[فتاوی رضویہ جدید:ج۸ص ۵۰۲]

(۱۰) اذان کے وقت کانوں میں انگلیاں ڈالنا سنت مستحبہ ہے۔حدیث شریف میں ہے:

''أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أمر بلالا أن يجعل إصبعيه فی أذنيه، وقال: إنه أرفع لصوتك''

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں کیوں کہ اس سے آواز بلند ہوتی ہے۔[سنن ابن ماجہ: ۲۳۶/۱۔باب السنة فی الأذان]

حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

''يستحب، أن يجعل أصبعيه فی أذنيه''یعنی اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالنا مستحب ہے۔

[حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح: ۷۹/۱]

اور حیعلتین میں چہرہ پھیرنا مستحب ہے۔حی علی الصلاۃ پر دائیں اور حی علی الفلاح پر بائیں چہرہ پھیرنے کا حکم ہے۔

حاشیہ طحطاوی میں ہے:

''و''يستحب''أن يحول وجهه يمينا بالصلاة ويسارا بالفلاح''

یعنی حی علی الصلاۃ پر دائیں اور حی علی الفلاح پر بائیں طرف چہرہ پھیرنا مستحب ہے۔[مرجع سابق]

لٰہٰذا افضل و بہتر یہی ہے کہ کانوں میں انگلیاں ڈال کر ہی اذان پڑھی جائے۔ اور حیعلتین میں دائیں بائیں رخ پھیر لیا جائے۔ خواہ لاؤڈا سپیکر پر اذان پڑھے یا بغیر لاؤڈا سپیکر کے۔ البتہ کوئی اس کو ترک کرتا ہے تو شرعاً مجرم و گنہگار نہیں ہے۔

ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

نوٹ: آپ کے ارسال کردہ سوالات کے قریب چھ سوالات لکھ چکا تھا کہ کسی مسئلہ کے سلسلے میں کتب فتاوی سے مراجعت کی تو اچانک ''فتاوی مرکز تربیت افتا'' کی پہلی جلد میں آپ کے یہ سوالات نظر آئے اور ان کے جوابات بھی اس میں موجود تھے۔ جو ۱۴۳۲ھ میں لکھے گئے، دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ جب سوالات کے شافی جوابات آپ حاصل کر چکے ہیں تو اب آٹھ سال بعد ان سوالات کے جوابات کی دوبارہ کیا ضرورت محسوس ہوئی۔ خیر چار جوابات رہ گئے تھے اس لیے مکمل کر دئے۔ میرے جوابات فتاوی مرکز تربیت افتا کے جوابات سے الگ نہیں ہیں۔ البتہ عبارات و نصوص کا اضافہ ضرور ہے۔ اگر مجھے پہلے سے جوابات کا علم ہو جاتا تو میں انہیں جوابات کو آپ تک پہنچا دیتا۔ خیر آئندہ اس طرح کے سوالات جن کے جوابات مل چکے ہوں دوبارہ نہ بھیجیں۔ فقط، نعیمی۔

فتوی ۱۵ — اقامت بیٹھ کر سننا اور حی علی الصلاۃ پر کھڑا ہونا سنت ہے

مسئولہ: محمد عتیق، محمد عثمان، شیر محمد۔ خوشحال پور ٹانڈہ بادلی رامپور۔ ۱۸/ ذی الحجہ ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ

اقامت یعنی تکبیر کے وقت شروع تکبیر سے کھڑا ہونا چاہئے یا حی علی الصلاۃ پر کھڑا ہونا چاہئے، آیا ان دونوں میں بہتر طریقہ کون سا ہے؟ بہت ساری فقہ حنفی کی معتبر کتابوں سے صفحہ نمبر کے حوالہ کے ساتھ تحریر فرمائیں تاکہ نہ ماننے والوں کو آسانی کے ساتھ کتاب کھول کر مسئلہ دکھا دیا جائے۔ اور جو کتابیں دکھانے کے بعد بھی نہ مانے شریعت کا اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

الجواب

اقامت بیٹھ کر سننا اور حی علی الصلاۃ پر کھڑا ہونا ہی سنت و مستحب اور افضل عمل ہے۔ اس پر علمائے اہل سنت نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ہم یہاں حدیث، شروحات حدیث، فقہ حنفی اور خود کھڑے ہو کر تکبیر سننے والوں کے معتمد علما کی کتابوں سے دو چند حوالے درج کئے دیتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اذا اقیمت الصلاۃ فلا تقوموا حتی ترونی''

جب نماز قائم ہو تو جب تک مجھے نہ دیکھ لو کھڑے مت ہو۔ [صحیح البخاری، باب متی یقوم الناس، ۸۸/۱]

علامہ عینی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

''فلا تقوموا حتی ترونی "بعد ذلك (فإن قلت) ما الحكمة فی هذا النهی (قلت) لئلا یطول علیهم القیام''

نہ کھڑے ہو یہاں تک کہ مجھے دیکھ لو اس کے بعد کھڑے ہو۔ تو اگر تم کہو کہ اس منع کرنے میں کیا حکمت ہے تو میں کہوں گا اس لئے کہ مقتدیوں پر قیام لمبا نہ ہو جائے۔ [عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، ۲۲۵/۳]

علامہ عینی کے قول کے مطابق تو مفہوم یہ نکلتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اس لئے منع کیا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پہلے ہی کھڑے ہو جاتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دیر میں آتے تھے تو ان صحابہ کا قیام لمبا ہو جاتا تھا یہ تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اقامت شروع ہوتے ہی صحابہ کھڑے ہو جاتے ہوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر ختم ہونے کے وقت حی علی الصلاۃ کہے جانے پر تشریف لاتے ہوں۔ ملا علی قاری کی درج ذیل تشریح سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے۔

ملا علی قاری اس حدیث شریف کی شرح میں فرماتے ہیں:

''ولعله عليه السلام كان يخرج من الحجرة بعد شروع المؤذن في الاقامة ويدخل في محراب المسجد عند قوله حي على الصلاة ولذا قال ائمتنا ويقوم الامام والقوم عند حي على الصلاة''

غالباً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ سے مؤذن کے اقامت شروع کر دینے کے بعد نکلتے تھے اور مؤذن کے قول حی علی الصلاۃ کے وقت مسجد کی محراب میں داخل ہوتے تھے اسی وجہ سے ہمارے ائمہ نے فرمایا کہ امام اور قوم حی علی الصلاۃ کے وقت کھڑے ہوں۔ [مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح، باب الاذان، ۳۱۸/۲]

علامہ ابن حجر اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

''عن ابی حنیفة یقومون اذا قال حی علی الفلاح''

ابو حنیفہ علیہ الرحمہ سے مروی ہے کہ لوگ اس وقت کھڑے ہوں جب مؤذن حی علی الفلاح کہے۔

[فتح الباری لابن حجر، باب متی یقوم الناس، ۴۵۱/۲]

امام نووی شرح مسلم اس حدیث کے تحت کلام کرتے ہوے فرماتے ہیں:

''وقال أبو حنيفة رضى الله عنه والكوفيون يقومون فى الصف إذا قال حى على الصلاة فإذا قال قد قامت الصلاة كبر الإمام''

ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ اور کوفی حضرات نے کہا کہ لوگ صف میں حی علی الصلاۃ کے وقت کھڑے ہوں اور جب مکبر قد قامت الصلاۃ کہے تو امام تکبیر کہے۔ [شرح النووی علی مسلم، ۱۰۳/۵]

تحفۃ الملوک لزین الدین الرازی الحنفی میں ہے:

''السنة قیام الامام والقوم عند قول المؤذن حی علی الفلاح''

امام اور قوم کا مؤذن کے قول حی علی الفلاح کے وقت کھڑا ہونا سنت ہے۔ [جلد ۱ ص ۶۸، باب موضع تکبیر الامام]

امام کاسانی فرماتے ہیں:

''ان المؤذن اذا قال حی علی الفلاح فان کان الامام معهم فی المسجد یستحب للقوم ان یقوموا فی الصف''

مؤذن جب حی علی الفلاح کہے تو اگر امام مقتدیوں کے ساتھ ہو مسجد میں تو قوم کے لئے صف میں کھڑا ہو جانا مستحب ہے۔

[بدائع الصنائع: ج ۱ ص ۲۰۰ فصل بیان حکم التکبیر أیام التشریق]

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

''اذاقال المؤذن فی الاقامة حی علی الصلاة قام الامام والجماعة عندعلمائناالثلاثة للاجابة ....وفی الوقایةو یقوم الامام والقوم عندحی علی الصلاة''

جب مؤذن اقامت میں حی علی الصلاۃ کہے توامام اور جماعت ہمارے تینوں علما کے نزدیک جواب دینے کے لئے....اوروقایہ میں ہے کہ امام اور قوم حی علی الصلاۃ کے وقت کھڑے ہو جائیں۔[۲۱۱/۱]

محیط برہانی میں ہے: ''یقوم الامام والقوم اذاقال المؤذن حی علی الفلاح عندعلمائنا الثلاثة رحمهم الله''

ہمارے تینوں علما کے نزدیک امام اور قوم مؤذن کے قول حی علی الفلاح کے وقت کھڑے ہو جائیں۔[آداب الصلاۃ، ۱۶/۲]

کتاب المبسوط للشیبانی میں ہے:

''اذاکان الامام معهم فی المسجدفانی احب الیهم ان یقوموافی الصف اذاقال المؤذن حی علی الفلاح''

جب امام مسجد میں مقتدیوں کے ساتھ ہو تو مجھے محبوب ہے کہ وہ مؤذن کے قول حی علی الفلاح کے وقت صف میں کھڑے ہو جائیں[باب افتتاح الصلاۃ، ج ۱ ص ۶]

حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

''واذا اخذ الموذن فی الاقامة ودخل رجل المسجد فانه یقعد ولا ینتظرقائما فانه مکروه''

اور جب مؤذن نے اقامت شروع کی اور کوئی شخص مسجد میں داخل ہوا تو وہ بیٹھ جائے، کھڑے ہو کر انتظار نہ کرے کیوں کہ یہ مکروہ ہے۔[کتاب الصلاۃ ص ۲۷۸]

اور پھر اس سے نتیجہ اخذ فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''ویفهم منه کراهة القیام ابتداء الاقامة والناس عنها غافلون''

اس سے سمجھ آتا ہے کہ ابتدائے اقامت میں کھڑا ہونا مکروہ ہے اور لوگ اس سے غافل ہیں۔[مرجع سابق]

ردالمحتار میں ہے: ''یکره له الانتظار قائماولکن یقعدثم یقوم اذابلغ المؤذن حی علی الفلاح''

کھڑے ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے بیٹھ جائے پھر جب مؤذن حی علی الفلاح پر پہنچے تو کھڑا ہو۔[باب الاذان، ۷۱/۲]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''اذادخل الرجل عند الاقامة یکره له الانتظار قائماولکن یقعد ثم یقوم اذابلغ المؤذن قوله حی علی الفلاح کذافی المضمرات۔ ان کالموذن غیرالامام وکان القوم مع الامام فی المسجدفانه یقوم الامام والقوم اذاقال المؤذن حی علی الفلاح عندعلمائناالثلاثة وهو الصحیح''

اس عربی عبارت کا ترجمہ دیوبندی عالم مولوی امیر علی نے اس طرح کیا ہے:

جب کوئی شخص اقامت کے وقت داخل ہو تو اس کو کھڑے ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے، بلکہ بیٹھ جائے پھر مؤذن جب حی علی الفلاح کہے تو کھڑا ہو ایسا ہی مضمرات میں لکھا ہے۔ اگر مؤذن امام کے سوا کوئی اور ہو اور نمازی مع امام کے مسجد کے اندر ہوں تو مؤذن جس وقت اقامت میں حی علی الفلاح کہے اس وقت ہمارے تینوں علما کے نزدیک امام اور نمازی کھڑے ہو جائیں، یہی

صحیح ہے۔[۱/۵۷، الفصل فی کلمات الاذان والاقامۃ]
علامہ عبد الحی لکھنوی جو دیوبندی جماعت کے نزدیک بھی مسلم ہیں تعلیق المجد علی موطا محمد "میں لکھتے ہیں :
"قال ابوحنیفة واصحابه اذالم یکن معهم الامام فی المسجد فانهم لایقومون حتی یروا الامام .... واذاکان معهم فانهم یقومون اذاقال حی علی الفلاح"
ابو حنیفہ اوران کے اصحاب نے فرمایا کہ جب مسجد میں مقتدیوں کے ساتھ امام نہ ہو تو مقتدی حضرات جب تک امام کو نہ دیکھ لیں کھڑے نہ ہوں، اور جب امام مقتدیوں کے ساتھ ہو تو مقتدی، مکبر کے قول حی علی الفلاح کے وقت کھڑے ہوں۔
[تعلیق الممجد علی موطا محمد، ص ۳۷۳]
یہی علامہ عبد الحی لکھنوی اپنی کتاب معین المفتی والسائل میں لکھتے ہیں :
"یقوم الامام عند حی علی الصلاة کذا فی الهدایة والوقایة وفی الخلاصة والخزانة انهم یقومون عند حی علی الفلاح"
اس عربی عبارت کا ترجمہ دیوبندی جماعت کے نامور عالم مفتی عتیق مظاہری استاد حدیث دارالعلوم جامع الہدی گل شہید مرادآباد، نے یہ کیا ہے۔
"امام حی علی الصلاۃ پر کھڑا ہو جائے، جیسا کہ ہدایہ، اور وقایہ وخلاصہ وخزانہ میں ہے۔ وہ یعنی مقتدی کھڑے ہوں حی علی الفلاح پر"[معین المفتی والسائل مع نفع المفتی والسائل، ص ۱۷۳]
دیوبندی جماعت کے مفتی اعظم، دارالعلوم دیوبند کے پہلے مستقل مفتی، عزیز الرحمن صاحب اپنے ایک فتوی میں لکھتے ہیں:
"نماز کے آداب میں سے ہے فقہا نے یہ لکھا ہے کہ حی علی الفلاح کے وقت سب کھڑے ہو جاویں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر پہلے سے مقتدی کھڑے ہو جاویں تو کچھ محل اعتراض نہیں ہے، کیوں کہ ترک استحباب اور ترک ادب پر کچھ طعن نہیں ہو سکتا۔ البتہ بہتر یہی ہے جیسا کہ فقہا نے لکھا ہے۔ اور در مختار میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر امام آگے کی طرف سے یعنی سامنے سے آوے تو جس وقت امام پر نظر پڑے مقتدی کھڑے ہو جاویں، بہر حال اس میں ہر طرح وسعت ہے، مگر اتباع تصریحات فقہا کا اولی وافضل ہے"[فتاوی دارالعلوم دیوبند، جلد ۲ ص ۱۱۳، ۱۱۲، مکتبہ دارالعلوم دیوبند]
دیوبندی جماعت کے معتمد عالم علامہ کتب الدین خاں دہلوی کی کتاب مظاہر حق شرح مشکوۃ جس کی ترتیب جدید فاضل دیوبند مولوی عبد اللہ جاوید غازی پوری نے کی ہے۔ اس میں لکھا ہے:
"فقہا نے لکھا ہے کہ تکبیر کہنے والا جب حی علی الصلوۃ کہے تو مقتدیوں کو اس وقت کھڑے ہونا چاہئے"
[مظاہر حق جدید شرح مشکوۃ جلد ۱ ص ۴۷۵]
دیوبندی جماعت کے مشہور مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں"
"امام اعظم ابو حنیفہ کے مذہب میں وہ تفصیل ہے جو عالمگیری اور بدائع کے حوالے سے اوپر مذکور ہوئی کہ امام اور مقتدی اگر اقامت سے پہلے ہی مسجد میں موجود تھے تو صحیح روایت کے مطابق "حی علی الفلاح" پر اٹھ جانا چاہئے"
[جواہر الفقہ جلد دوم ص ۴۳۷]

مزید لکھتے ہیں ”خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت امام اور مقتدی سب اقامت سے پہلے سے مسجد میں موجود ہوں توامام اعظم ابو حنیفہ ،امام احمد بن حنبل، کے نزدیک آخر اقامت پر کھڑا ہونا افضل ہے“[مرجع سابق، ص۴۳۸]

الحاصل:۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور دیگر فقہائے احناف کے نزدیک امام اور مقتدی اگر مسجد میں موجود ہوں (اور عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے) تو اقامت بیٹھ کر سننا، اور مکبر جب حی علی الصلاۃ کہے تو کھڑا ہونا مستحب وافضل ہے۔ اور اس بات کا اقرار دیوبندی جماعت کے علمانے بھی کیا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا۔ تو اب اس مستحب اور افضل عمل کے خلاف کرنا، اور اس پر بضد رہنا اور نئی نئی تاویلیں نکالنا کہاں کا انصاف ہے؟

یہ کہنا کہ شروع میں صفوں کو درست کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کیا یہ بات فقہائے احناف کو پتہ نہیں تھی بالکل پتہ تھی مگر پھر بھی انہوں نے بیٹھ کر تکبیر سننے کو مستحب وافضل اور کھڑے ہو کر تکبیر سننے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ کیوں کہ مسجدوں میں صفوں میں عام طور پر لوگ پہلے آکر بیٹھ جاتے ہیں تو اب حی علی الصلاہ پر کھڑے ہو کر آخر تکبیر تک اتنا وقت رہتا ہے کہ صفیں درست کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام محمد فرماتے ہیں:

”ينبغي للقوم إذا قال المؤذن حي على الفلاح أن يقوموا إلى الصلاة فيصفوا، ويسووا الصفوف، ويحاذوا بين المناكب، فإذا أقام المؤذن الصلاة كبر الإمام، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله“

یعنی قوم کو چاہئے کہ جب موذن حی علی الفلاح کہے تو نماز کے لئے کھڑے ہوں صف بندی کریں اور صفوں کو سیدھا کریں اور کاندھوں کو ملائیں اور جب موذن قد قامت الصلاۃ کہے تو امام تکبیر کہے اور یہی قول ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

[موطا امام مالک، باب تسوية الصف، ۵۶/۱]

اور کتاب الآثار میں یہی بات ان الفاظ کے ساتھ ہے:

”إذا قال المؤذن: حي على الفلاح، فإنه ينبغي للقوم أن يقوموا فيصفوا، فإذا قال المؤذن قد قامت الصلاة، كبر الإمام" قال محمد: وبه نأخذ، وهو قول أبي حنيفة رضي الله عنه“

یعنی جب مؤذن حی علی الفلاح کہے تو لوگوں کو چاہئے کہ کھڑے ہوں صف بندی کریں۔ جب مؤذن قد قامت الصلاۃ کہے تو امام تکبیر کہے امام محمد نے فرمایا کہ ہم اسی کو لیتے ہیں اور یہی قول ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔

[کتاب الآثار، باب الاذان، جلد ۱ ص۱۰۷]

الحاصل:۔ اقامت بیٹھ کر ہی سننا مستحب اور افضل ہے۔ اس کے بر خلاف کرنا مکروہ وخلاف سنت ہے۔

هٰذا ما عندي والعلم عند الله تعالىٰ۔

فتوی ۱۶ — نماز میں بلا ضرورت مکبر کھڑا کرنا درست نہیں

مسئولہ: سمیر شیخ، گیٹ نمبر ۲ مالونی ملاڈ ویسٹ ممبئی ۹۵۔ ۸/ربیع الغوث ر۱۴۳۵ھ

باسمہ تعالیٰ: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں

ہمارے یہاں کی مسجد میں نماز پنجگانہ میں کبھی پانچ، سات صف نمازی رہتے ہیں ،اور ایک صف میں تقریبا(۱۴۔۱۶)افراد ہوتے ہیں امام کی آواز پچھلی صف تک بآسانی پہنچ جاتی ہے۔چند دن قبل مسجد ہٰذا کے ایک ٹرسٹی نے امام کی اجازت کے بغیر مکبر رکھ دیا۔جب امام صاحب نے مسئلہ بتایا کہ امام کی آواز پہنچتی ہو تو مکبر کی کیا ضرورت ہے؟

تو مذکورہ ٹرسٹی نے کہا کہ یہاں امام کی چلے گی یا کمیٹی کی؟ دریافت طلب امر یہ ہے کہ

(1)بلاضرورت مکبر رکھنا کیسا ہے؟(2)مذکورہ ٹرسٹی کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

قرآن مقدس میں ہے: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا '

اور اپنی نماز نہ بہت آواز سے پڑھو نہ بالکل آہستہ اور ان دونوں کے بیچ میں راستہ چاہو۔

[ترجمہ قرآن کنزالایمان پارہ ۱۵ سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۱۰]

اس آیت کریمہ سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ نماز(بلاضرورت)تیز آواز سے پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔امام ہو خواہ مقتدی۔اسی لئے فقہائے کرام نے اپنی کتب میں حکم دیا کہ امام ضرورت سے زیادہ آواز بلند نہ کرے۔

فتاوی عالمگیری جسے حضرت اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ کے زیر نگرانی ہندوستان کے پانچ سو جید علما نے ترتیب دیا ہے اس میں بحر الرائق کے حوالے سے امام کا بلاضرورت آواز بلند کرنا برا لکھا ہے:

''اذاجهرالامام فوق حاجة الناس اساء'' امام نے جب لوگوں کی ضرورت سے زیادہ آواز بلند کی تو برا کیا۔

[۷۲/۱فصل فی واجبات الصلاۃ]

فتاوی نوازل میں فقیہ ابو اللیث سمرقندی فرماتے ہیں:

''لايبالغ الامام فی الجهرلانه يكره ان يزيد فيه على حاجة الناس'' امام آواز زیادہ بلند نہ کرے اس لئے کہ آواز لوگوں کی ضرورت سے زیادہ کرنا مکروہ ہے۔[فتاوی نوازل،ص ۷۹ ۲،فصل فی واجبات الصلاۃ]

لہٰذا جب امام کے لئے بلاضرورت آواز تیز کرنے کا حکم نہیں ہے تو پھر کسی مقتدی کو مکبر کی حیثیت سے بلاضرورت آواز بلند کرنے کا حکم کیسے ہو سکتا ہے۔اسی لئے امام شامی نے ردالمحتار میں فرمایا:

''والزائد على قدر الحاجة كما هو مكروه للامام يكره للمبلغ''

ضرورت سے زیادہ آواز بلند کرنا جس طرح امام کے لئے مکروہ ہے اسی طرح مکبر کے لئے بھی۔

مزید فرماتے ہیں:''واعلم ان التبليغ عند عدم الحاجة اليه بان بلغهم صوت الامام مكروه وفی السيرة الحلبيه اتفق الائمة الاربعة على ان التبليغ حينئذ بدعة منكرة ای مكروهة واما عند الاحتياج اليه فمستحب''

اور جان لو کہ تبلیغ(یعنی تکبیر وغیرہ کہنا)بلاضرورت بایں طور کہ مقتدیوں تک امام کی آواز پہنچ رہی ہو مکروہ ہے۔اور سیرت حلبیہ میں ہے کہ چاروں ائمہ حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ تبلیغ(تکبیر وغیرہ)اس وقت(یعنی جب امام کی آواز لوگوں تک پہنچ

رہی ہو) بدعت منکرہ یعنی مکروہ ہے البتہ ضرورت کے وقت مستحب ہے۔

[ردالمحتار علی درالمختار ۱۷۲/۲، باب صفة الصلاۃ]

حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

''اعلم ان التکبیر عند عدم الحاجة الیه بان یبلغهم صوت الامام مکروہ وفی السیرة الحلبیه اتفق الائمة الاربعة علی ان التبلیغ فی هٰذہ الحالة بدعة منکرة ای مکروهة واما عند الاحتیاج الیه بان کانت الجماعة لایصل الیهم صوت الامام امالضعفه اولکثرتهم فمستحب''

جان لو کہ تکبیر کہنا بلاضرورت بایں طور کہ مقتدیوں تک امام کی آواز پہنچ رہی ہو مکروہ ہے۔ اور سیرت حلبیہ میں ہے کہ چاروں ائمہ حضرات کا اس پر اتفاق ہے کہ تبلیغ (تکبیر وغیرہ کہنا) اس حالت میں (یعنی جب امام کی آواز لوگوں تک پہنچ رہی ہو) بدعت منکرہ یعنی مکروہ ہے۔ البتہ ضرورت کے وقت کہ جماعت ہو اور لوگوں تک آواز نہ پہنچ رہی ہو امام کی کمزوری کے سبب یا لوگوں کی کثرت کی وجہ سے (تکبیر کہنا) مستحب ہے۔ [۲۶۲، کتاب الصلاۃ فصل فی بیان سننها]

بالجملہ: عبارات بالا کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ نماز میں امام خواہ مکبر کسی کا بھی بلاضرورت آواز بلند کرنا درست نہیں ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جب کہ امام صاحب کی آواز مقتدیوں تک بآسانی پہنچ رہی تھی ٹرسٹی صاحب کا مکبر کھڑا کرنا ازروئے شرع درست نہیں، بلکہ مکروہ بدعت سیئہ ہے۔ ٹرسٹی مذکور کا ایک امر غیر مشروع مکروہ وبدعت سیئہ پر اس طرح ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنا اور امام مذکور کے ساتھ تحکمانہ انداز سے گفتگو کر کے ہتک عزت کرنا یقیناً قابل مذمت ہے۔ ٹرسٹی مذکور کو چاہئے کہ اپنے اس فعل سے رجوع کرے اور ازراہ احتیاط توبہ کرے۔ اور آئندہ کبھی شریعت کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرے۔ نیز کسی مسجد کا ٹرسٹی ہونا ایک اچھا کام ہے اللہ اس کا اجر عطا فرمائے گا۔ لیکن امام واجب التعظیم ہے امام کا احترام کریں،

شریعت کے مسائل میں ان کی اتباع کریں۔ اور شریعت کے معاملات میں اس درجہ جرات وبیباکی سے کام نہ لیں کہ یہ کسی بھی طرح جائز نہیں ہے۔ اگر ٹرسٹی مذکور ایسی حرکات شنیعہ سے باز نہ آئے تو نمازیوں پر لازم ہے کہ ایسے شخص کو ٹرسٹی کے عہدے سے برخواست کریں اور کسی بہتر شخص کا انتخاب کریں۔

هٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

فتوی ۱۷ — غسل، نماز، تراویح، فاسق پیر سے متعلق چند مختلف مسائل

مسئولہ: صوفی محمد یامین قصبہ دتیانہ ڈاک خانہ خاص تحصیل گڑھ مکیشور ضلع ہاپوڑ۔ ۱۶ر شوال المکرم ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین قرآن وحدیث کی روشنی میں

(۱) ۶۰ سال کی عمر والے آدمی کو کھانسی اٹھی پیشاب کا قطرہ آگیا یا بدہضمی کے ساتھ ہوا خارج کے ساتھ پس آگیا، نیکر اتار دیا استنجا کر کے نماز پڑھ لی صبح کو غسل کیا نماز ہو گی یا نہیں؟ نماز سے پہلے غسل فرض ہوا یا نہیں؟

غسل کب فرض ہوتا ہے؟

(۲) نماز کی حالت میں تین بار حرکت کی تین جگہ کھجایا تو نماز درست ہے یا نہیں؟

(۳) قرآن کریم تراویح کے اندر سنا جارہا ہے ایک یا دو بار بسم اللہ پڑھی باقی چھوڑ دی جب کہ ایک سو۱۱۳ یا ۱۱۴ بار بسم اللہ ہیں کیا پورے قرآن کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

(۴) اگر کوئی پیر خلاف شرع کام کرے اجنبیہ عورتوں سے پیر دبوائے، بچیوں کو اپنی گود میں بٹھا کر گندی حرکت کرے اور عمر سے جوان ہو تو اس کی اتباع پیر جیسی کریں یا نہیں پیر بنانے کے لئے کن کن باتوں کو دیکھنا چاہئے۔ جواب عنایت فرمائیں

الجواب

(۱) صورت مسئولہ میں غسل فرض نہیں ہوا اس لئے کہ غسل فرض ہونے کے لئے مندرجہ ذیل اسباب کا پایا جانا ضروری ہے۔ منی کا شہوت کے ساتھ نکلنا، احتلام کا ہونا، مرد کے حشفہ کا سبیلین میں داخل ہونا، اور عورت کا حیض ونفاس سے فارغ ہونا۔ مبسوط سرخسی میں ہے

''خمسة منها فريضة. الاغتسال من التقاء الختانين، ومن إنزال الماء، ومن الاحتلام، ومن الحيض، والنفاس''

غسل پانچ چیزوں سے فرض ہوتا ہے مرد وعورت یا مرد و مرد دونوں کی شرمگاہوں کے ملنے سے (بشرطیکہ حشفہ داخل ہو) منی نکلنے سے (شہوت کے ساتھ) اور احتلام سے اور عورت کے حیض ونفاس سے (جب کہ وہ فارغ ہو جائیں)

[مبسوط سرخسی، ۱/۹۰]

حلبی کبیری میں ہے:

''خمسة منها فريضة .... الاغتسال من الحيض والاغتسال من النفاس والاغتسال من التقاء الختانين اذا كان مع غيبوبة الحشفة..... والاغتسال من خروج المني على وجه الدفق والشهوة والاغتسال من الاحتلام اذا خرج منه''

غسل پانچ چیزوں سے فرض ہوتا ہے حیض اور نفاس سے اور شرمگاہوں کے ملنے سے اس حال میں کہ حشفہ غائب ہو اور جست و شہوت کے ساتھ منی نکلنے سے۔ اور احتلام سے جب کہ منی باہر نکل آئے۔ [غنية المستملي شرح منية المصلي، ص۴۷]

(۲) نماز کی حالت میں ایک رکن میں تین مرتبہ کھجلانے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

فتاوی شامی میں ہے: ''الحك بيد واحدة في ركن ثلاث مرات يفسد الصلاة إن رفع يده في كل مرة''

ایک رکن میں ایک ہاتھ سے تین بار کھجلانا اگر ہر مرتبہ میں ہاتھ اٹھایا تو نماز کو فاسد کر دیتا ہے۔

[فتاوی شامی: ۲/۴۰۷، کتاب الصلاة، باب مایفسد الصلاة]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''إذا حك ثلاثا في ركن واحد تفسد صلاته هذا إذا رفع يده في كل مرة أما إذا لم يرفع في كل مرة فلا تفسد''

جب ایک رکن میں تین بار کھجلایا تو نماز فاسد ہو جائے گی یہ حکم جب ہے کہ ہر مرتبہ ہاتھ اٹھایا ہو رہا جب ہر مرتبہ ہاتھ نہیں اٹھایا تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔ [فتاوی ہندیہ، ۱/۱۰۴، کتاب الصلاۃ باب مایفسد الصلاۃ ومایکرہ]

حاشیہ طحطاوی میں خلاصہ کے حوالے سے ہے:

''وإن حك ثلاثا في ركن واحد تفسد صلاته إذا رفع يده في كل مرة وإلا فلا تفسد لأنه حك واحد''

اگر ایک رکن میں تین بار کھجلایا تو نماز فاسد ہو جائے گی جب کہ ہر مرتبہ ہاتھ اٹھایا ہو ورنہ فاسد نہیں ہو گی اس لئے کہ وہ ایک ہی بار کھجلانا ہے۔[حاشیہ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، کتاب الصلاۃ باب مایفسد الصلاۃ، ص ۳۲۳]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''ضبط کرے، اور نہ ہو سکے یا اس کے سبب نماز میں دل پریشان ہو تو کھجالے مگر ایک رکن مثلاً قیام یا قعود یا رکوع یا سجود میں تین بار نہ کھجاوے، دو بار تک اجازت ہے۔''[فتاوی رضویہ جدید، ۷/۳۸۴]

حضور صدر الشریعہ فرماتے ہیں:

''ایک رکن میں تین بار کھجانے سے نماز جاتی رہتی ہے، یعنی یوں کہ کھجا کر ہاتھ ہٹالیا پھر کھجایا پھر ہاتھ ہٹالیا و علیٰ ہذا اور اگر ایک بار ہاتھ رکھ کر چند مرتبہ حرکت دی تو ایک ہی مرتبہ کھجانا کہا جائے گا''[بہار شریعت حصہ سوم ص ۱۳۲]

(۳) ہمارے ائمہ اور جمہور علما کے نزدیک بسملہ قرآن کا جز ہے۔ اس لئے قرآن شریف میں ایک بار ہی پڑھنا کافی ہے۔ اور خاص تراویح میں جہر کے ساتھ ایک بار پڑھنا ضروری ہے۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

'بسم اللہ شریف کے باب میں ہمارے ائمہ کرام بلکہ جمہور ائمہ صحابہ و تابعین و غیر ہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مذہب حق و محقق یہ ہے کہ وہ کسی سورت قرآن کی جز نہیں، جداگانہ آیت واحدہ ہے، کہ تبرک و فصل بین السور کے لئے مکرر نازل ہوئی۔ امام عبد العزیز بن احمد بن محمد بخاری علیہ رحمۃ الباری کہ اجلہ ائمہ حنفیہ ہیں کتاب التحقیق شرح حسامی میں فرماتے ہیں:

الصحيح من المذهب انها من القراٰن لكنها ليست جزء من كل سورة عندنا بل هي اٰية منزلة للفصل بين السور كذا ذكر ابوبكر الرازي ومثله روي عن محمد رحمه الله تعالیٰ

(صحیح مذہب ہمارا یہ ہے کہ وہ قرآن کی جز ہے مگر ہر سورت کی جز نہیں۔ بلکہ یہ ایسی آیۃ ہے جو سورتوں میں فاصلہ کے لئے نازل کی گئی ہے، یوں ابو بکر رازی نے ذکر کیا۔ اور امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی ایسے ہی مروی ہے)

[فتاوی رضویہ جدید، ۷/۲۶۲]

اور مسلم الثبوت اور اس کی شرح فواتح الرحموت کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''البسملة من القراٰن اٰية فتقرأ في الختم مرة'' یعنی بسم اللہ شریف قرآن عظیم کی ایک آیت ہے تو ختم میں ایک بار پڑھی جائے گی، ملک العلماء بحر العلوم اس کی شرح فواتح الرحموت میں فرماتے ہیں:

''على هذا ينبغي ان يقرأها في التراويح بالجهر مرة ولا تتأدى سنة الختم دونها''

یعنی اس بنا پر چاہئے کہ بسم اللہ شریف تراویح میں جہر سے ایک بار پڑھی جائے بے اس کے سنت ختم ادا نہ ہو گی۔

[مرجع سابق، ص ۲۶۱]

مزید فرماتے ہیں:

''اسی طرح قمر الاقمار سے بھی گزرا کہ وہ ہمارے ائمہ کرام کے نزدیک تمام قرآن میں صرف ایک آیت ہے نہ یہ کہ ایک سو تیرہ یا چودہ آیتیں ہوں اور جب آیت واحدہ ہے تراویح میں اس کی صرف ایک بار تلاوت ادائے سنت ختم کے لئے آپ ہی کافی'' [مرجع سابق، ص ۲۶۴]

(۴) خلاف شرع کام کرنے والے پیر سے بیعت ہونا اس کی پیروی کرنا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے۔ سوال میں درج باتیں اگر واقعی پیر کے اندر پائی جاتی ہوں تو وہ بلاشبہہ فاسق ہے۔ اور فاسق کی اتباع و پیروی اور اس سے مرید ہونا کسی بھی صورت جائز نہیں ہے۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''فاسق کے ہاتھ پر بیعت جائز نہیں، اگر کرلی ہو فسخ کرکے کسی پیر متقی، سنی، صحیح العقیدہ، عالم دین، متصل السلسلۃ کے ہاتھ پر بیعت کرے'' [فتاوی رضویہ جدید، ۲۰۳/۲۱]

کسی شخص کو اپنا پیر بنانے سے پہلے چار چیزیں دیکھنا چاہئے۔

(۱) سنی صحیح العقیدہ ہو (۲) ضروری علم رکھتا ہو (۳) کبیرہ گناہوں سے بچنے والا ہو (۴) اجازت صحیح متصل ہو۔

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''بیعت گفتن و در مسند ارشاد نشستن را از چار شرط ناگزیر ست:

یکے آنکہ سنی صحیح العقیدہ باشد زیرا کہ بد مذہبیاں سگان دوزخ اند بدترین خلق چنانچہ در حدیث آمدہ ست۔

دوم عالم بعلم ضروری بودن کہ ع

بے علم نتواں خدا را شناخت

سوم اجتناب کبائر کہ فاسق واجب التوہین است و مرشد واجب التعظیم ہر دو چہ گونہ بہم آید۔

چہارم اجازت صحیحہ متصلہ کما اجمع علیہ اھل الباطن۔ ہر کہ از نہا ہیچ شرطے رافاقد ست او ر انشاید پیر گرفتن''

یعنی بیعت لینے اور مسند ارشاد پر بیٹھنے کے لئے چار شرطیں ضروری ہیں:

ایک یہ کہ سنی صحیح العقیدہ ہو اس لئے کہ بد مذہب دوزخ کے کتے اور بدترین مخلوق ہیں، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

دوسری شرط ضروری علم کا ہونا، اس لئے کہ بے علم خدا کو پہچان نہیں سکتا۔

تیسری یہ کہ کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرنا اس لئے کہ فاسق کی توہین واجب ہے اور مرشد واجب التعظیم ہے دونوں چیزیں کیسے اکھٹی ہوں گی۔

چوتھی اجازت صحیح متصل ہو جیسا کہ اس پر اہل باطن کا اجماع ہے۔

جس شخص میں ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط نہ ہو تو اس کو پیر نہیں پکڑنا چاہئے۔''

[فتاوی رضویہ جدید، ۴۹۲/۲۱، ۴۹۱]

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

فتوی ۱۸ — نماز جماعت سے ادا نہ کرنے والا فاسق و گنہگار ہے

مسئولہ:(مولانا) محمد ظہیر اشرف قادری نعمانی خادم مدرسہ اہل سنت انصار العلوم بھیڑی بریلی شریف یوپی۔۱۹/ ذیقعدہ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے ملت و مفتیان اہل سنت درج ذیل مسئلہ میں
بکر کوئی نماز سوائے جمعہ مسجد میں نہیں پڑھتا۔ باقی نمازیں گھر پڑھتا ہے بغیر عذر شرعی کے۔ ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث اقوال علما کی روشنی میں کتب معتبرہ ومستندہ سے مزین فرما کر جواب دیں اجر جزیل کے مستحق ہوں۔

الجواب

نماز جماعت سے ادا کرنا واجب ہے اس کا عمداً بلا عذر شرعی ترک کرنا گناہ ہے۔ جماعت سے نماز نہ ادا کرنے والوں سے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک کہ فرمایا کہ جماعت کے وقت اگر مرد گھر میں ہوں تو میں گھروں میں آگ لگادوں جیسا کہ مسلم شریف کی درج ذیل حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''ولقد هممت أن آمر بالصلاة، فتقام، ثم آمر رجلا فيصلي بالناس، ثم أنطلق معي برجال معهم حزم من حطب إلى قوم لا يشهدون الصلاة، فأحرق عليهم بيوتهم بالنار''

یعنی میں نے یہ ارادہ کیا کہ نماز پڑھانے کا حکم دوں اور وہ قائم ہو جائے پھر میں ایک آدمی کو حکم دوں کہ وہ نماز پڑھائے پھر میں اپنے ساتھ ان لوگوں کو لے کر جن کے پاس لکڑیوں کے ڈھیر ہوں ان لوگوں کے پاس جاؤں جو نماز میں حاضر نہیں ہوئے اور ان کے گھر کو آگ سے جلا ڈالوں۔'' [۲۳۲/۱ باب فضل صلاة الجماعة وبيان التشديد في التخلف عنها]

مزید فرمایا:

''لقد هممت أن آمر فتياني أن يستعدوا لي بحزم من حطب، ثم آمر رجلا يصلي بالناس، ثم تحرق بيوت على من فيها''
یعنی میں نے ارادہ کیا کہ اپنے نوجوانوں کو حکم دوں کہ وہ لکڑیوں کے ڈھیر کے ساتھ تیار ہو جائیں پھر میں کسی شخص کو نماز پڑھانے کا حکم دوں پھر میں ان گھروں میں آگ لگادوں جن میں وہ (نماز جماعت سے نہ پڑھنے والے) لوگ ہیں۔

[مرجع سابق]

فتاوی عالمگیری میں بدائع الصنائع کے حوالے سے ہے:

''تجب على الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين على الصلاة بالجماعة من غير حرج''

(عاقل بالغ آزاد نماز پر قادر لوگوں پر عذر شرعی کے علاوہ، جماعت واجب ہے) [۸۲/۱، باب الخامس في الامامة]

بنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

''ترك الجماعة بغير عذر يجب به التعزير'' (بغیر عذر جماعت ترک کرنا موجب تعزیر ہے) [۳۲۵/۲]

بحر الرائق میں ہے:

''وتصریحهم بالإثم لمن ترك الجماعة''

(اور فقہاء نے ترک جماعت کرنے والے کے لئے گناہ کی صراحت فرمائی ہے)[۱/ ۵۲۷، باب صفة الصلاة]

مجمع الانہر میں ہے:

''لا تجوز شهادة تارك الجماعة''(تارک جماعت کی گواہی جائز نہیں ہے)[۲۷۷/۳، کتاب الشہادات]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''ترک جماعت اور ترک حاضری مسجد کا عادی فاسق ہے اور فاسق قابل اتباع نہیں''[فتاوی رضویہ قدیم، ۳۸۰/۳]

مزید فرماتے ہیں:

''تارک جماعت وہ کہ بے کسی عذر شرعی قابل قبول کے قصداً جماعت میں حاضر نہ ہو۔ مذہب صحیح معتمد پر اگر ایک بار بھی بالقصد ایسا کیا گنہگار ہوا تارک واجب ہوا مستحق عذاب ہوا۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ اگر عادی ہو کہ بارہا حاضر نہیں ہوتا اگرچہ بارہا حاضر بھی ہوتا ہو تو بلاشبہہ فاسق، فاجر مردود الشہادۃ ہے''[مرجع سابق، ص ۳۴۶]

الحاصل: ترک جماعت کے سبب بکر فاسق مردود الشہادہ ہے، بکر پر لازم ہے توبہ کرے اور نماز باجماعت پڑھے۔

هٰذا ما عندي والعلم عند الله تعالیٰ

فتوی ۱۹

نماز میں رفع یدین، ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی شرعی حیثیت اور چند اہم مسائل

مسئولہ: (قاری) محمد یامین (مہتمم) خادم مدرسہ اسلامیہ نوری للبنات سرور کھیڑ اکاشی پور۔ ۹/ ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل کے بارے میں

(۱) نماز پڑھتے وقت ہاتھوں کو ناف پر باندھنے کا ثبوت کون سی حدیث سے ہے؟

(۲) زید کہتا ہے کہ رفع یدین کا ثبوت تو حدیث پاک میں سیکڑوں جگہ ملتا ہے رفع یدین نہ کرنے کا ثبوت کتنی حدیثوں سے ثابت ہے۔

(۳) قعدہ اولیٰ یا آخری میں جب بیٹھتے ہیں تو شہادت کی انگلی کو کب اٹھانا چاہئے اور کب گرانا چاہئے؟

(۴) دونوں سجدوں کے درمیان میں کیا کوئی دعا بھی پڑھی جاتی ہے؟

(۵) نماز میں کھڑے ہوتے وقت کاندھے سے کاندھا ملانا اور قدم سے قدم ملانا کس حدیث سے ثابت ہے؟

(۶) قعدہ اولیٰ کے بعد جب کھڑے ہوتے ہیں تو زمین پر ہاتھ رکھ کر دونوں ہاتھ ہتھیلیوں کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں کیا یہ صحیح ہے؟

(۷) وتر کی نماز کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں

الجواب

(۱) سنن ابو داؤد شریف کے نسخہ اعرابی میں حضرت علی سے مروی انہوں نے فرمایا:

''من السنة وضع الكف على الكف في الصلاة تحت السرة'' (ہتھیلی کا ہتھیلی پر ناف کے نیچے رکھنا نماز میں سنت ہے)

[حاشیہ سنن ابوداؤد، ۲۰۱/۱، باب وضع اليمنى على اليسرى في الصلاة]

امام بخاری کے استاد ابو بکر بن ابی شیبہ کی مصنف میں حضرت علی سے مروی انہوں نے فرمایا:

''من سنة الصلاة وضع الأيدي على الأيدي تحت السرر'' (ہاتھ کا ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھنا نماز کی سنت ہے) [۳۱۰/۲]

اسی میں حضرت حجاج بن حسان سے مروی انہوں نے کہا:

''سمعت أبا مجلز، أو سألته قال: قلت: كيف يضع؟ قال: يضع باطن كف يمينه على ظاهر كف شماله ويجعلها أسفل من السرة''

(میں نے ابو مجلز کو سنا، یا ان سے سوال کیا کہ ہاتھ کیسے رکھے، فرمایا اپنے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی اپنے بائیں ہاتھ کی پشت پر ناف کے نیچے رکھے) [مرجع سابق]

سنن کبری للبیہقی میں حضرت علی سے مروی انہوں نے فرمایا:

''إن من السنة في الصلاة وضع الكف على الكف تحت السرة'' (نماز میں ہتھیلی کا ہتھیلی پر ناف کے نیچے رکھنا سنت ہے)

[السنن الکبریٰ للبیہقی: ۴۸/۲، کتاب الصلاۃ]

اس کے علاوہ بہت سی احادیث سے ناف کے نیچے ہاتھ باندھے کا ثبوت ملتا ہے، مزید تفصیل کے لئے کتب احادیث سے مراجعت کریں۔

(۲) زید کا کہنا کہ ''رفع یدین کا ثبوت تو حدیث پاک میں سیکڑوں جگہ ملتا ہے'' غلط ہے وہابیوں کے یہاں جو طریقہ رفع یدین کا مروج ہے وہ بس دو تین احادیث سے ہی ثابت ہے اور محدثین محققین کے نزدیک وہ بھی منسوخ ہے۔ البتہ رفع یدین کا ترک بہت سی احادیث وآثار سے ثابت ہے۔ ہم یہاں چند نقل کر دیتے ہیں۔

صحابی رسول براء بن عازب سے مروی فرماتے ہیں:

''رایت رسول الله صلى الله عليه وسلم رفع يديه حين افتتح الصلوة ثم لم يرفعهما حتى انصرف''

یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جس وقت آپ نے نماز شروع کی تو دونوں ہاتھ اٹھائے اس کے بعد فارغ ہونے تک دونوں ہاتھوں کو نہیں اٹھایا۔

[سنن ابوداؤد شریف، ۱۱۱/۱، کتاب الصلوة، باب من لم يذكر الرفع عند الركوع]

اسی میں حضرت عبد اللہ ابن مسعود سے مروی فرماتے ہیں:

''ألا أصلي بكم صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم ۔ فصلى فلم يرفع يديه إلا مرة''

یعنی کیا میں تمہارے سامنے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہ پڑھوں۔ پھر آپ نے نماز پڑھی پس اپنے دونوں ہاتھ

نہیں اٹھائے مگر ایک ہی مرتبہ)(مرجع سابق)

سنن ترمذی میں بھی حضرت عبد اللہ ابن مسعود سے مروی فرماتے ہیں:

''ألا أصلی بکم صلاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصلی، فلم یرفع یدیہ إلا فی أول مرۃ.''

یعنی کیا میں تمہارے سامنے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہ پڑھوں۔ پھر آپ نے نماز پڑھی۔ پس اپنے دونوں ہاتھ نہیں اٹھائے مگر ایک ہی مرتبہ)امام ترمذی اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد اس حدیث سے متعلق فرماتے ہیں

''حدیث ابن مسعود حدیث حسن.وبہ یقول غیر واحد من أھل العلم من أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، والتابعین. وھوقول سفیان الثوری، وأھل الکوفۃ.''

(عبد اللہ ابن مسعود کی حدیث حسن ہے اور یہی قول بہت سے اہل علم اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعین کا ہے اور یہی سفیان ثوری اوراہل کوفہ کا قول ہے)

[سنن ترمذی، ۱/ ۵۹، ابواب الصلوۃ، باب رفع الیدین عندالرکوع]

سنن نسائی میں یہی حدیث پاک درج ذیل الفاظ میں مروی ہے:

''ألا أخبرکم بصلوۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فقام فیرفع یدیہ اول مرۃ ثم لایعد''

یعنی کیا میں تمہارے سامنے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہ پڑھوں۔ پھر آپ کھڑ ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا پہلی مرتبہ پھر نہیں اٹھایا)[سنن نسائی، ۱/ ۱۱۷، کتاب الصلوۃ]

امام بخاری کے استاد امام ابو بکر کی مصنف میں عاصم بن کلیب کے والد کلیب سے مروی:

''أن علیا، کان یرفع یدیہ إذا افتتح الصلاۃ، ثم لا یعود''

(حضرت علی اپنے دونوں ہاتھوں کو نماز شروع کرتے وقت اٹھاتے تھے پھر نہیں اٹھاتے تھے)

[مصنف ابن ابی شیبہ، ۱/ ۲۱۳، باب من کان یرفع یدیہ فی أول تکبیرۃ ثم لا یعود]

اسی میں ابو اسحاق سے مروی وہ فرماتے ہیں:

''کان أصحاب عبد اللہ وأصحاب علی، لا یرفعون أیدیھم إلا فی افتتاح الصلاۃ، قال وکیع،، ثم لا یعودون''

(حضرت عبد اللہ اور حضرت علی کے تلامذہ اپنے ہاتھوں کو آغاز نماز کے وقت اٹھاتے تھے وکیع نے فرمایا کہ پھر نہیں اٹھاتے تھے)[مرجع سابق، ص ۲۱۴]

اسی میں حضرت مجاہد سے مروی فرماتے ہیں:

''ما رأیت ابن عمر، یرفع یدیہ إلا فی أول ما یفتتح''(میں نے عبد اللہ ابن عمر کو آغاز نماز کے علاوہ دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے نہیں دیکھا)[مرجع سابق]

مزید تفصیل کے لئے کتب احادیث اور فتاوی رضویہ، جاء الحق وغیرہ کتب اہل سنت کا مطالعہ کریں۔

(۳) حدیث شریف سے انگلی کا اشارہ تو ثابت ہے لیکن کب اٹھائے یہ ثابت نہیں۔ البتہ ائمہ احناف کے نزدیک تشہد کے

وقت حلقہ بنانے اور لا الہ الا اللہ کے لا کے وقت انگلی کا اشارہ کرنے اور الا پر گرا دینے کا حکم ہے۔ در مختار میں ہے:

''الصحيح أنه يشير بمسبحته وحدها، يرفعها عند النفي ويضعها عند الإثبات''

(صحیح یہ ہے کہ صرف کلمہ کی انگلی سے اشارہ کرے اسے نفی (یعنی لا) کے وقت اٹھائے اور اثبات (یعنی الا) کے وقت) گرا دے۔ [درمختار، باب صفۃ الصلاۃ، ۲/۲۱۸]

اس کے تحت ردالمحتار میں ہے:

''يرفع السبابة عند النفي ويضعها عند الإثبات وهذا ما اعتمده المتأخرون لثبوته عن النبي –صلى الله عليه وسلم بالأحاديث الصحيحة''

(کلمہ کی انگلی اٹھائے نفی کے وقت اور اثبات کے وقت گرا دے۔ اور یہی ہے جس پر متاخرین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ کے ثبوت کے سبب اعتماد کیا ہے) [ردمحتار مع درمختار، باب صفۃ الصلاۃ، ۲/۲۱۸]

حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے: ''العقد وقت التشهد فقط فلا يعقد قبل ولا بعد وعليه الفتوى''

(انگلیوں کا حلقہ صرف تشہد کے وقت بنایا جائے گا نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد اور اسی پر فتوی ہے) [کتاب الصلاۃ ۲۷۰]

الحاصل تشہد میں شہادت کے وقت انگلیوں کا حلقہ بنائے اور لا پر کلمہ کی انگلی کا اشارہ کرے اور الا پر انگلی گرا کر ساری انگلیاں سابقہ حالت پر چھوڑ دے۔

(۴) جی ہاں دونوں سجدوں کے درمیان دعا پڑھنا سنت ہے۔

سنن نسائی میں حضرت حذیفہ سے مروی کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں نماز ادا کی تو نماز میں نبی کو سجدوں کے درمیان سنا: ''وكان يقول بين السجدتين: رب اغفر لي، رب اغفر لي''

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سجدوں کے درمیان کہہ رہے تھے اے اللہ مجھے بخش دے اے اللہ مجھے بخش دے۔

[۱/۱۲۹، باب الدعا بین السجدتین]

سنن ترمذی میں حضرت عباس سے مروی:

''أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يقول بين السجدتين: اللهم اغفر لي، وارحمني، واجبرني، واهدني، وارزقني''

یعی نبی صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سجدوں کے درمیان کہتے تھے اے اللہ مجھے بخش دے، اور مجھ پر رحم فرما میرے نقصان کی تلافی فرما اور مجھے ہدایت پر قائم رکھ اور مجھے رزق عطا فرمایا۔ [۱/۶۳، باب مایقول بین السجدتین]

سنن ابو داؤد میں انہیں سے مروی:

''أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يقول بين السجدتين: اللهم اغفر لي، وارحمني، وعافني، واهدني، وارزقني''

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سجدوں کے درمیان کہتے تھے اے اللہ مجھے بخش دے، اور مجھ پر رحم فرما اور مجھے عافیت دے اور مجھے ہدایت پر قائم رکھ اور مجھے رزق عطا فرما۔ [۱/۱۲۳، باب الدعاء بین السجدتین]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"اللھم اغفرلی کہنا امام و مقتدی و منفرد سب کو مستحب ہے۔ اور زیادہ طویل دعا سب کو مکروہ۔ ہاں منفرد کو نوافل میں مضائقہ نہیں"[فتاوی رضویہ قدیم،۶۲/۳]

(۵) کاندھے سے کاندھا ملانا اور قدم سے قدم ملانا بمعنی قریب کرنا درج ذیل حدیث سے ثابت ہے۔ حضرت انس بن مالک سے مروی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''أقیموا صفوفکم، فإنی أراکم من وراء ظھری، وکان أحدنا یلزق منکبه بمنکب صاحبه، وقدمه بقدمه''

یعنی اپنی صفیں سیدھی کرلیا کرو! کیوں کہ میں اپنی پیٹھ کے پیچھے بھی دیکھتا ہوں۔ اور ہم میں سے ہر شخص اپنا کاندھا اپنے ساتھ والے کے کاندھے اور اپنا قدم اس کے قدم سے ملا دیتا تھا)

[صحیح بخاری: ۱۴۶/۱،باب إلزاق المنکب بالمنکب والقدم بالقدم فی الصف]

یہ بات ذہن میں رہے کہ یہاں کاندھے سے کاندھا ملانا تو سنت ہے لیکن محققین علما اور فقہائے احناف کے نزدیک قدم سے قدم ملانے سے مراد قدم کا قدم سے قریب کرنا ہے، اس کی علت بیان کرتے ہوئے حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''وحدیث اصح انس بن مالك رضی اللہ تعالیٰ عنھما: کان احدنا یلزق منکبه بمنکب صاحبه وقدمه بقدمه''

(ہم میں سے ہر ایک اپنے کاندھے کو دوسرے کے کاندھے سے اوپر اپنے قدم کو دوسرے کے قدم سے ملاتا تھا)

میں درباہ کعاب و اقدام ارادہ معنی حقیقی پر اقدام نہیں ہو سکتا کہ قیام میں سنّت تقریب قدمین ہے، خود صاحب مفتاح رحمہ الفتاح کو مسلم کہ فرجہ چہار انگشت مسنون است (چار انگل کا فاصلہ مسنون ہے) اگر چہ اس تجدید کی بھی سند پُوچھئے تو کتاب الاثر میں امام سے روایت ملے گی یا امام اقطع کا قول، نہ بالخصوص حدیث صحیح یا ظاہر الروایۃ و متون کی تصریح بہر حال ایسی تفریج کہ زید کا کعب اِدھر عمرو اُدھر بکر کے کعب سے ملصق ہو صراحۃً شانِ ادب کے بھی خلاف و شنیع ہے..... یہ تو ہر گز نہ مسنون نہ مطلوب کہ پاؤں اپنی وضع خلق کے خلاف رکھے جائیں۔"[فتاوی رضویہ قدیم،۵۶/۳]

(۶) یہ درست نہیں ہے بلکہ خلاف سنت ہے نبی کریم نے اس طرح کھڑا ہونے سے منع فرمایا ہے۔

مشکوۃ شریف میں حضرت عبد اللہ ابن عمر سے مروی فرماتے ہیں:

''نھی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم أن یجلس الرجل فی الصلاۃ وھو معتمد علی یدہ''

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی کا نماز میں ہاتھ پر ٹیک لگا کر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔

نیز اس میں انہیں سے مروی ''نھی أن یعتمد الرجل علی یدیه إذا نھض فی الصلاۃ''

یعنی آدمی کا نماز میں اٹھتے وقت اپنے ہاتھوں کا سہارا لینا منع ہے۔ [مشکوۃ المصابیح، ۸۵/۱،باب التشھد]

سنن ابو داؤد شریف میں ہے:

''عن ابن عمر قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم -قال أحمد بن حنبل: أن یجلس الرجل فی الصلاۃ، وھو معتمد علی یدہ وقال ابن عبد الملك، نھی أن یعتمد الرجل علی یدیه إذا نھض فی الصلاۃ''

یعنی حضرت عبد اللہ ابن عمر نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، امام احمد بن حنبل نے فرمایا

(اس کا مطلب یہ کہ) نماز میں آدمی اس طرح بیٹھے کہ ہاتھ پر ٹیک لگائے ہوئے ہو، اور ابن عبد الملک نے فرمایا کہ نماز سے کھڑے ہوتے وقت ہاتھ کا سہارا لینے سے منع فرمایا گیا ہے)

[سنن ابوداؤد، ۱۴۲/۱، باب کراہیۃ الاعتماد علی الیدفی الصلاۃ]

(۷) وتر کا طریقہ وہی ہے جو احناف کے یہاں مروج ہے یعنی مغرب کی طرح تین رکعت ادا کرنی ہیں البتہ تیسری رکعت میں سورہ پڑھ کے تکبیر کہنے کے بعد قنوت بھی پڑھنی ہے باقی سب وہی جو مغرب کی نماز میں ہے۔

سنن ترمذی میں حضرت علی سے مروی فرماتے ہیں:

''کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوتر بثلاث یقرأ فیھن بتسع سور من المفصل یقرأ فی کل رکعۃ بثلاث سور آخرھن قل ھو اللہ أحد''

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھتے تھے اور ان میں قصار مفصل کی نو سورتیں پڑھتے اور ہر رکعت میں تین سورتیں جن میں آخری سورۃ اخلاص ہوتی تھی۔ [سنن ترمذی: ۱۰۶/۱، باب فی الوتر بثلاث]

سنن دار قطنی میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

''قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر اللیل ثلاث کوتر النھار صلاۃ المغرب''

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رات کے وتر تین رکعت ہیں جیسے دن کی وتر نماز مغرب ہے۔

[۳۴۹/۲، الوتر ثلاث کثلاث المغرب]

امام طبرانی کی معجم کبیر میں حضرت عبد اللہ ابن مسعود سے مروی:

''وتر اللیل کوتر النھار صلاۃ المغرب ثلاثا''

(وتر کی نماز دن کے وتر مغرب کی نماز کی طرح تین رکعت ہے)[۲۸۲/۹]

درج بالا روایات سے وتر کی نماز کا مغرب کی طرح تین رکعت ہونا ثابت ہوا۔ نیز مذکورۃ الصدر روایات میں تینوں رکعات میں سورتیں پڑھنے کی بھی صراحت موجود ہے۔ اب ذیل میں وتر کی آخری رکعت میں سورۃ کے بعد رکوع سے پہلے تکبیر کہنا اور قنوت پڑھنے کا ثبوت بھی ملاحظہ فرمالیں۔ امام بخاری کے استاد امام ابو بکر کی مصنف میں حضرت عبد اللہ ابن مسعود سے مروی:

''کان إذا فرغ من القراءۃ کبر ثم قنت، فإذا فرغ من القنوت، کبر ثم رکع''

یعنی کہ جب وہ قراءت سے فارغ ہوتے تھے تو تکبیر کہتے پھر قنوت پڑھتے اور جب قنوت سے فارغ ہوتے تو تکبیر کہتے پھر رکوع کرتے تھے) [مصنف ابن ابی شیبہ، ۲۲۸/۳، کتاب جامع الصلوۃ، باب فی التکبیر للقنوت]

اسی میں ہے کہ شعبہ نے حکم، حماد اور ابو اسحاق سے روایت کی ''یقولون فی قنوت الوتر إذا فرغ، کبر ثم قنت''

یعنی وتر میں قنوت کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ جب فارغ ہو تکبیر کہے پھر قنوت پڑھے۔ [مرجع سابق، ص ۲۲۹]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نماز فجر میں قنوت سے پہلے تکبیر کہنے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قنوت سے پہلے تکبیر ہونی چاہئے

جیسا کہ طارق بن شہاب سے مروی ہے:

''أنه صلى خلف عمر بن الخطاب الفجر، فلما فرغ من القراءة كبر، ثم قنت، ثم كبر، ثم ركع''

یعنی انہوں نے عمر بن خطاب کے پیچھے نماز ادا کی جب قراءت سے فارغ ہوئے تکبیر کہی پھر قنوت پڑھی پھر تکبیر کہی پھر رکوع کیا۔ امام بخاری کی ''قرۃ العینین برفع الیدین فی الصلاۃ'' میں بھی حضرت عبد اللہ سے مروی ہے:

''أنه كان يقرأ في آخر ركعة من الوتر قل هو الله أحد ثم يرفع يديه ويقنت قبل الركعة.''

یعنی وہ وتر کی آخری رکعت میں قل ہو اللہ احد پڑھنے کے بعد ہاتھوں کو اٹھاتے اور رکعت سے پہلے قنوت پڑھتے۔[۶۸/۱]

سنن ابو داؤد میں حضرت ابی بن کعب سے مروی: ''ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قنت يعني في الوتر قبل الركوع''

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے۔[۲۰۲/۱، باب القنوت فی الوتر]

سنن کبری للبیہقی میں حضرت ابی بن کعب سے مروی:

''كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يوتر بثلاث يقرأ فيها بسبح اسم ربك الأعلى، وقل يا أيها الكافرون، وقل هو الله أحد، وكان يقنت قبل الركوع''

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھتے تھے۔ اس میں ،سبح اسم ربك الاعلى اور قل يا أيها الكافرون، اور قل هو الله أحد، پڑھتے اور رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے۔[۵۷/۳]

الحاصل: مذکورہ بالا احادیث وآثار سے نماز وتر کا مغرب کی نماز کی طرح تین رکعت ہونا نیز اس کی آخری رکعت میں سورہ کے بعد تکبیر کہنا اور اس کے بعد قنوت پڑھنا پھر تکبیر کہہ کر رکوع کرنے کا ثبوت صاف طور پر موجود ہے۔

هٰذا ما عندي والعلم عند الله تعالىٰ

عشاء کے فرض جماعت سے ادا نہ کرنے والا وتر جماعت سے ادا نہ کرے ایک مفتی صاحب کے خلاف اصول فتوی کا جواب

فتوی ۲۰

مسئولہ: (مولانا) اذعان اقبال رضا خان نعیمی،
بمیار، بونیار، بارہ مولہ جموں کشمیر۔ ۲۳؍ رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں

کیا رمضان المبارک میں عشاء کی فرض نماز اگر جماعت سے ادا نہ کرے تو وتر بھی جماعت سے نہ ادا کرنے کا حکم ہے؟
آج تک علما سے یہی سنتے اور پڑھتے آئے تھے کہ جس نے عشاء کی فرض نماز جماعت سے ادا نہیں کی اس کو وتر جماعت سے نہیں پڑھنے چاہیے۔ لیکن وہاٹس ایپ پر مہاراشٹر کے ایک مفتی صاحب کا فتوی اس کے برخلاف گردش کر رہا ہے جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ مسئلہ مرجوح ہے۔ اور راجح مسئلہ یہ ہے کہ اگر عشاء کے فرض جماعت سے نہیں ادا کئے تو وتر جماعت سے ادا کر سکتا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس فتوی میں جو لکھا گیا ہے کیا وہ درست ہے؟

ہم فتوی مع استفتابعینہٖ پیش کر رہے ہیں۔ فتوی کی بابت جو بھی حکم ہو تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

(استفتا)

عشاء کی فرض نماز جماعت سے ادانہ کرنے والا وتر کی جماعت میں شریک ہو سکتا ہے یا نہیں ؟-فقہ کی بعض اردو کتابوں میں ہے کہ وہ شریک نہیں ہو سکتا ہے- ناچیز کا مشورہ یہ ہے کہ اس مسئلہ پر علمائے کرام غور فرمائیں اور بہار شریعت وغیرہ کے مآخذومراجع کی عبارتوں کی روشنی میں اپنی اپنی تحقیق پیش کریں ۔ کیوں کہ بندۂ حقیر کی نظر میں یہ مسئلہ قابل غور ہے اور بہار شریعت میں قول مرجوح کا نقل ہو جانا بھی ممکن ہے جو پوری بہار شریعت کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں۔

مفتی رہبر رضا اشرفی سمنانی جامعی-

(فتوی)

الجواب بعون الملك الوهاب

جو شخص فرض عشاء جماعت کے ساتھ نہ پڑھاہو وہ وتر کی جماعت میں شریک ہو سکتا ہے۔فقہائے کرام کااس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ رمضان میں اگر کسی شخص نے عشاء کی نماز جماعت سے نہ پڑھی تو آیاوہ وتر جماعت سے پڑھے یاتنہا؟

بعض فقہائے کرام کااس بارے نظریہ ، یہ ہے کہ جس شخص نے عشاء تنہاپڑھی وہ وتر بھی تنہاپڑھے یہی افضل ہے۔(لیکن یہ نظریہ مجھ قلیل العلم اور ناقص الفہم کے علم وتحقیق کے مطابق مرجوح ہے)

اور بعض فقہائے کرام کا نظریہ اور تحقیق ہے کہ جس شخص نے عشاء تنہاپڑھی ہو اس کا جماعت کے ساتھ وتر پڑھنابلا کراہت جائز ہے اور جب جماعت جائز ہے تو افضل بھی یہی ہے(مجھ فقیر اشرفی اور بے بضاعت کے نزدیک بھی یہی نظریہ باعتبار دلائل راجح اور قوی تر ہے۔

فقہائے کرام کے درمیان یہ اختلاف دراصل اس اختلاف کی بنیاد پر ہے کہ آیارمضان میں وتر کی جماعت عشاء کی جماعت کے تابع ہے یاتراویح کی جماعت کے ؟ صحیح یہ ہے کہ نفس وتر اگرچہ عشاء کے تابع ہیں لیکن وتر کی جماعت کا مسنون ہوناتراویح کی جماعت کی سنّیت کے تابع ہے، کیوں کہ اگروتر کی جماعت عشاء کی جماعت کے تابع ہوتی تووتر ساراسال جماعت کے ساتھ مسنون ہوتے کیوں کہ عشاء کی نماز میں جماعت ساراسال مسنون ہے اور چونکہ وتر صرف رمضان میں جماعت کے ساتھ مسنون ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ وتر کی جماعت کی سنّیت تراویح کی جماعت کی سنّیت کے تابع ہے۔ان عبارات مذکورہ سے یہ بات خوب واضح ہو گئی کہ رمضان میں وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہے نہ کہ عشاء کی جماعت کے -

اور ردالمختار جلد دوم کتاب الصلوۃ/باب الوتر والنوافل صفحہ 500 میں ہے:

''الذی یظهران جماعة الوترتبع لجماعة التراویح وان کان الوترنفسه اصلافی ذاته لان سنة الجماعة فی الوترانماعرفت بالاثرتابعة للتراویح''

یعنی جوبات ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہے اگرچہ فی نفسہ وتر اصل ہے اس لئے کہ وتر میں جماعت کا مسنون ہونا احادیث کی روشنی میں تراویح ہی کی تابع ہے۔اب جب یہ بات واضح ہو گئی کہ وتر کی جماعت تراویح کی

جماعت کے تابع ہے تو اسی سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ رمضان میں اگر کسی شخص نے عشاء کی نماز تنہا پڑھی اور تراویح جماعت کے ساتھ پڑھی ہو پھر بھی وہ وتر کی نماز جماعت کے ساتھ بلا کراہت پڑھ سکتا ہے۔

اور علامہ ابراہیم حلبی منیۃ المصلی کی شرح کبیر میں لکھتے ہیں:

''قال ابویوسف البانی اذا صلی مع الامام شیئا من التراویح یصلی معه الوتر وکذا اذا لم یدرک معه شیئا منها وکذا اذا صلی التراویح مع غیره له ان یصلی الوتر معه وهو الصحیح ذکره ابو اللیث وکذا قال ظهیر الدین المرغینانی لو صلی العشاء وحده فله ان یصلی التراویح مع الامام وهو الصحیح''

ابو یوسف بانی کہتے ہیں کہ اگر امام کے ساتھ کچھ تراویح پڑھ لی ہیں تو اس کے ساتھ وتر پڑھ سکتا ہے۔ اور اگر امام کے ساتھ کچھ بھی نہ پڑھا ہو (نہ فرض نہ تراویح) اسی طرح اگر کسی اور کے ساتھ تراویح پڑھی ہوں تو وہ امام کے ساتھ وتر پڑھ سکتا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس کو ابو اللیث نے ذکر کیا ہے اسی طرح ظہیر الدین مرغینانی نے کہا ہے۔ اور اگر تنہا عشاء کی نماز پڑھی ہو تو وہ امام کے ساتھ تراویح پڑھ سکتا ہے یہی صحیح ہے۔ اور اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ علامہ موصوف کتاب مذکور کی دوسری شرح صغیر میں لکھتے ہیں:

''واذالم یصل الفرض مع الامام قیل لا یتبعه فی التراویح ولا فی الوتر وکذا اذالم یصل معه التراویح لایتبعه فی الوتر والصحیح انه یجوز ان یتبعه فی ذالك كله''

جب امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے گئے ہوں تو کہا گیا کہ پھر امام کی اقتداء میں نہ تراویح پڑھے نہ وتر۔ اسی طرح اگر امام کی اقتداء میں تراویح نہ پڑھی ہوں تو اس کی اقتداء میں وتر نہ پڑھے۔ اور صحیح یہ ہے کہ جب امام کے ساتھ فرض یا تراویح نہ پڑھی ہوں تو وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے ہوں تو تراویح جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے"۔ اور حاشیہ الطحطاوی علی الدر المختار جلد اول للعلامہ احمد بن محمد الطحطاوی میں ہے:

لان المنفرد لو صلی العشاء وحده فله ان یصلی التراویح مع الامام الی قوله قضیة التعلیل فی المسئلة السابقة بقولهم لانها تبع ان یصلی الوتر بجماعة فی هذه الصلوة لانه لیس تبع للتراویح ولا للعشاء عند الامام رحمه الله تعالی"

اگر کوئی شخص عشاء کی نماز تنہا پڑھے تو اس کیلئے امام کے ساتھ تراویح پڑھنا جائز ہے۔ اور اسی پر یہ مسئلہ متفرع ہے کہ اس صورت میں وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے کیوں کہ وتر کی جماعت امام رحمہ اللہ کے نزدیک نہ فرض کے تابع ہے نہ تراویح کے۔ علامہ طحطاوی کی عبارت مذکورہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جو شخص عشاء کی فرض نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھے وہ وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ علامہ موصوف کی یہ بات کہ

"وتر کی جماعت فرض اور تراویح میں سے کسی کے تابع نہیں ہے"

ہمارے موقف (وتر کی جماعت کی سنیت تراویح کی جماعت کی سنیت کے تابع ہے) کے خلاف نہیں۔ اس لئے کہ ہمارا موقف یہ نہیں ہے کہ مطلقاً وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہے بلکہ ہمارا موقف یہ ہے کہ وتر کی جماعت کی سنیت تراویح کی جماعت کی سنیت کے تابع ہے۔ بہر حال علامہ طحطاوی کی عبارت مذکورہ ہمارے اس موقف کو ثابت کرنے میں بالکل صریح

ہے کہ جو شخص فرض عشاء جماعت سے نہ پڑھا ہو وہ وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ اور علامہ محمد خراسانی قہستانی رحمہ اللہ تعالی علیہ اپنی کتاب جامع الرموز جلد اول میں لکھتے ہیں:

''یجوز ان یصلی الوتر بجماعۃ وان لم یصل شیئا من التراویح مع الامام او صلھا مع غیرہ وھو الصحیح لکنہ اذا لم یصل الفرض معہ لایتبعہ فی الوتر کما فی المنیہ''

اگر امام کے ساتھ تراویح نہ پڑھی ہو یا کسی اور شخص کے ساتھ تراویح پڑھی ہو (دونوں صورتوں میں) وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے لیکن جب فرض امام کے ساتھ نہ پڑھے ہوں تو وتر امام کے ساتھ نہ پڑھے جیسا کہ منیہ میں ہے:

قہستانی کی اس عبارت سے بعض علماء کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اگر فرض جماعت کے ساتھ نہ پڑھے ہوں تو وہ وتر بھی جماعت کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ علامہ قہستانی کی عبارت کا صحیح محل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص فرض اور تراویح دونوں امام کے ساتھ نہ پڑھے ہوں تو وہ امام کے ساتھ وتر نہ پڑھے۔

اور علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالی ردالمحتار جلد دوم باب الوتر والنوافل میں تاتارخانیہ کی یہ عبارت

انہ سال علی ابن احمد عمن صلی الفرض والتراویح وحدہ او التراویح فقط ھل یصلی الوتر مع الامام، فقال لا،

(یعنی علی بن احمد سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا جس نے فرض اور تراویح تنہا پڑھی یا صرف تراویح تنہا پڑھی تو کیا وتر امام کے ساتھ پڑھ سکتا ہے؟ کہا نہیں) کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ثم رائیت القھستانی ذکر تصحیح ماذکرہ المصنف ثم قال لکنہ اذا لم یصل الفرض معہ لایتبعہ فی الوتراہ۔ فقولہ ولو لم یصلھا ای وقد صلی الفرض معہ لکن ینبغی ان یکون قول القھستانی معہ احترازا عن صلاتھا منفردا امالو صلاھا جماعۃ مع غیرہ ثم صلی الوتر معہ لاکراھۃ۔تامل۔''

پھر میں نے قہستانی کو دیکھا کہ مصنف کی بات کی تصحیح کو بیان کیا۔ پھر کہا لیکن اگر فرض جماعت سے نہیں پڑھی تو وتر بھی جماعت سے نہ پڑھے ان کا قول ''اگر تراویح جماعت سے نہیں پڑھی یعنی صرف فرض جماعت سے پڑھی لیکن مناسب یہ کہ القہستانی کا قول ''معہ'' تنہا تراویح پڑھنے سے احتراز کے طور پر ہو۔ لیکن اگر اس نے تراویح کسی اور کے ساتھ جماعت سے پڑھی پھر وتر جماعت کے ساتھ پڑھی تو کراہت نہیں - علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ کی مذکورہ نقل کردہ عبارات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ علامہ علی بن احمد اور علامہ قہستانی کے نزدیک مطلقا امام کے ساتھ عشاء نہ پڑھنا وتر کی جماعت کیلئے موجب کراہت نہیں۔ بلکہ اس صورت میں مکروہ ہے جب کہ کسی شخص نے امام کے ساتھ نہ فرض پڑھے ہوں نہ تراویح اس وقت امام کے ساتھ وتر پڑھنا مکروہ ہے۔ تاتارخانیہ اور علامہ قہستانی کی عبارات کو اس خاص صورت پر محمول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہے۔ اس لئے اگر اس نے فرض کے علاوہ تراویح جماعت کے ساتھ نہیں پڑھی تو اس کا وتر جماعت کے ساتھ پڑھنا مکروہ ہے۔ البتہ اگر فرض جماعت کے ساتھ نہیں پڑھے لیکن اگر تراویح کسی امام کے ساتھ پڑھ لی ہے تو اب وتر کی جماعت مکروہ نہیں ہے۔ کیوں کہ تراویح جماعت کے ساتھ پڑھ چکا ہے (اور یہاں کراہت سے مراد کراہت تنزیہی ہے) اور اسی سے یہ بھی معلوم کہ اگر اس شخص نے تراویح بھی اسی امام کے ساتھ پڑھی ہو تو پھر اس امام کے ساتھ

باجماعت وتر پڑھنا بطریق اولی مکروہ نہیں ہوگا۔ اور یہی زیر بحث مسئلہ ہے۔ حیرت ہے کہ بعض علماء نے علامہ قہستانی اور علامہ شامی وغیرہ کے حوالہ سے تنہا فرض پڑھنے والے کیلئے مطلقا یہ لکھ دیا کہ وہ وتر کی جماعت میں شریک نہیں ہو سکتا حالانکہ یہ فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالی اس کے برعکس یعنی جواز کی تصریح کرتے ہیں کمالایخفی علی المحققین۔

ماحصل تحقیق یہ ہے کہ جو شخص فرض عشاء جماعت کے ساتھ نہ پڑھے وہ وتر کی جماعت میں شریک ہو سکتا ہے اس لئے کہ تنہا عشاء پڑھنے والے کو باجماعت وتر پڑھنے سے نہ قرآن نے منع کیا ہے نہ حدیث نے، نہ اجماع نے، اور نہ قیاس نے۔ تو پھر محض ماضی قریب کے بعض علماء کے یہ کہہ دینے سے کہ شریک نہیں ہو سکتا کیسے کہ دیا جا سکتا ہے کہ فرض تنہا پڑھنے والا وتر کی جماعت میں شریک نہیں ہو سکتا؟ (ہو سکتا ہے ہمارے ان علماء سے تسامح ہوا ہو)

مجھ فقیر اشرفی کا صریح موقف یہی ہے کہ فرض کی جماعت میں جو شریک نہ تھا وہ وتر کی جماعت میں شریک ہو سکتا ہے

هذاماعندی ومن ادعی خلاف ذالك فعليه البيان با الدليل القوی والاثبات باالتحقيق والله تعالیٰ اعلم وعلمه اتم واحکم۔ **کتبه**

محمد ساحل پرویز اشرفی الجامعی مفتی وچیف قاضی عالم ربانی سید احمد اشرف دارالافتاء والقضاء وصدرالمدرسین جامعہ اشرفیہ سرکار کلاں مع کلیات اشرف نگر پکھال روڈ ناسک مہاراشٹر

16رمضان1439ہجری-2جون2018عیسوی

الجواب

راجح مسئلہ وہی ہے جو آج تک آپ نے سنا اور پڑھا ہے۔ یعنی اگر رمضان میں کسی نے نماز عشاء کے فرض جماعت سے ادا نہیں کئے تو وہ وتر بھی جماعت سے ادا نہ کرے۔ اور رہا آپ کا پیش کردہ فتوی تو یہ اصول کی طرف مراجعت کئے بغیر عجلت میں لکھا گیا ہے۔ فقیر فتوی مذکورہ کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مفتی موصوف کا یہ کہنا کہ

"جو شخص فرض عشاء جماعت کے ساتھ نہ پڑھا ہو وہ وتر کی جماعت میں شریک ہو سکتا ہے"

قول راجح کے خلاف ہے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اور پھر یہ کہنا کہ

"بعض فقہائے کرام کا اس بارے نظریہ یہ ہے کہ جس شخص نے عشاء تنہا پڑھی وہ وتر بھی تنہا پڑھے یہی افضل ہے۔ (لیکن یہ نظریہ مجھ قلیل العلم اور ناقص الفہم کے علم و تحقیق کے مطابق مرجوح ہے)

یہ مرجوح کا قول نصوص فقہا کے سراسر خلاف ہے۔ جس کو ہم ان شاء اللہ آگے ثابت کریں گے۔ مزید برآں ہم آپ کے علم میں اضافہ کے لیے عرض کر دیں کہ یہ مفتی موصوف کی تحقیق نہیں ہے جیسا کہ موصوف نے لکھا ہے۔ بلکہ اس خلاف نصوص فقہا و جمہور تحقیق کا سہرا خاص کر دیابنہ کے سر جاتا ہے۔ جو ان کی کتابوں سے ظاہر ہے۔

نیز ان کے دیکھا دیکھی دو چار سنی مفتیوں نے بھی اس قول مرجوح پر جزم کر لیا۔ انہیں میں سے ایک مولانا غلام رسول سعیدی پاکستانی ہیں جنہوں نے شرح صحیح مسلم میں اس مسئلہ پر بحث کی اور راجح مسئلہ کو مرجوح بنانے کی حتی الامکان کوشش کی

ہے۔ مفتی موصوف کا فتوی دراصل قدرے الفاظ کے ساتھ وہیں سے ماخوذ ہے۔ اہل علم حضرات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ کہیں کہیں توبعینہٖ عبارات بھی شرح صحیح مسلم سے لی گئی ہیں۔ مگر فتوی میں جتایا یہ گیاہے کہ یہ مفتی موصوف کی تحقیق ہے۔ اب اس کو ارباب علم کس درجہ میں رکھیں گے یہ انہیں پر چھوڑتے ہیں۔ اور مفتی موصوف کے پیش کردہ شرح مسلم میں درج دلائل پر گفتگو کرتے ہیں۔

مفتی موصوف اپنے دعوی پر دلیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صحیح یہ ہے کہ نفس وتر اگرچہ عشاء کے تابع ہیں لیکن وتر کی جماعت کا مسنون ہونا تراویح کی جماعت کی سنّیت کے تابع ہے، کیوں کہ اگر وتر کی جماعت عشاء کی جماعت کے تابع ہوتی تو وتر سارا سال جماعت کے ساتھ مسنون ہوتے، کیوں کہ عشاء کی نماز میں جماعت سارا سال مسنون ہے۔ اور چوں کہ وتر صرف رمضان میں جماعت کے ساتھ مسنون ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وتر کی جماعت کی سنّیت تراویح کی جماعت کی سنّیت کے تابع ہے۔ ان عبارات مذکورہ سے یہ بات خوب واضح ہوگئی کہ رمضان میں وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہے نہ کہ عشاء کی جماعت کے۔''

مفتی موصوف کی عبارت سے دو باتیں سامنے آئیں۔

اولاً: وتر کی جماعت کی سنّیت تراویح کی جماعت کی سنّیت کے تابع ہے۔

ثانیاً: رمضان میں وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہے نہ کہ عشاء کی جماعت کے۔

قطع نظر اس سے کہ موصوف کے دونوں اقوال بظاہر متضاد ہیں ہم بس یہاں اتنا بتا دیں کہ مفتی موصوف نے بڑی عجلت میں یہ فیصلہ لیاہے۔ موصوف کے بتائے ہوئے قاعدے کی روشنی میں اس صورت کا کیا حکم ہوگا کہ جب کسی نے فرض جماعت سے پڑھے لیکن تراویح کی جماعت نہیں کی؟

اگر رمضان میں وتر تراویح کی جماعت کے تابع ہیں یا تراویح کی جماعت کی سنیت کے تابع ہیں (مطلقاً) تو دونوں صورتوں میں تراویح ادا نہ کرنے والے کے لیے وتر کی جماعت کی سنیت یا اس کی ادائیگی کا حکم نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ تراویح جماعت سے ادا نہیں کی گئیں۔ جو حکم متبوع کا وہی حکم تابع کا ہوتا ہے لیکن فقہا نے وتر جماعت سے ادا کرنے کا حکم دیاہے۔ جیسا کہ فتاوی عالمگیری میں ہے:

''صلى العشاء وحده فله أن يصلي التراويح مع الإمام ولو تركوا الجماعة في الفرض ليس لهم أن يصلوا التراويح بجماعة وإذا صلى معه شيئا من التراويح أو لم يدرك شيئا منها أو صلاها مع غيره له أن يصلي الوتر معه هو الصحيح''

یعنی جس نے تنہا نماز ادا کی تو وہ امام کے ساتھ نماز تراویح ادا کرے۔ اور اگر سب نے فرض کی جماعت چھوڑ دی تو ان کے لیے جماعت سے تراویح ادا کرنے کا حکم نہیں ہے۔ اور اگر تراویح میں سے کچھ امام کے ساتھ پڑھ لیں یا بالکل نہیں پڑھیں یا اس امام کے علاوہ کسی اور امام کی اقتدا میں تراویح ادا کیں تو اس امام کے ساتھ وتر ادا کرے یہی صحیح ہے۔

مجمع الانھر میں ہے:

''وفي القهستاني ويجوز أن يصلي الوتر بالجماعة وإن لم يصل شيئا من التراويح مع الإمام أو صلاها مع غيره وهو

الصحیح''

یعنی اور قہستانی میں ہے کہ وتر باجماعت ادا کرنا جائز ہے اگرچہ تراویح میں سے کچھ بھی امام کے ساتھ نہ پڑھی ہوں یا پڑھی ہوں مگر دوسرے امام کے ساتھ اور یہی صحیح ہے۔[مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر، ۱/۲۰۵، باب الوتر والنوافل]

در مختار میں ہے:

''ولولم یصلها) أی التراویح (بالإمام) أو صلاها مع غیره له أن یصلی الوتر معه''

یعنی اگر تراویح امام کے ساتھ ادا نہیں کیں یا دوسرے امام کے ساتھ ادا کیں تو امام کے ساتھ وتر پڑھ سکتا ہے۔

[الدرالمختار، باب الوتر والنوافل، ۲/۵۰۰، ۴۹۹]

علاوہ ازیں بعض فقہانے وتر کی جماعت کو عشاء کی فرض نماز کے تابع قرار دیا بعض نے تراویح کے تابع قرار دیا۔ اور امام اعظم سے دونوں کا عدم ثابت ہے۔ یعنی وتر کی جماعت نہ فرض نماز کے تابع ہے نہ تراویح کے۔ جیسا کہ خود مفتی موصوف نے حاشیہ طحطاوی کی عبارت پیش کی ہے۔

'' لانه لیس تبع للتراویح ولاللعشاء عندالامام رحمه الله تعالی "۔

کیوں کہ وتر کی جماعت امام رحمہ اللہ کے نزدیک نہ فرض کے تابع ہے نہ تراویح کے۔ اور اس پر مفتی موصوف کا یہ کہنا کہ:

"علامہ موصوف کی یہ بات کہ

"وتر کی جماعت فرض اور تراویح میں سے کسی کے تابع نہیں ہے"

ہمارے موقف وتر کی جماعت کی سنیت تراویح کی جماعت کی سنیت کے تابع ہے) کے خلاف نہیں اس لئے کہ ہمارا موقف یہ نہیں ہے کہ مطلقا وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہے بلکہ ہمارا موقف یہ ہے کہ وتر کی جماعت کی سنیت تراویح کی جماعت کی سنیت کے تابع ہے۔" خود ان کے گزشتہ قول

ان عبارات مذکورہ سے یہ بات خوب واضح ہوگئی کہ رمضان میں وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہے نہ کہ عشاء کی جماعت کے۔"

کے خلاف ہے۔ کیوں کہ موصوف نے فتوی کا دارومدار مطلقاً وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہونے پر رکھا ہے، جیسا کہ فتوی سے ظاہر ہے۔ اگر حکم مطلقانہ رکھا ہوتا تو مسئلہ بیان کرتے ہوئے وضاحت ضرور کی گئی ہوتی۔

الغرض مفتی موصوف کا وتر کی جماعت کو تراویح کے تابع قرار دے کر اسی پر فتوی کا دارومدار رکھنا کہاں تک درست ہے اسے اہل علم بخوبی جان سکتے ہیں۔

ہم یہاں وتر کی جماعت تراویح کی جماعت یا فرض نماز کے تابع ہونے کے سلسلے میں امام اہل سنت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں محدث بریلوی قدس سرہ کی تحقیق انیق جو فقہا کی دقیق و مختلف فیہا عبارات کی تطبیق کی صورت میں ظاہر ہوئی پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''فقد تحرر بما تقرر، ان جماعة الوتر تبع لجماعة الفرض فی حق احد من المصلین، والجماعة التراویح فی الجملة لافی

حق کل، ولرمضان بمعنی انها تکرہ فی غیرہ ''

پس اس تقریر سے یہ بات صاف ہوگئی کہ وتر کی جماعت فرض کی جماعت کے تابع ہے تمام نمازیوں کے لئے۔ اور وتر کی جماعت، تراویح کی جماعت کے تابع ہے کچھ نمازیوں کے لئے۔ (یعنی بعض حضرات نے بھی تراویح باجماعت پڑھ لیں تو دوسروں کو وتر کی جماعت میں شرکت جائز ہے) اور وتر کی جماعت رمضان کے بھی تابع ہے لیکن اس معنی میں کہ غیر رمضان میں یہ جماعت مکروہ ہے" [فتاوی رضویہ جدید: ج۷ص۵۶۷]

الحاصل: مفتی موصوف کا وتر کی جماعت کو تراویح کی جماعت کے تابع قرار دے کر یہ باور کرانا کہ جس نے عشاء کے فرض ادا نہیں کئے وہ وتر باجماعت ادا کرے کیوں کہ اس نے تراویح باجماعت ادا کی ہیں۔ اور وتر چوں کہ تراویح کی جماعت کے تابع ہیں اس لیے اس کو بھی جماعت سے ادا کرے، قیاس مع الفارق کے قبیل سے ہے۔ جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر چکے۔

مفتی موصوف فتاوی شامی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اور ردالمحتار جلد دوم کتاب الصلوۃ/باب الوتر والنوافل صفحہ ۵۰۰ میں ہے:

''الذی یظهران جماعة الوترتبع لجماعة التراویح وان کان الوترنفسه اصلافی ذاته لان سنة الجماعة فی الوترانماعرفت بالاثرتابعة للتراویح''

یعنی جو بات ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہے اگر چہ فی نفسہ وتر اصل ہے اس لئے کہ وتر میں جماعت کا مسنون ہونا احادیث کی روشنی میں تراویح ہی کے تابع ہے۔ اب جب یہ بات واضح ہوگئی کہ وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہے تو اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ رمضان میں اگر کسی شخص نے عشاء کی نماز تنہا پڑھی اور تراویح جماعت کے ساتھ پڑھی ہو پھر بھی وہ وتر کی نماز جماعت کے ساتھ بلا کراہت پڑھ سکتا ہے۔"

فتاوی شامی کی جو عبارت موصوف نے پیش کی ہے اس سے بس اس قدر ثابت ہوا کہ تراویح کی جماعت کا مسنون ہونا احادیث کی روشنی میں تراویح ہی کے تابع ہے۔ البتہ اس سے موصوف نے یہ نتیجہ نکال کر واقعی حیرت میں ڈال دیا ہے کہ

"تو اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ رمضان میں اگر کسی شخص نے عشاء کی نماز تنہا پڑھی اور تراویح جماعت کے ساتھ پڑھی ہو پھر بھی وہ وتر کی نماز جماعت کے ساتھ بلا کراہت پڑھ سکتا ہے۔"

ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ اگر اس بات کو مطلق رکھا جائے گا تو پھر تراویح باجماعت ادا نہ کرنے والوں کے لیے وتر باجماعت ادا کرنے کا حکم نہیں ہوگا کیوں کہ وتر کی جماعت تراویح کی جماعت کے تابع ہے۔ اور جب تراویح کی جماعت نہیں تو وتر کی کیوں؟ مفتی موصوف مزید دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اور علامہ ابراہیم حلبی منیۃ المصلی کی شرح کبیر میں لکھتے ہیں"

''قال ابویوسف البانی اذاصلی مع الامام شیئا من التراویح یصلی معه الوتروکذااذالم یدرك معه شیئامنها وکذا اذا صلی التراویح مع غیرہ له ان یصلی الوترمعه وهوالصحیح ذکرہ ابواللیث وکذاقال ظهیرالدین المرغینانی لوصلی العشاء وحدہ فله ان یصلی التراویح مع الامام وهوالصحیح''۔

ابو یوسف بانی کہتے ہیں کہ اگر امام کے ساتھ کچھ تراویح پڑھ لی ہیں تو اس کے ساتھ وتر پڑھ سکتا ہے اور اگر امام کے ساتھ کچھ بھی نہ پڑھا ہو (نہ فرض نہ تراویح) اسی طرح اگر کسی اور کے ساتھ تراویح پڑھی ہوں تو وہ امام کے ساتھ وتر پڑھ سکتا ہے اور یہی صحیح ہے اس کو ابو اللیث نے ذکر کیا ہے اسی طرح ظہیر الدین مرغینانی نے کہا ہے۔ اور اگر تنہا عشاء کی نماز پڑھی ہو تو وہ امام کے ساتھ تراویح پڑھ سکتا ہے یہی صحیح ہے۔"

افسوس مفتی موصوف نے شرح کبیر کی عبارت کو سمجھا ہی نہیں۔ پوری عبارت میں کہیں بھی فرض کی جماعت چھوڑنے والے کے لیے وتر کی جماعت کا حکم نہ صراحتاً مذکور ہے نہ اشارتاً۔ عبارت کا ترجمہ یوں ہے:

یعنی امام ابو یوسف بانی نے کہا کہ جب امام کے ساتھ کچھ تراویح ادا کی ہوں تو وتر بھی اسی کے ساتھ ادا کرے۔ اور یوں ہی جب امام کے ساتھ تراویح میں سے کچھ ادا نہ کیا ہو اور یوں ہی جب تراویح دوسرے امام کے ساتھ ادا کی ہوں تو وہ وتر اِس امام کے ساتھ ادا کرلے یہی صحیح ہے۔ اس کو ابو اللیث نے ذکر کیا اور ایسا ہی ظہیر الدین مرغینانی نے کہا کہ اگر اس نے عشاء کے فرض تنہا ادا کئے ہوں تو تراویح امام کے ساتھ ادا کرسکتا ہے اور یہی صحیح ہے۔

اس ترجمہ سے واضح ہو گیا کہ موصوف نے جو ترجمہ کیا ہے وہ ان کا اپنا ہے۔ عبارت سے وہ مطلب بالکل نہیں نکلتا جو انہوں نے لکھا ہے۔ ترجمہ میں انہوں نے خیانت سے کام لیا ہے اس کی ایک واضح مثال یہی ہے کہ انہوں نے

''وكذااذا لم يدرك معه شيئامنها'' کا ترجمہ '' اور اگر امام کے ساتھ کچھ بھی نہ پڑھا ہو (نہ فرض نہ تراویح) کیا ہے۔

حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ منھامیں ضمیر کا مرجع فرض اور تراویح نہیں بلکہ صرف تراویح ہے جس پر سباق شاہد ہے۔

مفتی موصوف مزید دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اور اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ علامہ موصوف کتاب مذکور کی دوسری شرح صغیر میں لکھتے ہیں:

''واذالم يصل الفرض مع الامام قيل لا يتبعه فى التراويح ولا فى الوتر وكذا اذالم يصل معه التراويح لايتبعه فى الوتروالصحيح انه يجوزان يتبعه فى ذالك كله''۔

جب امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے گئے ہوں تو کہا گیا کہ پھر امام کی اقتداء میں نہ تراویح پڑھے نہ وتر اسی طرح اگر امام کی اقتداء میں تراویح نہ پڑھی ہوں تو اس کی اقتداء میں وتر نہ پڑھے۔ اور صحیح یہ ہے کہ جب امام کے ساتھ فرض یا تراویح نہ پڑھی ہوں تو وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے ہوں تو تراویح جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے"۔

اس عبارت کا جو مطلب مفتی موصوف نے سمجھا وہ نہیں ہے۔ بلکہ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جس امام کے ساتھ فرض ادا نہیں کئے اس امام کے ساتھ تراویح و وتر ادا نہ کرے۔ اور یوں ہی جس امام کے ساتھ تراویح ادا نہیں کی اس کے ساتھ وتر ادا نہ کرے۔ لیکن صحیح یہ ہے ان ساری باتوں میں اس امام کی اتباع جائز ہے۔ مطلب اگر کسی اور امام کے ساتھ فرض پڑھ لیے ہیں تو دوسرے امام کے ساتھ تراویح اور وتر پڑھ سکتا ہے۔ اور اگر تراویح کسی اور امام کے ساتھ ادا کیں تو وتر دوسرے امام کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ شرح صغیر کی اس عبارت سے متعلق امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے زبردست بحث فرمائی ہے فقیر بعینہٖ اس بحث کو یہاں پیش کئے دیتا ہے۔

''نعم وقع فی شرح المنیة الصغیر، مانصه اذا لم یصل الفرض مع الامام قیل لایتبعه فی التراویح ولافی الوتر وکذا اذالم یصل معه التراویح لایتبعه فی الوتر والصحیح انه یجوز ان یتبعه فی ذلك کله حتی دخل بعد ماحصل الامام الفرض وشرع فی التراویح فانه یصلی الفرض اولا وحده ثم یتابعه فی التراویح وفی القنیة لوترکوا الجماعة فی الفرض لیس لهم ان یصلا التراویح جماعة فاوهم ذلك عند بعض الناس ان الحلبی صحح جواز اتباع الامام فی الوتر وان لم یتبع فی الفرض،

ہاں منیہ صغیر میں یہ بات مذکور ہے کہ جس نے فرض باجماعت نہ پڑھے ہوں وہ تراویح اور وتر کی جماعت میں ایک قول کے مطابق شریک نہ ہو۔ اور وہ بھی جو اس امام کے ساتھ تراویح کی جماعت میں شریک نہ ہوا تو وہ بھی اس امام کے ساتھ وتر کی جماعت میں شریک نہ ہو (لیکن یہ بات درست نہیں) کیوں کہ ان مذکور تمام صورتوں میں وہ وتر امام کے ساتھ باجماعت پڑھ سکتاہے، حتی کہ امام کے فرض سے فارغ ہونے کے بعد اگر مسجد میں آیا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ پہلے اکیلے فرض پڑھ کر پھر تراویح کی جماعت میں شریک ہو جائے۔

اور قنیہ میں ہے کہ اگر لوگ فرض کی جماعت کے تارک ہوں تو وہ تراویح باجماعت امام کے ساتھ نہ پڑھیں۔ اس سے بعض حضرات کو یہ وہم ہوا ہے کہ حلبی نے فرض باجماعت کے بغیر وتر کی جماعت میں شرکت کو صحیح قرار دیا ہے۔

وانا اقول لیس هو رحمه الله تعالیٰ من اصحاب التصحیح وانما وظیفته النقل عن ائمة الترجیح ومعلوم ان شرحه الصغیر انما هو ملخص من شرحه الکبیر وهذه عبارة الکبیر بمرأی عین منك لاتری فیه تصحیحا اصلا ناظر الی هذا المتوهم وانما فیه تصحیحان الاول من الامام الفقیه ابی اللیث بجواز اتباع الامام فی الفقیه ابی اللیث بجواز اتباع الامام فی الوتر سؤ صلی التراویح کلها اوبعضها معه اومع غیره اووحده منفردا وهذا مجمل قوله ''یجوز ان یتبعه فی ذلك کله والثانی عن الامام ظهیر الدین المرغینانی لجواز الاتباع فی التراویح وان لم یتبعه فی الفرض، وعله یتفرع الفرع المذکور فی الشرحین معا'' حتی لودخل بعد ماصلی الامام الفرض فالتوهم الحاصل فی عبارة الشرح الصغیر انما منشوه ماوقع فیه ههنا من الاختصار المخل الاتری انه اقتصر فی التفریع المذکور کاصله الکبیر علی قوله، یتابعه فی التراویح، ولوکان مراده بقوله فی ذلك کله، مایشمل المتوهم، لزاد ایضا والوتر،

میں کہتاہوں کہ حلبی رحمۃ اللہ علیہ اصحاب تصحیح میں سے نہیں، ان کا کام صرف ائمہ ترجیح کے قول کو نقل کرنا ہے۔ اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ان کی شرح صغیر یہ ان کی کبیر شرح کا خلاصہ ہے اور کبیر شرح کی عبارت آپ کے سامنے ہے اس میں اس وہم کے متعلق کوئی تصحیح نظر نہیں آتی۔ اس مسئلہ میں صرف دو تصحیحیں موجود ہیں۔ ایک امام فقیہ ابو اللیث کی جو کہ کسی طرح بھی تراویح پڑھ لینے والے کو خواہ اکیلے یا جماعت کے ساتھ اس امام یا کسی دوسرے امام کے ساتھ، پھر یہ کہ تمام تراویح یا بعض باجماعت پڑھی ہوں، وتر کی جماعت میں شرکت کے جواز کے بارے میں ہے۔ اور اس کو بطور اجمال حلبی نے اپنے اس قول سے تعبیر کیا کہ، اس وتر کی جماعت میں شرکت کی ان تمام صورتوں میں جائز ہے۔ اس بارے میں دوسری تصحیح امام ظہیر الدین مرغینانی کی ہے جو کہ امام کے ساتھ تراویح کی جماعت میں شرکت کے جواز سے متعلق ہے اس شخص کے بارے میں جس نے اس امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے ہوں، اسی تصحیح پر صغیر وکبیر شرحوں کی تفریع مرتب ہے کہ کوئی شخص امام کے

فرض سے فارغ ہونے کے بعد مسجد میں آیا الخ۔ لہٰذا شرح صغیر کی عبارت سے جو وہم پیدا ہوا وہ اس اختصار کی وجہ سے پیدا ہوا۔ کیا آپ نہیں دیکھ رہے کہ انہوں نے تفریع بیان کرتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ وہ فرض پڑھنے کے بعد امام کے ساتھ تراویح میں شامل ہو جائے، اور شرح کبیر میں بھی اتنا ہی ذکر ہے، اور اس کے قول ”ان سب صورتوں میں“ وہ صورت بھی شامل ہوتی جس کا وہم ہوا ہے تو پھر تفریع میں، تراویح میں شامل ہونے کے ساتھ وتر میں شامل ہونے کو بھی ذکر کرتے،

وبالجملة فالمعروف المعلوم من تصحيحات الائمة هو الذی بينه فی الشرح الكبير، وهذا المتوهم لايعرف له تصحيح ولاترجيح، فلايعارض مانص عليه فی منية الفقهاء وحكم به حكما جازما من دون ذكر خلاف فعليك بالتبصر والانصاف ولك ان تقول ان ''الامام'' عرف باللام وضمير ''يتبعه'' راجع اليه والمعرفة اذا اعيدت معرفة كان المراد عين الاول غالبا، فالمعنى اذا لم يصل الفرض مع هذا الامام فله ان يتبعه فی الوتر ای لايجب لاتباعه فی الوتر ان يكون اتبع هذا الامام بعينه فی الفرض، وهذا صحيح لاشك ويؤيد هذا الفهم ان القهستانی لما قال اذا لم يصل الفرض معه لايتبعه فی الوتر۔ احتاج الشامی الى ابانة مراده وان المقصود مع امام ما، لامع خصوص هذا الامام، ان جادل مجادل فنقول الشرح الصغير مطالب بتصحيح نقل هذا التصحيح الذی لايعلم له اثرا صلا فی كتاب قبله حتى فی الكبير الذی كان اصله، والله الموفق۔

الحاصل۔ ائمہ کرام کی تصحیحات سے صرف وہی بات معلوم ہوتی ہے جو کہ شرح کبیر میں ہے حالانکہ وہم شدہ کی اس میں کوئی تصحیح یا ترجیح نظر نہیں آتی۔ لہٰذا شرح کبیر کی عبارت منیۃ الفقہاء کی تصریح عبارت کے معارض نہیں ہو سکتی جبکہ اس منیہ میں جزمی حکم ہے اور اس میں کسی اختلاف کا اس بارے میں کوئی ذکر نہیں ہے، تجھے غور وفکر میں انصاف چاہئے۔

اور تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ شرح صغیر کی عبارت میں لفظ ”الامام“ معروف بالام ہے اور لفظ یتبعہ، میں ضمیر کا مرجع وہی امام ہے، اور اکثر طور پر معرفہ کو جب دوبارہ معرفہ ذکر کیا جائے تو وہی ایک مراد ہوتا ہے، تو اس قاعدہ کے مطابق معنی یہ ہو گا کہ جب اس خاص امام کے ساتھ وتر باجماعت پڑھ سکتا ہے یعنی کسی امام کے ساتھ وتر پڑھنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ فرض بھی اسی کے ساتھ باجماعت پڑھے ہوں، اور یہ مفہوم بلاشک وشبہ صحیح ہے۔ اس مفہوم کی تائید قہستانی کے اس قول سے ہوتی ہے جس کی مراد کو علامہ شامی نے واضح کیا ہے، وہ یہ کہ جب قہستانی نے کہا جب امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے ہوں تو وتر اس کے ساتھ نہ پڑھے۔ اس پر علامہ شامی نے مراد کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ اس امام سے مراد کوئی امام ہے۔ یعنی اگر کسی بھی امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے تو پھر وتر بھی جماعت سے نہ پڑھے، اگر کوئی اس وہم پر بحث کا اصرار کرتا ہے تو اس کو یہ کہہ دیا جائے کہ صغیر کا اصل ہے“

[فتاوی رضويه جديد، جلد۷ص ۵۶۴تا۵۶۶]

مفتی موصوف نے مزید دلیل دیتے ہوئے لکھا:

”اور حاشیہ الطحطاوی علی الدر المختار جلد اول للعلامہ احمد بن محمد الطحطاوی میں ہے۔

لان المنفرد لوصلى العشاء وحده فله ان يصلى التراويح مع الامام الى قوله قضية التعليل فی المسئلة السابقة بقولهم لانها تبع ان يصلى الوتر بجماعة فی هذه الصلوة لانه ليس تبع للتراويح ولاللعشاء عند الامام رحمه الله تعالى''۔

اگر کوئی شخص عشاء کی نماز تنہا پڑھے تو اس کیلئے امام کے ساتھ تراویح پڑھنا جائز ہے اوراسی پر یہ مسئلہ متفرع ہے کہ اس صورت میں وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے کیوں کہ وتر کی جماعت امام رحمہ اللہ کے نزدیک نہ فرض کے تابع ہے نہ تراویح کے۔"

موصوف نے اس عبارت کو بھی نہیں سمجھا اگر فتاوی رضویہ شریف کا مطالعہ کر لیا ہوتا تو ترجمہ کرنے میں بھی آسانی ہو جاتی اور مفہوم بھی واضح ہو جاتا۔ پہلے ہم حاشیہ طحطاوی کی عبارت بعینہٖ نقل کرتے ہیں: تاکہ مسئلہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

(قوله ولوتركوا الجماعة فى الفرض)عبر بالجمع لان المنفرد لوصلى العشاء وحده فله ان يصلى التراويح مع الامام منح لكن تعليل الشرح يعم المنفرد(قوله فليراجع)قضية التعليل فى المسئلة السابقة بقولهم لانها تبع ان يصلى الوتر بجماعة فى هذه الصورة لانه ليس تبع للتراويح ولا للعشاء عند الامام رحمه الله تعالى''

[حاشية الطحطاوى على الدر المختار، جلد ۱ ص ۲۹۷، باب الوتر والنوافل]

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ سابقہ مسئلہ سے مراد در مختار کا مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے:

''ولوتركوا الجماعة فى الفرض لم يصلوا التراويح بجماعة''

لیکن مفتی موصوف نے خود امام طحطاوی کا بیان کردہ سابق مسئلہ سمجھ لیا ہے جو درست نہیں ہے۔

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت حاشیہ طحطاوی کی عبارت سے پیدا شدہ وہم کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''وانا قد راجعت المعزى اليه فلم اجده ناصا بما ظن، نعم قد تشم من بعض كلماته رائحة ذلك حيث قال عند قول الدر المختار لوتركها الكل (يعنى جماعة التراويح) هل يصلون الوتر بجماعة فليراجع قضية التعليل فى المسئلة السابقة (اى لوتركوا الجماعة فى الفرض لم يصلوا التراويح بجماعة) بقولهم لانها تبع ان يصلى الوتر جماعة فى هذه الصورة لانه ليس بتبع للتراويح ولا للعشاء عند الامام رحمه الله تعالى انتهى۔

درر الفرید فی مسائل الصیام والقیام والعید جو کہ فاضل مفتی محمد عنایت احمد علیہ الرحمۃ کی کتاب ہے، کے منہیہ میں جو مذکور ہے کہ اگر کسی نے فرض جماعت سے نہ پڑھے ہوں تو وتر کی جماعت میں شریک ہو سکتا ہے، اور اس بات کو انہوں نے حاشیہ طحطاوی کی طرف منسوب کیا ہے، تو یہ سہو ہے۔ حالانکہ میں نے حاشیہ طحطاوی کو دیکھا ہے میں نے اس میں یہ بات صراحۃً مذکور نہ پائی، ہاں علامہ طحطاوی کی ایک عبارت سے اس بات کی بو آتی ہے، جہاں انہوں نے در مختار کے اس قول اگر سب نے جماعت تراویح کو ترک کر دیا ہو تو کیا وہ وتر جماعت سے ادا کر سکتے ہیں، اس بارے میں رجوع کرنا چاہئے پر لکھا ہے کہ سابقہ مسئلہ کی تعلیل کی طرف رجوع کرنے کا اشارہ ہے یعنی وہ سابقہ مسئلہ یہ ہے کہ "اگر فرض با جماعت کو انہوں نے ترک کیا ہو تو تراویح جماعت سے ادا نہ کریں" اس مسئلہ کی تعلیل یہ ہے، جس کو انہوں نے یوں بیان کیا ہے، کیوں کہ تراویح تابع ہیں، وہ وتر کو اس صورت میں جماعت کے ساتھ پڑھے کیوں کہ وتر تراویح کے تابع ہیں اور نہ ہی عشاء کے تابع ہیں امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہیٰ" [فتاوی رضویہ جدید، جلد ۷ ص ۵۵۸۔ ۵۵۹]

ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''آرے علامہ حلبی محشی در جواب ایں سوال ازرائے و فہم خود چناں بحث کرد کہ گو جماعت تراویح یکسر متروک باش تاہم مقتضائے تعلیل آن ست کہ جماعت وتر روا باشد زیرا کہ او نماز مستقل بنفسہ است۔

وھذا نصہ علی مانقل العلامۃ الطحطاوی قولہ فلیراجع قضیۃ التعلیل فی المسئلۃ السابقۃ بقولھم لانھا تبع، ان یصلی الوتر بجماعۃ فی ھذہ الصورۃ لانہ لیس بتبع للتراویح ولا للعشاء عند الامام رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ایں جانیز چنانکہ دیدی کلام در منفرد فی الفرض نیست۔

ہاں علامہ حلبی محشی نے ازخود اس سوال کے جواب میں اپنی رائے اور فہم سے یہ بحث کی ہے کہ اگرچہ تراویح کی جماعت متروک ہوگئی مگر اب وتر کی جماعت کو ترک نہ کریں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وتر ایک مستقل علیحدہ نماز ہے۔ اور ان کا بیان یہ ہے جیسا کہ علامہ طحطاوی نے ان کا بیان نقل کیا ہے "کتب کی طرف رجوع کرو" یہ اس علت کا قرینہ ہے جو انہوں نے سابقہ مسئلہ میں بیان کی ہے کہ تراویح تابع ہیں اس لئے اس کو جائز ہے کہ وہ وتر باجماعت پڑھے، کیوں کہ وتر نہ تو تراویح کے تابع ہیں اور نہ ہی عشاء کے۔ امام صاحب کے قول میں رحمہ اللہ تعالیٰ، آپ نے ملاحظہ کیا کہ یہاں بھی فرض اکیلے پڑھنے والے کے بارے میں بات نہیں ہے۔'' [فتاوی رضویہ جدید، جلد۷ ص ۵۵۰]

مفتی موصوف مزید لکھتے ہیں کہ:

''اور علامہ محمد خراسانی قہستانی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی کتاب جامع الرموز جلد اول میں لکھتے ہیں:

''یجوز ان یصلی الوتر بجماعۃ وان لم یصل شیئا من التراویح مع الامام او صلھا مع غیرہ وھو الصحیح لکنہ اذا لم یصل الفرض معہ لایتبعہ فی الوتر کما فی المنیہ''

اگر امام کے ساتھ تراویح نہ پڑھی ہو یا کسی اور شخص کے ساتھ تراویح پڑھی ہو (دونوں صورتوں میں) وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے لیکن جب فرض امام کے ساتھ نہ پڑھے ہوں تو وتر امام کے ساتھ نہ پڑھے جیسا کہ منیہ میں ہے

قہستانی کی اس عبارت سے بعض علماء کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اگر فرض جماعت کے ساتھ نہ پڑھے ہوں تو وہ وتر بھی جماعت کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ علامہ قہستانی کی عبارت کا صحیح محل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص فرض اور تراویح دونوں امام کے ساتھ نہ پڑھے ہوں تو وہ امام کے ساتھ وتر نہ پڑھے۔ اور علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ ردالمحتار جلد دوم باب الوتر والنوافل میں تاتارخانیہ کی یہ عبارت

انہ سال علی ابن احمد عمن صلی الفرض والتراویح وحدہ او التراویح فقط ھل یصلی الوتر مع الامام فقال لا: اھ

(یعنی علی بن احمد سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا جس نے فرض اور تراویح تنہا پڑھی یا صرف تراویح تنہا پڑھی تو کیا وتر امام کے ساتھ پڑھ سکتا ہے؟ کہا نہیں) کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں

''ثم رائیت القھستانی ذکر تصحیح ماذکرہ المصنف ثم قال لکنہ اذا لم یصل الفرض معہ لایتبعہ فی الوتر اھ۔ فقولہ ''ولو لم یصلھا'' ای وقد صلی الفرض معہ لکن ینبغی ان یکون قول القھستانی معہ احترازا عن صلاتھا منفردا اما لو صلاھا جماعۃ مع غیرہ ثم صلی الوتر معہ لاکراھۃ۔ تامل''

افسوس مفتی موصوف یہاں خود غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور دوسرے علما کے بارے میں غلط فہمی کا قول کرنے لگے۔ قہستانی کی عبارت بے غبار، صاف اور صریح ہے۔ اس میں کسی طرح کا شک وتردد نہیں ہے۔ موصوف اس عبارت کو بار بار پڑھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں قہستانی میں ہے:

"لکنه اذالم یصل الفرض معه لایتبعه فی الوتر کمافی المنیه"

یعنی جب امام کے ساتھ فرض ادا نہیں کئے تو وتر میں امام کی اتباع نہ کرے ایساہی منیہ میں ہے۔"

لیکن موصوف نے اس سے یہ نتیجہ نکالا

"کہ اگر کوئی شخص فرض اور تراویح دونوں امام کے ساتھ نہ پڑھے تو وہ امام کے ساتھ وتر نہ پڑھے"

کسی بھی عربی خواں سے اس عبارت کا ترجمہ کرائیں اور کسی بھی قابل شخص سے اس کا مفہوم معلوم کریں وہی ہو گا جو فقیر نے ترجمہ کیا ہے۔ نا کہ وہ جو موصوف نے مطلب نکالا ہے۔ نیز موصوف نے اس عبارت کا مطلب یہ کیسے نکال لیا یہ تو خود ان کے پیش کردہ دلائل میں سے ایک دلیل کے صراحتاً خلاف ہے۔

مفتی موصوف نے اپنے دعوی پر بڑے ہی طمطراق کے ساتھ شرح صغیر کی عبارت پیش کی تھی اس عبارت سے جو مفہوم اخذ ہوتا ہے وہ موصوف کے اس نتیجہ کے سراسر خلاف ہے ملاحظہ کریں۔ موصوف لکھتے ہیں:

"اور اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ علامہ موصوف کتاب مذکور کی دوسری شرح صغیر میں لکھتے ہیں:

"واذالم یصل الفرض مع الامام قیل لا یتبعه فی التراویح ولا فی الوتر وکذا اذالم یصل معه التراویح لایتبعه فی الوتروالصحیح انه یجوزان یتبعه فی ذالك کله"

جب امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے گئے ہوں تو کہا گیا کہ پھر امام کی اقتداء میں نہ تراویح پڑھے نہ وتر اسی طرح اگر امام کی اقتداء میں تراویح نہ پڑھی ہوں تو اس کی اقتداء میں وتر نہ پڑھے اور صحیح یہ ہے کہ جب امام کے ساتھ فرض یا تراویح نہ پڑھی ہوں تو وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے ہوں تو تراویح جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے"۔

دیکھیں شرح صغیر کی عبارت کے ترجمہ سے جو موصوف نے کیا ہے اس سے صاف خود ان کے موقف کی مخالفت ہو رہی ہے۔

علاوہ ازیں قہستانی کی عبارت پر ردالمحتار کی تشریح بھی موصوف نہ سمجھ سکے۔

ردالمحتار کی عبارت میں قہستانی کے حوالے سے کہیں بھی وہ مفہوم نہیں ہے جو موصوف نے سمجھا ہے۔ یعنی نماز فرض تنہا ادا کرنے والے کو وتر جماعت سے پڑھنے کی اجازت ہے۔ اس عبارت کا ترجمہ اور مفہوم دونوں سے موصوف کا مدعا ثابت نہیں ہے۔ اور ردالمحتار کی طرف اس مسئلہ کو منسوب کرنا سراسر غلط اور دیانت کے خلاف ہے۔

امام اہل سنت اسی حوالے سے فرماتے ہیں:

"علامہ شامی کی طرف اس بات کو منسوب کرنا ایک مخالف چیز کو منسوب کرنا ہے کیوں کہ انہوں نے تصریح کی ہے کہ اگر فرض جماعت سے نہ پڑھے ہوں تو وتر بھی جماعت سے نہ پڑھے، اور علامہ قہستانی کے حوالے سے انہوں نے کہا ہے کہ

جب فرض امام کی اقتدا میں نہ پڑھے ہوں تو وتر میں اس کی اقتدا نہ کرے۔ باز خود گفت

ینبغی ان یکون قول القهستانی معه احترازعن صلوتها منفردا امالو صلاها جماعة مع غیره ثم صلی الوتر معه لاکراهة تأمل۔

اور علامہ نے خود فرمایا کہ علامہ قہستانی کا یہ کہنا کہ اس امام کے پیچھے فرض نہ پڑھے ہوں" کا مطلب یہ ہے اکیلے پڑھے ہوں، لیکن اگر اس نے فرض کسی دوسرے امام کی اقتدا میں پڑھے ہوں تو پھر وتر میں امام کے ساتھ جماعت میں پڑھنے میں کوئی کراہت نہیں ہے، غور کر۔

ودر در مختار این مسئلہ را اصلاً ذکرے نیست۔ مصنف وشارح اعظم اللہ تعالیٰ اجورھما وافاض علینا نورھما ہمیں نوشتہ اند کہ ہر کہ در تراویح منفرد بود در جماعت وتر داخل می تواند ش۔ حیث قالا لولم یصلها ای التراویح بالامام اوصلاها مع غیره له ان یصلی الوترمعه ایں مسئلہ رابامسئلہ ماچہ علاقہ کہ اینجا کلام در منفرد فی الفرض ست نہ منفرد فی التراویح وضرور نیست کہ ھر کہ تراویح تنہا گزاردہ است در فرض نیز منفرد بودہ باشد

اور در مختار میں اس مسئلہ کا بالکل ذکر نہیں ہے مصنف اور شارح (اللہ تعالیٰ ان کے اجر کو عظیم فرمائے اور ان کے نور کا ہم پر فیضان فرمائے) دونوں نے لکھا ہے کہ کسی نے صرف تراویح اکیلے پڑھی ہوں تو وہ وتر کی جماعت میں شریک ہو سکتا ہے۔ انہوں نے یوں فرمایا اگر اس نے تراویح امام کے ساتھ نہ پڑھی ہوں یا کسی اور امام کے ساتھ پڑھی ہوں تو اس کو اس امام کے ساتھ وتر پڑھنا جائز ہیں لیکن اس مسئلہ کا ہمارے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ ہمارا مسئلہ تو اکیلے فرض پڑھنے والے کے بارے میں ہے نہ کہ اکیلے تراویح پڑھنے کے بارے میں ہے کیوں کہ تراویح اکیلے پڑھنے کو یہ لازم نہیں کہ فرض بھی اکیلے پڑھے ہوں۔"

[فتاوی رضویہ جدید، جلد ۷ ص ۵۴۸]

الحاصل: موصوف نے اپنے فتوی میں جو عبارات پیش کی ہیں ان میں سے کوئی بھی عبارت موصوف کے مدعا کے مطابق نہیں ہے۔ موصوف نے عبارات کو سمجھنے میں عجلت سے کام لیا ہے۔ اگر سنجیدگی سے غور کر لیتے تو ہرگز راجح ومشہور مسئلہ کو مرجوح قرار دے کر اکثر علمائے کرام کے خلاف مسئلہ بیان کرنے کی جسارت نہ کرتے۔ یہ دراصل نقل کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر خود مفتی موصوف تحقیق کریں تو ان شاء اللہ مسئلہ کو ویسا ہی پائیں جیسا کہ اکثر علما وفقہا اور خاص کر امام اہل سنت مجدد دین وملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قدس سرہ نے فتاوی رضویہ اور صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ نے بہار شریعت میں بیان کیا ہے۔

لب لباب یہ ہے کہ جس نے فرض جماعت سے نہ پڑھے ہوں وہ وتر بھی جماعت سے نہ پڑھے۔ یہی فقہائے احناف نور اللہ مرقدھم کا موقف ہے۔ مسئلہ کی مکمل تفصیل کے لیے فتاوی رضویہ شریف قدیم، جلد ۳، اور جدید جلد ۷۔ کا مطالعہ کریں۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ورسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

تصدیقات

حضرت مفتی محمد سلیمان نعیمی برکاتی صاحب دامت معالیہم

زیب مسند افتاء جامعہ نعیمیہ مرادآباد

نحمدہ ونصلی علی حبیبہ الکریم

عند الفقہاء راجح مسئلہ یہی ہے کہ رمضان مبارک میں جس نے نماز عشاء جماعت سے نہیں پڑھی وہ وتر بھی جماعت سے نہ پڑھے۔ اوراسی پر علمائے اہل سنت کا عمل ہے۔ فاضل مجیب مفتی محمد ذوالفقار خان نعیمی صاحب کا جواب دلائل شرعیہ سے ماخوذ ومزین ہے میں اس فتوی کی تصدیق کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ پاک فاضل مجیب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین علیہ التحیۃ والتسلیم۔

محمد سلیمان نعیمی برکاتی

خادم التدریس والافتاء جامعہ نعیمیہ مرادآباد

مورخہ ۲۵/ رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ

تصدیق

الماس ملت مفتی محمد مقصود عالم قبلہ دام ظلہ

زیب مسند افتاء: فخر ازہر دار الافتا والقضا وسرپرست اعلیٰ جماعت رضائے مصطفی برانچ ہاسپیٹ بلہاری کرناٹک الہند

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اللھم ارنا الحق حقا والباطل باطلا

الجواب بھدایۃ الحق والصواب: جو شخص عشاء کی نماز جماعت سے ادا نہ کرے تو اس کو چاہئے کہ وہ وتر کی نماز بھی جماعت سے ادا نہ کرے شروع سے یہی موقف اکابرین ملت کا رہا ہے اور اسی پر عمل ہے۔ بلاشک وشبہ یہی قول راجح۔ ظواہر الروایہ اور مسلک جمہور ہے۔ عرصئہ قلیل سے چند افراد کے سروں پہ تحقیق کا بھوت سوار ہے، جب اپنے وجود میں مادہ تحقیق کے شعور کا بانکپن نہیں پاتے ہیں تو دوسروں کے گھروں میں جھانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور موقف اغیار کے مطابق جو دلیلیں ہوتی ہیں ان کی کتابوں سے سرقہ کر کے میدان میں آجاتے ہیں اس کے بعد بڑی اونچی ڈینگے مارنے کا آغاز ہو جاتا ہے۔

کچھ ایسا ہی یہاں بھی ہوا جس کے پاداش میں حبر العلم والادب، حضرت علامہ مفتی محمد ذوالفقار خان صاحب نعیمی ککرالوی زیدت معالیہ کو صداقت کی گل افشانی، فکر اکابرین کی ترجمانی اور قول راجح کی نشاندہانی کرانے کیلئے کارزارِ عمل میں آکر مورچہ حق وصداقت سنبھالنے کی حاجت آن پڑی۔ موصوف کے جواب سوال کا بنظر عمیق مطالعہ کیا ہر شش جہات سے عمدہ پایا۔ اس جواں سال صاحب کمال نے اکابرین کے موقف حقہ کی تائید وتوثیق کے دلائل کے ساتھ ان کے خلاف پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا ازالہ بڑے ہی عمدہ پیرایہ میں کیا ہے۔ ہم یہاں بتادیں کہ خلاف جمہور موقف صراحتاً دیابنہ کی طرف بہت پہلے عام ہو چکا تھا۔

محقق علی الاطلاق۔ امام اہلسنت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے تو بہت پہلے ہی اپنی تحقیق انیق کے ذریعے

مسکت جواب دے کر وہابیہ کے مجدد کی علمی وفقہی وجود کا جنازہ نکال دیا تھا۔ آج اسی ہتھیار سے لیس ہو کر اس کے غلام نے موقف مخالف کو اس کی علمی حیثیت کا احساس دلا دیا ہے۔ مولوی اشرفعلی تھانوی نے جماعت سے نماز نہ پڑھنے والوں کو وتر کی جماعت میں شرکت کے جواز کا قول کیا تھا اور اپنے دعوے کے اثبات میں وہی دلیلیں پیش کیا تھا۔

شامی ج،472/1۔ اور چلپی طحطاوی مصری ج،297/1 کی عبارتیں ہیں۔ جہاں مرقوم ہے کہ عشا کی جماعت کا تارک تراویح باجماعت نہ پڑھے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ عشا کی جماعت متبوع اور تراویح کی جماعت تابع ہے۔ اس کے بعد کی عبارت ہے فرض تنہا پڑھنے والا تراویح امام کے ساتھ پڑھے۔ اس مقام پر وتر کا ذکر نہیں اور نہ ہی اس بات کا تذکرہ ہے کہ کیوں پڑھے گا تو اس پر قیاس کیسا اسی کو قیاس مع الفارق کہتے ہیں۔ جس سے استدلال درست نہیں۔

دوسری عبارت میں صراحت ہے کہ امام کی اقتداء میں تراویح نہ پڑھے۔ یا اس امام کے علاوہ دوسرے امام کی اقتداء میں تراویح پڑھے تو وتر کی نماز اس امام کی اقتداء میں پڑھ سکتا ہے۔ اس سے بھی ان کا مدعا ثابت نہیں کیوں کہ فرض جماعت اور عدم جماعت کے ساتھ پڑھنے کا ذکر نہیں ہے۔ اس صورت میں دونوں پہلو کا تعین ممکن ہے۔ اگر سارے لوگ عشاء کی جماعت ترک کردیں تو تیسری صورت میں مسئلہ سابقہ کی جانب رجعت کا حکم ہے۔ صورت سابقہ یہ ہے کہ عشاء کی جماعت کا تارک ہے تو تراویح بھی جماعت کے ساتھ نہ پڑھے اس کی وجہ تراویح کی جماعت کا عشاء کی جماعت کے تابع ہونا ہے۔ تابع کا تابع بھی تابع ہو گا تو اس صورت میں بھی اکابرین اہلسنت کا موقف متحقق ہے۔ جانب مخالف کا نہیں۔ یہاں سے قول راجح کا بھی اثبات ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد امام اعظم کے قول کو دیکھتے ہیں تو آپ فرماتے ہیں کہ وتر نہ تراویح کے تابع ہے اور نہ ہی عشاء کے۔ تو جانب مخالف کا تابع ہونے کی بنیاد پر جواز کا حکم بیان کرنا لغو وعبث ہو جاتا ہے ورنہ اس کہاوت کے مثل ہو گا۔ مارے گھٹنہ پھوٹے سر۔ مولوی اشرفعلی کو بھی ان دلائل سے جواز کا حکم ہونا سمجھ میں نہ آسکا تو اس نے قول امام پر قیاس کرنا شروع کیا کہ تراویح عشاء کے تابع ہے اس کے باوجود عشاء جماعت سے نہ پڑھیں تو تراویح جماعت سے پڑھنے کی اجازت ہے۔

جب کہ وتر نہ تراویح کا تابع ہے نہ عشاء کا تابع ہے تو پھر اس کو جماعت سے پڑھنا کیوں کر نہ جائز ہو گا۔ مگر اس مجدد ضلالت کو اتنی بھی خبر نہ تھی کہ اختلاف مشائخ اور افضلیت جماعت کے باعث اجازت ہے جو وتر میں نہیں ہے ورنہ اس کی جماعت بھی ہمیشہ مطلوب ہوتی۔ اب بتائیے قول مرجوح کہاں ہے اور کس کو اصلاح کی ضرورت ہے۔ جب سائل نے مولوی اشرفعلی سے سوال کیا آپ ایسا کہہ رہے ہیں اور غایۃ الاوطار اردو ترجمہ درمختار باب الوتر والنوافل میں درمختار وصغیری کے حوالے سے اس کے برعکس لکھا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو عشاء کی نماز جماعت سے نہ پڑھے وہ وتر کی نماز بھی جماعت سے نہ پڑھے۔

اپنی عزت بچانے کیلئے اب جواب دیتا ہے کہ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس صورت میں بھی وتر جماعت کے ساتھ پڑھے۔ اس کے بعد صغیری کی عبارت پیش کرتا ہے۔ جب وہاں تین قول پاتا ہے۔ اور آخری اتفاقیہ قول پر نظر جاتی ہے کہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ اگر تمام لوگ عشاء کی جماعت کے تارک ہوں تو تراویح ووتر کچھ بھی جماعت کے ساتھ نہ پڑھیں۔ کیوں کہ تراویح کی جماعت عشاء کی جماعت کے تابع ہے اور یہی راجح ہے۔ اور تاتارخانیہ والی علی بن احمد کی روایت بھی اسی پر دال ہے حاشیۂ طحطاوی کی عبارت بھی اسی کی جانب مشیر ہے۔ درر۔ قنیہ اور بحر میں اسی کی صراحت ہے۔ قہستانی کا یہ جزئیہ بھی

سر چڑھ کر بانگ دھل اعلان کر رہا ہے۔ لکنه اذالم یصل الفرض معه لایتبعه فی الوتر‘‘ (رد المحتار، 2/48)
مولوی اشرفعلی کی کتاب امداد الفتاوی جدید ج، 353/352/349)
اسی کی اتباع کیا ہے مولوی سمیع الحق پاکستانی نے اپنی کتاب (فتاوی حقانیہ ج، 239/238/3) میں۔
محقق بننے کے جنون میں ہمارے لوگ بھی وہیں سے اکتساب کر کے اختلاف وانتشار کی فضا گرم کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں
زیر نظر فتوی جس فتوی کے جواب میں لکھا گیا ہے وہ فتوی بھی انہیں کوششوں میں سے ایک ہے۔ جس کا
مخزن فقہی جزئیات حضرت علامہ مفتی محمد ذوالفقار خان صاحب نعیمی ککرالوی زیدت معالیہ نے مدلل ومفصل اور احسن و اجمل جواب لاجواب عنایت فرمایا ہے۔ احقر مجیب ومصیب کے جواب کی کامل تائید وتصدیق کرتا ہے۔
واللہ تعالیٰ اعلم ورسولہ الاعظم صلی اللہ علیہ وسلم

محمد مقصود عالم فرحت ضیائی

خادم: فخر ازہر دارالافتا والقضا وسرپرست اعلیٰ جماعت رضائے مصطفی

برانچ ھاسپیٹ بلھاری کرناٹک الھند

۲۴؍رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ

تصدیق

فاضل جلیل حضرت مولانا مفتی محمد راحت خان صاحب قبلہ دام ظلہ
خادم دارالعلوم فیضان تاج الشریعہ، بریلی شریف

باسمہ تعالیٰ والصلاۃ والسلام علیٰ رسولہ الاعلیٰ

اسلاف امت، اکابرینِ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جن کو رب تبارک وتعالیٰ کی جانب سے خیر کا وافر حصہ ملا کہ ان کو فقہ وافتا کی ایسی سوجھ بوجھ عطا کی گئی جس کی مثالیں آج کے اس فتنوں بھرے دور میں تلاش کرنے سے نہیں ملتیں۔ کہیں پر بھی کوئی بھی معاملہ ہو جو اسلاف سے جڑا ہوا ہو تو اس کو عام طرح سے نہیں لینا چاہیے بلکہ فن کے اعتبار سے اس پر غور وفکر کرنا چاہیے۔ مثلاً فقہا کے اگر دو اقوال ایسے ملیں جو بظاہر ایک دوسرے سے معارض ہوں اور دونوں ہی معتمد ومستند فقہا کے اقوال ہوں تو اُن میں تطبیق کی کوئی صورت تلاش کرنی چاہیے اس طرح کہ دونوں کو اس محملِ حسن پر محمول کرنے میں کوئی قباحت نہ رہے۔ اگر ایسی صورت مل جائے تو بہت بہتر ہے بلکہ حتی الوسع اکابرینِ امت کی تحریروں میں تلاش کرنا چاہیے کہ انھوں نے اگر کوئی تطبیق کی صورت بتائی ہو تو اس کو اختیار کرنا چاہیے، اگر ان کی کتابوں میں کوشش کے باوجود نہ بھی مل پائے تو اپنی عقل وفہم کا قصور سمجھنا چاہیے اور اس معاملہ میں موجودہ اکابرین کی جانب رجوع کرنا چاہیے۔ بغیر تحقیق وتفتیش اپنی عقل پر اعتماد کرتے ہوئے اکابرین واسلاف علما وفقہا پر غلطی یا تسامح کا حکم لگانا جرات ونادانی ہے۔

آج کے زمانہ میں ایسی ترقی ہوئی ہے کہ پھلوں، سبزیوں اور جانوروں تک بہت سی چیزیں کم دنوں میں (ہائی بریڈ) تیار کی جا رہی ہیں، جن کے نقصانات بھی اہلِ علم پر واضح ہیں۔ لیکن اس سے بڑا نقصان اس میں ہے کہ آج کے زمانہ میں مفتی کم ہی دنوں

میں تیار ہو جاتے ہیں فضیلت پڑھی، اور کارِ افتا کی ذمہ داریاں سنبھالیں، ہو گئے مفتی۔ یا پھر فضیلت کے بعد دو سال تخصص فی الفقہ کیا بس ہو گئے مفتی، جب کہ کار افتا کی دشواری و نزاکت کا اندازہ تک نہیں ہو پاتا، اب یہ کم وقت میں تیار شدہ بھی ایسے مفتی ہو کر ظاہر ہوتے ہیں کہ کبھی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ کی تحقیق جلیل و انیق پر تنقید کرتے ہیں، کبھی صدر الشریعہ حضرت علامہ مفتی امجد علی اعظمی قدس سرہ پر تنقید کرتے ہیں، کبھی ان کے علاوہ دیگر نام ور مستند و معتمد علما وفقہا پر تنقید کرتے ہیں تاکہ لوگ سمجھیں کہ اِن کم دن کے مفتی صاحب کا بھی پایہ کتنا بلند ہے حالانکہ یہ طریقہ غلط ہے۔

ابھی ایک مفتی صاحب جن کا فقہ و افتا اور تصنیف و تحقیق کے حوالے سے اس سے قبل کبھی نام تک نہ سنا تھا ان کی ایک تحقیق اس متعلق آئی کہ رمضان المقدس میں جس نے عشا کی نماز جماعت سے نہیں پڑھی ہے وہ جماعت میں شریک ہو سکتا ہے اور ماضی کے جن علما وفقہا نے یہ حکم دیا تھا کہ جس نے فرض نماز جماعت سے نہ پڑھی ہو وہ وتر بھی جماعت سے نہ پڑھے ان پر تسامح کا حکم نافذ کیا۔

گرامی قدر حضرت مولانا مفتی محمد ذوالفقار خاں نعیمی حفظہ اللہ نوری دار الافتا اترا کھنڈ نے نہایت سنجیدگی سے مدلل و مبرہن اس فتوی کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ فرمایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ماضی کے اکابر علما وفقہا کا موقف کہ جس نے فرض نماز جماعت سے نہ پڑھی ہو وہ وتر بھی جماعت سے نہ پڑھے ہی درست و صحیح اور مفتی بہ ہے اور ان اقوال کے درمیان تطبیق بھی ظاہر فرمائی ہے کہ جن میں بعض لوگوں کو تعارض محسوس ہوا۔ الحمد للہ ناچیز نے مفتی صاحب کے فتوی کو دو مرتبہ بعض مقامات کو کئی مرتبہ پڑھا صحیح و درست اور قابل تقلید پایا، حقانیت و صداقت کی وجہ سے میں اس مبارک فتوی کی تائید و تصدیق کرتا ہوں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

محمد راحت خاں قادری غفرلہ القوی

خادم دار العلوم فیضان تاج الشریعہ، بریلی شریف

رمضان المبارک ۹ھ، بوقت سحر

فتوی ۲۱ — عذر شرعی کے سبب ستون والی صف میں نماز ہو جائے گی

مسئولہ: مولانا بلال احمد نظامی، رتلام مدھیہ پردیش۔ ۱۱ر رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں،
کہ درمیانِ صف ستون ہونے سے صف منقطع ہوگی یا نہیں؟
اس صف میں نماز ادا کرنے سے نماز ہو گی یا نہیں؟
مسجد میں جگہ کی تنگی کے سبب ستون والی صف میں نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب

صف کے درمیان ستون کا ہونا قطع صف کو لازم ہے۔ اور قطع صف مکروہ تحریمی ہے۔ جس کا مطلب نماز کا دوبارہ ادا کرنا واجب ہے۔ ہاں البتہ مقتدیوں کی کثرت ہو اور جگہ تنگ ہو تو کوئی حرج و کراہت نہیں ہے۔
معاویہ بن قرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ

''کنا ننهى أن نصف بين السوارى على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ونطرد عنها طردا''

یعنی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں ستونوں کے درمیان صف بنانے سے روکے جاتے تھے اور وہاں سے دھکے دے کر ہٹائے جاتے تھے۔ [سنن ابن ماجہ، ۱/۳۲۰، باب الصلاۃ بین السواری فی الصف]
سنن ترمذی میں ہے:

''قال أنس بن مالك: كنا نتقى هذا على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم.
وفى الباب عن قرة بن إياس المزنى. حديث أنس حديث حسن. وقد كره قوم من أهل العلم: أن يصف بين السوارى''

یعنی انس بن مالک نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور پاک میں ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے سے بچتے تھے اس باب میں قرہ بن ایاس مزنی سے بھی مروی ہے البتہ حضرت انس کی حدیث حسن ہے۔ اہل علم کے ایک گروہ نے دو ستونوں کے درمیان صف بنانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔

[سنن ترمذی، ۱/۳۰۴، باب ما جاء فی کراہیۃ الصف بین السواری]

شرح صحیح بخاری لابن بطال میں ہے:

''يكره أن يكون الصف يقطعه أسطوانة إذا صلوا جماعة''

یعنی جماعت میں صف کا اس طور پر ہونا کہ ستون قطع صف کرے مکروہ ہے۔ [۲/۱۳۳]

امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس حوالے سے باب باندھا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:
''باب الصلاة بين السوارى فى غير جماعة''، یعنی بغیر جماعت ستونوں کے درمیان نماز کا باب۔
اس کی شرح میں علامہ عینی صاحب شرح بخاری لکھتے ہیں:

یعنی إذا کان منفردا لا بأس فی الصلاۃ بین الساریتین، إذا لم یکن فی جماعۃ، وقید بغیر جماعۃ لأن ذلك یقطع الصفوف، وتسویۃ الصفوف فی الجماعۃ مطلوبۃ.''

یعنی جب منفرد ہو تو ستونوں کے درمیان نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جب کہ جماعت میں نہ ہو۔ امام بخاری نے باب باندھنے میں جماعت کی قید اس لیے لگائی کہ اس صورت میں صفیں قطع ہوں گی حالانکہ جماعت میں صفوں کا برابر رکھنا مطلوب ہے۔ [عمدۃ القاری، ۲۸۴/۴، باب الصلاۃ بین السواری فی غیر جماعۃ]

فتح الباری شرح بخاری میں ہے:

''إنما قیدها بغیر الجماعۃ لأن ذلك یقطع الصفوف وتسویۃ الصفوف فی الجماعۃ مطلوب وقال الرافعی فی شرح المسند احتج البخاری بهذا الحدیث أی حدیث بن عمر عن بلال علی أنه لا بأس بالصلاۃ بین الساریتین إذا لم یکن فی جماعۃ''

یعنی امام بخاری نے جماعت کے علاوہ کی قید اس لیے لگائی کہ اس صورت میں صفیں قطع ہوں گی۔ حالانکہ جماعت میں صفوں کا برابر رکھنا مطلوب ہے۔ اور رافعی نے شرح مسند میں کہا کہ امام بخاری نے اس حدیث سے احتجاج کیا یعنی حدیث ابن عمر جو بلال سے مروی ہے، اس بات پر کہ دو ستونوں کے درمیان میں نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جب کہ جماعت میں نہ ہو۔'' [فتح الباری لابن حجر، ۵۷۸/۱، باب الصلاۃ بین السواری فی غیر جماعۃ]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''مسند امام احمد و سنن ابی داؤد و جامع ترمذی و سنن نسائی و صحیح حاکم میں ہے:

عن عبد الحمید بن محمود قال صلینا خلف امیر من الامراء فاضطرنا الناس صلینا بین الساریتین فلما صلینا قال انس بن مالك رضی الله عنه کنا نتقی هذا علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم۔

یعنی ایک تابعی کہتے ہیں ہم نے ایک امیر کے پیچھے نماز پڑھی لوگوں نے ہمیں مجبور کیا کہ ہمیں دو ستونوں میں نماز پڑھنی ہوئی (جب ہم نماز پڑھ چکے تو) انس بن مالک نے فرمایا: ہم زمانۂ اقدس حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سے بچتے تھے۔

حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح ہے، ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن ہے، عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں قبیل باب الصلوٰۃ الی الراحلۃ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے کہ انہوں نے فرمایا:

لا تصفوا بین الاساطین واتموا الصفوف۔ ستونوں کے بیچ میں صف نہ باندھو اور صفیں پوری کرو۔ اور اس کی وجہ قطع صف ہے اگر تینوں دروں میں لوگ کھڑے ہوئے تو ایک صف کے تین ٹکڑے ہوئے اور یہ ناجائز ہے۔

[فتاوی رضویہ جدید، ج ۶ ص ۱۳۳۔۱۳۴]

حضور مفتی اعظم ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''صف میں خلل اگر بے عذر ہو نہایت ناپسند و مکروہ ہے۔ احادیث میں اس کے لیے وعید ہے۔''

مزید فرماتے ہیں:

بے عذر ایسی جگہ کھڑا ہونا نہ چاہئے۔ جہاں کسی حال سے قطع صف ہو۔'' [فتاوی مصطفویہ، ص ۱۹۲]

الحاصل:۔ صف کے درمیان ستون قطع صف کا سبب ہے۔ کیوں کہ اس کے ذریعہ صف دو حصوں میں یا اگر کئی ستون ہوئے تو کئی حصوں میں بٹ جائے گی۔ اور یہ امر بلاشبہہ خلاف شرع وناجائز ہے۔ اور اس کے سبب نماز تو ہو جائے گی البتہ مکروہ تحریمی ہوگی۔ فتاوی رضویہ میں ہے:

"قطع صف مکروہ تحریمی ہے" [فتاوی رضویه جدید،۷/۱۵۱]

اور مکروہ تحریمی کے سبب نماز کا دہرانا واجب ہو جاتا ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''الصلاة جائزة فی جمیع ذلك لاستجماع شرائطها وأرکانها وتعاد علی وجه غیر مکروه وهو الحکم فی کل صلاة أدیت مع الکراهة. کذا فی الهدایة فإن کانت تلك الکراهة کراهة تحریم تجب الإعادة أو تنزیه تستحب فإن الکراهة التحریمیة فی رتبة الواجب کذا فی فتح القدیر.''

مکروہات کی تمام صورتوں میں نماز کی شرطیں اور اس کے ارکان کے جمع ہونے کی وجہ سے نماز تو جائز ہے مگر غیر مکروہ طریقہ سے نماز لوٹائی جائے گی۔ اور یہ حکم ہر اس نماز کا ہے جو کراہت کے ساتھ ادا کی گئی ہو۔ ایسا ہی ہدایہ میں ہے۔ پس اگر وہ کراہت تحریمی ہے تو نماز کا اعادہ واجب ہے۔ اگر کراہت تنزیہی ہے تو نماز کا لوٹانا مستحب ہے۔ کیوں کہ کراہت تحریمی واجب کے مرتبہ میں ہے ایسا ہی فتح القدیر میں ہے۔

[فتاوی عالمگیری۔ ۱/۱۰۹، کتاب الصلاۃ، باب مایفسد الصلاۃ ومایکرہ فیھا]

یہ اس صورت میں ہے جب کہ نمازیوں کی کثرت نہ ہو اور مسجد میں وسعت ہو۔ اگر نمازیوں کی اس قدر بھیڑ ہو جائے کہ مسجد تنگ ہو رہی ہو تو ستون کے درمیان یا ستون کے دائیں بائیں نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عمدۃ القاری میں ہے:

''وقال مالك فی (المدونة) لا بأس بالصلاة بینهما لضیق المسجد. وقال ابن حبیب: لیس النهی عن تقطیع الصفوف إذ ضاق المسجد، وإنما نهی عنه إذا کان المسجد واسعا''

یعنی مالک نے مدونہ میں کہا کہ مسجد کے تنگ ہونے کے سبب ستون کے درمیان نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور ابن حبیب نے کہا کہ مسجد تنگ ہو تو قطع صفوف کی ممانعت نہیں ہے البتہ قطع صف کی نہی مسجد میں گنجائش کے وقت ہے۔"

[عمدۃ القاری شرح بخاری، ج۴ص ۲۸۶، باب الصلاۃ بین السواری فی غیر جماعۃ]

واللہ اعلم بالصواب ورسولہ اعلم صلی اللہ علیہ وسلم

نمازی کے آگے سے گزرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ حرام، مکروہ تحریمی، یا تنزیہی؟

فتوی ۲۲ مسئولہ: شہادت حسین بریلی شریف۔ ۲۵/ شوال ۱۴۳۸ھ

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں
نمازی کے آگے سے گزرنا کیسا ہے؟
حرام، مکروہ تحریمی یا مکروہ تنزیہی؟ مدلل ومفصل جواب عنایت فرمائیں اور عند اللہ ماجور رہوں۔

الجواب

نمازی کے آگے سے گزرنا جائز نہیں ہے۔ احناف کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے۔ اور چند محدثین اور محققین علما کے نزدیک حرام ہے تفصیل کے لیے محدثین کے اقوال اور فقہا کی عبارات پیش ہیں۔

علامہ بدرالدین عینی شرح بخاری عمدۃ القاری میں فرماتے ہیں:

''أن المرور بين يدى المصلى مذموم، وفاعله مرتكب الاثم. وقال النووى: فيه دليل على تحريم المرور، فان في الحديث النهى الاكيد والوعيد الشديد، فيدل على ذلك. قلت: فعلى ما ذكره ينبغي أن المرور بين يدى المصلى من الكبائر''

یعنی نمازی کے آگے سے گزرنا برا ہے اور گزرنے والا گنہگار ہے۔ اور نووی نے کہا کہ اس میں گزرنے کی حرمت پر دلیل ہے کیوں کہ حدیث میں سخت نہی اور وعید وارد ہے۔ جو اس کی حرمت پر دال ہے۔ تو میں نے کہا کہ نمازی کے آگے سے گزرنا کبائر میں سے ہے۔ [عمدۃ القاری شرح بخاری، ۲۹۵/۴، باب یرد المصلی من مر بین یدیہ]

علامہ عینی نے امام نووی کے قول گزرنے کی حرمت پر جزم کیا ہے۔

علامہ ابن رجب حنبلی شرح بخاری فتح الباری میں لکھتے ہیں:

''فيستدل به على تحريم المرور بين المصلى وسترته؛ لأنه جعله من عمل الشياطين، وأمر بالعقوبة عليه، وذلك من أدلة التحريم''

یعنی اس سے نماز اور اس کے سترہ کے درمیان گزرنے کی حرمت پر استدلال کیا گیا ہے کیوں کہ اس کو شیطانی عمل قرار دیا گیا ہے۔ اور اس پر سزا حکم بھی دیا گیا ہے اور یہ سب حرمت کی دلیلیں ہیں۔ [فتح الباری، ۸۸/۴]

اس عبارت میں علامہ ابن رجب نے نماز اور سترہ کے درمیان گزرنے کو حرام بتایا ہے۔

مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وهذا كله يدل على تحريم المرور بين يدى المصلى، وهو الصحيح عند أصحابنا والمحققين من أصحاب الشافعى وطائفة منهم ومن أصحابنا أطلقوا الكراهة وكذلك أطلقها غيرهم من أهل العلم منهم ابن عبد البر وغيره. وحكاه الترمذى عن

أهل العلم.وقد حمل اطلاق هؤلاء الکراهة علی التحریم؛ فان متقدمی العلماء کانوا یستعملون ذلك کثیرگ.وفی الحدیث: دلیل علی تحریم المرور بین یدی المصلی...ففی تحریم المرور وجهان لاصحابنا اصحهماالتحریم''

یعنی یہ سب نمازی کے آگے سے گزرنے کی حرمت پر دال ہے۔اور یہی ہمارے اصحاب اور محققین شوافع کے نزدیک صحیح ہے۔اور شوافع کا ایک گروہ اور ہمارے اصحاب حنابلہ مکروہ تحریمی قرار دیتے ہیں۔نیز ابن عبد البر اور چند دیگر علما بھی مکروہ کہتے ہیں امام ترمذی نے اہل علم کے حوالے سے اس کو ذکر کیا۔اوران علمانے مطلق کراہت کو تحریمی پر محمول فرمایاہے۔علمائے متقدمین اس کو بہت استعمال کرتے تھے... حدیث میں جوہے وہ نمازی کے آگے سے گزرنے کی حرمت پر دال ہے۔لہٰذا اگزرنے کی حرمت کے سلسلے میں دو قول ہیں۔ایک حرمت کادوسرا کراہت کاالبتہ دونوں میں اصح قول حرمت ہے۔''[فتح الباری،۹۵/۴]

علامہ مناوی فیض القدیر میں لکھتے ہیں:

''قال النووی: وفیه تحریم المرور أی بین یدی المصلی وسترته فان لم یکن سترة کره''

یعنی امام نووی نے کہا کہ نمازی اور سترہ کے درمیان سے گزرے گاتوحرام ہے۔اوراگر سترہ نہ ہو اور پھر گزرے گاتومکروہ ہے۔[فیض القدیر،۳۳۴/۵]

ملا علی قاری مرقاۃ المفاتیح میں شرح منیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وفی شرح المنیة: انما یکره المرور بین یدی المصلی اذا لم یکن عنده حائل نحو السترة''

شرح منیہ میں ہے کہ نماز کے درمیان سترہ نہ ہوتوسامنے سے گزرنامکروہ ہے۔[مرقاۃ المفتاتیح:ج ۲ ص ۲۴۳،باب السترہ]

یعنی ملا علی قاری نے شرح منیہ کے حوالے سے بغیر سترہ کے نمازی کے آگے سے گزرنامکروہ بیان کیاہے۔

مراقی الفلاح میں ہے:

''والمکروه المرور بمحل السجود علی الاصح فی المسجد الکبیروالصحراء وفی الصغیرمطلقا''

مراقی الفلاح میں مسجد صغیر میں مطلقاًاور مسجد کبیر میں موضع سجود تک گزرنامکروہ قراردیا۔[مراقی الفلاح:ج ۱ ص ۱۲۶،]

بحر الرائق میں ہے:

''وبهذا اعلم أن الکراهة تحریمیة لتصریحهم بالاثم''

اوراسی سے جان لیا گیا کہ کراہت تحریمی ہے فقہاکے اس کو گناہ قرار دینے کی وجہ سے۔[بحرالرائق،۱۶/۲]

بنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

''وفی الوسیط للشافعیة: یکره، وصرح العجلی بتحریمه ووافقه 'صاحب التهذیب' و 'التتمة' من الشافعیة وأصحابنا نصوا علی کراهته ذکرها فی 'المحیط' و 'الذخیرة' وقال فی 'المغنی' لایحل المرور من غیرستروبینه وبین الستر''

یعنی یہ عمل شوافع کی وسیط میں مکروہ مذکورہے۔اور عجلی اوران کی موافقت میں صاحب تہذیب وعلمائے شوافع نے حرام کی تصریح کی ہے۔اور ہمارے اصحاب (احناف) نے اس کی کراہت کا حکم کیاہے۔[۴۲۶/۲]

محیط برہانی میں ہے:

''أن المرور بين يدي المصلي مكروه'' یعنی نمازی کے آگے سے گزرنا مکروہ ہے۔[۱/ ۴۳۱]

بدائع الصنائع میں ہے:

''ويكره للمار أن يمر بين يدي المصلي'' نماز کے سامنے سے گزرنا مکروہ ہے۔[بدائع الصنائع: ج ۱ ص ۲۱۷]

فتاوی رضویہ میں ہے:

"نماز میں کوئی خلل نہیں آتا نکلنے والا گنہگار ہوتا ہے، نماز اگر مکان یا چھوٹی مسجد میں پڑھتا ہو تو دیوار قبلہ تک نکلنا جائز نہیں جب تک بیچ میں آڑ نہ ہو۔ اور صحرا یا بڑی مسجد میں پڑھتا ہو تو صرف موضع سجود تک نکلنے کی اجازت نہیں، اس سے باہر نکل سکتا ہے۔ موضع سجود کے یہ معنی ہیں کہ آدمی جب قیام میں اہل خشوع وخضوع کی طرح اپنی نگاہ خاص جائے سجود پر جمائے یعنی جہاں سجدے میں اس کی پیشانی ہوگی تو نگاہ کا قاعدہ ہے کہ جب سامنے روک نہ ہو تو جہاں جمائے وہاں سے کچھ آگے بڑھتی ہے جہاں تک آگے بڑھ کر جائے وہ سب موضع میں ہے اس کے اندر نکلنا حرام ہے اور اس سے باہر جائز"

[فتاوی رضویہ جدید، ۷/ ۲۵۶، ۲۵۵]

الحاصل: شوافع اور چند محدثین سے قطع نظر اکثر فقہا کے نزدیک اور خاص کر فقہائے احناف کے نزدیک نمازی کے آگے سے گزرنا بغیر سترہ کے مکروہ تحریمی ہے۔ علاوہ ازیں اعلیٰ حضرت نے جو حرام لکھا ہے تو اس سے مکروہ تحریمی ہی مراد ہے اس طرح کی بے شمار مثالیں فتاوی رضویہ اور کتب فقہ حنفیہ میں موجود ہیں، جہاں مکروہ تحریمی کو حرام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۲۳ ٹوپا یا سوئٹر موڑ کر نماز پڑھنے کا حکم

مسئولہ: زاہد علی میمن ممبئی۔ ۳/ صفر ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

ٹھنڈ کے موسم میں لوگ کیپ (ٹوپا) استعمال کرتے ہیں۔ کچھ ٹوپے ایسے بنے ہوئے ہوتے ہیں کہ انہیں ماتھے کے پاس سے موڑنا پڑتا ہے اگر نہ موڑیں تو منہ پر آجاتا ہے جس سے حرج ہوتا ہے۔ یوہیں سوئٹر وغیرہ سردی میں لوگ پہنتے ہیں تو وہ نیچے سے اندر کی طرف موڑ لیے جاتے ہیں اگر نہ موڑیں تو ایسا لگے گا کہ سوئٹر الٹا پہنے ہوئے ہیں۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا اس طرح ٹوپا اور سوئٹر پہن کر نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ جواب دیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

جو ٹوپے اور سوئٹر موڑنے والے ہوتے ہیں ان کو موڑ کر ہی پہنا جائے گا۔ ان کی ساخت اور بناوٹ ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ بغیر موڑے پہنے ہی نہیں جاتے۔ تو ان کو موڑ کر پہننا ہی لوگوں کی عادت ہے۔ اس میں نماز بلا کراہت ہو جائے گی۔ کیوں کہ نماز میں کپڑے کا موڑنا تب کراہت کا سبب ہوتا ہے جب کہ وہ عادت کے خلاف ہو۔ اور یہاں ایسا نہیں ہے تو نماز ہو جانے میں

کوئی شک نہیں۔ در مختار میں ہے:

''(سدل) تحریما للنهی (ثوبه) أی إرساله بلا لبس معتاد''

یعنی نماز میں خلاف معمول و معتاد کپڑا لٹکانا مکروہ تحریمی ہے۔ [درمختار: باب مایفسد الصلاۃ، ج ۱ ص]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''کپڑا اُلٹا پہننا اوڑھنا خلاف معتاد میں داخل ہے اور خلاف معتاد جس طرح کپڑا پہن یا اوڑھ کر بازار میں یا اکابر کے پاس نہ جا سکے ضرور مکروہ ہے'' [فتاوی رضویہ جدید: ج ۷ ص ۳۵۹] مزید فرماتے ہیں:

''کسی کپڑے کو ایسا خلافِ عادت پہننا جسے مہذب آدمی مجمع یا بازار میں نہ کر سکے اور کرے تو بے ادب خفیف الحرکات سمجھا جائے یہ بھی مکروہ ہے'' [مرجع سابق: ص ۳۸۶]

الحاصل: موڑنے والے ٹوپے اور سوئٹر میں نماز بلا کراہت ہو جائے گی۔

نماز میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا جائز نہیں
غیر مقلدین کے ایک پرچہ کا تفصیلی جواب

فتوی ۲۴ مسئولہ: حافظ محمد قاسم رضا قریشیان مسجد، سرس کھیڑا۔ ۱۶؍رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

مفتی صاحب! میں سرس کھیڑا کی ایک مسجد میں امامت کی خدمات سرانجام دے رہا ہوں ہمارے یہاں ویسے تو الحمد للہ اہل سنت وجماعت کی اکثریت ہے۔ البتہ کچھ لوگ غیر مقلدین کی صحبت سے متاثر ہو رہے ہیں ۔ غیر مقلدین کی طرف سے نماز میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے سلسلے میں ایک طویل پرچہ ایک صاحب نے مجھے دیا اور اس کا جواب طلب کیا ہے۔ احقر اس پورے پرچہ کو آپ کی خدمت میں پیش کرکے مؤدبانہ گزارش کرتا ہے کہ برائے کرم اس پرچہ کا مدلل و مفصل جواب مرحمت فرمائیں اور عند اللہ ماجور رہوں۔

(غیر مقلدین کا پرچہ)
امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے دلائل قرآن وسنت کی روشنی میں

حدیث نمبر ۱:

عن عبادة بن الصامت، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب

ترجمہ: یعنی عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کی نماز نہیں جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی ۔ رواہ بخاری ج نمبر ۱ ص ۱۰۴، مسلم ، ترمذی ، نسائی، مذکورہ بالا حدیث سورہ فاتحہ پڑھنے پر دال ہے۔ لیکن بعض مقلدین کا یہ اعتراض کہ یہ حدیث منفرد کے لیے ہے یہ درست نہیں ہے کیوں کہ اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے صلاۃ فرماکر تمام نمازوں کے بارے میں فرمایا کوئی خاص نماز نہیں چاہے امام ہو چاہیں مقتدی چاہے حضر میں ہو چاہے سفر میں ہر حالت میں نماز بغیر سورہ فاتحہ نہیں ہوتی کما قال البخاری فی الباب۔

دوسری بات اس حدیث میں لفظ من عام ہے جو ہر نمازی کو شامل ہے بغیر کسی کنایہ صارفہ کے اس من کو منفرد کے لئے محمول نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حدیث نمبر ۲:

عن أبی هريرة، عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: من صلی صلاة لم يقرأ فيها بأم القرآن فهي خداج ثلاثا غير تمام. فقيل لأبی هريرة: إنا نكون وراء الإمام، فقال: اقرأ بها في نفسك۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی ایسی نماز پڑھے کہ اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے تو وہ نماز ناقص ہے پوری نہیں ہے۔ بس ابوہریرہ سے کہا گیا کہ ہم لوگ امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو حضرت ابوہریرہ نے فرمایا سورہ فاتحہ آہستہ پڑھ لو۔ [مسلم ج ۱ ص ۱۷۰، ابوداؤد]

مذکورہ بالا حدیث میں "فهي خداج" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جس کے بارے میں امام بخاری نے "جزء القرآن ص ۵۴" میں لکھا ہے۔ قال أبو عبيد أخدجت الناقة إذا أسقطت والسقط ميت لا ينتفع به۔

یعنی ابوعبیدہ کہتے ہیں اخدجت الناقۃ اس وقت کہا جاتا ہے جب کہ اونٹنی بچہ کو وقت سے پہلے مردہ حالت میں گرادے تو وہ بچہ ایسا مردہ ہوتا ہے جس سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا ہے اسی طرح تمام شارحین حدیث اورائمہ لغت نے تحریر فرمایا ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ بغیر سورہ فاتحہ کے نماز باطل اور فاسد ہے کہ کسی کام کی نہیں اور یہ نقصان سجدہ سہو سے ہرگز پورا نہیں ہوگا۔

حدیث نمبر ۳:

عن عبادة بن الصامت، قال: صلی رسول الله صلی الله علیه وسلم الصبح، فثقلت عليه القراءة، فلما انصرف قال: إني أراكم تقرءون وراء إمامكم، قال: قلنا: يا رسول الله، إي والله، قال: لا تفعلوا إلا بأم القرآن، فإنه لا صلاة لمن لم يقرأ بها۔

ترجمہ: یعنی عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز پڑھی جس میں آپ پر قرات بھاری ہوئی پھر جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم لوگ اپنے امام کے پیچھے پڑھتے ہو ہم لوگوں نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قسم اللہ کی۔ آپ نے فرمایا نہ پڑھو مگر سورہ فاتحہ اس لیے کہ اس شخص کی نماز نہیں جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔ ابوداؤد، ترمذی۔

مذکورہ بالا حدیث میں عبادہ بن صامت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے یاد رہے کہ یہ ایک جہری نماز ہوتی ہے جس میں صحابہ کرام سورہ فاتحہ کے علاوہ قرأت کررہے تھے آپ نے سورہ فاتحہ کو پڑھنے کا حکم دیا اور.... مزید فرمایا اس شخص کی نماز نہیں جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔

حدیث نمبر ۴:

عن عمرو بن شعیب، عن ابیه عن جده، قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم تقرؤون خلفی، قالوا: نعم إنا لنهذ هذا قال: فلا تفعلوا إلا بأم القرآن۔

عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے اورانہوں نے اپنے داداسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ میرے پیچھے پڑھتے ہو لوگوں نے کہاہاں ہم لوگ جلدی جلدی پڑھتے ہیں آپ نے فرمایانہ پڑھو مگر سورہ فاتحہ۔(اس حدیث کو بخاری نے جزء القراءۃ میں اور بیہقی نے کتاب القرأۃ میں روایت کیااور یہ حدیث صحیح ہے۔)

حدیث نمبر ۵:

عن محمد بن أبی عائشة، عن رجل، من أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لعلکم تقرؤون والإمام یقرأ، قالوا: إنا لنفعل قال: لا إلا أن یقرأ أحدکم بفاتحة الکتاب۔

محمد بن ابی عائشہ نے ایک صحابی سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاشاید تم لوگ پڑھتے ہو جب کہ امام پڑھتاہے لوگوں نے کہابے شک ہم لوگ پڑھتے ہیں آپ نے فرمایانہیں مگر سورہ فاتحہ آہستہ پڑھناچاہئے۔(روایت کیاہے اس کو امام احمد نے مسندج ۵ص ۲۳۴)

اپیل میرے پیارے اور بھولے بھالے اسلامی بھائیو! کچھ مداری اور یہودی صفت لوگ اسلام کالبادہ اوڑھ کر علمائے کرام کی شکل میں موجود ہیں جولوگوں کے ایمان پرڈاکہ ڈال رہے ہیں اور لوگوں کو قرآن وسنت سے دور کررہے ہیں۔ مذکورہ بالاپانچ احادیث سے یہ بات روزروشن کی طرح عیاں ہے اور عین اسلام ہے کہ بغیر سورہ فاتحہ کوئی نماز نہیں ہوتی اسی لیے ایسے لوگوں کو چھوڑکر قرآن وسنت سے اپنے رشتے کو استوار کرواور ہرہر مسائل میں قرآن وسنت سے ہی اپنی رہنمائی حاصل کرو۔ کیوں کہ یہی دونوں چیزیں حیات جاوداں ہیں دلوں کو سکون دینے والی اورآخرت میں کامیابی سے ہمکنار کرنے والی۔ ان دونوں چیزوں کواپنی زندگی میں لازم پکڑے رہو۔ اوران پر مضبوطی سے عمل کرتے رہو۔

(دلائل احناف)

دلیل نمبر ۱: وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اورجب بھی قرآن پڑھاجائے اس کو غورسے سنواور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیاجائے۔(سورہ اعراف سورہ نمبر ۷ آیت نمبر ۲۰۴) سورہ مکی۔

الجواب ۱:

مذکورہ بالا آیت کوامام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کی دلیل بنانااپنے ناقص علم کوثابت کرنا۔ کیوں کہ یہ آیت کریمہ خاص ہے اور سری نمازیں ظہر، عصر کواس آیت کو کس طرح مستثنیٰ کیاجاسکتاہے کیوں کہ آیت خاص ہے اور دعوی عام ہے۔ آیت کریمہ میں یہ بات واضح ہے کہ جب قرآن پڑھاجائے تواسے غورسے سنواسی لئے کہ قابل غور بات یہ ہے کہ ظہرعصر کی نمازوں میں امام سری قرآن کرتاہے تواس کو کس طرح سے مقتدی سن سکتے ہیں توکیاپھر آپ اس آیت کے ضمن میں ہی

مقتدیوں کو سورہ فاتحہ پڑھنے کی اجازت دیں گے۔ یا پھر اس آیت کا تقلید شخصی کی وجہ سے انکار کر دیں گے۔ آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔

الجواب نمبر ۲:

یہ آیت کریمہ مکی ہے۔ مکی اور مدنی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو سورتیں مکے میں نازل ہوئیں وہ سورتیں مکی کہلاتی ہیں اور جو سورتیں مدینے میں نازل ہوئیں وہ مدنی کہلاتی ہیں اسی لئے یہ یاد ہونا چاہیئے کہ نماز باجماعت فرض مدینے میں ہوئی ہے۔ اور یہ آیت مکی ہے۔ جب جماعت سے مکہ میں نماز فرض یہ نہیں ہوتی تھی تو امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کا حکم کہاں سے نازل ہو گیا کیوں کہ قرآن مجید ضرورت کے مطابق ہی نازل ہوا کرتا تھا ہر آیت کے نزول کا کوئی نہ کوئی سبب تھا لہٰذا یہ آیت کریمہ بھی کفار مکہ کے جواب میں نازل ہوئی۔

دلیل:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ

ترجمہ: اور کافروں نے کہا اس قرآن کو سنو ہی مت اور بیہودہ گوئی کرو کیا عجب کہ تم غالب آجاؤ۔

(سورہ حم السجدۃ سورہ نمبر ۴۱ آیت ۲۶ شان نزول مکی)

تب اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ..... لہٰذا یہ دونوں آئتیں مکی ہیں۔ اور اس آیت میں کفار مکہ کو جواب دیا گیا ہے کہ جب بھی قرآن پڑھا جائے تو بیہودہ گوئی کے بجائے اسے غور سے سنو اور شور وغل کے بجائے خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

الجواب نمبر ۳:

اگر وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ کی آیت کو عام بھی مان لیا جائے تو حدیث نے یہ خاص کر دیا ہے کہ سورہ فاتحہ کے علاوہ امام کے پیچھے کچھ نہ پڑھو۔ کیوں کہ ایسے کئی دلائل قرآن وحدیث میں واضح طور پر موجود ہیں۔ اور یہ مسلمہ اصول ہے کہ حدیث کسی عام کو خاص اور خاص کو عام کر سکتی ہے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ کے اندر ارشاد فرمایا:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا

چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹ دیا کرو۔ (سورہ مائدہ سورہ نمبر ۵ آیت نمبر ۳۸)

یہ آیت عام ہے اس میں چوری کی مقدار کی وضاحت نہیں ہے کہ کتنی مقدار پر ہاتھ کاٹے جائیں لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حدود کا تعین فرما دیا ہے۔

دلیل: حدیث عن عائشہ عن رسول اللہ قال لا تقطع ید السارق الا فی ربع دینا رفصاعدا

ترجمہ: ام المومنین حضرت عائشہ سے روایت کہ رسول اللہ نے فرمایا چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے مگر چوتھائی دینار یا زیادہ کی چوری میں۔ رواہ مسلم، حدیث ۲۴۰)

دوسری دلیل:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ

ترجمہ: زناکار عورت ومرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤان پر اللہ کی شریعت کی حد جاری کرتے ہوئے تمہیں ہر گز ترس نہ کھانا چاہئے۔ اگر تمہیں اللہ پر قیامت کے دن پر ایمان ہو ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہئے۔

(سورہ نور سور نمبر ۲۴ آیت ۲)

لیکن نبی اکرم نے اس کی حدود کا تعین کرکے اس کو بھی خاص فرمادیا۔

دلیل: عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خذوا عنى، خذوا عنى، قد جعل الله لهن سبيلا. البكر بالبكر جلد مائة وتغريب سنة، والثيب بالثيب جلد مائة والرجم۔

ترجمہ: عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ نے فرمایا مجھ سے سیکھ لو سیکھ لو مجھ سے شرع کی باتیں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے ایک راہ نکالی جب بکر زنا کرے۔

احناف کی دوسری دلیل اوراس کا جواب

حدیث: عن جابر قال قال رسول الله من كان له امام فقراءة الامام له قراءة (ابن ماجه)

ترجمہ: حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ جس کا کوئی امام ہو توامام کی قرأت اس کی قرأت ہے۔

الجواب:

یہ حدیث سخت ضعیف ہے اور ناقابل استدلال ہے۔ اس کی سند میں جابر جعفی کذاب ہے وضاع ہے جھوٹی حدیثیں گھڑنے والا متروک الحدیث غیر ثقہ اور شیعی عقائد کا حامل ہے۔ اس کے جھوٹا ہونے کے لئے امام ابو حنیفہ کا یہ قول کافی ہے۔

''قال الامام ابوحنيفه ولا لقيت فيمن لقيت اكذب من جابر الجعفى''

یعنی امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی زندگی میں سب سے جھوٹا جابر جعفی ہی ملا۔ ملاحظہ ہو۔

ابن حبان ج ۳ص ۲۱۸ کامل فی الضعفاء لابن عدی، ج ا ص ۵۳۷، کتاب القرأۃ بیہقی ۱۰۸ میں جابر جعفی مدلس بھی ہے اور یاد رہے کہ جتنی حدیثیں ایسا مفہوم رکھتی ہیں وہ حد درجہ ضعیف ہیں۔

جواب ۲:

بقول تمہارے اس حدیث کو درست بھی مان لیا جائے تو لہ کی ضمیر امام ہی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی مقتدیوں کو سورہ فاتحہ پڑھنی ہو گی اس کو مقتدیوں پر محمول نہیں کیا جائے گا۔

جواب نمبر ۳: بقول تمہارے اگر لہ کی ضمیر مقتدیوں کی طرف لوٹ رہی ہے تو اسے سورہ فاتحہ کو چھوڑ کر دیگر قرآن پر محمول کیا جائے گا۔ بعض حضرات قرآن کا معنی فاتحہ لیتے ہیں۔ جو ایک نری جہالت ہے جیسے الیاس گھمن وغیرہ۔

میرے پیارے بھائیو قرآن کا معنی پڑھنا ہوتا ہے اور یہ آپ کو کوئی عربی کا ادنی طالب علم بتا سکتا ہے اور قرآن میں سورہ فاتحہ بھی شامل ہے لیکن آپ نے اس کی تخصیص فرمائی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورہ حجر سورہ نمبر ۱۵ آیت نمبر ۸۷ میں ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ

یقیناہم نے آپ کو سات آئتیں دے رکھی ہیں۔ کہ دہرائی جاتی ہیں اور عظیم قرآن بھی دے رکھا ہے۔ کیا ذرا آپ مجھے بتائیں گے کہ سات آئتیں قرآن مجید میں شامل نہیں ہیں۔ یقیناہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی فضیلت کو واضح کرنے کے لئے ایسا فرمایا ہے۔ اب یہ شور و غل کرنا کہ قرآن و سنت کے حاملین قرآن میں سورہ فاتحہ کو شامل نہیں کرتے یہ ایسا ہی ہے جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

الجواب

محترم امام صاحب آپ نے جو تحریر بھیجی ہے وہ خاصی طویل ہے۔ اور اس میں وہی پرانے اعتراضات ہیں جن کے جوابات بارہا ہمارے علما دے چکے ہیں۔ اور ان کے جوابات میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ایسے لوگوں کو جو اس طرح کے سوالات کے ذریعہ علما کو پریشان اور عوام کو بدظن کرنے کی کوشش کرتے ہیں کسی بھی طرح مطمئن کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ان کا کام تو یہی ہوتا ہے کہ ادھر ادھر سے دو چند سوالات نقل کئے اور انہیں عوام کے سامنے پیش کر دیا کہ اپنے علما سے جواب لا کر دو۔ عوام کو چاہئے تو یہ کہ ان سے کہے کہ جو تم نے سوالات لکھے ہیں وہ ہماری سمجھ سے دور ہیں اور جو ہمارے علما جوابات دیں گے انہیں سمجھنے کی صلاحیت ہمارے اندر ہے نہیں یہ سب علمی باتیں ہیں تو اس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ آپ اپنے علما کو بلا لو ہم اپنے علما کو بلا لیتے ہیں۔ اور اس طرح آپ یہاں ہمارے سامنے بیٹھ کر مسائل پر مناظرہ و مباحثہ کر لو تا کہ حق و باطل میں امتیاز ہو سکے۔ ان شاء اللہ اگر ایسا ہو گا تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔

خیر کثرت کار ہجوم افکار اتنی طویل تحریر کا جواب لکھنے کی مہلت نہیں دیتے مگر آپ کا پیہم اصرار اور مسلک حق کی حمایت کے پاکیزہ تصور نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ لہٰذا غیر مقلد پرچہ کے سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔

نماز میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے سے متعلق دلائل کے بالترتیب جوابات

دلیل نمبر (۱) کا جواب:

غیر مقلدین عام طور پر اپنے موقف پر درج ذیل حدیث بیان کرتے ہیں:

''لا صلاۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب''

اور اس کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ بغیر سورہ فاتحہ کے کسی کی بھی نماز نہیں ہے۔ حالانکہ حدیث پاک میں حکم منفرد کے لئے ہے۔ اور حدیث سے مراد نماز کا مکمل نہ ہونا ہے نماز کا بالکل نہ ہونا نہیں ہے۔ جیسا کہ پرچہ میں بیان کیا گیا ہے۔ پرچہ میں غیر مقلد صاحب نے جو دوسری حدیث نقل کی ہے

''عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من صلی صلاۃ لم یقرأ فیھا بأم القرآن فھی خداج ثلاثا غیر تمام''

اس میں بھی غیر تمام کا لفظ صراحتا بتا رہا ہے کہ نماز فاسد وباطل یا بالکل نہ ہونے کا حکم نہیں ہے بلکہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز ناتمام ونامکمل ہوتی ہے۔ ہم یہاں یہ بھی بتاتے چلیں کہ حدیث میں جو "لا" ہے وہ کئی معنی میں آتا ہے۔ کبھی ذات کی نفی کے لئے کبھی صفت کی نفی کے لئے کبھی زائد ہوتا ہے کبھی تاکید کے لئے آتا ہے۔ اور کبھی نفی جنس کے لئے آتا ہے۔ کبھی لا کمال کی نفی کے لئے آتا ہے۔ جیسے دار قطنی کی حدیث پاک میں ہے:

''لاصلاۃ لجار المسجد الافی المسجد'' یعنی مسجد کے پڑوسی کی نماز سوائے مسجد کے نہیں ہے۔

اب اگر یہاں لا کو کمال کی نفی کے بغیر نہ مان کر ذات کی نفی کے لئے مانا جائے گا تو پھر کسی کی بھی نماز مسجد کے بغیر ہوگی ہی نہیں حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں ماننا پڑے گا کہ لا کمال کی نفی کر رہا ہے کہ نماز مکمل نہیں ہے۔ نہ کہ بالکل نماز کے نہ ہونے کی۔ مشکوۃ وغیرہ میں حدیث پاک ہے حضرت انس سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

''لاایمان لمن لا امانۃ له ولا دین لمن لا عهد له''

یعنی جس کو امانت کا پاس نہیں اس کا ایمان نہیں اور جسے وعدہ کا پاس نہیں اس کا دین نہیں۔

اب اگر اس حدیث میں لا کو ذات کی نفی کے لئے مانا جائے گا تو پھر کوئی بھی امانت میں خیانت کرنے والا مومن نہیں رہے گا اور کوئی بھی وعدہ خلافی کرنے والا دین دار نہیں رہے گا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں کمال کی نفی ہے ذات کی نہیں۔ مطلب خائن کا ایمان کامل نہیں اور وعدہ خلاف کا دین کامل نہیں ہے۔

الحاصل: مبحوثہ حدیث میں بھی لا ذات کی نفی کے لئے نہیں ہے بلکہ کمال کی نفی کے لئے ہے۔ اور پھر اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ بغیر سورہ فاتحہ کے نماز نامکمل ہے۔ فاسد وباطل نہیں۔ اور یہ حکم بھی منفرد کے لئے ہے مقتدی کے لئے نہیں ہے۔ ملاحظہ کریں درج ذیل سنن ابو داؤد کی حدیث پاک۔

عن عبادة بن الصامت، يبلغ به النبي صلى الله عليه وسلم لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب فصاعدا، قال سفيان: لمن يصلي وحده

یعنی حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تبلیغ فرماتے تھے کہ جو شخص سورہ فاتحہ یا اس سے زائد کچھ نہیں پڑھے گا اس کی نماز مکمل نہیں ہے حضرت سفیان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو شخص اکیلے نماز پڑھ رہا ہو۔ (یعنی یہ حکم اکیلے نماز پڑھنے والے کے لئے ہے)

[سنن ابوداؤد، باب من ترک القراءۃ فی صلاتہ بفاتحۃ الکتاب، جلد ۱ ص ۲۱۷]

سنن ترمذی میں حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی:

من صلى ركعة لم يقرأ فيها بأم القرآن فلم يصل، إلا أن يكون وراء الإمام، هذا حديث حسن صحيح

جس شخص نے کوئی رکعت بغیر فاتحہ کے پڑھی اس نے نماز نہیں پڑھی مگر امام کے پیچھے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

اسی سنن ترمذی میں ہے:

''وأما أحمد بن حنبل فقال: معنی قول النبی صلی الله علیه وسلم لا صلاة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب، إذا کان وحده واحتج بحدیث جابر بن عبد الله حیث قال: من صلی رکعة لم یقرأ فیها بأم القرآن، فلم یصل إلا أن یکون وراء الإمام''

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ حدیث شریف ''سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں'' میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا منشا یہ ہے کہ جب وہ تنہا ہو۔ اورانہوں نے حدیث جابر سے احتجاج کیا کہ 'جس شخص نے کوئی رکعت بغیر فاتحہ کے پڑھی اس نے نماز نہیں پڑھی۔ مگر امام کے پیچھے۔

[سنن ترمذی، باب ما جاء فی ترک القراءة خلف الإمام إذا جهر الإمام بالقراءة]

درج بالا حدیث اورامام احمد بن حنبل کی تشریح کی روشنی میں یہ بات صاف ہوگئی کہ مبحوثہ حدیث پاک منفرد کے لئے ہے۔ اوریہی موقف احناف کا ہے الحمدللہ۔ اس پر مزید بحث کی جاسکتی ہے مگر انصاف پسند کے لئے یہی کافی ہے۔

دلیل نمبر ۲ کا جواب

''عن أبی هریرة، عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: من صلی صلاة لم یقرأ فیها بأم القرآن فهی خداج ثلاثا غیر تمام. فقیل لأبی هریرة: إنا نکون وراء الإمام، فقال: اقرأ بها فی نفسك۔''

غیر مقلد صاحب نے اس حدیث کو بیان کرکے بغیر سورہ فاتحہ کے نماز کو فاسد وباطل قرار دیتے ہوئے نماز کے نہ ہونے کا حکم بیان کیا ہے۔ جو یقینا بہت بڑی جہالت ہے۔ اور علم سے نابلد ہونے کی دلیل ہے۔ اگر ان کی اس بات کو تسلیم کیا جائے گا تو بہت سی احادیث کریمہ زد میں آجائیں گی اور بعض مقامات پر بہت سے صحابہ کرام اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازیں فاسد وباطل ہوتی نظر آئیں گی۔ ہم یہاں ایک دو مثالیں دینے پر اکتفا کرتے ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری ایام میں چند نمازیں سیدنا صدیق اکبر نے پڑھائیں ایک بار دوران نماز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو ابو بکر پیچھے ہٹ گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز شروع کی لیکن اس سے قبل ابو بکر سورہ فاتحہ مکمل یا کچھ پڑھ چکے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری سورہ فاتحہ نہیں پڑھی بلکہ وہاں سے شروع کی جہاں تک ابو بکر پڑھ چکے تھے۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس سے مروی درج ذیل حدیث ملاحظہ کریں:

''وأخذ رسول الله صلی الله علیه وسلم من القراءة من حیث کان بلغ أبو بکر''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ سے قراءت شروع کی جہاں تک ابو بکر ادا کر چکے تھے۔

[سنن ابن ماجہ جلد ۱/۳۹۱]

حدیث سے ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ فاتحہ یا تو پڑھی ہی نہیں اس کے سوا کوئی اور سورۃ پڑھی یا اگر پڑھی تو کچھ پڑھی کچھ ابو بکر پڑھ چکے تھے وہ چھوڑ دی۔ تو اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری یا آدھی سورہ فاتحہ نہیں پڑھی تو اہل حدیث غیر مقلد حضرات کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز فاسد وباطل ہوئی بلکہ نماز ہوئی ہی نہیں۔ العیاذ باللہ

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

''أنه دخل المسجد والنبی صلی الله علیه وسلم راکع فرکع قبل أن یصل إلی الصف، فقال النبی صلی الله علیه وسلم

زادك الله حرصا ولا تعد''

یعنی جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رکوع میں پایا وہ صف میں شامل ہوئے بغیر وہیں سے رکوع میں چلے گئے۔ تو نبی نے فرمایا اللہ تیرے حرص کو زیادہ فرمائے آئندہ اس طرح (بغیر صف میں شامل ہوئے رکوع میں چلے جانا) مت کرنا۔

درج بالا روایت میں صحابی کا سورہ فاتحہ نہ پڑھنا صاف ظاہر ہے مگر اس کے باوجود بھی نماز کو دہرایا نہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نماز کو دہرانے کا حکم نہیں فرمایا۔ اگر نماز سورہ فاتحہ کے بغیر ہوتی ہی نہیں یا فاسد و باطل ہوتی تو ضرور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دہرانے کا حکم فرماتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک کسی نے بھی سورہ فاتحہ نہ پڑھنے پر نماز کے فاسد و باطل ہونے یا اس کے نہ ہونے کا حکم نہیں لگایا ہے۔ مگر اس پرچہ میں غیر مقلد نے نماز کے فاسد اور باطل ہونے کا حکم دیا ہے۔ پتہ نہیں یہ حکم انہوں نے کہاں سے گڑھا ہے۔ ان کے مشہور و مستند علما بھی اس بات کو نہیں مانتے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی ہے یا فاسد و باطل ہوتی ہے۔ جیسا کہ غیر مقلدین کے مشہور عالم ارشاد الحق اثری نے اپنی کتاب توضیح الکلام ص ا ے پر صاف طور پر لکھا ہے۔

''اس کے برعکس امام بخاری سے لے کر دور قریب کے محققین علمائے اہل حدیث تک کسی کی تصنیف میں یہ دعوی نہیں کیا گیا کہ دیانت دارانہ تحقیق کے بعد فاتحہ نہ پڑھنے والے کی نماز باطل ہے اور وہ بے نمازی ہے۔ وغیرہ'' سعودی حکومت کی طرف سے جو قرآن ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ تقسیم کیا جاتا ہے اس میں ترجمہ اور تفسیر دونوں مشہور دو اہل حدیث عالم کی ہیں۔ ترجمہ مولوی جوناگڑھی اور تفسیر مولوی صلاح الدین یوسف کی ہے۔ اس میں سورہ فاتحہ کی تفسیر کرتے ہوئے غیر مقلدین کے امام و پیشوا ابن تیمیہ کے حوالے سے لکھا گیا ہے:

''علامہ ابن تیمیہ کا قول ہے کہ سلف کے مطابق اگر مقتدی امام کی قراءت سن رہا ہو تو نہ پڑھے اور نہ سن رہا ہو تو پڑھے۔''

ابن تیمیہ کے قول سے بھی ظاہر ہے کہ سورہ فاتحہ نہ پڑھنے سے نماز فاسد و باطل نہیں ہوتی بلکہ امام قراءت کرے تو ان کے نزدیک بھی نہ پڑھنے کا ہی حکم ہے۔ پتہ چلا کہ پرچہ میں غیر مقلد صاحب نے جو سورہ فاتحہ نہ پڑھنے پر نماز کے فاسد و باطل اور نماز نہ ہونے کا حکم لگایا ہے وہ خود ان کی اختراع ہے شریعت میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے۔

دلیل نمبر ۳ کا جواب

عن عبادة بن الصامت، قال: صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم الصبح، فثقلت عليه القراءة، فلما انصرف قال: إني أراكم تقرءون وراء إمامكم، قال: قلنا: يا رسول الله، إي والله، قال: لا تفعلوا إلا بأم القرآن، فإنه لا صلاة لمن لم يقرأ بها۔

مذکورہ بالا حدیث پاک نقل کر کے غیر مقلد صاحب نے اپنا موقف صاف کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے کہ بغیر سورہ فاتحہ نماز نہیں ہے۔ اس کے بہت سے جوابات ہیں ہم یہاں دو چند بیان کر دیتے ہیں:

اولا یہ حدیث پاک آپ کے اصول کے مطابق ضعیف اور غیر لائق احتجاج ہے۔ کیوں کہ اس میں ایک راوی محمد بن اسحاق ہے۔ جس پر آپ کے اکابر علمانے ضعیف ہونے کا حکم لگایا ہے۔ اور اس کی حدیث کو ضعیف مانا ہے اور حجت ماننے سے

انکار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: غیر مقلد عالم البانی نے لکھا ''ان ابن اسحاق مدلس''

[سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ ج ۱۰۸۷/۲]

غیر مقلد محدث عبد الرحمن مبارکپوری صاحب نے ''ابکار المنن کے ص ۵۳'' پر ایک حدیث کو محمد بن اسحاق کے مدلس ہونے کے سبب ضعیف قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

فان فی سندہ محمد بن اسحاق وھو مدلس و رواہ عن فاطمۃ بنت المنذر بالعنعنۃ ومع ھذا قد تفرد ھوا اللفظ ولم یقلہ غیرہ

اس کی سند میں محمد بن اسحاق ہے جو مدلس ہے اور اس حدیث کو فاطمہ بن منذر سے عن کے ساتھ روایت کرتا ہے اور وہ حدیث کے ان لفظوں کے نقل کرنے میں منفرد ہے یہ لفظ کسی اور نے نقل نہیں کیے اس لیے یہ ضعیف ہے۔

غیر مقلد فیض عالم صدیقی نے لکھا:

''محمد بن اسحاق جمہور کے نزدیک ضعیف تھا'' [صدیقہ کائنات ص ۱۱۴]

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے محمد بن اسحاق کے بارے میں لکھا:

محمد بن اسحاق حجت نیست [دلیل الطالب ص ۲۳۹]

اور بھی بہت سے حوالے دئے جاسکتے ہیں مگر ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

حاصل یہ ہوا کہ محمد ابن اسحاق علمائے غیر مقلدین کے نزدیک ضعیف ہے اس کی حدیث تدلیس کے سبب ضعیف ہوتی ہے۔

اس حدیث کو غیر مقلد پیشوا ناصر الدین البانی نے ضعیف لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو ''ضعیف سنن الترمذی جلد ۱ ص ۴۳''

اور خود غیر مقلد صاحب نے اس پرچہ میں بھی ایک حدیث کو ضعیف ثابت کرنے میں راوی کے مدلس ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ لہٰذا غیر مقلد صاحب کے اصول کے مطابق بھی یہ ضعیف ہے۔ اور چونکہ محمد بن اسحاق کی حدیث علمائے غیر مقلدین کے نزدیک حجت نہیں ہے تو پھر اس حدیث سے غیر مقلد صاحب کا احتجاج چہ معنی دارد؟

علاوہ ازیں اس میں ایک راوی مکحول ہے جس کو ائمہ نقاد نے مدلس لکھا ہے البانی نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہتے ہوئے مکحول کا مدلس ہونا ذکر کیا ہے ملاحظہ کریں:

''إسنادہ ضعیف؛ مکحول صاحب تدلیس، وقد عنعنه. واضطرب علیه في إسنادہ'' [ضعیف أبي داود، جلد ۱ /۳۳۸]

لہٰذا حدیث مذکور غیر مقلدین کے اصول کے مطابق راوی مکحول کے مدلس ہونے کے سبب اور راوی نافع کے مجہول و مستور ہونے کے سبب ضعیف ناقابل اعتبار ٹھہری۔

بالفرض اس حدیث کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ حدیث درج ذیل وجوہات کے سبب قابل ترجیح نہیں ہے۔

(۱) اس حدیث سے نماز بالجہر میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم ہے حالانکہ قرآن مقدس میں ہے: واذا قری القرآن....

لہٰذا یہ حدیث جو خبر واحد کے دائرہ میں ہے قرآن کے حکم صریح کے خلاف ہے اس لئے قابل قبول نہیں ہے۔

(۲) اس حدیث کے بر خلاف حضرت مولی علی، حضرت عمر حضرت جابر حضرت عبد اللہ بن عمر حضرت عبد اللہ بن عباس حضرت عبد اللہ بن مسعود جیسے جلیل القدر مشاہیر صحابہ کرام سے بکثرت روایتیں منقول ہیں۔

(جنہیں ہم آگے بیان کریں گے) لہٰذا صحابہ کی اکثریت کے مقابلہ میں صرف ایک صحابی کی حدیث وہ بھی ضعیف حدیث ہر گز لائق اعتبار نہیں ہو سکتی ہے۔

(۳) مذکورہ بالا صحابہ کرام سے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ وغیرہ نہ پڑھنے کی احادیث قرآن کے حکم کے مطابق بھی ہیں اس لئے یہی قابل ترجیح ہیں۔ اور وہ مرجوح ہے۔

اس حدیث پر اور کئی جہت سے کلام ہو سکتا ہے مگر یہ اوراق اس کے متحمل نہیں اس لئے بس اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

دلیل نمبر ۴ کا جواب

عن عمرو بن شعیب، عن ابیہ عن جدہ، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقرؤون خلفی، قالوا: نعم إنا لنهذ هذا قال: فلا تفعلوا إلا بأم القرآن۔

امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے سے متعلق مذکورہ بالا حدیث بھی بیان کی جاتی ہے۔ اس حدیث سے متعلق ہم عرض کر دیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس میں دو راوی مجروح ہیں۔ عمرو بن شعیب اور عکرمہ بن عمار۔ عمرو بن شعیب کے بارے میں احمد بن حنبل نے کہا:

''له أشياء مناكير، إنما نكتب حديثه نعتبره، فأما أن يكون حجة فلا''

یعنی وہ منکر روایتیں لاتا ہے البتہ ہم اس کی حدیث لکھتے ہیں اس کا اعتبار کرتے ہیں لیکن وہ حجت نہیں ہے۔

یحیی کہتے ہیں کہ عمرو بن شعیب کی حدیث واہی ہے اور انہوں نے کذاب بھی کہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

يحيى يقول: حديث عمرو بن شعيب عندنا واه حدثنا محمد قال: حدثنا عباس قال: سمعت يحيى يقول: عمرو بن شعيب كذاب، إنما هو عمرو بن شعيب بن محمد بن عبد الله بن عمرو بن العاص، وهو يقول: أبي، عن جدي، عن النبي صلى الله عليه وسلم، فمن هاهنا ضعف' [الضعفاء الكبير للعقيلی، ۳/۲۷۳]

عکرمہ بن عمار کو احمد بن حنبل نے ''ضعیف الحدیث'' کہا ہے۔ [میزان الاعتدال ۳/۹۱]

دار قطنی نے مدلس بتایا۔ ملاحظہ ہو [طبقات المدلسین، ۱/۴۲]

ابو حاتم نے تدلیس کے ساتھ وہم بھی بیان کیا۔ ابن خراش نے کہا ''وفی حدیثه نكرة''

[تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، ۲۰/۲۶۱]

علامہ جوزی نے یحیی بن سعید اور امام احمد کے حوالے سے لکھا:

''قال يحيى بن سعيد أحاديث ضعاف ليس بصحاح قال أحمد أحاديثه ضعاف''

یعنی یحیی بن سعید نے کہا اس کی احادیث ضعیف ہیں صحیح نہیں اور امام احمد نے کہا اس کی احادیث ضعیف ہیں۔

[الضعفاء والمتروکین لابن الجوزی۔ [۲/۱۸۵]

الغرض بعض ائمہ نقاد کے نزدیک عمرو بن شعیب اور عکرمہ بن عمار دونوں راوی مجروح ہیں۔ اور جس طرح کی جرح پیش کی گئی ہے اس کے مطابق غیر مقلدین کے نزدیک راوی کی روایت ضعیف ہوتی ہے لائق حجت نہیں ہوتی ہے۔

جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں۔ لہٰذا غیر مقلدین کے لئے یہ حدیث بھی کام کی نہیں۔ اور امام احمد حنبل کے بیان کی روشنی میں عمرو بن شعیب کی روایت لکھی جائے گی مگر اس سے حجت نہیں پکڑی جا سکتی ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ غیر مقلدین جو عام طور پر بخاری شریف کی صحیح احادیث ہی مانگتے ہیں وہ غیر بخاری کی ضعیف حدیث تک کو اپنے موقف کو بچانے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ اس حدیث کے مقابلہ پر اس سند سے اعلیٰ سند میں احادیث موجود ہیں جنہیں ہم اپنے مقام پر بیان کریں گے لیکن غیر مقلدین انہیں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔

دلیل نمبر ۵ کا جواب

عن محمد بن أبي عائشة، عن رجل، من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لعلكم تقرؤون والإمام يقرأ؟ قالوا: إنا لنفعل قال: لا إلا أن يقرأ أحدكم بفاتحة الكتاب۔

یہ حدیث پاک چند وجوہات سے ضعیف و نا قابل قبول ہے۔

ایک تو یہ کہ اس حدیث پاک کو بیہقی نے دوسری سند سے بیان کیا ہے جس میں ابراہیم بن ابو اللیث ہے جس پر ائمہ نقاد نے سخت جرح فرمائی ہے۔ کذاب و وضاع تک کہا ہے۔ لسان المیزان وغیرہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا اس سند سے تو یہ حدیث بالکل ضعیف ہے۔ البتہ اس پرچہ میں اس حدیث کو مسند احمد سے نقل کیا ہے۔ لیکن اس سند سے بھی غیر مقلدین کا کام نہیں چلنے والا ہے۔ کیوں کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عبد اللہ بن زید ابو قلابہ ہیں جو سخت مدلس تھے۔

امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے ''أنه يدلس عمن لحقهم وعمن لم يلحقهم''

یعنی ابو قلابہ جن سے ملاقات ہوئی ان سے بھی اور جن سے ملاقات نہیں ہوئی ان سے بھی تدلیس کرتے ہیں۔

[میزان الاعتدال، ۴۲۶/۲]

اور تدلیس کے بارے میں ہم جواب نمبر ۳ کے تحت غیر مقلدین کا موقف بیان کر چکے ہیں کہ ان کے نزدیک مدلس کی روایت ضعیف ہوتی ہے اور مدلس حجت نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ حدیث قابل حجت نہیں ہے۔

دوسری وجہ اس حدیث کے غیر معتبر ہونے کی یہ ہے کہ اس حدیث کو ''رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' سے روایت کیا گیا ہے مطلب مجہول صحابی سے روایت کیا گیا ہے۔ اور مجہول صحابی کی روایت کو محدثین نے قابل حجت نہیں مانا ہے۔ نخبۃ الفکر وغیرہ اصول حدیث کی کتابوں میں صحیح حدیث کی تعریف کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا صحابی روایت کرے جو مجہول نہ ہو۔

علاوہ ازیں محدثین کے نزدیک جب کوئی تابعی ''عن رجل من الصحابة'' سے ''عنعنه'' کرے تو وہ روایت ضعیف نا قابل قبول ہوتی ہے۔ علامہ سخاوی نے فتح المغیث میں علامہ ابن صیرفی کے حوالے سے لکھا ہے

''إذا قال رجل من التابعين.... عن رجل من الصحابة، وما أشبه ذلك، فلا يقبل.''

یعنی جب تابعین میں سے کوئی رجل من الصحابہ یا اس کے مشابہ الفاظ سے روایت کرے تو قبول نہ ہو گی۔

[فتح المغيث، ۱۹۱/۱]

الغرض یہ حدیث پاک سند کے اعتبار سے نا قابل قبول ہے۔
بر سبیل تنزل اسے صحیح بھی مان لیں تو یہ حدیث پاک تو الحمد للہ ہمارے موقف کے مطابق ہے۔ ترجمہ پر غور کریں۔
غیر مقلد صاحب نے جو ترجمہ کیا ہے پہلے اس کا جائزہ لیں:

''محمد بن ابی عائشہ نے ایک صحابی سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید تم لوگ پڑھتے ہو جب کہ امام پڑھتا ہے لوگوں نے کہا بے شک ہم لوگ پڑھتے ہیں آپ نے فرمایا نہیں مگر سورہ فاتحہ آہستہ پڑھنا چاہئے''

اس ترجمہ میں لکھا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں مگر سورہ فاتحہ آہستہ پڑھنا چاہئے۔
غیر مقلد صاحب نے آہستہ پڑھنا چاہئے کہاں سے گھڑ لیا پتہ نہیں۔ پوری حدیث پڑھیں اس میں کہیں نہیں کہ آہستہ پڑھنی چاہئے۔ بلکہ صحابہ کے پڑھنے پر آپ نے پوچھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ نہیں (مطلب نہیں پڑھنا چاہئے) کیوں نہیں پڑھنا چاہئے اس لئے کہ تم میں سے ایک ہی سورہ فاتحہ پڑھے۔ کون ایک مقتدی نہیں بلکہ امام۔ (باقی سب خاموش رہیں) اگر ایک مقتدی مانیں گے تو بڑا حرج واقع ہوگا۔ حدیث کے اس مفہوم پر بہت سی احادیث موید ہیں۔ جس مسند احمد کے حوالے سے غیر مقلد صاحب نے حدیث نقل کی ہے ہم بھی نقل کرتے ہیں:

''عن أبي موسى قال: علمنا رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا قمتم إلى الصلاة فليؤمكم أحدكم، وإذا قرأ الإمام فأنصتوا''

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی کہ جب تم نماز ادا کرو تو چاہئے کہ تم میں سے کوئی ایک تمہاری امامت کرے۔ اور جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔

[مسند احمد، جز ۳۲/۴۹۶]

یہ حدیث پاک سنن ابو داؤد، سنن ابن ماجہ وغیرہ میں بھی ہے۔ اس کو محدثین نے صحیح قرار دیا ہے۔ امام مسلم نے اس حدیث سے متعلق فرمایا:

''وإذا قرأ فأنصتوا فقال: هو عندي صحيح''

یعنی جب امام قراءت کرے تو خاموش رہو یہ حدیث میرے نزدیک صحیح ہے۔

[صحيح مسلم، باب التشهد في الصلاة، ۱/۳۰۴]

غیر مقلد صاحب نے اپنے مطلب کی حدیث لے لی مگر یہ حدیث پاک چھوڑ دی جو حدیث مشہور صحابی سے مروی تھی اسے چھوڑ کر غیر مشہور و مجہول صحابی کی حدیث کو سند بنانا کہاں کی عقلمندی ہے۔

احناف کے دلائل کے خلاف جوابات کا جائزہ

دلیل (۱)

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور جب قرآن پڑھا جائے اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم ہو۔

(ترجمہ کنز الایمان، سورہ اعراف سورہ نمبر ۷ آیت نمبر ۲۰۴)

امام کے پیچھے سورہ فاتحہ وغیرہ نہ پڑھنے کے سلسلے میں احناف کے پاس بہت سے دلائل ہیں ان میں سے پہلی دلیل قرآن مقدس کی مذکورہ بالا آیت کریمہ ہے۔

غیر مقلد صاحب نے اس دلیل کے جواب میں اپنی طرف سے کافی کچھ لکھا ہے سابق اوراق میں پڑھا جاسکتا ہے ہم یہاں تفصیلاً سب کا جواب دیں گے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ ہم یہاں بس ضروری باتوں کو بیان کرتے ہیں:

اس دلیل کے تین جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے جنہیں پڑھ کر یقیناً اہل علم کو افسوس ہوگا کہ کس طرح اپنی بات منوانے میں خیانتیں کی جاتی ہیں۔

جواب الجواب (۱)

غیر مقلد صاحب نے لکھا کہ یہ آیت خاص ہے۔

یہ غیر مقلد صاحب کا خود کا قول ہے حالانکہ مفسرین کرام نے اس آیت کو خاص نہیں عام مانا ہے۔

ابو بکر رازی جصاص نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں لکھا ہے:

''الآیۃ کافیۃ فی ظهور معناها وعموم لفظها ووضوح دلالتها علی وجوب الاستماع والإنصات لقراءة الإمام''

یعنی آیت اپنے معنی کی وضاحت اور الفاظ کی عمومیت کے لحاظ سے امام کی قراءت کے سبب سننے اور خاموش رہنے کے واجب ہونے پر واضح دلیل ہے۔ [احکام القرآن، ۲۱۶/۴]

پتہ چلا کہ یہ آیت عام ہے۔ خاص نہیں۔ جب جب قرآن پڑھا جائے گا اس کا غور سے سننا اور خاموش رہنا لازم ہوگا۔

رہا یہ شبہہ کہ پھر ظہر، عصر کی نمازیں اس سے کیسے مستثنیٰ ہوں گی۔ تو جواب بہت آسان ہے۔

احناف امام کی قراءت بالجہر کے وقت خاموش رہتے ہوئے غور سے سن کر قرآن کے ظاہری حکم پر عمل کرتے ہیں اور امام کی قراءت بالسر کے وقت، احادیث صحیحہ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے قراءت نہ کرو خاموش رہو۔ امام کی قراءت ہی تمہاری قراءت ہے۔ اس کے ذریعہ نیز اسی آیت کے ایک جملہ ''أَنْصِتُوا'' کے حکم پر عمل کرتے ہوئے خاموش رہتے ہیں اگر غور کریں تو سمجھ میں آئے گا کہ اللہ پاک نے ''فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا'' کا حکم کیوں دیا، ایک کافی تھا قرآن پڑھا جائے تو خوب غور سے کان لگا کر سنو (اہل لغات کے مطابق یہی معنی ہے فاستمعوا کا) جب خوب غور سے کان لگا کر کوئی سنے تو ظاہر ہے خاموشی کے بغیر یہ کام ہو نہیں پائے گا تو خاموش رہنا بھی ضرور پائے جائے گا۔ تو ''وَأَنْصِتُوا'' کیوں آیا۔ اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ جب امام قرآن بالجہر پڑھے تو غور سے سنو اور خاموش رہو اور جب بالسر پڑھے تو قراءت نہ کرو بلکہ خاموش رہو۔ اس طرح قرآن کے عموم پر عمل ہو گیا اور احادیث کریمہ کے خصوص پر عمل ہو گیا۔

جواب الجواب (۲)

غیر مقلد صاحب نے آیت کریمہ کے شان نزول کے بارے میں یہ بتایا کہ یہ آیت کافروں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اور اس پر کوئی حوالہ کسی معتبر کتاب کا نہیں دیا۔ یہ غیر مقلدین کا پرانا اعتراض ہے اور برسوں پہلے اس کا جواب علمانے عطا فرما دیا ہے۔ ہم یہاں یہ باور کرا دیں کہ یہ آیت نماز سے متعلق ہی نازل ہوئی ہے۔ کافروں کے حق میں نہیں مومنین کے

حق میں نازل ہوئی ہے اس تعلق سے سیکڑوں حوالے پیش کئے جاسکتے ہیں ۔اوراس پر کافی جوابات دئے جاسکتے ہیں مگر ہم اختصار کے مد نظر قرآن کریم کی آیات کریمہ کے شان نزول کے سلسلے میں معتبر ومستند مانے جانے والے مفسرین کی جماعت سے دوچند حوالے پیش کرنے پر اکتفاکرتے ہیں کیوں کہ قرآن کی آیات کے شان نزول وغیرہ کے سلسلے میں مفسرین کرام کے اقوال زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

تفسیر در منثور میں اس آیت کے تحت حضرت ابوہریرہ کے حوالے سے درج ذیل شان نزول یہ بیان کیا گیاہے۔

''نزلت فی رفع الأصوات وهم خلف رسول الله صلی الله علیه وسلم فی الصلاة''

یعنی یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز بلند آواز کرنے کے سلسلے میں نازل ہوئی۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس کے حوالے سے یہ شان نزول ذکر فرمایا

صلی النبی صلی الله علیه وسلم فقرأ خلفه قوم فنزلت (وإذا قرء القرآن فاستمعوا له وأنصتوا)''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی تو آپ کے پیچھے قوم نے قراءت کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔[تفسیر در منثور]

تفسیر بغوی میں ہے:

''اختلفوا فی سبب نزول هذه الآیة، فذهب جماعة إلی أنها فی القراءة فی الصلاة''

اس آیت کے سبب نزول میں اختلاف ہے البتہ ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہ آیت نماز میں قراءت کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔

نیز غیر مقلد صاحب نے لکھاہے کہ مکہ میں جب جماعت فرض ہی نہیں ہوئی توامام کے پیچھے مقتدیوں کو سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کاحکم کہاں سے نازل ہوگیا؟

اس کے تفصیلی بہت سے جوابات دئے جاسکتے ہیں مگر ہم یہاں بس اختصاراًبتادیں کہ اولاً جماعت سے نماز فرض نہیں ہے بلکہ واجب ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ مکہ میں بھی جماعت سے نمازاداکی جاتی تھی بخاری ومسلم کتب احادیث سے بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔یہاں ہم بس ایک حوالہ بخاری شریف سے پیش کرتے ہیں۔جس میں طائف سے واپسی پر عکاظ بازار جاتے ہوئے مقام نخلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کانماز فجر پڑھانابیان کیا گیاہے۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس سے مروی فرماتے ہیں:

انطلق النبی صلی الله علیه وسلم فی طائفة من أصحابه عامدین إلی سوق عكاظ، وقد حیل بین الشیاطین وبین خبر السماء، وأرسلت علیهم الشهب، فرجعت الشیاطین إلی قومهم، فقالوا: ما لكم، فقالوا: حیل بیننا وبین خبر السماء، وأرسلت علینا الشهب، قالوا: ما حال بینكم وبین خبر السماء إلا شیء حدث، فاضربوا مشارق الأرض ومغاربها، فانظروا ما هذا الذی حال بینكم وبین خبر السماء، فانصرف أولئك الذین توجهوا نحو تهامة إلی النبی صلی الله علیه وسلم وهو بنخلة عامدین إلی سوق عكاظ، وهو یصلی بأصحابه صلاة الفجر فلما سمعوا القرآن تسمعوا له, فقالوا: هذا الذی حال بینم وبین خبر السماء''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ عکاظ کے بازار کی طرف ارادہ کرکے چلے اس وقت شیاطین اورآسمانی خبروں کے درمیان روک لگادی گئی تھی۔اوران پر شعلے پھینکے جاتے تھے۔توشیاطین اپنی قوم کی طرف لوٹ آئے۔پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ہمارے اورآسمانی خبروں کے درمیان روک لگادی گئی ہے۔اور ہم پر انگارے پھینکے جاتے ہیں۔توانہوں نے کہاکہ تمہارے اورآسمان کے درمیان کوئی نئی چیز حائل ہے جس کے سبب رکاوٹ ہورہی ہے توزمین کے شرق وغرب میں گھوم کر دیکھو۔وہ کون سی چیز ہے جو تمہارے اورآسمان کے درمیان حائل ہے۔ان میں جو تہامہ کی طرف گئے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آئے اور حضور نخلہ میں تھے بازار عکاظ جارہے تھے اوراپنے اصحاب کو نماز فجر پڑھارہے تھے۔جب انہوں نے قرآن سناتو بغور سنااور کہا بخدا ایہی ہے جو تمہارے اورآسمان کی خبر کے درمیان حائل ہے۔

[بخاری،باب الجہر بقراءۃ صلاۃ الفجر]

اس حدیث کی شرح میں امام نووی فرماتے ہیں:

''وفيه إثبات صلاة الجماعة وأنها مشروعة في السفر وأنها كانت مشروعة من أول النبوة''

اوراس میں جماعت کی نماز کا ثبوت ہے اور یہ ہے کہ وہ سفر میں مشروع تھی اور یہ کہ وہ دور نبوت کے آغاز ہی سے مشروع تھی۔[شرح مسلم، ۱۶۹/۴]

اس پر تفصیلی کلام اہل سنت کی کتابوں میں درج ہے وہاں دیکھاجاسکتاہے۔یہاں اختصار مقصود ہے اس لئے بس اسی پر اکتفا کیاہے۔

جواب الجواب(۳)

غیر مقلد صاحب کا یہ کہنا کہ آیت کو اگر عام مان بھی لیں تو حدیث نے اس کو خاص کردیاہے کہ سورہ فاتحہ کے علاوہ امام کے پیچھے کچھ نہ پڑھو۔غیر مقلد صاحب نے آیت کو عام مان کر حدیث سے اس کی جو تخصیص بیان کی ہے ہر گز ہر گز قابل قبول نہیں ہے۔یہ خود ان کی طرف سے ہے۔احادیث کریمہ میں کہیں ایسی تخصیص نہیں پائی جاتی ہے۔بلکہ ایسی کوئی حدیث ہی نہیں پائی جاتی ہے جس سے صراحتاًیہ ثابت ہو کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھو اوراس کے علاوہ کچھ نہ پڑھو۔جن احادیث سے یہ مفہوم اخذ کیاجاتاہے وہ سب ضعیف وناقابل عمل ہیں،اگر انہیں مقبول مان بھی لیاجائے تب بھی اس کے برخلاف احادیث صیحیہ کی کثرت ہے جس کے سبب یہ منسوخ کے حکم میں ہیں۔لہٰذا منسوخ،ضعیف ناقابل عمل احادیث سے قرآن کے حکم میں تخصیص کسی بھی حال میں جائزنہ ہوگی۔توجب دعوی ہی درست نہ ٹھہرا تواس پر مبنی دلائل کس کام کے؟

اوردلائل بھی ایسے جنہیں پڑھ کر غیر مقلد صاحب کی علمی لیاقت وصلاحیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکے۔

اس لئے دلائل پر وقت ضائع کرنامناسب نہیں ہے۔

دلیل(۲)

''عن جابر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من كان له امام فقراءة الامام له قراءة''

یعنی حضرت جابر سے مروی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبی جس کا امام ہو توامام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔

غیر مقلد صاحب نے اس حدیث کو ضعیف بنانے میں کافی زور صرف کیاہے۔اس حدیث کی ایک سند میں راوی کے کذاب ووضاع ہونے کا حکم لگاکر حدیث کو ضعیف وناقابل استدلال گرداناہے۔حالانکہ غیر مقلدین کے معتبر ومستند عالم البانی نے اس حدیث کو حسن قراردیاہے۔اس کی کیاوجہ ہے اس کو خود غیر مقلد صاحب تلاش کریں۔ہم یہاں سردست اتنابتادیں کہ یہ حدیث مختلف کتابوں میں متعدداسانید کے ساتھ موجودہے اوراکثراسانید میں غیر مقلد صاحب کامطعون راوی نہیں پایاجاتاہے۔بلکہ ان میں سے کچھ احادیث توایسی ہیں جن کے جملہ راوی ثقہ غیر مجروح ہیں۔

یہاں تمام اسانید کاجمع کرنامشکل ہے ہم یہاں بس ایک دوسند بیان کرنے پر اکتفاکرتے ہیں::

''ابوحنيفة عن موسى، عن عبد الله بن شداد، عن جابر بن عبد الله رضي الله عنه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة''

حضرت ابوحنیفہ روایت کرتے ہیں حضرت موسی سے وہ عبداللہ بن شداد سے وہ حضرت جابر بن عبداللہ سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاجس کاامام ہوتوامام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔

[جامع مسانیدالامام الاعظم،للخوارزمی،ج ۱ ص ۳۳۱]

اس سند میں کوئی راوی مجروح نہیں ہے تمام رواۃ ثقہ ہیں۔

قال أحمد بن منيع في مسنده: أخبرنا إسحاق الأزرق، حدثنا سفيان وشريك عن موسى بن أبي عائشة عن عبد الله بن شداد عن جابر رضي الله عنه -قال: قال رسول الله -صلى الله عليه وسلم من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة''

امام احمد بن منیع نے فرمایاکہ ہمیں اسحاق ازرق نے خبردی ان سے حدیث بیان کی سفیان اور شریک نے وہ موسی بن ابوعائش سے روایت کرتے ہیں وہ عبداللہ بن شداد سے وہ حضرت جابر بن عبداللہ سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاجس کاامام ہوتوامام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔[مسنداحمدبن منیع بحوالہ فتح القدیر،جلد ۱/۳۳۸]

اس سند میں بھی کوئی راوی مجروح نہیں ہیں سب ثقہ ہیں۔غیر مقلد مشہور عالم نواب صدیق حسن بھوپالی نے اپنی کتاب ''ہدایۃ السائل الی ادلۃ المسائل''میں امام احمد بن منیع کے حوالے سے دوسندوں کاذکرکرتے ہوئے،پہلی سند کو شیخین کی شرط پراوردوسری کو مسلم کی شرط پر صحیح قراردیاہے۔

علاوہ ازیں امام حاکم نے اس حدیث کواوراس کے علاوہ چند احادیث کواپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں درج کرکے لکھا:

''فكل هذه الأحاديث مشهورة بأسانيدها، وطرقها''

اپنے اسانید اور طرق کے اعتبار سے تمام احادیث مشہور ہیں[۹۲/۱]

اگر اختصار مقصونہ ہوتاتو ہم مزید اسانید بھی نقل کرتے۔البتہ ہم اسی مفہوم کی ملتی جلتی چند صحیح احادیث اور بھی یہاں نقل کردیتے ہیں تاکہ غیر مقلد صاحب کوپتہ چلے کہ احناف کے پاس دلائل کی کمی نہیں ہے اوربس یہی ایک حدیث ان کے موقف پر بس نہیں ہے بلکہ بہت سی احادیث کریمہ صحیحہ احناف کے موقف پر موجود ہیں۔

امام بخاری کے استاد ابو بکر بن ابوشیبہ اپنی مصنف میں ثقہ راویوں سے یہ روایت بیان کرتے ہیں:

''حدثنا مالك بن إسماعيل، عن حسن بن صالح، عن أبي الزبير، عن جابر، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: كل من كان له إمام فقراءته له قراءة''

حدیث بیان کی ہم سے مالک بن اسماعیل نے وہ حسن بن صالح سے وہ ابوزبیر سے وہ حضرت جابر سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کا امام ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔

[مصنف لابن ابی شیبہ، ۱/۳۳۱]

اس روایت میں تمام راوی ثقہ ہیں۔ موطا امام محمد میں ہے:

قال محمد اخبرنی ابوحنیفة قال حدثنا ابوالحسن موسی بن ابی عائشه عن عبدالله بن شداد بن الهاد بن جابر بن عبدالله عن النبی صلی الله علیه وسلم انه قال من صلی خلف الامام فان قراءة الامام له قراءة''

کہا امام محمد نے مجھے امام ابوحنیفہ نے خبر دی انہوں نے کہا کہ ہم سے ابوالحسن موسی بن ابوعائشہ نے حدیث بیان کی وہ عبداللہ بن شداد سے وہ جابر بن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص امام کے پیچھے نماز ادا کرے تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔[موطا امام محمد ۲۵]

اس میں تمام راوی ثقہ ہیں۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے:

''حدثنا أسود بن عامر، أخبرنا حسن بن صالح، عن أبي الزبير، عن جابر، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من كان له إمام، فقراءته له قراءة''

ہم سے اسود بن عامر نے روایت کیا انہیں خبر دی حسن بن صالح نے وہ ابوزبیر سے وہ حضرت جابر سے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی کہ جس کا امام ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔[جز ۲۳ ص ۱۲]

اس حدیث کی سند میں بھی تمام راوی ثقہ ہیں۔ اور اس کی سند صحیح متصل ہے تفصیل کے لئے، امام شمس الدین ابوالفرج مقدسی کی ''الشرح الکبیر للمقنع'' ملاحظہ کریں۔

جواب الجواب (۲)

غیر مقلد صاحب کا یہ کہنا کہ حدیث میں لہ کی ضمیر امام کی طرف لوٹ رہی ہے بالکل غلط اور علم نحو سے عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ نحوی قاعدہ کے مطابق اس حدیث میں من مبتدا ہے اور فقراءۃ الامام لہ قراءۃ اس کی خبر ہے۔ اگر لہ کی ضمیر امام کی طرف راجع مانی جائے گی تو پھر من مبتدا کی طرف کون سی ضمیر راجع ہوگی۔ حالانکہ خبر جب جملہ ہو تو اس میں مبتدا کی طرف راجع ہونے والی ضمیر یا مظہر ضروری ہے جو مبتدا کی طرف راجع ہو تاکہ خبر کا مبتدا سے ربط ہو سکے۔

اگر من مبتدا کے لئے ضمیر پوشیدہ مانی جائے تو کیوں؟ اور کس قاعدہ سے؟

جو تاویل غیر مقلد صاحب نے گھڑی ہے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ خلاف واقع ہے۔ عربی زبان میں اکثر غیر مقلد صاحب کے قیاس کے برخلاف ہی واقع ہوا ہے۔ جس کی ہزاروں مثالیں ہیں۔ ہم قرآن وحدیث سے دو چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَنْ يَتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا [سورہ طلاق آیت نمبر ۲]

''مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ''

[سورہ شوری آیت ۲۰]

''من بنى لله مسجدا صغيرا كان أو كبيرا بنى الله له بيتا في الجنة''

جس نے اللہ کے لیے مسجد بنائی چھوٹی ہو یا بڑی اللہ پاک اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا۔

[سنن ترمذی، باب ما جاء في فضل بنيان المسجد]

کیا اس حدیث میں لہ کی ضمیر اسم جلالت اللہ کی طرف راجع ہو گی ہر گز نہیں بلکہ من کی طرف راجع ہے۔ اگر من کی طرف راجع نہ مانی جائے تو یقینا ترجمہ و مفہوم غلط ہو جائے گا۔

''من فرج عن مسلم كربة من كرب الدنيا فرج الله عنه كربة من كرب الآخرة''

جس نے کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیف دور کی اللہ پاک اس کی اخروی تکلیف دور فرمائے گا۔

[سنن الكبرى للبيهقي، ۴۶۲/۶]

کیا یہاں عنہ کی ضمیر من کے علاوہ اسم جلالت کی طرف راجع مانی جائے گی؟ بڑا حرج واقع ہو گا۔ بلاشبہ یہاں عنہ کی ضمیر من ہی کی طرف راجع ہے۔ آیت کریمہ اور احادیث کریمہ سے ہمارا مدعا صاف ہو گیا الحمد للہ۔

لہٰذا غیر مقلد صاحب کا یہ قیاس باطل ٹھہرا۔

جواب الجواب (۳)

غیر مقلد صاحب نے اپنے تیسرے جواب میں عجیب طرز استدلال اختیار کیا ہے۔ لکھا ہے

"بقول تمہارے اگر لہ کی ضمیر مقتدیوں کی طرف لوٹ رہی ہے تو اسے سورہ فاتحہ کو چھوڑ کر دیگر قرآن پر محمول کیا جائے گا۔ بعض حضرات قرآن کا معنی فاتحہ لیتے ہیں۔ جو ایک نری جہالت ہے"

اس سے غیر مقلد صاحب کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں اگر وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس حدیث میں قراءت سے مراد سوائے فاتحہ کے قرآن مراد ہے۔ تو اس کے لئے کون سی دلیل ہے جناب کے پاس؟ جس سے انہوں نے یہ حکم اخذ کیا ہے۔ اگر وہ اپنی مستدل یہ حدیث ''لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب''

پیش کریں گے۔ تو ہم اس کے بہت سے جوابات پیچھے بیان کر آئے ہیں۔ علاوہ ازیں اس سے بھی ان کا مدعا ثابت نہیں ہو گا کیوں کہ سنن ابو داؤد میں یہ حدیث اولا تو منفرد کے لئے ہے۔ اگر غیر مقلدین کی مانیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس میں سورہ فاتحہ کے علاوہ قرآن بھی شامل ہے۔ کیوں کہ پوری حدیث اس طرح ہے

عن عبادة بن الصامت، يبلغ به النبي صلى الله عليه وسلم لا صلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب فصاعدا، قال سفيان: لمن يصلي وحده

یعنی حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تبلیغ فرماتے تھے کہ جو شخص

سورہ فاتحہ یااس سے زائد کچھ نہیں پڑے گا اس کی نماز مکمل نہیں ہے حضرت سفیان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو شخص اکیلے نماز پڑھ رہاہو۔(یعنی یہ حکم اکیلے نماز پڑھنے والے کے لئے ہے)

[سنن ابوداؤد، باب من ترک القراءۃ فی صلاتہ بفاتحۃ الکتاب، جلد ۱ ص ۲۱۷]

اس میں فصاعدا سے مراد سورہ فاتحہ کے علاوہ قرآن سے کچھ اور ملاناہے۔خواہ وہ کوئی بھی سورت یا آیت ہو۔حالانکہ یہ خود غیر مقلد صاحب کے مسلک کے خلاف ہے۔اوراس طرح غیر مقلد صاحب کا یہ جواب خود انہیں بھاری پڑے گا۔

الحاصل: غیر مقلد صاحب نے بڑی محنت سے احناف کے خلاف دلائل پیش کرنے کی کوشش کی تھی مگر الحمدللہ ان کے دلائل تار عنکبوت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔

خلاصہ بحث:۔ غیر مقلدین صاحب نے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے سلسلے میں چاراحادیث بیان کی تھیں جن پر ہم کلام کرچکے ہیں یہاں ہم ان احادیث کا نچوڑ پیش کردیتے ہیں:

پہلی حدیث: لا صلاۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب

اس حدیث سے کسی طرح امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا ثابت نہیں ہوتا ہے۔کسی عربی داں سے ترجمہ کراکے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔بلکہ سنن ابوداؤد شریف میں اس روایت میں ''فصاعدا''کا اضافہ اور حضرت سفیان کا فرمان'' لمن یصلی وحدہ'' ہمارے موقف کے عین مطابق ہے۔نہ کہ غیر مقلد صاحب کے مسلک کے مطابق۔

دوسری حدیث:۔من صلی صلاۃ لم یقرأ فیها بأم القرآن فهی خداج ثلاثا غیر تمام. فقیل لأبی هریرۃ: إنا نکون وراء الإمام، فقال: اقرأ بها فی نفسك۔

اس حدیث سے بھی امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کا جواز ثابت نہیں ہوتا ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان عالیشان سے بس اتنا ثابت ہے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز ادھوری ہے۔اور یہ تو ہم بھی مانتے ہیں ہمارا مسلک یہ ہے کہ منفرد سورہ فاتحہ کے بغیر نماز ادا کرے گا تو ترک واجب کے سبب نماز نامکمل ہوگی۔اور اگر امام کے ساتھ ہوگا تو امام کی قراءت ہی مقتدی کی قراءت مانی جائے گی تو امام کا پڑھنا واجب ہوگا بغیر اس کے نماز نامکمل ہوگی۔امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے۔اس پر چند احادیث ہم گزشتہ اوراق میں بیان کرآئے ہیں یہاں چند احادیث وآثار مزید نقل کردیتے ہیں۔

حضرت جابر سے مروی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''من صلی خلف إمام، فإن قراءۃ الإمام له قراءۃ''

جو امام کے پیچھے نماز ادا کرے تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔[المعجم الاوسط، ۸/۴۳]

حضرت عمر فرماتے ہیں:

''لیت فی فم الذی یقرأ خلف الإمام حجرا''

کاش کہ اس آدمی کے منہ میں پتھر ہو جو امام کے پیچھے قراءت کرتا ہے۔[مؤطا لامام المالک، ۱/۶۳]

حضرت مولی علی فرماتے ہیں:

''من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرۃ''

یعنی جس نے امام کے پیچھے قراءت کی اس نے فطرت کے خلاف کیا۔[مصنف ابن ابی شیبہ، جلد ۱/۴۱۲]

اس مفہوم کی روایتیں حضرت عمر، حضرت مولی علی، عبد اللہ ابن عمر، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبد اللہ ابن عباس حضرت انس حضرت عبد اللہ ابن مسعود وغیر ھم بہت سے صحابہ کرام سے مروی ہیں۔علامہ عینی کے مطابق امام کے پیچھے قراءت کرنے سے اسی جلیل القدر صحابہ نے منع فرمایاہے،ملاحظہ کریں علامہ عینی کی شرح بخاری۔

اور حدیث میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کی جو بات ہے وہ ابوہریرہ کی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں ہے۔اس پر تفصیلی کلام کیا جاسکتاہے۔مگر انصاف پسندوں کے لیے اتناہی بہت ہے۔

تیسری حدیث:

''صلی رسول الله صلی الله علیه وسلم الصبح، فثقلت علیه القراءة، فلما انصرف قال:إنی أراکم تقرءون وراء إمامکم، قال:قلنا:یا رسول الله، إی والله، قال:لا تفعلوا إلا بأم القرآن، فإنه لا صلاة لمن لم یقرأ بها۔

یہ روایت بھی بالکل مفید نہیں ہے کیوں کہ بخاری شریف جو غیر مقلدین کے نزدیک بھی سب سے زیادہ معتبر کتاب ہے اور وہ بات بات پر بس بخاری کے ہی حوالے مانگتے ہیں اس میں عبادہ بن صامت سے ہی یہ حدیث پاک بس اتنے الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

''لا صلاة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب''[بخاری،باب وجوب القراءة]

اس میں نہ جماعت کا ذکر ہے اور نہ امام کے پیچھے پڑھنے نہ پڑھنے کا اس سے بس وہی ثابت ہے جس سے ہمیں بھی اتفاق ہے۔کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز صحیح نہیں۔لیکن کیاامام کے پیچھے بھی سورہ فاتحہ کا یہی حکم ہے تواس سلسلے میں امام بخاری ہی کی کتاب القراءۃ سے ایک حدیث ملاحظہ کرلیں۔جس سے ہمارے مسلک کی مکمل تائید ہورہی ہے۔حضرت جابر سے مروی:

''من صلی رکعة لم یقرأ فیها بأم القرآن فلم یصل إلا وراء الإمام''

یعنی جس نے ایک رکعت نماز ادا کی اور اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز ادا نہیں کی مگر امام کے پیچھے۔

[القراءۃ خلف الامام للبخاری، ۱/۶۳]

اس پر کافی کچھ کلام ہم پیچھے کر آئے ہیں۔

حدیث نمبر ۴:قال رسول الله صلی الله علیه وسلم تقرؤون خلفی، قالوا: نعم إنا لنهذ هذا قال: فلا تفعلوا إلا بأم القرآن۔

حدیث نمبر ۵:عن محمد بن أبی عائشة، عن رجل، من أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم قال:قال رسول الله صلی الله علیه وسلم:لعلکم تقرؤون والإمام یقرأ،قالوا:إنا لنفعل قال:لا إلا أن یقرأ أحدکم بفاتحة الکتاب۔

اولا یہ دونوں حدیثیں منسوخ کے درجہ میں ہیں اس کی ناسخ حدیث منازعت ہے۔ملاحظہ کریں۔

''أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال:"هل قرأ أحد منکم آنفا فی الصلاة، قالوا: نعم یا رسول الله،"قال:"أما إنی أقول: مالی أنازع القرآن، فانتهی الناس عن القراءة حین قال ذلك'

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ کیاتم میں سے کسی نے ابھی نماز میں قراءت کی؟ صحابہ نے کہاہاں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: تبھی تومیں کہوں کہ میرے ساتھ قرآن کریم کی قراءت میں منازعت کیوں ہورہی ہے۔تولوگ قراءت سے بازآگئے جب آپ نے کہا۔'[کنزالعمال،۲۹۲/۸] یہ حدیث صحیح ہے۔

اس صحیح حدیث میں فرمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام کا امام کے پیچھے قراءت سے رک جاناصراحتاً ثابت ہورہاہے۔ثانیاً غیر مقلد صاحب کی بیان کردہ حدیث، ضعیف ہے۔جیساکہ ہم سابقہ اوراق میں بیان کرچکے ہیں۔

ثالثاً:ان روایتوں میں جو استثناہے ''ام القرآن ام الکتاب بفاتحۃ الکتاب وغیرھا'' یہ معتبر ومحفوظ نہیں ہے۔

حضوراعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''اولاًیہ حدیث ضعیف ہے اُن صحیح حدیثوں کی جو ہم نے مسلم اور ترمذی ونسائی وموطائے امام مالک وموطائے امام محمد وغیرہا صحاح ومعتبرات سے نقل کیں کب مقاومت کرسکتی ہے،امام احمد بن حنبل وغیرہ حفّاظ نے اس کی تضعیف کی،یحیی بن معین جیسے ناقدین جس کی نسبت امام مدوح نے فرمایا جس حدیث کویحیٰی نہ پہچانے حدیث ہی نہیں۔فرماتے ہیں استثنائے فاتحہ غیر محفوظ ہے۔''

لب لباب: نماز میں سورہ فاتحہ پڑھناواجب ہے۔مگر منفرد اورامام کے لئے۔لیکن مقتدی کے لیے امام کی اقتدامیں قرآن وغیرہ پڑھنے کی ہرگزاجازت نہیں ہے۔بلکہ امام کاپڑھنامقتدی ہی کاپڑھناہے۔احادیث نبویہ صیحہ وآثار صحابہ ومعمولات علما سے یہی ثابت ہے۔عالم اسلام خاص کرہندوستان کے علماومشائخ کی اکثریت اور عوام اہل سنت کایہی معمول رہاہے اورآج بھی یہی معمول ہے۔

ھٰذاماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ

تصدیقات

مفتیان کرام جامعہ نعیمیہ مرادآباد
مفتیان کرام مدرسہ بدرالعلوم جس پور

فتوی ۲۵ — مسجد میں نماز عید ہو جانے کے بعد دوبارہ نماز ادا کرنے کا حکم

مسئولہ: محمد منور القادری محلہ علی خاں کاشی پور۔ ۱۱/ ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں
مسجد کے امام صاحب نے نماز عید پڑھائی، چھت پر جو نمازی تھے ان تک مکبر کی آواز نہیں پہنچی اوراس طرح ان کی نماز چھوٹ گئی۔ توکیااس کے بعد دوسری جماعت اسی مسجد میں کسی اور کو امام بنا کر ادا کی جاسکتی ہے یا نہیں؟
کچھ مفتیان کرام نے کہادوسری نماز ادا کی جائے اور کچھ نے منع کیا۔ اور کہا کہ عید گاہ میں یا کہیں اوراگر نماز مل سکتی ہے تو وہاں ادا کریں ورنہ دوسری جماعت نہ کریں۔ شریعت کی روشنی میں جو حکم ہو بیان فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

ایسی صورت میں کہ امام معین نے نماز پڑھادی ہو، اورآواز نہ پہنچنے کے سبب اوپر والوں کی نماز چھوٹ گئی توانہیں دوسری جماعت اسی مسجد میں کرنے کا حکم نہیں تھا۔ ان نمازیوں کو چاہئے تھا کہ جب عید گاہ اور دوسری مساجد میں ابھی نماز کا وقت تھا تو وہیں چلے جاتے۔ جن مفتی حضرات نے دوبارہ جماعت کرنے سے منع کیااور دوسری مسجد یا عید گاہ میں جانے کو کہا، انہوں نے درست کہا۔ فقہاء وعلماء کرام کا بھی یہی حکم ہے۔ کہ نماز عید اگر کسی سبب سے مسجد میں مقررہ امام کے ساتھ نہ ادا کر سکیں تو دوسری مسجد میں چلے جائیں ۔ دوسری جماعت اسی مسجد میں کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اوراس کی علت یہ ہے کہ عید اور جمعہ کی امامت کے لئے سلطان اسلام، یاماذون یاعوام الناس کا منتخب کردہ امام شرط ہے۔ ان کے سوا کسی اور کو پڑھانے کی اجازت نہیں ہے۔ خواہ امام حافظ قاری ہی ہو۔ امام معین کے نماز عید پڑھالینے کے بعد وقتی طور پر دس بیس سو پچاس لوگوں کے کہنے سے کسی کو عید اور جمعہ کا امام نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ اس مسئلہ میں درج ذیل باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں ۔ جن پر آگے تفصیلی بحث کی جائے گی۔

(۱) عید کی نماز اگر امام معین نے پڑھادی ہے اور کچھ لوگ تاخیر کے سبب رہ گئے یا وہ نماز میں تھے مگر ان کی نماز کسی سبب فاسد ہو گئی تو وہ کیا کریں؟

(۲) وقت باقی ہے تو کیا باقی ماندہ حضرات امام معین کے نماز پڑھانے کے بعد اسی مسجد میں دوسری جماعت کر سکتے ہیں؟

(۳) نماز پنجگانہ کی طرح کیا عید کی بھی جماعت ثانیہ کی اجازت ہے۔

(۴) اگر دوسری جماعت کی جائے تو امام کسے بنایا جائے۔

(۵) اگر اپنی مرضی سے کسی کو امام بنا کر کے نماز ادا کریں تو کیا شرعاً ایسا کرنے کی اجازت ہے؟

مذکورہ بالا مسائل کی بالترتیب تفصیل ملاحظ کریں۔

پہلی صورت میں حکم شرع یہ ہے کہ اگر مقررہ امام نے ازروئے شرع نماز درست پڑھادی ہو اور ایک شخص یا کچھ لوگ نماز سے رہ گئے ہوں تو وہ عید گاہ وغیرہ دوسری جگہ نماز ادا کرنے کی کوشش کریں ۔ اگر وہاں بھی نماز نہ پڑھ پائیں خواہ کسی

سبب سے ہو تو پھر انہیں نماز عید پڑھنے کا حکم نہیں ہے بلکہ فقہائے کرام نے انہیں چاشت کی چار رکعت نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ تبیین الحقائق میں ہے:

''أن الإمام لو صلاها مع جماعة وفاتت بعض الناس لا يقضيها من فاتته إذا خرج الوقت، وكذلك في الوقت''

امام نے نماز پڑھادی جماعت کے ساتھ اور کچھ لوگوں کی نماز چھوٹ گئی تو وہ وقت میں یا اس کے بعد اس کی قضا نہیں کریں گے۔''[تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق، ۲۲۶/۱، باب صلاة العيد]

درر الحکام شرح غرر الاحکام میں ہے:

''أن الإمام صلاها مع جماعة وفاتت عض الناس لا يقضيها في الوقت وبعده''

امام نے نماز پڑھادی جماعت کے ساتھ اور کچھ لوگوں کی نماز چھوٹ گئی تو وہ وقت میں یا اس کے بعد اس کی قضا نہیں کریں گے۔''[درر الحكام شرح غرر الاحكام، ۱۴۴/۱]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''لو صلاها مع الجماعة وفاتت بعض الناس لا يقضيها من فاتته خرج الوقت أو لم يخرج''

اگر امام نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھادی اور بعض لوگوں کی نماز چھوٹ گئی تو جن کی نماز چھوٹی ہے وہ قضا نہیں کریں گے وقت نکل گیا ہو یا نہ نکلا ہو۔''

[فتاوی عالمگیری، ۱۵۳/۱، ۱۵۲، باب صلاة العيدين]

تبیین الحقائق شرح کنز الد قائق، درر الحکام شرح غرر الاحکام اور فتاوی عالمگیری کی عبارت سے صراحۃً یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص یا ایک سے زیادہ لوگوں کی نماز عید کی جماعت چھوٹ گئی ہو تو وقت باقی ہو یا نہ ہو وہ اب قضا نہیں کریں گے۔ لیکن فقہ کی دوسری کتابوں میں دوسرے مقام پر امام مقرر و معین کے پیچھے اگر نماز مل سکتی ہو تو وہاں ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بصورت دیگر نماز چاشت ادا کرنے کا۔ ملاحظہ کریں: بحر الرائق میں ہے:

''(قوله: ولم تقض إن فاتت مع الإمام) فمراده نفي صلاتها وحده وإلا فإذا فاتت مع إمام وأمكنه أن يذهب إلى إمام آخر فإنه يذهب إليه؛ لأنه يجوز تعدادها في مصر واحد في موضعين وأكثر اتفاقا إنما الخلاف في الجمعة وأطلقه فشمل ما إذا كان في الوقت أو خرج الوقت، وما إذا لم يدخل مع الإمام أصلا أو دخل معه وأفسدها فلا قضاء عليه أصلا۔

ان کا قول کہ قضا نہیں کرے گا اگر امام کے ساتھ فوت ہو گئی۔ تو اس سے مراد تنہا اس کی نماز کا چھوٹ جانا ہے۔ اگر امام کے ساتھ چھوٹ گئی (مطلب نماز ادا کر چکا ہے اس نے نہیں ادا کی) اور اگر دوسرے امام کی طرف جانا ممکن ہو تو وہاں جائے کیوں کہ نماز عید کا ایک ہی شہر میں دو اور اس سے زیادہ مقامات پر ہونا جائز ہے بالاتفاق۔ البتہ جمعہ میں اختلاف ہے۔ اور ان کا اسے مطلق رکھنا اس لئے کہ وہ اس حکم کو شامل ہے کہ کام وقت میں ہو یا وقت نکل گیا ہو۔ اور جب امام کے ساتھ بالکل شامل نہیں ہوا یا شامل ہوا ہو لیکن نماز فاسد کر دی ہو تو اس پر بالکل قضا نہیں ہے۔''

[بحر الرائق شرح كنز الدقائق، ۲۸۴/۲، ۲۸۳ صلاة العيدين]

مراقی الفلاح میں ہے: ''فإن شاء انصرف وإن شاء صلی نفلا والأفضل أربع فیکون له صلاۃ الضحی''
تو اگر چاہے (دوسری جگہ) پڑھ لے اور اگر چاہے تو نفل نماز ادا کرلے اور افضل یہ ہے کہ چار رکعت نماز پڑھ لے تاکہ نماز چاشت ہو جائے''[مراقی الفلاح شرح نورالایضاح، باب صلاۃ العیدین، ۱/۲۰۳]

حاشیہ طحطاوی میں ہے:

ولو قدر بعد الفوات مع الإمام علی إدراکها مع غیرہ فعل للاتفاق علی جواز تعددها''

اگر ایک امام کے ساتھ فوت ہونے کے بعد دوسرے امام کے ساتھ نماز ادا کر سکتا ہو تو نمازی وہاں چلا جائے کیوں کہ متعدد مقامات پر عید کے جواز پر اتفاق ہے''[حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، ص ۵۳۵]

در مختار میں ہے:

'لو امکنه الذهاب الی امام آخر فعل لانها تؤدی بمصر واحد بمواضع کثیرۃ''

اگر دوسرے امام کی طرف جانا ممکن ہو تو جائے کیوں کہ ایک شہر میں کئی جگہ نماز عید ادا کی جاسکتی ہے۔''

[الدرالمختار، ۳/۵۹، باب العیدین]

شدید بارش کے سبب بعض اہل شہر کی نماز عید چھوٹ جانے پر جماعت ثانیہ سے متعلق ایک سوال کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''اگر مقرر کردہ امام سب پڑھ چکے اور بعض لوگ رہ گئے تو یہ بیشک نہیں پڑھ سکتے نہ آج نہ کل''

[فتاوی رضویہ قدیم، ۳/۸۰۵]

حضور اعلیٰ حضرت کی اس عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے مفتی عبدالحق صاحب رضوی مفتی اشرفیہ مبارکپور، لکھتے ہیں:

''اللہ عزوجل سیدی اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کو اسلام اور مسلمین کی طرف سے بہترین جزا عطا فرمائے کہ میں اپنی اس تحریر میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا، آقائے نعمت سیدی اعلیٰ حضرت نے اپنے فتوی مبارکہ کے اخیر کی چند سطروں میں وہ سب کچھ کہہ دیا یعنی وہ مسلمان جو جمعہ وعیدین کی پہلی جماعت میں شریک نہیں ہو سکے ہیں اور ان باقی ماندہ لوگوں میں کوئی مقرر کردہ امام جمعہ وعیدین بھی ہے تو دوسری جماعت کی امامت وہی مقرر کردہ امام جمعہ وعیدین کرے گا اور اگر مقرر کردہ سارے امام پڑھ چکے ہیں تو ایسی صورت میں باقی ماندہ لوگ اگر جمعہ ہے تو تنہا تنہا اپنی ظہر پڑھیں گے۔ اور اگر عیدین ہے اس کی قضا نہیں۔ لہٰذا ترک واجب کی وجہ سے بارگاہ الٰہی میں توبہ واستغفار کریں گے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ لوگ چار رکعت چاشت کی نماز پڑھیں''

[ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور، اکتوبر ۲۰۱۲ء ص ۱۱]

صدرالشریعہ فرماتے ہیں۔

''امام نے نماز پڑھ لی اور کوئی شخص باقی رہ گیا خواہ وہ شامل ہی نہ ہوا تھا یا شامل تو ہوا مگر اس کی نماز فاسد ہو گئی تو اگر دوسری جگہ مل جائے پڑھ لے ورنہ نہیں پڑھ سکتا، ہاں بہتر یہ ہے کہ یہ شخص چار رکعت چاشت کی نماز پڑھے''

[بہارشریعت، حصہ چہارم، ص ۷۸۳]

بحر الرائق ،مراقی الفلاح،حاشیہ طحطاوی، اور بہار شریعت کی مندرجہ بالاعبارات سے ثابت ہوا کہ اگر امام معین کے ساتھ نماز عید نہ ادا کر سکا تو دوسرے کسی امام کے پیچھے نمازادا کرے۔ نیز بحر الرائق اور در مختار سے یہ بھی پتہ چلا کہ نماز عید شہر میں کئی مقامات پر ہو سکتی ہے ۔اور فتاوی رضویہ سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ اگر شہر کے سبھی مقرر کردہ امام نماز سے فارغ ہو گئے ہوں تو پھر نماز عید ادا کرنے کا حکم نہیں ہے۔البتہ ایک ہی مقام پر نماز عید کی امام معین اور امام غیر معین کے ساتھ دو جماعتوں کی اجازت کتب فقہ میں صراحۃً کہیں نظر سے نہیں گزری۔ بعض کتب میں اجمالی طور پر دو جماعت کا ذکر ہے مگر مشروط ہے۔ جس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آپ ملاحظہ کریں گے۔

یہاں تک یہ ثابت ہوا کہ اگر ایک یا ایک سے زیادہ لوگوں کی نماز عید چھوٹ جائے تو وہ کوشش کریں کہ کسی اور مسجد میں امام معین کے پیچھے ادا کرلیں ۔ورنہ نماز نفل چار رکعت بشکل چاشت ادا کرلیں ۔اب رہا معاملہ یہ کہ جس طرح نماز پنجگانہ میں جماعت کے بعد دوسری جماعت کی اجازت ہے تو کیا وہ اجازت نماز عید کے لئے بھی ہو گی۔اور جس طرح کسی بھی نیک لائق امامت شخص کو نماز پنجگانہ میں نماز کے لئے کھڑا کر دیتے ہیں کیا نماز عید میں بھی کر سکتے ہیں ؟تو اس کا جواب یہ ہے، کہ امام معین کے نماز عید پڑھالینے کے بعد جماعت ثانیہ اسی مسجد میں جائز نہیں ہے۔البتہ امام معین کے نماز پڑھالینے کے بعد نماز پنجگانہ کی جماعت ثانیہ چند قیود کے ساتھ بلا کراہت جائز ہے۔اور کم پڑھے لکھے لوگوں کو یہیں مغالطہ ہوتا ہے۔وہ نماز پنجگانہ کے حکم کو نماز عید وجمعہ پر بھی منطبق کر دیتے ہیں ۔حالانکہ نماز عید اور نماز جمعہ کا حکم نماز پنجگانہ سے بہت جداگانہ ہے۔ نماز پنجگانہ میں کسی بھی شخص کو امام بنا کر جماعت ادا کر سکتے ہیں۔ مگر عید اور جمعہ کی نماز میں ایسا نہیں ہے۔وہاں تو جماعت کے لئے امام، بادشاہ اسلام ہو، یا اس کا نائب وماذون ہو یا یا قاضی شرع ہو جسے علماء نے قاضی مانا ہو یہاں قاضی سے عوام کا منتخب قاضی مراد نہیں ہے ۔یا اعلم علمائے بلد یعنی شہر کے سبھی عالموں میں سب سے زیادہ علم والا عالم ہو، اگر یہ سب نہ ہو تو وہ بمجبوری عامہ مسلمین نے جسے متفقہ امام مقرر کیا ہو، بس اسی کو عید اور جمعہ پڑھانے کی اجازت ہے۔اس کے ہوتے ہوئے یا اس کے نماز پڑھالینے کے بعد وقتی طور پر کسی کو امام منتخب کر لینا اور اس کے پیچھے نماز عید وجمعہ ادا کرنا ہر گز ہر گز جائز نہیں ہے۔یہ سب بخوبی جانتے ہیں کہ ایک عید گاہ میں یا ایک مسجد میں بس ایک ہی امام معین و مقرر کیا جاتا ہے جسے سب جانتے ہیں کہ اس مسجد کا امام فلاں شخص ہے۔کیوں کہ اس کا تقرر ہو چکا ہوتا ہے۔ تو شرعی ضابطہ یہی ہے کہ بس نماز عید وجمعہ پڑھانے کا حق اسی کو حاصل ہے۔ اگر وہ پڑھادے تو پھر کسی کو اجازت نہیں ہے۔ہاں البتہ سلطان اسلام وغیرہ جن کا ذکر اوپر ہوا وہ اس وقت کسی کو امام مقرر کریں تو اجازت ہو گی۔ لیکن سو پچاس لوگ وقتی طور پر یوں ہی کسی کو جماعت ثانیہ کے لئے کھڑا کر دیں اور اسے امام بنالیں شرعاً اس کی اجازت نہیں ہو گی۔

یہاں یہ بھی باور کرادیں کہ نماز عید وجمعہ دونوں کا حکم ایک ہے۔ نماز عید کی سوائے خطبہ کے وہی شرائط ہیں جو نماز جمعہ کی ہیں جیسا کہ فتاوی عالمگیری میں ہے:"**ویشترط للعیدما یشترط للجمعة إلا الخطبة**"

نماز عید کے لئے وہی شرائط ہیں جو نماز جمعہ کے لئے ہیں سوائے خطبہ کے۔"

[فتاوی عالمگیری، ۱/۱۵۰، باب صلاۃ العیدین]

لہٰذا نماز عید اور جمعہ کی پہلی جماعت ہو یا دوسری جماعت، اس کے لئے مشروط امام ہی ضروری ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو نہ پہلی جماعت ہوگی اور نہ دوسری۔ علاوہ ازیں ایک جماعت امام معین پڑھالے تو دوسرا امام عموماً مساجد میں معین نہیں ہوتا تو اس کو نماز عید و جمعہ کا حق امامت حاصل نہیں ہوگا۔ اور جب حق حاصل نہیں ہوگا تو وہ پڑھا نہیں سکتا اور جب وہ پڑھانے کا اہل ہی نہیں تو اس کے پیچھے نماز کیوں کر ہو سکتی ہے اور جب نماز نہیں ہو سکتی تو جماعت کی اجازت کیسے مل جائے گی۔ نماز عید اور جمعہ کے لئے امام کی کیا شرائط ہیں اور امام معین کے نماز پڑھانے کے بعد نماز عید کی جماعت کے لئے کون سا امام نماز پڑھا سکتا ہے اور کب نماز ثانی پڑھی جا سکتی ہے اور کب نہیں۔ کتب فقہ کی درج ذیل عبارات میں تفصیل ملاحظہ کریں:

حاشیہ طحطاوی میں ہے:

قوله: "لا تتم بدون الإمام أي السلطان أو مأموره" أي وقد صلاها الإمام أو مأموره فإن كان مأمورا بإقامتها له أن يقيمها''

اوران کا قول کہ امام یعنی سلطان اسلام یا اس کے مامور کے بغیر نماز پوری نہیں ہو سکتی۔ یعنی امام یا اس کے نائب نے نماز پڑھادی پس اگر وہ امامتِ عید کے لئے مامور تھا تو وہ اسے پڑھا سکتا ہے۔" [حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، ص ۵۳۵]

بدائع الصنائع میں ہے:

''فلا يجوز أداؤها إلا بتلك الصفة؛ ولأنها مختصة بشرائط يتعذر تحصيلها في القضاء، فلا تقضى كالجمعة ولكنه يصلي أربعا مثل صلاة الضحى إن شاء؛ لأنها إذا فاتت لا يمكن تداركها بالقضاء لفقد الشرائط''

نماز عید کا ادا کرنا جائز نہیں ہے مگر اسی طرح سے (جس طرح مشروع ہے، کہ جماعت ہو، سلطان اسلام، ماذون یا امام معین ہو) کیوں کہ نماز عید چند شرائط کے ساتھ مختص ہے جن کا حصول قضا میں دشوار ہے۔"

[بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ۱/۲۲۴، باب صلاۃ العیدین]

محیط برہانی میں ہے:

''علماؤنا رحمهم الله قالوا: لا يجوز إقامتها إلا بشرائط مخصوصة منها الإمام، فإذا فاتت مع الإمام فقد عجز عن قضائها، فلا يلزمه القضاء''

ہمارے علماء نے، اللہ ان پر رحمت نازل فرمائے، فرمایا نماز عید کا قائم کرنا جائز نہیں ہے مگر مخصوص شرائط کے ساتھ ان میں سے ایک امام کا ہونا بھی ہے۔ تو جب امام کی نماز کے ساتھ اس کی نماز چھوٹ گئی تو وہ قضا سے عاجز ہو گیا تو اس پر قضا لازم نہیں ہے۔" [محیط برہانی، ۲/۱۱۲]

مراقی الفلاح میں ہے:

''ومن فاتته الصلاة" فلم يدركها سُوَرَةُ مع الإمام لا يقضيها" لأنها لم تعرف قربة إلا بشرائط لا تتم بدون الإمام أي السلطان أو مأموره''

جس نے یہ نماز امام کے ساتھ نہیں پائی تو وہ قضا نہیں کرے گا کیوں کہ وہ مشروع نہیں ہے مگر شرائط کے ساتھ جو نہیں پوری

ہوں گی بغیر امام کے یعنی سلطان یا اس کے مامور کے بغیر" [مراقی الفلاح شرح نورالایضاح، باب صلاۃ العیدین، ۲۰۳/۱]

حضور اعلیٰ حضرت نماز عید وجمعہ میں امام سے متعلق شرائط بیان کرتے رقم طراز ہیں:

"جمعہ وعیدین کی امامت مثل نماز پنجگانہ نہیں کہ جسے چاہے امام کر دیجئے بلکہ اُس کے لئے شرط لازم ہے کہ امام ماذون من جہتہ سلطان الاسلام ہو بلاواسطہ یا بالواسطہ کہ ماذون کا ماذون ہو یا ماذون الماذون کا ماذون ہو۔" [فتاوی رضویہ قدیم، ۷۰۸/۳]

مزید فرماتے ہیں:

"نمازِ عید مثل نماز جمعہ ہے نمازِ پنجگانہ کی طرح نہیں جن میں ہر شخص صالح امامت کر سکتا ہے، عیدین اور جمعہ کے لئے شرط ہے کہ امام خود سلطانِ اسلام ہو یا اُس کا نائب یا اس کا ماذون، اور نہ ہو تو بضرورت جسے عام مسلم انوں نے امامتِ جمعہ وعیدین کے لئے مقرر کیا ہو" [فتاوی رضویہ قدیم، ۸۰۶/۳] اور لکھتے ہیں:

"جمعہ وعیدین کی امامت پنجگانہ کی امامت سے بہت خاص ہے، امامت پنجگانہ میں صرف اتنا ضرور ہے کہ امام کی طہارت ونماز صحیح ہو، قرآن عظیم صحیح پڑھتا ہو، بدمذہب نہ ہو، فاسق معلن نہ ہو، پھر جو کوئی پڑھائے گا نماز بلا خلل ہو جائے گی بخلاف نماز جمعہ وعیدین کہ ان کے لئے شرط ہے کہ امام خود سلطان اسلام ہو یا اس کا ماذون، اور جہاں یہ نہ ہوں تو بضرورت جسے عام مسلم انوں نے جمعہ وعیدین کا امام مقرر کیا ہو کما فی الدر المختار وغیرہ، دوسرا شخص اگر ایسا ہی عالم وصالح ہو ان نمازوں کی امامت نہیں کر سکتا اگر کرے گا نماز نہ ہوگی" [فتاوی رضویہ قدیم، ۸۰۱/۳]

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"نماز جمعہ وعیدین مثل عام نمازوں کے نہیں کہ جسے امام کر دیا نماز ہو گئی۔ ان کے لئے ضرور ہے کہ امام خود سلطان اسلام ہو یا اس کا مقرر کردہ، اور یہ نہ ہوں تو بضرورت وہاں کے عام مسلمانوں نے جسے امامت جمعہ کے لئے معین ومقرر کیا ہو، توان تینوں جماعتوں میں جس کا امام امامِ معین ومقرر کردہ جمعہ تھا اس کی اور اس کے مقتدیوں کی نماز ہو گئی باقیوں کی نہیں، اور اگر کسی کا امام ایسا نہ تھا تو کسی کی نہ ہوئی" [فتاوی رضویہ قدیم، ۷۲۳/۳] اور لکھتے ہیں:

"جمعہ وعیدین وکسوف میں ہر شخص امامت نہیں کر سکتا بلکہ لازم ہے کہ سلطانِ اسلام کا مقرر کردہ یا اُس کا ماذون ہو، ہاں جہاں یہ نہ مل سکیں تو بضرورت عام اہل اسلام کسی کو امام مقرر کر لیں، صورتِ سوال میں جبکہ سلطنتِ اسلام سقی اللہ تعالیٰ عھدھا سے بحکم حاکم شرع وہاں جمعہ قائم اور امامت خاندان ایام قدیم میں مستمر ودائم ہے تو امام خود ماذون من جانب السلطان ہے، اس کے ہوتے بلا مجبوری شرعی عام مسلمانوں کو بھی امام جدید قائم کرنے کا اختیار نہیں۔

لان الخیرۃ لھم انما یکون عند الضرورۃ لفقد الماذون فاذا وجد فلا ضرورۃ فلا خیرۃ۔

(انھیں اختیار ضرورت کے وقت ہے جب مامور نہ ہو اور جب مامور ہے تو اب ضرورت نہیں لہذا اختیار بھی نہ ہوگا۔)"

[فتاوی رضویہ قدیم، ۷۰۷/۳]

اگر عید کی نماز ایک عید گاہ میں دو الگ الگ امام پڑھائیں یعنی ایک عید گاہ میں عید کی دو جماعتیں ہوں یا مسجد میں دو امام دو جمعہ پڑھائیں تو کیا اس کی اجازت ہوگی اس تعلق سے حضور اعلیٰ حضرت رقم طراز ہیں:

"ظاہر ہے کہ ایک مسجد میں ایک نماز کے لئے دو(۲) شخص امام مقرر نہیں ہوتے توجو ان میں مقرر نہیں ہے اس کی اور اس کے پیچھے والوں کی نماز نہ ہوگی" [فتاوی رضویہ قدیم، ۸۰۶/۳] مزید فرماتے ہیں:

"اور مسجد واحد کے لئے وقتِ واحد میں دو امام کی ہر گز ضرورت نہیں، توجب پہلا امام معیّن جمعہ ہے دوسرا ضرور اُس کی لیاقت سے دور و مہجور تو اُس کے پیچھے نماز جمعہ باطل و محذور" [فتاوی رضویہ قدیم، ۸۰۷/۳]

عبارات مذکورہ سے صاف حکم معلوم ہوا کہ ایک عید گاہ میں یا ایک مسجد میں دو امام مقرر نہیں ہوتے توجو مقرر و معین ہوگا اس کی نماز ہو جائے گی اور جو مقرر و معین نہ ہو تو اس کی اور اس کے پیچھے پڑھنے والوں کی نماز نہیں ہوگی۔ ایک عید گاہ میں دو اماموں کی جماعت کے جواز کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اگر دونوں امام ماذون با قامت نماز عید تھے تو دونوں نمازیں جائز ہو گئیں" [فتاوی رضویہ قدیم، ۸۰۳/۳]

اور جب دونوں امام شرعاً ماذون ہوں تو ان کی پڑھائی ہوئی نماز ہو جائے گی۔ لوگوں کو اس سے بھی مغالطہ ہو جاتا ہے کہ فتاوی فیض الرسول وغیرہ فتاوی میں نماز جمعہ و عید کے بارے میں سوال کے جواب میں اجمالی حکم بیان کرتے ہوئے کہیں کہیں بس اتنا ہی لکھا گیا ہے۔ اور اس کو سمجھے بغیر لوگوں سے کہہ دیا جاتا ہے کہ فیض الرسول میں لکھا ہوا ہے کہ نماز ہو جائے گی "ماذون با قامت" کو بالکل حذف کر جاتے ہیں، حالاں کہ یہ ہر صاحب علم جانتا ہے کہ جہاں صرف ماذون با قامت لکھا ہوا ہے وہاں ماذون سے نماز جمعہ و عید قائم کرنے کا شرعی جواز رکھنے والا مراد ہے۔ جس کی تفصیل گزر چکی۔

علاوہ ازاں عید و جمعہ چوں کہ شرائط کے اعتبار سے یکساں ہیں سوائے ایک شرط خطبہ کے، اس لئے ہم کچھ مسائل جماعت جمعہ کے ایک ہی مسجد میں دوبار ہونے کے جواز وعدم جواز سے متعلق نقل کرتے ہیں۔ تاکہ جمعہ کے ضمن میں مقام واحد میں متعدد نماز عید ہونے کا بھی حکم واضح ہو جائے۔

حضور اعلیٰ حضرت جمعہ و عیدین میں امام کے تقرر کی شرائط اور ایک مسجد میں ایک ہی نماز جمعہ کے لئے دو امام ہونے اور ایک مسجد میں دوبار جمعہ ہونے کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"امامت جمعہ و عیدین ہر کس نتواں کرد بلکہ واجب ست کہ سلطانِ اسلام یا ماذون او باشد و بضرورت آنکہ مسلمان اور امام جمعہ مقرر کردہ باشند و شک نیست کہ یک مسجد را دو امام جمعہ کہ اقامت جمعہ واحدہ کنند نباشد پس در مسجد واحد دوبار جمعہ نتواں شد چوں بعض مردماں ایں جا جمعہ نیابند بمسجدے دیگر اگر یابند روند کہ تعدد جمعہ در شہر مذہب مفتی بہ رواست ہمچناں اگر امامے معین برائے امامتِ جمعہ یابند و در غیر مسجد در شہر یا فنائے شہر ادا کنند نیز روا باشد زیرا کہ مسجد شرط جمعہ نیست"

جمعہ و عیدین کی امامت ہر کوئی نہیں کرواسکتا بلکہ واجب ہے کہ وہ سلطانِ اسلام یا اس کی طرف سے مامور ہو، البتہ ضرورت کے پیش نظر مسلمان امام جمعہ مقرر کر سکتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسجد میں ایک جمعہ کی اقامت کے لئے دو امام نہیں ہو سکتے۔ لہذا ایک مسجد میں دوبار جمعہ نہیں ہو سکتا۔ جب کچھ لوگ اس مسجد میں جمعہ نہ پاسکتے تو وہ دوسری مسجد میں چلے جائیں کیوں کہ مفتی بہ مذہب کے مطابق شہر میں متعدد جگہ جمعہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر مقرر امامِ جمعہ کو شہر یا فنائے شہر میں مسجد کے علاوہ پالیتے ہیں تو وہاں بھی جمعہ جائز ہوگا۔ کیوں کہ جمعہ کے لئے مسجد شرط نہیں" [فتاوی رضویہ قدیم، ۷۰۵/۳]

مزید فرماتے ہیں:

"اور پر ظاہر کہ کلام اُسی صورت میں ہے جبکہ پہلا جمعہ صحیح ادا ہو لیا ورنہ مسجد واحد میں تعددِ جمعہ کہاں اور دُوسری مسجد میں اولویت کا کیا منشاء، تو ضرور ہے کہ پہلی نماز اسی نے پڑھائی جو اس مسجد میں اقامتِ جمعہ کا مالک تھا۔ اب یہ دوبارہ وہیں جمعہ پڑھانے والا دو حال سے خالی نہیں یا اس مالکِ اقامت کے اذن سے پڑھائے گا یا بے اذن۔ اول کی طرف راہ ممنوع کہ یہاں اذنِ مالک نہیں، مگر انابت اور بعد اس کے کہ آج کا جمعہ خود اصل پڑھا چکا اقامت شعار ہو چکی، جمعہ امروز میں انابت کے کوئی معنی نہیں کہ انابت تحصیل ناحاصل کے لئے ہوتی ہے نہ تحصیل حاصل کے واسطے۔ نہ نائب و منیب ایک امر میں جمع ہو سکیں اور آئندہ جمعہ کے لئے اذن جمعہ امروز کا اذن نہیں تو شق ثانی ہی متعین ہوئی اور جمعہ میں غیر امامِ جمعہ کی امامت بے اذن امامِ جمعہ باطل ہے"

[فتاوی رضویہ قدیم، ۳/۶۹۰]

لوگ کبھی کبھی کسی معمولی سی وجہ کو شرعی مجبوری کا نام دے کر ایک امام کے ہوتے ہوئے ایک اور نیا امام مقرر کر لیتے ہیں۔ امام جدید قائم کرنے کے سلسلے میں شرعی مجبوری کیا ہوتی ہے اس کو بیان کرتے ہوئے حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"یہاں مجبوری شرعی یہ کہ امام ماذون خود نہ رہے۔ یا اُس میں مذہب وغیرہ کے فساد پیدا ہونے سے قابلیت امامت معدوم ہو جائے اور اس خاندانِ ماذون میں کوئی اور بھی صالح امامت نہ ہو، جب ان صورتوں میں سے کچھ نہ تھا اس دوسرے شخص کی امامت نہ ہوئی اُس کے پیچھے نماز عید و جمعہ محض باطل ہوں گی وہ سخت گناہوں کا خود بھی مرتکب ہوگا اور اُتنے مسلمانوں کو بھی شدید معصیتوں میں مبتلا کر دے گا وہ دوسری مسجد کا جمعہ حرام ہوگا اور ظہر کا فرض سر پر رہے گا۔ اور عیدین میں نماز عید باطل ہوگی اُس کا پڑھنا گناہ ہوگا۔ واجبِ عید سر پر رہ جائے گا تفریق جماعت تو وہاں کہی جائے کہ نماز جمعہ یا عیدین اس کے پیچھے بھی صحیح ہو جائیں، جب یہاں سرے سے ہوئی ہی نہیں تو تفریق کیسی، بلکہ ابطال نماز ہے کہ سب سے سخت تر ہے"

[فتاوی رضویہ قدیم، ۳/۷۰۷]

عبارت مذکورہ میں حضور اعلیٰ حضرت نے صاف فرما دیا کہ بلا وجہ شرعی عام لوگوں کو بھی امام جدید منتخب کرنے کا حق نہیں ہے اور شرعی مجبوری کی بھی کیسی صراحت فرمائی "یہاں مجبوری شرعی یہ کہ امام ماذون خود نہ رہے یا اُس میں مذہب وغیرہ کے فساد پیدا ہونے سے قابلیت امامت معدوم ہو جائے اور اس خاندانِ ماذون میں کوئی اور بھی صالح امامت نہ ہو" بہت سے مقامات پر لوگوں نے جمعہ اور عید کے مسئلہ امامت کو خانگی معاملہ سمجھ لیا ہے جب چاہا، جیسا چاہا، کر لیا دس بیس سو پچاس لوگ اکھٹا ہوئے اور جماعت کرا لی۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"مسلمانو! نماز حکمِ شرعی ہے احکامِ شرع کے مطابق ہی ہو سکتی ہے کوئی خانگی معاملہ نہیں کہ جس نے جب چاہا کر لیا۔ حکمِ شرعی یہ ہے کہ اقامتِ جمعہ کے لئے سلطانِ اسلام یا اُس کا نائب یا اُس کا ماذون شرط ہے۔ اور جہاں سلطانِ اسلام نہ ہو عالم دین فقیہ معتمد اعلم اہل بلد کے اذن سے امامِ جمعہ و عیدین مقرر ہو سکتا ہے۔ اور جہاں یہ بھی نہ ہو تو بمجبوری جسے وہاں کے عامہ مسلمین انتخاب کر لیں وُہ امامت جمعہ یا عیدین کر سکتا ہے ہر شخص کو اختیار نہیں کہ بطورِ خود یا ایک دو یا دس بیس یا سو پچاس کے کہے سے امامِ جمعہ

یا عیدین بن جائے۔ ایسا شخص اگرچہ اس کا عقیدہ بھی صحیح ہو اور عمل میں بھی فسق وفجور نہ ہو جب بھی امامتِ جمعہ وعیدین نہیں کر سکتا اگر کرے گا نماز اُس کے پیچھے باطل محض ہوگی۔ کہ اُن تین طریقوں میں سے ایک وجہ کا امام یہاں شرطِ صحت نماز تھا جب شرط مفقود مشروط مفقود۔ ولہذا صورتِ مسئولہ میں پہلے لوگوں کا جمعہ باطل محض ہوا اور دوسرے لوگوں کا صحیح''

[فتاوی رضویہ قدیم، ۳/۲۷۵]

اور فرماتے ہیں:

''یہ مسئلہ نہایت واجب الحفظ ہے، آج کل جُہّال میں یہ بلا بہت پھیلی ہوئی ہے کہ جمعہ یا نماز عید نہ ملی کسی مسجد میں ڈھائی آدمی جمع ہوئے۔ اور ایک شخص کو امام ٹھہرا کر نماز پڑھ لی وہ نماز نہیں ہوتی۔ اور اُس کے پڑھنے کا گناہ الگ ہوتا ہے۔ عوام کے خیال میں یہ نمازیں بھی پنجگانہ کی طرح ہیں کہ جس نے چاہا امامت کرلی، حالانکہ شرعاً یہاں امام خاص اس طریق معیّن کا درکار ہے اُس کے بغیر یہ نمازیں ہو نہیں سکتیں'' [فتاوی رضویہ قدیم، ۳/۷۰۷]

کتب فقہ کی معتبر کتابوں سے خاص فتاوی رضویہ شریف سے یہ بات بالکل صاف ہوگئی کہ نماز عید غیر معین کے علاوہ کسی کو پڑھانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اگر امام معین نے پڑھادی ہو اور لوگ نماز عید سے رہ گئے ہوں تو ان کو الگ سے کوئی امام کر کے جماعت کرنا جائز نہیں ہے۔

مزید چند اور حوالے اردو فتاوی سے اس مسئلہ سے متعلق نقل کئے دیتے ہیں تاکہ لوگوں کو مسئلہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

ایک ہی جگہ نماز عید کی دو جماعتوں کا حکم بیان کرتے ہوئے حضور صدر الشریعہ فرماتے ہیں:

''نماز عید کے لئے بھی امام شرط ہے۔ جس طرح جمعہ کے لئے اور امام سلطان اسلام ہوگا یا اس کا نائب یا قاضی اور جہاں یہ نہ ہوں تو عام لوگوں نے جس کو امام مقرر کرلیا ہو وہ نماز پڑھائے گا۔ صورت مسئولہ میں جب کہ امام معین موجود ہے پھر دوسرے امام کو قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا امام معین نے جو پڑھایا وہی صحیح ہے اور دوسری جماعت ناجائز''

[فتاوی امجدیہ، ۱۶۸]

نماز جمعہ اور عید کا حکم ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں البتہ ایک حوالہ نماز جمعہ کے دوبار ہونے کے سلسلے میں اور پیش ہے۔ اور اس مسئلہ میں نماز عید اور نماز جمعہ کا حکم ایک سا ہے جیسا کہ پیچھے گزر چکا۔ فتاوی شرعیہ میں ہے:

''جمعہ کی نماز باجماعت ایک مسجد میں بروجہ مسنون ادا ہو جانے کے بعد پھر اسی مسجد میں جمعہ کی دوسری جماعت ناجائز ہے کیوں کہ نماز جمعہ کے لئے عوام کے منتخب امام کا ہونا شرط ہے اور دوسری جماعت میں یہ شرط مفقود ہے تو دوسری جماعت سرے سے ہوگی ہی نہیں۔ اذا فات الشرط فات المشروط، جب شرط فوت ہوگئی تو مشروط بھی فوت ہوگیا۔ عامۃ المسلمین کو یہ حق پہنچتا ہے کہ چند افراد کو جماعت ثانیہ سے روکیں۔ [فتاوی شرعیہ، ۳/۵۴۲، ۵۴۱]

مفتی عبد الحق رضوی صاحب مفتی اشرفیہ مبارکپور اعظم گڑھ جمعہ وعیدین کی جماعت ثانیہ سے متعلق اپنے ایک تفصیلی فتوی میں لکھتے ہیں:

ایک مسجد میں دو یا چند بار جمعہ وعیدین کی جماعت جائز و درست ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مسجد کے ارباب حل

وعقد ٹرسٹیان (متولی وغیرہ) پہلے ہی سے حسب ضرورت دو یا چند امام جمعہ وعیدین مقرر کردیں مقرر کردہ امام ہی نماز پڑھائے کوئی دوسرا نہ پڑھائے"[ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور، اکتوبر ۲۰۱۶ء ص ۹] آگے لکھتے ہیں:

"اگر صورت حال یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کی اتنی کثرت ہو کہ وہ سب بیک وقت مسجد میں سما ہی نہیں سکتے اس مجبوری کے پیش نظر مسجد کے ارباب حل وعقد نے پہلے ہی سے حسب ضرورت دو یا چند امام جمعہ وعیدین مقرر کر رکھے ہیں انہیں مقرر کردہ اماموں نے متعدد بار مسجد یا عید گاہ میں جمعہ وعیدین کو پڑھایا.... تو تعدد جمعہ وعیدین شرائط مذکورہ کے ساتھ الضرورات تبیح المحظورات اور دفع حرج کی وجہ سے جائز و درست ہے۔"[مرجع سابق، ص ۱۳]

ایک ہی مسجد میں اور ایک ہی مصلی پر تین اماموں کا تین بار نماز عید الاضحی پڑھانے سے متعلق بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"نمازِ عید مثل نماز جمعہ ہے نمازِ پنجگانہ کی طرح نہیں جن میں ہر شخص صالح امامت کر سکتا ہے، عیدین اور جمعہ کے لئے شرط ہے کہ امام خود سلطانِ اسلام ہو یا اُس کا نائب یا ماذون، اور وہ نہ ہو تو بضرورت جسے عام مسلمانوں نے امامتِ جمعہ وعیدین کے لئے مقرر کیا ہو، ظاہر ہے کہ ایک مسجد میں ایک نماز کے لئے دو شخص امام مقرر نہیں ہوتے تو جو امام مقرر نہیں اس کے پیچھے والوں کی نماز نہ ہو گی۔[فتاوی بحر العلوم، ۱/۵۵۵]

ایک عید گاہ میں ایک سے زائد جماعتوں کا حکم بیان کرتے ہوئے بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"متعدد جماعتوں کے امام اگر شرعی طور پر مقرر اور متعین تھے تو تمام جماعتوں کی نماز ہو گئی۔ اور اگر آج کل کے دستور کے مطابق مقررہ امام تو ایک ہی تھا بغیر جماعت کے لوگوں نے وقتی طور پر کسی صالح امامت کو آگے بڑھا دیا اور نماز پڑھ لی تو ان کی نماز عید ادا نہ ہوئی"[فتاوی بحر العلوم، ۱/۳۰۷]

اور جو لوگ نماز پنجگانہ کی جماعت ثانیہ پر اس کو قیاس کرتے ہوئے حکم دے دیتے ہیں کہ محراب سے ادھر ادھر کھسک کر نماز پڑھ لو ہو جائے گی۔ بحر العلوم فرماتے ہیں:

"نہ ہی محراب سے ادھر ادھر کھسک کر پڑھنے سے نماز جائز ہو گی۔ جس نے یہ شگوفہ نکالا اس نے خلط مبحث کیا یہ مسئلہ پنجوقتی نماز کے بارے میں ہے۔ تو نماز عید پر اس مسئلہ کو جاری کرنا غلط ہے۔"[فتاوی بحر العلوم، ۱/۳۰۷]

بالجملہ: صورت مسؤل عنہا میں امام معین نے جب نماز عید پڑھا دی تو جو لوگ باقی بچے ان کو کسی اور مسجد میں یا عید گاہ میں نماز ادا کرنی چاہئے تھی۔ اسی مسجد میں غیر معین امام کے پیچھے نماز ادا کرنا ہرگز ہرگز جائز نہیں تھا۔ جن مفتیوں نے اس جماعت سے منع کیا اور عید گاہ یا دوسری مسجد میں جانے کا مشورہ دیا انہوں نے بالکل ٹھیک کیا۔ اور جن مفتیوں نے دوسری جماعت ادا کرنے کا حکم دیا انہوں نے تصریحات ائمہ، عبارات فقہاء اور اقوال علماء کے خلاف کیا۔ ان کو کتابوں سے رجوع کر کے مسئلہ بتانا چاہئے تھا۔ اگر کتابیں دیکھ لیتے تو نماز عید کی جماعت ثانیہ کو نماز پنجگانہ کی جماعت ثانیہ نہ سمجھ بیٹھتے۔ اور لوگوں کی نماز عید ضائع نہ کراتے۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

تصدیقات

مقدام العلماوالفقہا حضرت علامہ مفتی محمد صالح صاحب دامت معالیھم
شیخ الحدیث جامعۃ الرضابریلی شریف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بحمدہٖ تعالیٰ فاضل مجیب، گرامی وقار مفتی، حضرت مولاناعلامہ ذوالفقار خاں صاحب نعیمی زید مجدہٗ وفضلاً نے حق افتاء باحسن الوجوہ ادافرمادیا۔ آپ نے امر مسؤل عنہ کے سب گوشوں کے کیل کانٹے اچھی طرح درست کر دئے ہیں۔بے شک صورت مسؤل عنھاکا یہی حکم معین ہو گا جو مفتی صاحب نے لکھاہے۔بالجملہ جواب بہت اچھاہے حق وصواب ہے کہ باوقعت دلائل سے مدلل اور قابل قدر نظائر سے مؤید وآراستہ ہے۔جزاہ اللہ عزوجل خیر او جعل سعیہ مشکورا۔بے شک ایک عید گاہ میں ایک ہی دن دوبار یازیادہ بار اقامت نماز عید(باستثنائے صورت نادرہ معتبرہ شرعا) ممنوع ہے نامشروع ہے۔ابتداع فی الدین ہے۔ کذابین فی الرضویۃ فی حکم اقامۃ الجمعۃ ثانیۃً اوثالثۃً۔وھٰذہ نظیرھا(انظر صفحہ۶۹۱ج۳)واللہ تعالیٰ اعلم

محمد صالح قادری نوری بریلوی غفرلہ

۲۲۔۱۲۔۱۴۳۸ھ

استاذالفقہا حضرت مفتی ایوب خاں صاحب قبلہ دام ظلہ
شیخ الحدیث جامعہ نعیمیہ مرادآباد

ھٰذاھوالحق فماذابعد الحق الاالضلال، ھٰذاھوالحق والحق احق ان یتبع

فقیر محمد ایوب نعیمی غفرلہ جامعہ نعیمیہ مرادآباد۱۳/ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ

حضرت علامہ مفتی محمد سلیم صاحب مدظلہ
منظراسلام بریلی شریف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماشاءاللہ صورت مسئولہ کاحضرت فاضل مجیب دام اقبالہ نے نہایت ہی تحقیقی جواب تحریر فرماکر اپنے موقف کو جزئیات فقہیہ کی روشنی میں بحسن وخوبی واضح فرمایاہے۔محمد سلیم بریلوی، منظر اسلام بریلی شریف

علاوہ ازیں مندرجہ ذیل علمائے کرام اور مفتیان عظام نے مذکورہ بالا تحریر کی تصدیق وتائید فرمائی ہے۔

مفتی محمد سلیمان نعیمی، جامعہ نعیمیہ مرادآباد۔مفتی قاضی شہید عالم، مولاناحنیف برکاتی، جامعہ نوریہ، بریلی شریف، مفتی محمد افروز عالم، مفتی محمد ایوب خاں نوری، منظر اسلام بریلی شریف، مفتی محمد افضال احمد رضوی، مرکزی دار الافتاء بریلی شریف۔ مفتی مطیع الرحمن، جامعۃ الرضا، بریلی شریف، مفتی سید شاہد میاں، قاضی رام پور، مفتی محمد نسیم، مفتی بدر عالم، جامعہ اشرفیہ مبارک پور۔مفتی امجد رضاامجد، ادارہ شرعیہ پٹنہ بہار، مفتی اشتیاق احمد مصباحی، جامعہ فاروقیہ بھوجپور۔مفتی ذیشان مصباحی، دارالافتاء مدرسہ بدرالعلوم جس پور، مفتی محمد سلطان رضا نعیمی، مرادآباد،

فتوی ۲۶ نماز، روزہ، وغیرہ سے متعلق چند مسائل

مسئولہ: محمد عبد الرشید قادری پیلی بھیتی۔ ۱۸/ ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

(۱) کیا ایسا بھی ہے کہ نماز کبھی باعتبار فقہ وفتاوی ہو جاتی ہے مگر مقبول بار گاہ الٰہی نہیں ہوتی ؟

(۲) فاسق معلن کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہے یا نہیں ؟ اگر ہے تو خود فاسق معلن کی اپنی نماز کا بھی یہی حکم ہے ؟ اگر نہیں تو جب اس کی اپنی نماز ہو جاتی ہے تو اس کی اقتدا کرنے والوں کی نماز کیوں نہیں ہوتی اس پر مکروہ اور واجب الاعادہ کا حکم کیوں دیا جاتا ہے ؟

(۳) نماز پنجوقتہ میں اگلی صف افضل اور نماز جنازہ میں پچھلی صف بہتر ایسا کیوں ؟

(۴) عیدین کے دن روزہ رکھنا حرام ہے تو کیا عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دن بھی روزہ رکھنا حرام ہے اگر نہیں تو کیوں وجہ فرق بیان فرمائیں ؟

(۵) ہماری ایک کتاب دینیات نام کی ہے اس کے صفحہ ۲۹ و ۳۰ پر کارٹون بنے ہوئے ہیں کیا ان پر تصویر کا اطلاق ہو گا؟ کتاب پیش خدمت ہے۔

(۶) گورنمنٹی ملازم جب ریٹائرڈ ہو جاتا ہے تو اس کو آدھی تنخواہ ملتی ہے اور پھر اس کی موت کے بعد اس کی بیوی کو (اگر زندہ رہے) تو اس آدھی کی نصف ملتی ہے آیا اس کو اور اس کی بیوی کو مذکورہ تنخواہ لینا درست ہے یا نہیں ؟

(۷) ہندہ کی شادی ہوئی اور چند ماہ بعد بغیر کسی بچہ کی ماں بنے فوت ہو گئی تو ہندہ کے جہیز اور دیگر جائداد کا مالک کون ہو گا؟ دوسری صورت ہندہ کی شادی کے بعد ایک بچے کی (خواہ بیٹی ہو یا بیٹا) ماں ہو کر فوت ہوئی اور بچہ زندہ ہے تو کیا حکم ہو گا؟

الجواب

(۱) ایسا بارہا ہوتا ہے کہ فقہ وفتاوی کی رو سے اس کی نماز ٹھیک ہوتی ہے لیکن بار گاہ الٰہی میں مقبول نہیں ہوتی،

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" ثلاثة لا يقبل الله منهم صلاة، من تقدم قوما وهم له كارهون، ورجل أتى الصلاة دبارا والدبار أن يأتيها بعد أن تفوته، ورجل اعتبد محررة "

یعنی تین آدمی ایسے ہیں جن کی نماز اللہ کی بار گاہ میں قبول نہیں ہوتی (یعنی انہیں نماز کا ثواب نہیں ملتا) ایک تو وہ آدمی جو کسی قوم کا امام ہو اور قوم اس سے ناخوش ہو۔ دوسرا وہ آدمی جو نماز میں پیچھے آئے اور پیچھے کا مطلب یہ ہے کہ نمازوں کا (مستحب) وقت نکل جانے کے بعد آئے، اور تیسرا وہ آدمی جو آزاد کو غلام سمجھے)

[سنن ابو داؤد، ۱۶۲/۱، باب الرجل يؤم القوم وهم له كارهون]

سنن ترمذی میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ثلاثة لا تجاوز صلاتهم آذانهم: العبد الآبق حتى يرجع، وامرأة باتت وزوجها عليها ساخط، وإمام قوم وهم له كارهون''

یعنی تین آدمی ایسے ہیں جن کی نماز ان کے کانوں سے بلند نہیں ہوتی (یعنی درجہ قبولیت کو نہیں پہنچتی) ایک تو اپنے مالک کے یہاں سے بھاگا ہوا غلام جب تک کہ وہ (اپنے مالک کے پاس) واپس نہ آجائے، دوسری وہ عورت جو اس حالت میں رات گزار دے کہ اس کا شوہر اس سے ناراض ہو، تیسرا وہ امام جسے اس کی قوم پسند نہ کرتی ہو۔

[سنن ترمذی، ۱/۴۶۶، باب ماجاء فیمن أم قوماوھم لہ کارھون]

شعب الایمان للبیہقی میں ہے:

''قال النبي صلى الله عليه وسلم "ثلاثة لا تقبل لهم صلاة، ولا ترتفع لهم إلى السماء حسنة، العبد الآبق حتى يرجع إلى مواليه، والمرأة الساخط عليها زوجها حتى يرضى، والسكران حتى يصحو''

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین آدمی ایسے ہیں جن کی نماز قبول نہیں ہوتی، اور آسمان تک نہیں پہنچتی، ایک تو اپنے مالک کے یہاں سے بھاگا ہوا غلام جب تک کہ وہ اپنے مالک کے پاس واپس نہ آجائے، دوسری وہ عورت جو اس حالت میں رات گزار دے کہ اس کا شوہر اس سے ناراض ہو، تیسرا نشہ والا یہاں تک کہ اس کا نشہ اتر جائے)

[شعب الایمان للبیہقی، ۹۴/۱۱]

مزید اس کے علاوہ ظالم، حرام کا لقمہ کھانے والے زکاۃ وغیرہ ادانہ کرنے والے، شرابی وغیرہ کی بھی نماز قابل قبول نہیں ہے۔

شعب الایمان لبیہقی میں حضرت عبد اللہ ابن عمر سے مروی فرماتے ہیں:

''من اشترى ثوبا بعشرة دراهم وفي ثوبه درهم من حرام لا يقبل الله له صلاة ما دام عليه منه شيء ثم قال: صمتا إن لم أكن سمعته من رسول الله صلى الله عليه وسلم مرتين أو ثلاثا''

یعنی جس نے دس درہم کا کپڑا خریدا اور اس میں ایک درہم بھی حرام کا تھا تو جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر رہے گا اللہ اس کی کوئی نماز قبول نہیں فرمائے گا۔ پھر کہا اگر میں نے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دو یا تین مرتبہ نہ سنی ہو تو میرے دونوں کان بہرے ہو جائیں۔ [شعب الایمان لبیہقی، ۲۱۰/۸]

اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری فرماتے ہیں:

''أي لا يثاب عليها كمال الثواب، وإن كان مثابا بأصل الثواب، وأما أصل الصلاة فصحيحة بلا كلام ذكره ابن الملك، وقال الطيبي كان الظاهر أن يقال منه، لكن المعنى لم يكتب الله له صلاة مقبولة مع كونها مجزئة مسقطة للقضاء كالصلاة في الدار المغصوبة وهو الأظهر لقوله تعالى ﴿إنما يتقبل الله من المتقين﴾ والثواب إنما يترتب على القبول، كما أن الصحة مترتبة على حصول الشرائط والأركان، والتقوى ليست بشرط لصحة عند أهل السنة والجماعة''

یعنی اس کو نماز کا مکمل ثواب نہیں ملے گا اگرچہ وہ اصل ثواب کا حقدار ہو گا۔ اور لیکن نماز کی اصل تو وہ صحیح ہے اس میں کسی کو کلام نہیں ہے۔ اس کو ابن ملک نے ذکر کیا اور طیبی نے کہا کہ یہ ظاہری قول ہے۔ لیکن اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے یہاں اس

کی نماز مقبول نہیں ہے۔ باوجودیکہ وہ کافی ہے اداکو ساقط کرنے والی ہے۔ جیسے مغصوب زمین میں نماز اور یہی اظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان ”اللہ اسی سے قبول کرتا ہے جسے ڈر ہے“ اور ثواب قبول پر موقوف ہوتا ہے جیسا کہ صحت شرائط اورارکان کے حصول پر موقوف ہے اور تقوی اہل سنت وجماعت کے نزدیک نماز کی صحت کے لئے شرط نہیں ہے)

[مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، ۳۰/۶، ۲۹، باب الکسب وطلب الحلال،]

اوراسی مرقاۃ میں ایک مقام پر امام نووی کے حوالے سے ہے کہ انہوں نے فرمایا:

”أما عدم قبول صلاته فمعناه أنه لا ثواب له فيها، وإن كانت مجزئة في سقوط الفرض عنه، ولا يحتاج معها إلى إعادة، ونظير هذه الصلاة في الأرض المغصوبة مجزئة مسقطة للقضاء، ولكن لا ثواب له فيها، كذا قاله جمهور أصحابنا قالوا: فصلاة الفرض وغيرها من الواجبات إذا أتى بها على وجهها الكامل يترتب عليها شيئان: سقوط الفرض عنه، وحصول الثواب، فإذا أداها في أرض مغصوبة حصل الأول دون الثاني“

یعنی نماز کے قبول نہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس میں کوئی ثواب نہیں اگرچہ فرض اس سے ساقط ہو جائے گا۔ اوراس کے اعادہ کی بھی ضرورت نہیں اوراس کی مثال غصب شدہ زمین پر نمازادا کرنا ہے کہ وہ اداکو ساقط کرنے کے لئے کافی ہے لیکن اس میں کوئی ثواب نہیں۔ ہمارے جمہوراصحاب نے ایسا ہی کہا ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ فرض اوراس کے علاوہ واجب نمازیں جب کامل طور پر ادا کی جائیں تو اس پر دو چیزیں مرتب ہوتی ہیں ایک اس سے فرض ساقط ہو جاتا ہے اوردوسرا ثواب کا حاصل ہونا۔ توجب مغصوب زمین میں نمازادا کی تو پہلی چیز حاصل ہوگئی دوسری نہیں)[مرجع سابق: باب الکہانۃ، ۴۱۰/۸]

اور حضوراعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”کسی فعل کا صحیح ہو جانا اور بات ہے اور اس پر ثواب ملنا مقبول بارگاہ ہونا اور بات ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص دکھاوے کے لیے نماز پڑھے نماز صحیح تو ہوگئی فرض اُتر گیا، پر نہ قبول ہوگی نہ ثواب پائے گا، بلکہ الٹا گناہگار ہوگا“

[فتاوی رضویہ جدید، ۱۸۲/۱۰]

(۲) فاسق معلن کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہے۔ اورخود فاسق کی نماز بھی مکروہ ہے۔ اوراس کی اقتدا میں نمازادا کرنے والوں کی نماز بھی مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہے۔ لیکن اس کے پیچھے نماز کے مکروہ ہونے کا اس سے تعلق نہیں کہ خوداس کی نماز صحیح ہے یا نہیں بلکہ اس کے پیچھے نماز کی کراہت اور وجوب اعادہ کے حکم کی علت فقہانے یہ بیان فرمائی ہے۔ کہ وہ دینی امور میں لاپرواہ اوراس کو نماز میں آگے بڑھانے میں اس کی تعظیم ہے اور فاسق کی تعظیم حرام ہے۔

امداد الفتاح شرح نورالایضاح میں ہے:

”كره إمامة الفاسق العالم لانه لايهتم لامردينه ولان في تقديمه للامامة تعظيمه وقد وجب إهانته شرعا“

یعنی فاسق عالم کی امامت مکروہ ہے اس لئے کہ وہ اپنے دینی معاملات کا اہتمام نہیں کرتا۔ اوراس لئے کہ اس کو امامت کے لئے آگے بڑھانے میں اس کی تعظیم ہے حالانکہ ازروئے شرع اس کی توہین واجب ہے)

[ص ۳۴۲ فصل فی بیان احق بالامامۃ]

مراقی الفلاح میں ہے:

''کرہ إمامة ''الفاسق'' العالم لعدم اهتمامه بالدين فتجب إهانته شرعا فلا يعظم بتقديمه للإمامة''

یعنی فاسق عالم کی امامت مکروہ ہے دینی معاملات کا اہتمام نہیں کرنے کی وجہ سے۔ اور ازروئے شرع اس کی توہین واجب ہے۔ لہٰذا اسے امامت کے لئے آگے بڑھا کر اس کی تعظیم نہ کی جائے گی۔ [۱/۱۱۵، فصل فی الأحق بالإمامة]

(۳) علماء کرام نے نماز میں پہلی صف اور نماز جنازہ میں آخری صف کی افضلیت کی کئی علتیں بیان فرمائی ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ما من مسلم يموت فيصلى عليه ثلاث صفوف من المسلمين إلا أوجب قال: فكان مالك إذا استقل أهل الجنازة جزأهم ثلاثة صفوف للحديث''، یعنی کوئی مسلمان ایسا نہیں کہ اس کا انتقال ہو اور اس پر مسلمانوں کی تین صفیں نماز پڑھیں مگر اس کے لئے (جنت) واجب ہو جاتی ہے) امام مالک جب دیکھتے لوگ کم ہیں تو اس حدیث کے سبب تین صفیں بنالیا کرتے)

[سنن ابو داؤد، ۲/۴۵۱، باب الصفوف علی الجنازة]

اس کی شرح میں ملا علی قاری مرقاۃ المفاتیح میں رقمطراز ہیں:

''ذكر الكرماني أن أفضل الصفوف في صلاة الجنازة آخرها، وفي غيرها أولها، إظهارا للتواضع، ولتكون شفاعته أدعى إلى القبول''

یعنی کرمانی نے ذکر کیا کہ نماز جنازہ میں آخری صف اور اس کے علاوہ نماز میں پہلی صف کے افضل ہونے کا سبب انکساری کا ظاہر کرنا ہے اور اس لئے بھی تاکہ اس کی شفاعت قبولیت سے زیادہ قریب ہو جائے)

[مرقاۃ المفاتیح، ۴/۱۴۹، باب المشی بالجنازۃ والصلاۃ علیها]

در مختار میں ہے:

''وأفضل صفوفها آخرها إظهارا للتواضع'' (نماز جنازہ میں پچھلی صف افضل ہے عاجزی کے ظاہر کرنے کی وجہ سے)

[الدر المختار: ۳/۱۱۲، باب صلاۃ الجنازۃ]

اسی کے تحت ردالمحتار میں ہے:

''ويستحب أن يصف ثلاثة صفوف، حتى لو كانوا سبعة يتقدم أحدهم للإمامة، ويقف وراءه ثلاثة ثم اثنان ثم واحد فلو كان الصف الأول أفضل في الجنازة أيضا لكان الأفضل جعلهم صفا واحدا ولكره قيام الواحد وحده كما كره في غيرها''

یعنی نماز جنازہ میں تین صفیں بنانا مستحب ہے۔ یہاں تک کہ اگر سات لوگ ہوں تو ان میں سے ایک کو امامت کے لئے آگے کریں اور امام کے پیچھے تین لوگ کھڑے ہوں پھر اس کے بعد دو لوگ پھر ایک۔ اگر نماز جنازہ میں بھی پہلی صف کو افضل قرار دیا جائے تو ایک ہی صف بنانا افضل ہو جائے گا۔ اور تنہا ایک کا کھڑا ہونا مکروہ قرار پائے گا۔ جیسا کہ نماز جنازہ کے علاوہ نماز میں مکروہ ہوتا ہے۔ (حالانکہ ایسا نہیں ہے) [ردالمحتار: ۳/۱۱۲، باب صلاۃ الجنازۃ]

اسی میں ہے:

أما فيها فآخرها إظهارا للتواضع لأنهم شفعاء فهو أحرى بقبول شفاعتهم ولأن المطلوب فيها تعدد الصفوف فلوفضل الأول امتنعوا عن التأخر عند قلتهم ''

یعنی نماز جنازہ میں پچھلی صف افضل ہے عاجزی کے ظاہر کرنے کی وجہ سے۔ اس لئے کہ نمازی حضرات شفیع ہیں تو ان کی شفاعت میت کے حق میں قبولیت کے زیادہ لائق ہے۔ اوراس لئے بھی کہ نماز جناہ زمیں صفوں کی کثرت مقصود ہے تو اگر پہلی صف کو افضل قرار دجائے تو لوگ قلت کے وقت پیچھے رہنے سے رک جائیں گے۔[ردالمحتار، ۲/۲ ۱ ۳باب الامامة]

ایک سبب یہ بھی ہے کہ علما کے نزدیک نماز جناہ عبادت اصنام سے مشابہ ہے۔

جیسا کہ نورالانوار میں تحریر ہے ''صلاة الجنازة في نفسها بدعة مشابهة لعبادة الاصنام''

یعنی نماز جنازہ بعینہا بدعت ہے جو بتوں کی عبادت سے مشابہ ہے۔[نورالانوار، مبحث الامر، ص ۵۱،]

حاشیہ قمر الاقمار میں علامہ عبد الحلیم لکھنوی نے اس کے تحت لکھاہے:

''مشابهة: لحضور الميت الذي هو كالحجر بين يدي المسلمين''

یعنی میت جو کہ پتھر کی طرح ہے اس کا مسلمانوں کے سامنے ہونے کی وجہ سے مشابہت ہے۔

[قمر الاقمار حاشیہ نورالانوار ص ۳۸]

لہٰذا مسلمان نماز کی حالت میں جس قدر میت سے دور ہو گا عبادت اصنام کی مشابہت سے اتناہی دور ہو گا۔

فتاوی مرکز تربیت افتاء میں لکھاہے:

''میت کی نماز پڑھنا بظاہر عبادت اصنام سے مشابہ ہے لیکن اس کو حق ادائیگی مسلم کے لئے حسن قرار دیا گیاہے۔ اور وہ صرف نماز جنازہ سے حاصل ہو جاتاہے۔ لہٰذا جس قدر میت سے دور رہے گا تشبہ بعبادۃ الاصنام سے دور رہے گا۔ اس لئے بھی آخری صف کو فضیلت حاصل ہوتی ہے''[فتاوی مرکز تربیت افتاء، ۱/۵ ۲۱]

(۴) عیدین میں روزہ حرام ہے اور عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دن روزہ حرام نہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا اور میلاد کے دن روزہ رکھاہے۔

جیسا کہ حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

''عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه نهى عن صوم يوم الفطر، ويوم الأضحى''

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر اور بقر عید کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔

[سنن ابن ماجہ، ۱/ ۵۴۹، باب في النهي عن صيام يوم الفطر والأضحى]

حضرت انس سے مروی

''أن النبي صلى الله عليه وسلم "نهى عن صوم خمسة أيام في السنة: يوم الفطر، ويوم النحر، وثلاثة أيام التشريق''

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سال میں پانچ دن روزہ رکھنے سے منع فرمایاہے عید الفطر کے دن اور عید الاضحی کے دن اور گیارہ سے تیرہ ذی الحجہ تک ایام تشریق کے تین دن)[سنن دارقطنی، ۳/ ۲۰۹]

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دن روزہ رکھنا سنت ہے۔ جیسا کہ مسلم شریف کی درج ذیل حدیث پاک گواہ ہے۔

''سئل عن صوم يوم الاثنين قال: ذاك يوم ولدت فيه''

یعنی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دوشنبہ کے دن روزہ رکھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس دن (روزہ اس لئے رکھتا ہوں) میری ولادت ہوئی۔

نیز بخاری و مسلم میں حضرت عمر سے مروی درج ذیل روایت میں عیدین میں روزہ نہ رکھنے کی یہ علت بھی بیان کی گئی ہے۔ حضرت عمر فاروق اعظم نے فرمایا:

"هذان يومان نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صيامهما: يوم فطركم من صيامكم، واليوم الآخر تأكلون فيه من نسككم "(ان دونوں دنوں میں روزہ رکھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے (اس لئے کہ) عید الفطر کے دن تمہارے روزوں سے افطار کا دن ہے اور دوسرا دن (بقر عید) وہ ہے جس میں تم اپنی قربانیاں کھاتے ہو)

[صحیح بخاری: باب صوم یوم الفطر]

مزید ملا علی قاری نے تین علتیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی علت ''علة الحرمة هي الوصف بكونه يوم فطر ويوم نحر والصوم ينافيهما''

یعنی حرمت کی علت اس کا افطار اور نحر سے متصف ہونا ہے اور روزہ اس کے منافی ہے۔

دوسری علت ''فإن الصوم فيه كأنه إعراض عن ضيافة الله تعالى لخلقه''

یعنی اس دن روزہ رکھنا اللہ کی جانب سے اس کی مخلوق کی ضیافت سے اعراض کرنا ہے۔

تیسری علت ''محافظة على انتهاء رمضان دفعا لتوهم وجوب الزيادة''

یعنی (روزہ عید الفطر میں حرام ہے) اختتام رمضان کا خیال رکھتے ہوئے تاکہ زیادتی کے وجوب کا وہم بھی نہ رہے۔

[مرقاۃ المفاتیح، ۴/۴۷۸، باب صیام التطوع]

فتح الباری میں اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے:

''هو الفصل من الصوم وإظهار تمامه وحده بفطر ما بعده والآخر لأجل النسك المتقرب بذبحه ليؤكل منه ولو شرع صومه لم يكن لمشروعية الذبح فيه معنى''

یعنی روزہ کے بعد روزہ نہ رکھ کر (یعنی افطار کرکے) روزوں کے مکمل ہونے کا صرف اظہار کرنا مقصود ہے، اور دوسرا دن (بقر عید اس میں روزہ نہیں رکھا جاتا ہے) اس قربانی کی وجہ سے جس کے ذریعے تقرب حاصل کیا جاتا ہے تاکہ اس سے کچھ کھایا جاسکے۔

[فتح الباری شرح صحیح البخاری: ج ۴ ص ۲۳۹، باب صوم یوم الفطر]

الحاصل: عیدین میں روزہ نہ رکھنے کی چند وجوہات ہیں لیکن عید میلاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں روزہ نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لئے اس میں روزہ رکھنا حرام نہیں ہے بلکہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن روزہ رکھا ہے لہٰذا اس دن روزہ

رکھنا سنت ہے۔

(۵) کارٹون ازروئے شرع تصویر ہی کا حکم رکھتے ہیں۔ لیکن تصویر میں اصل سر اور چہرہ ہی ہوا کرتا ہے۔ آپ کی کتاب میں کارٹون دیکھے مگر اس میں نہ سر ہے نہ چہرہ۔ اس لئے اس پر تصویر کا حکم منطبق نہیں ہوگا۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"دیگر اعضاوجہ وراس کے معنی میں نہیں اگرچہ مدار حیات ہونے میں مماثل ہوں کہ چہرہ ہی تصویر جاندار میں اصل ہے، ولہٰذا سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی کا نام تصویر رکھا اور شک نہیں کہ فقط چہرہ کو تصویر کہتے اور بنانے والے بارہا اسی پر اقتصار کرتے ہیں ملوک نصارٰی کہ سکہ میں اپنی تصویر چاہتے ہیں اکثر چہرہ تک رکھتے ہیں اور بیشک عامہ مقاصد تصویر چہرہ سے حاصل ہوتے ہیں" [فتاوی رضویہ جدید، ۵۷۹/۲۴]

نیز خلاصۃ الفتاوی کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''ان کان مقطوع الراس لاباس به ولو محی وجه الصورة فهو کقطع الراس''

یعنی اگر تصویر کا سر کاٹ دیا گیا تو پھر اس کے رکھنے میں کوئی حرج نہیں، اور تصویر کے چہرے کو مٹا دینا سر کاٹنے کی طرح ہے)[مرجع سابق]

(۶) ملازم کو ریٹائرڈ ہونے کے بعد گورنمنٹ سے اس کی خوشی سے ملنی والی تنخواہ ملازم اور اس کی بیوی کے لئے ازروئے شرع بلا کراہت جائز ہے۔

(۷) ہندہ کی جائداد اس کے انتقال کے بعد اس کا ترکہ ہے جو شرعی طور پر اس کے وارثین کو ملے گا۔ اگر اس نے شوہر کے ساتھ ماں باپ چھوڑے ہیں تو وہ بھی اس میں حصہ دار ہوں گے۔ اور اگر کوئی بچہ بھی ہے تو وہ بھی حصہ پائے گا۔ اور ہندہ نے کس کس کو چھوڑا ہے اور کس کو کتنا کتنا ملے گا اگر اس کی تفصیل منظور ہو تو بہار شریعت وغیرہ کتابوں میں دیکھیں بآسانی مل جائے گی۔

ھٰذا ماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ

فتوی ۲۷ — فاسق کی خود کی نماز کا حکم شرعی

مسئولہ: (مولانا) محمد کامران حسین، محلہ چھوٹی مسجد شیش گڑھ بریلی شریف۔ ۱۹/ربیع الغوث ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان ذوی الاحترام مسئلہ ذیل میں

داڑھی منڈے منفرد کی نماز واجب الاعادہ ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث اقوال بزرگان دین کی روشنی میں معتبر ومستند حوالجات کے ساتھ جواب عطا فرما کر اجر جزیل کے مستحق ہوں۔ بینوا توجروا

الجواب

داڑھی منڈانا ناجائز وحرام ہے۔ داڑھی منڈانے والا فاسق ہے۔ فاسق کے نماز ادا کرنے سے فرض ساقط ہو جاتا ہے اور علما اس کی نماز پر جائز وصحیح کا اطلاق فرماتے ہیں، مگر اس کی نماز کا ثواب کم ہونے اور اس کے فسق کے سبب اس کی نماز مکروہ تحریمی

ہونے کا حکم دیتے ہیں ۔اور مکروہ تحریمی حکم میں اقرب الی الواجب ہے اس لئے ترک واجب کے سبب علما نماز دہرانے کو واجب قرار دیتے ہیں۔حدیث پاک میں شرابی کی نماز مقبول نہ ہونے کی شرح کرتے ہوئے ملا علی قاری رقم طراز ہیں:

''إنما خص الصلاة بالذکر أنها أفضل عبادات البدن، فإذا لم يقبل منها فلأن لا يقبل منها عبادة أصلا كان أولى، قال المظهر: هذا وأمثاله مبني على الزجر وألا يسقط عنه فرض الصلاة إذا أداها بشرائطها ولكن ليس ثواب صلاة الفاسق كثواب صلاة الصالح، بل الفسق ينفي كمال الصلاة وغيرها من الطاعات، وقال النووي إن لكل طاعة اعتبارين: أحدهما سقوط القضاء عن المؤدي، وثانيهما ترتيب حصول الثواب فعبر عن عدم ترتيب الثواب بعدم قبول الصلاة''

نماز کو ذکر سے خاص کیا اس لئے کہ وہ بدنی عبادتوں میں افضل ہے۔ تو جب یہ مقبول نہیں تو کسی عبادت کو بدرجہ اولی قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہ اور اس طرح کی مثالیں تنبیہ پر مبنی ہیں۔ ورنہ نماز کا فرض تو ادا ہو جائے گا جب کہ نماز اس کی شرطوں کے ساتھ ادا کی گئی ہو۔ لیکن فاسق کی نماز کا ثواب متقی کی نماز کی طرح نہیں ہو گا۔ بلکہ فسق نماز اور اس کے علاوہ عبادات کے مکمل ہونے کے منافی ہے۔اور امام نووی نے کہا کہ عبادت کے دو اعتبار ہیں ان میں سے ایک ادا کرنے والے سے فرض کا ساقط ہو جانا اور دوسرا ثواب کی تحصیل کا مرتب ہونا۔ تو نماز کے قبول نہ ہونے کو ثواب کے مرتب نہ ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

[مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح، ۳۲۱/۷: کتاب الحدود، باب بیان الخمر ووعید شاربها]

مراقی الفلاح شرح نور الایضاح میں ہے:

''والمكروه تحريما إلى الحرمة أقرب وتعاد الصلاة مع كونها صحيحة لترك واجب وجوبا وتعاد استحبابا بترك غيره قال في التجنيس كل صلاة أديت مع الكراهة فإنها تعاد لا على وجه الكراهة''

مکروہ تحریمی حرام کے زیادہ کے قریب ہے نماز صحیح ہونے کے باوجود بھی واجب کے ترک ہونے کی وجہ سے دہرانا واجب ہے۔ اور کراہت تحریمی کے علاوہ کراہت کے سبب نماز دہرانا مستحب ہے۔ تجنیس میں کہا کہ ہر وہ نماز جو کراہت کے ساتھ ادا کی گئی اسے غیر مکروہ طریقہ سے دہرایا جائے۔[مراقی الفلاح شرح نور الایضاح: کتاب الصلاۃ، ص ۱۲۴]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''الصلاة جائزة في جميع ذلك لاستجماع شرائطها وأركانها وتعاد على وجه غير مكروه وهو الحكم في كل صلاة أديت مع الكراهة. كذا في الهداية فإن كانت تلك الكراهة كراهة تحريم تجب الإعادة أو تنزيه تستحب فإن الكراهة التحريمية في رتبة الواجب كذا في فتح القدير.''

مکروہات کی تمام صورتوں میں نماز کی شرطیں اور اس کے ارکان کے جمع ہونے کی وجہ سے نماز تو جائز ہے مگر غیر مکروہ طریقہ سے نماز لوٹائی جائے گی۔ اور یہ حکم ہر اس نماز کا ہے جو کراہت کے ساتھ ادا کی گئی ہو۔ ایسا ہی ہدایہ میں ہے ۔ پس اگر وہ کراہت تحریمی ہے تو نماز کا اعادہ واجب ہے۔ اگر کراہت تنزیہی ہے تو نماز کا لوٹانا مستحب ہے۔ کیوں کہ کراہت تحریمی واجب کے مرتبہ میں ہے ایسا ہی فتح القدیر میں ہے۔

[ج ۱/ ۱۰۹، کتاب الصلاۃ، باب ما یفسد الصلاۃ وما یکرہ فیھا]

حضور اعلی حضرت سے جب داڑھی منڈانے والے کی خود کی نماز کے بارے میں حکم معلوم کیا گیا تو آپ نے درج ذیل جواب تحریر فرمایا:

”داڑھی منڈانا فسق ہے اور فسق سے متلبس ہو کر بلا توبہ نماز پڑھنا باعث کراہت نماز ہے۔ جیسے ریشمی کپڑے پہن کر یا صرف پائجامہ پہن کر اور داڑھی منڈانے والا فاسق معلن ہے نماز ہو جانا بایں معنی ہے کہ فرض ساقط ہو جائے گا ورنہ گنہگار ہو گا“

[فتاوی رضویہ قدیم:۳/۲۷۱، ۲۷۰]

بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی فرماتے ہیں:

”داڑھی منڈے کی نماز ہوتی تو ہے مگر مکروہ تحریمی ہوتی ہے کہ دوبارہ عیب دور کر کے دہرائی جائے۔ در مختار میں ہے کل صلاۃ ادیت مع الکراھۃ تجب اعادتھا جو نماز مکروہ پڑھی گئی اس کا دہرانا واجب ہے۔ مگر اس نے تو داڑھی منڈا رکھی ہے دوبارہ صحت کے ساتھ پڑھے گا کیسے؟ البتہ داڑھی منڈانے پر توبہ کر کے پڑھے تو اور بات ہے مختصر یہ کہ اس طرح نماز پڑھنے کے بعد بھی آخرت میں مواخذہ ہو گا اگر صحیح طریقہ سے دہرایا نہیں۔ ہاں اس کا عذاب تارک الصلاۃ کے عذاب سے کم ہو گا۔

[فتاوی بحر العلوم، ۱/۴۴۴، کتاب الصلاۃ]

الحاصل: داڑھی منڈانے والا فاسق معلن ہے اس کی نماز مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہے۔

فتوی ۲۸ — مائک میں نماز ادا کرنے کا حکم

سائلین: مصلیان مدینہ مسجد کھجوری خاص دہلی۔ ۹۴۔ ۲۴ / ربیع الغوث ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ

مدینہ مسجد واقع کھجوری خاص دہلی اہل سنت وجماعت کی مسجد ہے۔ جمعہ میں یہاں نمازیوں کی تعداد قریب 1200 ہوتی ہے، مسجد کے بھر جانے کی وجہ سے باہر دونوں طرف کی گلیوں میں قریب 20 میٹر تک روڈ پر نمازی آجاتے ہیں۔ مسجد تین منزلہ ہے اور ساری منزلیں نمازیوں سے پر ہو جاتی ہیں۔ اس ضرورت کو دیکھتے ہوئے شرعی کونسل آف انڈیا بریلی شریف کے سیمینار میں لئے گئے فیصلے کے مطابق مکبرین کے لازمی تاکید واہتمام کے ساتھ جمعہ وعیدین کے موقع پر مائک کا استعمال کیا جاتا ہے، پانچوں وقت استعمال نہیں کیا جاتا، ایک دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ تاکید کے باوجود تکبیر نہیں ہوئی۔ جس سے روڈ پر پڑھنے والے بعض حضرات کی نمازیں خراب بھی ہوئیں، کیا اس صورت کے مد نظر مائک کا استعمال کرنا درست ہے؟

مسجد کے پاس ہی شیعوں کی مسجد بھی ہے جس کی نماز کا ٹائم مدینہ مسجد سے دو منٹ کے فرق سے ہے، وہ مائک کا استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہاں کے نمازیوں کو خلل پڑتا ہے۔ کچھ لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ مائک سے نماز نہیں پڑھانا چاہئے اور وہ یہ بات بھی کہتے ہیں کہ: جو امام ایک بار مائک پر نماز پڑھادے اس کے پیچھے کبھی نماز ہی نہیں ہوتی، کیا ان لوگوں کا یہ کہنا درست ہے؟ کچھ لوگ ضروت کے باعث مائک کے استعمال کو درست جانتے ہیں۔ اور دہلی میں اہل سنت کی بڑی مساجد میں ضرورت کے باعث مائک کا استعمال کیا ہی جارہا ہے۔ شریعت حقہ کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

یہ مسئلہ علمائے اہلسنت کے نزدیک مختلف فیہا ہے۔ بعض علمائے کرام جوازاور بعض عدم جواز کا حکم دیتے ہیں۔
لاؤڈا سپیکر سے متعلق اکابر علمائے کرام کی آراء و نظریات اگر دیکھیں تو اکثریت اس کے استعمال کو ناجائز وممنوع قرار دیتی ہے اور جو علمائے کرام جواز کے قائل ہیں وہ بھی کم سے کم احتیاط کا حکم تو دیتے ہی ہیں۔ حضور مفتی اعظم ہند فرماتے ہیں:
”جولوگ نہ امام کی آواز سنیں نہ مبلغ کی آوازان تک پہنچی نہ ایسے مقتدیوں کو دیکھتے ہیں جو امام یا مبلغ کی آواز سن کر رکوع وسجود کرے محض لاؤڈا سپیکر کی آواز سن کر یہ معاملات کریں ان کی نماز نہ ہو گی“[فتاوی مفتی اعظم،۷۲/۳]
حضور صدرالافاضل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:
”لاؤڈا سپیکر کا مسجد میں لاناہی بیکار ہے کیوں کہ امام کی قراءت سنانے کے لئے لاؤڈا سپیکر کا استعمال درست نہیں ہے“
[القول المقبول فی عظمۃ قول اللہ والرسول،مؤلفہ مفتی محمد صاحبداد خاں،صفحہ:۵۳]
حضور صدرالشریعہ فرماتے ہیں:
”آلہ مکبر الصوت (لاؤڈا سپیکر) سے خطبہ سننے میں حرج نہیں مگر اس کی آواز پر رکوع سجود کرنا مفسد نماز ہے،
دوسرے فتوی میں فرماتے ہیں:
”اس کے ناجوازی کی وجہ اب تک ذہن میں نہیں آئی ہے.... مگر نماز میں یہ جدت اچھی معلوم نہیں ہوتی جو طریقہ سلف صالحین کا ہے اس سے عدول اچھانہیں“[فتاوی امجدیہ،۱۹۰/۱]
مفتی حبیب اللہ نعیمی فرماتے ہیں:
”اکابر علمائے کرام وجمہور مفتیان عظام نے نماز میں لاؤڈا سپیکر کے استعمال کو ممنوع قرار دیاہے بعض نماز کے فاسد ہونے کے قائل ہوئے اور بعض مکروہ ہونے کے،اس کے استعمال کو ممنوع سب نے قرار دیاہے۔ دوسرے فتوی میں فرماتے ہیں:
”اجمیر شریف یاجامع مسجد دہلی یاناخدا مسجد کلکتہ کا فعل وعمل قابل حجت نہیں۔ اگر کچھ مساجد میں اس کا استعمال دلیل جواز ہو سکتاہے تو لاکھوں مساجد میں اس کا عدم استعمال عدم جواز کی دلیل بطریق اولیٰ ہو سکتاہے۔“
[حبیب الفتاوی،۴۵۸/۱]
مفتی جلال الدین امجدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:
”جولوگ صرف لاؤڈا سپیکر کی آواز پر رکوع وسجود کریں گے ان کی نماز نہ ہو گی یہی فتوی حضور مفتی اعظم ہند قبلہ دامت برکاتھم القدسیہ اور بہت سے اکابر اہل سنت کا ہے۔ اور بعض لوگوں کے نزدیک اگرچہ نماز ہو جائے گی لیکن چونکہ معاملہ نماز جیسی اہم عبادت کے جائز اور ناجائز ہونے کا ہے اس لئے تاوقتیکہ محققین فن یہ ثابت نہ کر دیں کہ لاؤڈا سپیکر کی آواز بعینہٖ متکلم کی آواز ہے احتیاطا نماز کے ناجائز ہونے کا ہی حکم دیا جائے گا۔“[فتاوی فیض الرسول،۳۵۸/۱،۳۵۷]
حضور حافظ ملت فرماتے ہیں:
”مجھے اس کی تحقیق نہیں احتیاط احتراز میں ہے۔ مزید فرماتے ہیں:

حدیث شریف میں سرکاردوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایاایسی چیز کو چھوڑدو جس میں شک وشبہہ ہواوراسے اختیار کرو جس میں کوئی شبہہ نہیں۔لہٰذا میری رائے میں یہی صورت زیادہ مناسب ہے کہ لاؤڈاسپیکر نماز میں استعمال ہی نہ کیاجائے کہ نماز میں کسی قسم کا جھگڑا اور شبہہ ہو۔[مقدمہ فتاوی شارح بخاری، ۱/۳۹]

مفتی نظام الدین صاحب نے مائک میں نماز کے جائز ہونے کی تحقیق فرمائی ہے لیکن ان کا موقف بھی اس سلسلہ میں حضور حافظ ملت کی طرح نماز میں لاؤڈاسپیکر کے استعمال سے بچنے کا ہی ہے۔خود لکھتے ہیں:

”حضرت(مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ)نے لاؤڈاسپیکر پر نماز کے عدم جواز کے کثیر فتاوی صادر کئے۔البتہ راقم کا موقف اس باب میں وہ ہے جو حضور حافظ ملت مولاناشاہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔“

[مرجع سابق،ص ۴۱]

الغرض لاؤڈاسپیکر پر نمازاداکرنے کے سلسلے میں مختلف اقوال ہیں کچھ فساد نماز کا حکم دیتے ہیں کچھ علما مکروہ تحریمی کا حکم دیتے ہیں کچھ مطلقاجواز کا حکم دیتے ہیں کچھ مکبرین وغیرہ کی قید کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں۔

جس سے پتہ چلتاہے کہ اس مسئلہ میں علمائے کرام کے درمیان اختلاف شدید ہے۔جب علمائے کرام کے مابین کسی مسئلہ میں اختلاف واقع ہو تو اس اختلاف سے بچناہی بہتر ہے جیسا کہ،بنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

''بل أوجب للخروج عن الخلاف لا سیافی باب العبادات''

یعنی اختلاف سے نکلنا ضروری ہے خاص کر عبادات کے معاملے میں۔

[بنایہ شرح ہدایہ،۳/۲۳۱،باب صلاۃ الجنازۃ فی المسجد،]

غمز عیون البصائر میں ہے:

''قد نصوا علی أن الخروج من الخلاف مندوب''،یعنی علمانے اس پر نص فرمائی ہے کہ اختلاف سے نکلنا مستحب ہے۔

[غمز عیون البصائر،۲/۶۳،کتاب الزکاۃ]

بحرالرائق میں ہے:

''والخروج من الخلاف مستحب عندنا''،یعنی ہمارے نزدیک اختلاف سے بچنا مستحب ہے[۱/۹۴،کتاب الطہارۃ]

درمختار میں ہے:''یندب للخروج من الخلاف لاسیا للإمام''

یعنی اختلاف سے نکلنا مستحب ہے خاص کر امام کے لئے[۱/۲۷۹،۲۷۸،کتاب الطہارۃ،]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”محل اختلاف علما میں مراعات خلاف جہاں تک ارتکاب مکروہ کو مستلزم نہ ہو بالاجماع مستحب ہے۔

[فتاوی رضویہ قدیم،۳/۳۶۸]

اور نماز جیسی اہم عبادت میں احتیاط بھی بہت ضروری ہے۔اوراس میں احتیاط یہی ہے کہ لاؤڈاسپیکر کا استعمال نہ کیاجائے،علمائے کرام نے اس پر نص فرمائی ہے کہ عبادات میں احتیاط ضروری ہے۔

فتاوی شامی میں ہے:

''أن الأخذ بالاحتیاط فی باب العبادات واجب''

احتیاط پر عمل کرنا عبادات کے معاملہ میں ضروری ہے [ردالمحتار، باب صدقة الفطر، ۲/۳۶۶]

مراقی الفلاح میں ہے:

''الاحتیاط لازم فی باب العبادات''، یعنی عبادات کے معاملہ میں احتیاط برتنا ضروری ہے۔

[مراقی الفلاح، ص ۴۱، کتاب الطهارة، فصل مایجب فیه الاغتسال]

لہٰذا نماز میں لاؤڈا سپیکر کا استعمال کرنے سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے باوجود بھی اگر فتنہ وفساد کے سبب لاؤڈا سپیکر استعمال کرنا پڑ جائے تو مکبرین کا بھی انتظام کیا جائے۔ اور اگر اس صورت پر بھی کام نہ بنے تو امام مسجد لوگوں کو مسئلہ سے آگاہ کرنے کے بعد لاؤڈا سپیکر پر نماز پڑھا سکتا ہے۔ امام کو صرف اس وجہ سے مسجد سے استعفی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

بریلی شریف میں حضور تاج الشریعہ کی سرپرستی میں ہونے والے فقہی سیمینار میں لاؤڈا سپیکر پر نماز سے متعلق یہی فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہم آخر میں وہ فیصلہ یہاں پر پیش کئے دیتے ہیں۔

"(۱) لاؤڈا سپیکر کی آواز متکلم کی عین آواز نہیں ہے اس لئے محض لاؤڈا سپیکر سے مسموع آواز پر اقتدا اہم احناف کے نزدیک صحیح نہیں۔ بالفرض یہ آواز ماہیت کے اعتبار سے متکلم کی آواز بھی ہو تو بھی حکماً یہ اصل آواز نہیں لہٰذا اب بھی محض اس آواز پر اقتدا درست نہیں ہو گی۔

(۲) جہاں کہیں نماز میں لاؤڈا سپیکر کے استعمال پر لوگ جبر کریں وہاں مکبرین کا بھی انتظام کیا جائے اور مقتدیوں کو مسئلہ کی صورت آگاہ کرتے ہوئے ہدایت کی جائے کہ وہ لاؤڈا سپیکر کی آواز پر اقتدا نہ کرکے مکبرین کی آواز پر اقتدا کریں۔

(۳) اسی طرح مکبرین کو بھی ہدایت کی جائے کہ وہ بھی لاؤڈا سپیکر کی آواز پر اقتدا نہ کریں۔

(۴) کہیں مکبر مقرر کرنے کی بھی صورت نہ بنے تو امام مسئلہ بتادے وہ اس بنا پر امامت سے مستعفی نہ ہو۔"

[فیصلہ جات شرعی کونسل، ص ۳۸]

بالجملہ:۔ نماز میں لاؤڈا سپیکر کا استعمال اکثر علمائے کرام کے نزدیک درست نہیں ہے اس لئے حکم شرع یہی ہے کہ لاؤڈا سپیکر پر نماز نہ پڑھائی جائے۔ اور اگر واقعی مجبوری پائی جائے تو امام صاحب نمازیوں کو مسئلہ سے آگاہ کرکے نماز پڑھا سکتے ہیں۔

لیکن جہاں تک ممکن ہو بچنے کی کوشش کی جائے۔ کیوں کہ نماز ایک اہم عبادت ہے اس میں کسی طرح کی بے احتیاطی نماز کو برباد بھی کر سکتی ہے۔ علاوہ ازیں بعذر شرعی مائک میں نماز پڑھانے کے سبب امام کے لائق امامت نہ رہنے والی بات غلط ہے اس بات کا شرع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۲۹ لاؤڈا سپیکر پر نماز عید وجمعہ کا حکم شرعی

مسئولہ: مختار رضا جامع مسجد سلطانپور پٹی اودھم سنگھ نگر۔ ۲۹/ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ جمعہ کی نماز عید کی نماز سنت تراویح لاؤڈا سپیکر سے پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟

وجہ یہ ہے کہ نماز جمعہ کے دن پوری مسجد بھر جاتی ہے اور امام صاحب کی آواز پہلی سے دوسری صف تک ہی پہنچتی ہے حالانکہ مکبر بھی کھڑا کیا جاتا ہے، اس کے باوجود بھی لوگ شور مچاتے ہیں، اعتراض کرتے ہیں کہ لاؤڈا سپیکر پر نماز ہے اور کہتے ہیں سب جگہ لاؤڈا سپیکر سے نماز ہو رہی ہے جیسے کہ کاشی پور میں رام نگر رامپور دلی ٹھاکر دوارہ وغیرہ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں آپ سے درخواست ہے کہ قرآن وحدیث کے حوالے کے ساتھ جواب دیں لاؤڈا سپیکر سے نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب

فرمان رب تعالیٰ ہے:

وَلَا تَجۡهَرۡ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتۡ بِهَا وَابۡتَغِ بَيۡنَ ذٰلِكَ سَبِيۡلًا

اور اپنی نماز نہ بہت آواز سے پڑھو نہ بالکل آہستہ اور ان دونوں کے بیچ میں راستہ چاہو۔

[ترجمہ قرآن کنزالایمان، پارہ ۱۵، سورہ بنی اسرائیل، آیت ۱۱]

لاؤڈا سپیکر پر نماز کا مسئلہ علما کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ کچھ علما جواز کے قائل ہیں، لیکن علما کی اکثریت لاؤڈا سپیکر پر نماز پڑھنے پڑھانے کو منع کرتی ہے۔ حضور مفتی اعظم ہند فرماتے ہیں:

"جو لوگ نہ امام کی آواز سنیں نہ مبلغ کی آواز ان تک پہنچی نہ ایسے مقتدیوں کو دیکھتے ہیں جو امام یا مبلغ کی آواز سن کر رکوع وسجو کرے محض لاؤڈا سپیکر کی آواز سن کر یہ معاملات کریں ان کی نماز نہ ہوگی" [فتاوی مفتی اعظم، ۷۲/۳]

مفتی جلال الدین امجدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"لاؤڈا سپیکر پر نماز پڑھنے کا مسئلہ مختلف فیہ ہے، دوسرے فتوی میں فرماتے ہیں:

"جو لوگ صرف لاؤڈا سپیکر کی آواز پر رکوع وسجود کریں گے ان کی نماز نہ ہوگی یہی فتوی حضور مفتی اعظم ہند قبلہ دامت برکاتھم القدسیہ اور بہت سے اکابر اہل سنت کا ہے اور بعض لوگوں کے نزدیک اگرچہ نماز ہو جائے گی لیکن چونکہ معاملہ نماز جیسی اہم عبادت کے جائز اور ناجائز ہونے کا ہے اس لئے تاوقتیکہ محققین فن یہ ثابت نہ کردیں کہ لاؤڈا سپیکر کی آواز بعینہٖ متکلم کی آواز ہے احتیاطا نماز کے ناجائز ہونے کا ہی حکم دیا جائے گا۔" [فتاوی فیض الرسول، ۳۵۸/۱،۳۵۷]

حضور صدرالشریعہ فرماتے ہیں:

"آلہ مکبر الصوت (لاؤڈا سپیکر) سے خطبہ سننے میں حرج نہیں مگر اس کی آواز پر رکوع سجود کرنا مفسد نماز ہے۔ البتہ دوسرے فتوی میں فرماتے ہیں "اس کے ناجوازی کی وجہ اب تک ذہن میں نہیں آئی ہے.... مگر نماز میں یہ جدت اچھی معلوم نہیں ہوتی

جو طریقہ سلف صالحین کا ہے اس سے عدول اچھا نہیں" [فتاوی امجدیہ، ۱/۱۹۰]

مفتی حبیب اللہ نعیمی فرماتے ہیں:

"اکابر علمائے کرام وجمہور مفتیان عظام نے نماز میں لاؤڈا سپیکر کے استعمال کو ممنوع قرار دیا ہے۔ بعض نماز کے فاسد ہونے کے قائل ہوئے اور بعض مکروہ ہونے کے، اس کے استعمال کو ممنوع سب نے قرار دیا ہے۔ دوسرے فتوی میں فرماتے ہیں:

"اجمیر شریف یا جامع مسجد دہلی یا ناخدا مسجد کلکتہ کا فعل وعمل قابل حجت نہیں اگر کچھ مساجد میں اس کا استعمال دلیل جواز ہو سکتا ہے تو لاکھوں مساجد میں اس کا عدم استعمال عدم جواز کی دلیل بطریق اولی ہو سکتا ہے۔"

[حبیب الفتاوی، ۱/۴۵۸]

الحاصل نماز میں لاؤڈا سپیکر کا استعمال اکثر علمائے کرام کے نزدیک درست نہیں ہے۔ اس لئے حکم شرع یہی ہے کہ لاؤڈا سپیکر پر نماز نہ پڑھائی جائے خواہ کوئی نماز ہو۔ اور کاشی پور وغیرہ کسی شہر کی کسی مسجد میں نماز لاؤڈا سپیکر پر ہونا یہ قابل حجت نہیں ہے۔ حتی الامکان کوشش کی جائے کہ نماز لاؤڈا سپیکر پر نہ ادا کی جائے۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

فتوی ۳۰ — مائک پر نماز کا حکم

مسئولہ: ضمیر احمد خاں صاحب، نزد جامع مسجد قصبہ ککرالہ ضلع بدایوں۔

محمد ارشد خاں نعیمی نزد جامع مسجد قصبہ ککرالہ ضلع بدایوں۔ ۲۴/ربیع الغوث ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے اہل سنت مفتیان قوم وملت اس بارے میں کہ

ہماری مسجد میں نماز جمعہ لاؤڈا سپیکر سے ہوتی ہے جب کہ امام صاحب کی آواز بغیر لاؤڈا سپیکر کے بھی آخری صف تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اگر کبھی نمازی زیادہ ہو جاتے ہیں تو مکبر کے ذریعہ آواز اوپر پہنچ سکتی ہے۔ امام صاحب جو پیچھے کبھی مکبر کھڑا کرتے ہیں تو مکبر بھی لاؤڈا سپیکر کی ہی اقتدا کرتا ہے نہ کہ امام صاحب کی اصل اواز کی۔ اب ایسی صورت میں نماز کا کیا حکم ہے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ایسی صورت میں جائز ہو گا؟ جو لوگ لاؤڈا سپیکر کی آواز پر اقتدا کریں گے ان کی نماز کا کیا حکم ہے۔ کمیٹی والوں کا کہنا ہے کہ اب لاؤڈا سپیکر عام ہو چکا ہے اس لئے اس پر نماز ہو جاتی ہے۔ اور کچھ لوگ نماز تراویح بھی اس پر پڑھنا چاہتے ہیں یہ بول کر کہ ہم کو امام صاحب کی آواز نہیں آتی ہم قرآن کو نہیں سن پاتے تو نماز تراویح کے لئے کیا حکم ہے؟

اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر قرآن نہیں سنا تو تراویح نہیں ہوئیں تو ان کا یہ کہنا کہاں تک درست ہے؟

جواب عنایت فرما کر احسان عظیم فرمائیں۔

الجواب

مائک پر نماز کا مسئلہ علمائے اہلسنت کے نزدیک مختلف فیہا ہے۔ بعض علمائے کرام جواز اور بعض عدم جواز کا حکم دیتے ہیں۔

لاؤڈا سپیکر سے متعلق اکابر علمائے کرام کی آراء ونظریات اگر دیکھیں تو اکثریت اس کے استعمال کو ناجائز وممنوع قرار دیتی

ہے۔اور جو علمائے کرام جواز کے قائل ہیں وہ بھی کم سے کم احتیاط کا حکم تو دیتے ہی ہیں۔

حضور مفتی اعظم ہند فرماتے ہیں:

’’جولوگ نہ امام کی آواز سنیں نہ مبلغ کی آوازان تک پہنچی نہ ایسے مقتدیوں کو دیکھتے ہیں جو امام یا مبلغ کی آواز سن کر رکوع وسجود کرے محض لاؤڈا سپیکر کی آواز سن کر یہ معاملات کریں ان کی نماز نہ ہوگی‘‘[فتاوی مفتی اعظم، ۷۲/۳]

حضور صدر الافاضل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

’’لاؤڈا سپیکر کا مسجد میں لانا ہی بیکار ہے کیوں کہ امام کی قراءت سنانے کے لئے لاؤڈا سپیکر کا استعمال درست نہیں ہے‘‘

[القول المقبول فی عظمۃ قول اللہ والرسول، مؤلفہ مفتی محمد صاحبداد خاں، صفحہ:۵۳]

حضور صدر الشریعہ فرماتے ہیں

’’آلہ مکبر الصوت (لاؤڈا سپیکر) سے خطبہ سننے میں حرج نہیں مگر اس کی آواز پر رکوع سجود کرنا مفسد نماز ہے،

دوسرے فتوی میں فرماتے ہیں:

’’اس کے ناجوازی کی وجہ اب تک ذہن میں نہیں آئی ہے .... مگر نماز میں یہ جدت اچھی معلوم نہیں ہوتی جو طریقہ سلف صالحین کا ہے اس سے عدول اچھا نہیں‘‘[فتاوی امجدیہ، ۱۹۰/۱]

مفتی حبیب اللہ نعیمی فرماتے ہیں:

’’اکابر علمائے کرام وجمہور مفتیان عظام نے نماز میں لاؤڈا سپیکر کے استعمال کو ممنوع قرار دیا ہے بعض نماز کے فاسد ہونے کے قائل ہوئے اور بعض مکروہ ہونے کے،اس کے استعمال کو ممنوع سب نے قرار دیا ہے۔دوسرے فتوی میں فرماتے ہیں:

’’اجمیر شریف یا جامع مسجد دہلی یا ناخدا مسجد کلکتہ کا فعل وعمل قابل حجت نہیں اگر کچھ مساجد میں اس کا استعمال دلیل جواز ہو سکتا ہے تو لاکھوں مساجد میں اس کا عدم استعمال عدم جواز کی دلیل بطریق اولیٰ ہو سکتا ہے۔‘‘

[حبیب الفتاوی، ۴۵۸/۱]

مفتی جلال الدین امجدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

’’جولوگ صرف لاؤڈا سپیکر کی آواز پر رکوع وسجود کریں گے ان کی نماز نہ ہوگی۔یہی فتوی حضور مفتی اعظم ہند قبلہ دامت برکاتہم القدسیہ اور بہت سے اکابر اہل سنت کا ہے۔اور بعض لوگوں کے نزدیک اگرچہ نماز ہوجائے گی لیکن چونکہ معاملہ نماز جیسی اہم عبادت کے جائز اور ناجائز ہونے کا ہے اس لئے تاوقتیکہ محققین فن یہ ثابت نہ کر دیں کہ لاؤڈا سپیکر کی آواز بعینہٖ متکلم کی آواز ہے احتیاطا نماز کے ناجائز ہونے کا ہی حکم دیا جائے گا۔‘‘[فتاوی فیض الرسول، ۳۵۷/۱۔۳۵۸]

حضور حافظ ملت فرماتے ہیں:

’’مجھے اس کی تحقیق نہیں احتیاط احتراز میں ہے۔مزید فرماتے ہیں:

حدیث شریف میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایسی چیز کو چھوڑدو جس میں شک وشبہہ ہو اور اسے اختیار کرو جس میں کوئی شبہہ نہیں۔لہٰذا میری رائے میں یہی صورت زیادہ مناسب ہے کہ لاؤڈا سپیکر نماز میں استعمال

ہی نہ کیا جائے کہ نماز میں کسی قسم کا جھگڑا اور شبہہ ہو۔ [مقدمہ فتاوی شارح بخاری، ۱/۳۹]

مفتی نظام الدین صاحب نے مائک میں نماز کے جائز ہونے کی تحقیق فرمائی ہے لیکن ان کا موقف بھی اس سلسلہ میں حضور حافظ ملت کی طرح نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے بچنے کا ہی ہے۔

خود لکھتے ہیں:

"حضرت (مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ) نے لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے عدم جواز کے کثیر فتاوی صادر کئے البتہ راقم کا موقف اس باب میں وہ ہے جو حضور حافظ ملت مولانا شاہ عبد العزیز محدث مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔"

[مرجع سابق، ص ۴۱]

الغرض لاؤڈ اسپیکر پر نماز ادا کرنے کے سلسلے میں مختلف اقوال ہیں کچھ فساد نماز کا حکم دیتے ہیں کچھ علما مکروہ تحریمی کا حکم دیتے ہیں کچھ مطلقا جواز کا حکم دیتے ہیں کچھ مکبرین وغیرہ کی قید کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسئلہ میں علمائے کرام کے درمیان اختلاف شدید ہے۔ جب علمائے کرام کے مابین کسی مسئلہ میں اختلاف واقع ہو تو اس اختلاف سے بچنا ہی بہتر ہے جیسا کہ، بنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

''بل أوجب للخروج عن الخلاف لا سيما في باب العبادات'' یعنی اختلاف سے نکلنا ضروری ہے خاص کر عبادات کے معاملے میں

[بنایہ شرح ہدایہ، ۳/۲۳۱، باب صلاۃ الجنازۃ فی المسجد،]

غمز عیون البصائر میں ہے:

''قد نصوا على أن الخروج من الخلاف مندوب''

علما نے اس پر نص فرمائی ہے کہ اختلاف سے نکلنا مستحب ہے [غمز عیون البصائر، ۲/۶۳، کتاب الزکاۃ]

بحر الرائق میں ہے:

''والخروج من الخلاف مستحب عندنا'' ہمارے نزدیک اختلاف سے بچنا مستحب ہے [۱/۹۴، کتاب الطہارۃ،]

در مختار میں ہے:

''يندب للخروج من الخلاف لا سيما للإمام'' اختلاف سے نکلنا مستحب ہے خاص کر امام کے لئے

[۱/۲۷۹، ۲۷۸، کتاب الطہارۃ]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"محل اختلاف علما میں مراعات خلاف جہاں تک ارتکاب مکروہ کو مستلزم نہ ہو بالاجماع مستحب ہے۔

[فتاوی رضویہ قدیم، ۳/۳۶۸]

اور نماز جیسی اہم عبادت میں احتیاط بھی بہت ضروری ہے، اور اس میں احتیاط یہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال نہ کیا جائے، علمائے کرام نے اس پر نص فرمائی ہے کہ عبادات میں احتیاط ضروری ہے۔ فتاوی شامی میں ہے:

''أن الأخذ بالاحتياط فی باب العبادات واجب''

احتیاط پر عمل کرنا عبادات کے معاملہ میں ضروری ہے۔[ردالمحتار، باب صدقة الفطر، ۳۶۶/۲]

مراقی الفلاح میں ہے:

''الاحتیاط لازم فی باب العبادات''، یعنی عبادات کے معاملہ میں احتیاط برتنا ضروری ہے۔

[مراقی الفلاح، ص ۴۱، کتاب الطهارة، فصل مایجب فيه الاغتسال]

لہٰذا نماز میں لاؤڈاسپیکر کا استعمال کرنے سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کی جائے۔اس کے باوجود بھی اگر فتنہ وفساد کے سبب لاؤڈاسپیکر استعمال کرنا پڑجائے تو مکبرین کا بھی انتظام کیا جائے اور اگر اس صورت پر بھی کام نہ بنے تو امام مسجد لوگوں کو مسئلہ سے آگاہ کرنے کے بعد لاؤڈاسپیکر پر نماز پڑھا سکتا ہے۔امام کو صرف اس وجہ سے مسجد سے استعفی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

بریلی شریف میں حضور تاج الشریعہ کی سرپرستی میں ہونے والے فقہی سیمینار میں لاؤڈاسپیکر پر نماز سے متعلق یہی فیصلہ کیا گیا ہے۔ہم آخر میں وہ فیصلہ یہاں پر پیش کئے دیتے ہیں۔

"**(۱)** لاؤڈاسپیکر کی آواز متکلم کی عین آواز نہیں ہے اس لئے محض لاؤڈاسپیکر سے مسموع آواز پر اقتدا ہم احناف کے نزدیک صحیح نہیں، بالفرض یہ آواز ماہیت کے اعتبار سے متکلم کی آواز بھی ہو تو بھی حکماً یہ اصل آواز نہیں لہٰذا اب بھی محض اس آواز پر اقتدا درست نہیں ہوگی۔

(۲) جہاں کہیں نماز میں لاؤڈاسپیکر کے استعمال پر لوگ جبر کریں وہاں مکبرین کا بھی انتظام کیا جائے اور مقتدیوں کو مسئلہ کی صورت آگاہ کرتے ہوئے ہدایت کی جائے کہ وہ لاؤڈاسپیکر کی آواز پر اقتدا نہ کرکے مکبرین کی آواز پر اقتدا کریں۔

(۳) اسی طرح مکبرین کو بھی ہدایت کی جائے کہ وہ بھی لاؤڈاسپیکر کی آواز پر اقتدا نہ کریں۔

(۴) کہیں مکبر مقرر کرنے کی بھی صورت نہ بنے تو امام مسئلہ بتادے وہ اس بنا پر امامت سے مستعفی نہ ہو۔"

[فیصلہ جات شرعی کونسل، ص ۳۸]

بالجملہ :۔ نماز میں لاؤڈاسپیکر کا استعمال اکثر علمائے کرام کے نزدیک درست نہیں ہے اس لئے حکم شرع یہی ہے کہ لاؤڈاسپیکر پر نماز نہ پڑھائی جائے۔

اور اگر واقعی مجبوری پائی جائے اور لوگ سمجھانے کے باوجود بھی نہ مان رہے ہوں لڑائی کا اندیشہ ہو تو امام صاحب نمازیوں کو مسئلہ سے آگاہ کرکے نماز پڑھا سکتے ہیں۔لیکن جہاں تک ممکن ہو بچنے کی کوشش کی جائے کیوں کہ نماز ایک اہم عبادت ہے اس میں کسی طرح کی بے احتیاطی نماز کو برباد بھی کرسکتی ہے۔

رہا معاملہ تراویح میں قرآن شریف سننے کا تو صرف اس کی وجہ سے لاؤڈاسپیکر پر نماز کے جائز ہونے کا حکم نہیں دیا جاسکتا ہے۔نماز خواہ فرض، واجب، سنت، نفل ہو یا تراویح ہو نماز تو نماز ہے۔اور کوئی بھی نماز مائک پر علمائے اہل سنت کی اکثریت کے نزدیک جائز نہیں ہے۔اور لوگوں کا یہ کہنا کہ تراویح میں قرآن نہیں سنیں گے تو تراویح نہیں ہوں گی یہ مسئلہ

انہوں نے خود گڑھاہے۔ شریعت میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مائک اب قریب سوسال سے وجود میں آیا ہے اس سے پہلے تیرہ سو سال جو فرض وواجب نمازیں اور تراویح جماعت سے ادا کی گئیں ان میں مائک یامائک جیسی کسی چیز کا استعمال نہیں ہو تا تھا۔ اور نمازی بھی کثیر تعداد میں ہوتے تھے تو کیا سب کو آواز آتی تھی؟ ہر گز نہیں۔ بڑے بڑے مجمع میں نمازیں ہوتی تھیں۔ ہزاروں لاکھوں مقتدی نماز میں ہوتے تھے۔ تراویح بھی پڑھتے تھے۔ کیا سب کو آواز آتی تھی یقیناً نہیں آتی ہو گی۔
تو کیا ان سب کی نماز نہیں ہوئی؟ کیا انہیں ثواب نہیں ملا؟ بلاشبہ ملا ہو گا۔ تو پھر اس طرح کی لایعنی باتیں کرنا اور شریعت کے مسائل میں مداخلت کرنا ہر گز مسلمان کو زیب نہیں دیتا ہے۔ مومن کو تو شریعت کے مباح مسئلہ پر بھی عمل کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔
اور یہ معاملہ تو فرض نماز کا ہے۔ اس لئے اس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ کہیں مائک کے چکر میں نمازیں ضائع نہ ہو جائیں۔

ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

فتوی ۳۱ جمعہ کی نماز کے لیے امام کے تقرر کے احکام

مسئولہ: (قاری) محمد عبد السمیع (صاحب) کالپی شریف ضلع جالون۔ ۲۲ر رجب المرجب ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان ذوی الاحترام درج ذیل مسئلہ میں
جمعہ کی نماز کے لئے امام منتخب کرنے کا حق کس کو حاصل ہے کیا چند لوگ مل کر کسی کو امام جمعہ بنا سکتے ہیں اگر نہیں تو ایسے منتخب کردہ امام کے پیچھے نماز جمعہ کی ادائیگی کا کیا حکم ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

نماز جمعہ میں امام کے انتخاب کے لئے سلطان اسلام یا اس کے نائب یا سلطان کے ماذون اور ان کی غیر موجودگی میں علمائے اہل سنت میں سے کسی قاضی اور فقیہ کا جو علما میں سب سے زیادہ علم رکھتا ہو، ہونا شرط ہے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہوں تو بمجبوری بستی کے مسلمانان اہل سنت کی اکثریت جس امام کا انتخاب کرے اس کے پیچھے نماز جمعہ ادا کرنے کی اجازت ہو گی۔ اور چند لوگوں کے امام منتخب کرنے سے کسی کو جمعہ کا امام نہیں مانا جا سکتا اور اس کی پڑھائی جانے والی نماز پر نماز جمعہ کا حکم بھی نہیں ہو گا۔ وہ ازروئے شرع باطل محض قرار دی جائے گی۔ حضور اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:
"حکم شرعی یہ ہے کہ اقامتِ جمعہ کے لئے سلطانِ اسلام یا اُس کا نائب یا اُس کا ماذون شرط ہے اور جہاں سلطانِ اسلام نہ ہو عالم دین فقیہ معتمد اعلم اہل بلد کے اذن سے امامِ جمعہ وعیدین مقرر ہو سکتا ہے اور جہاں یہ بھی نہ ہو تو بمجبوری جسے وہاں کے عامہ مسلمین انتخاب کرلیں وُہ امامت جمعہ یا عیدین کر سکتا ہے ہر شخص کو اختیار نہیں کہ بطورِ خود یا ایک دو یا دس بیس یا سو پچاس کے کہے سے امامِ جمعہ یا عیدین بن جائے ایسا شخص اگرچہ اس کا عقیدہ بھی صحیح ہو اور عمل میں بھی فسق وفجور نہ ہو جب بھی امامتِ جمعہ وعیدین نہیں کر سکتا اگر کرے گا نماز اُس کے پیچھے باطل محض ہو گی کہ اُن تین طریقوں میں سے ایک وجہ کا امام یہاں

شرطِ صحت نماز تھا جب شرط مفقود مشروط مفقود ولہذا صورتِ مسئولہ میں پہلے لوگوں کا جمعہ باطل محض ہوا اور دوسرے لوگوں کا صحیح دُرمختار میں ہے:

یشترط لصحتها السلطان او مامورہ باقامتها،

جمعہ کی صحت کے لئے سلطان یا اس شخص کا ہونا جس کو سلطان نے اقامتِ جمعہ کی اجازت دی ہو ضروری ہے۔

حدیقہ ندیہ میں ہے:

اذا خلا الزمان من سلطان ذی کفایة فالامور موکلة الی العلماء ویلزم الامة الرجوع الیهم ویصیرون ولاة فاذا عسر جمعهم علی واحد استقل کل قطر باتباع علمائه فان کثروا فالمتبع اعلمهم،

جب زمانہ کامل سلطان سے خالی ہو جائے تو معاملات علما کے سپرد ہوں گے اور امّت پر علما کی طرف رجوع لازم ہوگا اور علما والی بن جائیں گے اور جب علما کا کسی ایک معاملہ پر اجماع واتفاق مشکل ہو جائے تو لوگ اپنے اپنے علاقے کے علما کی اتباع کریں، اگر علاقے کے علما کی کثرت ہو تو پھر ان میں سے بڑے عالم کی اتباع کریں، تنویر الابصار ودرمختار میں ہے:(نصب العامة) الخطیب غیر معتبر مع وجود من ذکر۔ واللہ تعالیٰ اعلم (عام لوگوں کا مقرر کرنا) خطیب کو معتبر نہیں جبکہ مذکورہ لوگوں میں سے کوئی ایک موجود ہو۔"

[فتاوی رضویہ قدیم، جلد ۳ صفحہ ۲۷۵۔۲۷۶]

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"جمعہ وعیدین وکسوف میں کوئی امامت نہیں کر سکتا اگرچہ حافظ قاری متقی وغیرہ وغیرہ فضائل کا جامع ہو۔ مگر وُہ جو بحکم شرع عام مسلمانوں کا خود امام ہو کہ بالعموم اُن پر استحقاقِ امامت رکھتا ہو، یا ایسے امام کا ماذون ومقرر کردہ ہو اور یہ استحقاق علی الترتیب صرف تین طور پر ثابت ہوتا ہے۔

اوّل: وہ سلطان اسلام ہو۔

ثانی: جہاں سلطنت اسلام نہیں وہاں امامتِ عامہ اس شہر کے اعلم علما کو ہے۔

ثالث: جہاں یہ بھی نہ ہو وہاں بمجبوری عام مسلمان جسے مقرر کر لیں، بغیر ان صورتوں کے جو شخص نہ خود ایسا امام ہے نہ ایسے امام کا نائب وماذون ومقرر کردہ، اس کی امامت ان نمازوں میں اصلاً صحیح نہیں، اگر امامت کرے گا نماز باطل محض ہوگی، جمعہ کا فرض سر پر رہ جائے گا۔ ان شہروں میں کہ سلطانِ اسلام موجود نہیں اور تمام ملک کا ایک عالم پر اتفاق دشوار ہے، اعلم علمائے بلد کہ اس شہر کے سنّی عالموں میں سب سے زیادہ فقیہ ہو، نماز کے مثل مسلمانوں کے دینی کاموں میں ان کا امام عام ہو اور بحکم قرآن عظیم اُن پر اُس کی طرف رجوع اور اسکے ارشاد پر عمل فرض ہے، جمعہ وعیدین وکسوف کی امامت وہ خُود کرے یا جسے مناسب جانے مقرر کرے اُس کے خلاف پر عوام بطور خود اگر کسی کو امام بنالیں گے صحیح نہ ہوگا کہ عوام کا تقرر بمجبوری اس حالت میں روا رکھا گیا ہے جب امام عام موجود نہ ہو، اُس کے ہوتے ہوئے اُن کی قرارداد کوئی چیز نہیں"

[مرجع سابق ص ۷۱۸۔۷۱۹]

الحاصل: نماز جمعہ کے لئے امام منتخب کرنے کا کام سلطان اسلام یا نائب سلطان یا سلطان کے ماذون اوران کے نہ ہونے پر علمائے اہل سنت کے سب سے زیادہ علم رکھنے والوں کا ہے۔اوراگر یہ بھی موجود نہ ہوں تو بستی کے مسلمانوں کی اکثریت امام جمعہ منتخب کرے،اوراگر چند لوگوں نے امام کا انتخاب کیا مگر اکثریت نے اسے قبول نہیں کیا تو ایسا امام بھی نماز جمعہ پڑھانے کا مجاز نہیں ہے۔ھٰذا ماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ

نماز میں قرآن پاک درست نہ پڑھنے والے کے پیچھے نماز کا حکم
مائک پر سلام پڑھنا جائز ہے

فتوی ۳۲ مسئولہ: خلیق احمد عرف سجن پردھان موضع رمپورہ شاکر۔۱۸ر صفر المظفر ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام درج ذیل مسائل میں

(۱) قرآن پاک پڑھنے میں امام صاحب کی کئی جگہ خامیاں دیکھی جارہی ہیں۔کھڑے پڑے زبر زیر کا کچھ خیال نہیں رکھتے عین کی جگہ الف ق کی جگہ ک ط کی جگہ ت ذ کی جگہ زاورح کی جگہ ہ یہ تمام حروف صحیح طور سے ادا نہیں ہوتے۔اس کے علاوہ کہیں الف کو بڑھا دیا تو کہیں الف کم کر دیا مد کی جگہ الف پڑھ دیا اور مد متصل کی جگہ مد منفصل پڑھ دیا اور بھی کئی خامیاں ہیں جیسے نماز میں جلدی کرنا اور پچھلے دامن کو بار بار جھٹکا دینا ان حرکات پر وہ دھیان نہیں دیتے اوراسی طرح نمازیں پڑھا رہے ہیں۔

کیا ان تمام صورتوں میں ان کے پیچھے نمازیں ہورہی ہیں یا نہیں؟

اور جو نمازیں اب تک ان کے پیچھے پڑھی ہیں کیا ان کو دہرایا جاے۔

(۲) مائک سے سلام پڑھنا کیسا ہے ایک صاحب کا کہنا ہے کہ فتاوی فیض الرسول وغیرہ کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر اس سے کسی مریض کو تکلیف ہو،یا کسی کی نماز میں خلل واقع ہورہا ہو یا نیند میں خلل پڑتا ہو تو مائک پر یا تیز آواز میں جائز نہیں ہے۔خلاصہ جواب سے آگاہ فرمائیں۔نوازش ہوگی۔

الجواب

(۱) ایسا شخص لائق امامت نہیں ہے،قرآن پاک کے ہر ہر حرف کو اس کے مخرج کے ساتھ ادا کرنا لازم ہے۔حروف کو بدلنا حرام ہے۔جس طرح کی خامیاں ذکر کی گئی ہیں وہ اگر دانستہ ہیں ان میں سے کچھ حرام اور کچھ کفر کی حد تک جاتی ہیں ایسی غلطیاں عام طور پر فساد معنی کا موجب ہوتی ہیں۔اور فساد معنی کے سبب نماز بھی نہیں ہوتی ہے۔الغرض ایسا شخص جو حروف کی ادائیگی پر قادر ہونے کے باوجود بھی اس طرح کی غلطیاں کرتا ہے ہرگز ہرگز لائق امامت نہیں ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

’’من لا یحسن بعض الحروف ینبغی أن یجهد ولا یعذر فی ذلك فإن کان لا ینطق لسانه فی بعض الحروف إن لم یجد آیة لیس فیها تلك الحروف تجوز صلاته ولا یؤم غیرہ‘‘

جو شخص حروف کو اچھی طرح ادا نہیں کرسکتا اس پر لازم ہے کہ کوشش کرے اور وہ اس سلسلے میں معذور نہیں ہے اس کے

باوجود بھی وہ بعض حروف جو وہ ادا نہیں کرپاتا اور اس کو ان حروف کے علاوہ کوئی اور آیت نہیں ملی تو وہ خود اس کی نماز جائز ہے البتہ وہ امامت نہ کرے۔" [باب فی زلۃ القاری، جلد ۱ ص ۷۹]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"اگر ایسی غلطیاں کرتا ہے کہ معنی میں فساد آتا ہے مثلاً حرف کی تبدیل جیسے ع ط ص ح ظ کی جگہ وت س ہ ز پڑھنا کہ لفظ مہمل رہ جائے یا معنی میں تغیر فاحش راہ پائے یا کھڑا پڑا کی بد تمیزی کہ حرکات بڑھ کر حروف مدہ ہو جائیں اور وہی قباحتیں لازم آئیں، جس طرح بعض جہال نستعین کو نستاعین پڑھتے ہیں کہ بے معنی.... تو ہمارے ائمہ متقدمین کے مذہب صحیح و معتمد محققین پر مطلقاً خود اس کی نماز باطل ہے.... اور جب اُس کی اپنی نہ ہو گی تو قواعد داں وغیرہ کسی کی اس کے پیچھے نہ ہو سکے گی۔ فان صلوٰۃ المأموم مبتنیۃ علی صلوٰۃ الامام۔ اور اگر غلطی یوں ہے کہ حرف بروجہ صحیح ادا نہیں کر سکتا جس طرح آج کل عام دہقانوں اور بہت شہریوں کا حال ہے تو اب جمہور متاخرین کا بھی فتوی اسی پر ہے کہ اس کے پیچھے صحیح خواں کی نماز باطل

کما افادہ العلامۃ الغزی والعلامۃ الخیر الرملی وغیرھما۔

اور جب اس کی اپنی نہ ہو گی اور اگر عجزیوں ہے کہ سیکھنے کی کوشش نہ کی یا کچھ دنوں کر کے چھوڑ دی اگر لپٹا رہتا تو امید تھی کہ آجاتا جب تو ایسی غلطی ان کے نزدیک بھی خود اس کی اپنی نماز بھی باطل کرے گی۔ غرض ایسا شخص امام بنانے کے لائق نہیں اور اگر ایسی غلطی نہیں کرتا جس سے فسادِ معنی ہو تو نماز خود اس کی بھی صحیح اور اس کے پیچھے اور سب کی صحیح، پھر اگر حالت ایسی ہے کہ تجوید کے امور ضروریہ واجبات شرعیہ ادا نہیں ہوتے جن کا ترک موجب گناہ ہے جیسے مد متصل بقدر ایک الف وغیرہ۔ جب بھی اُسے امام نہ بنایا جائے گا نماز اس کے پیچھے بشدت مکروہ ہو گی۔ لاشتمالھا علی امر مؤثم وکونہ فاسقا بتمادیہ علی ترك واجب متحتم۔" [فتاوی رضویہ قدیم، جلد ۳ ص ۱۹۱]

حضور صدر الشریعہ فرماتے ہیں:

"قرآن مجید مطلقا صحیح پڑھنا فرض ہے نماز میں ہو یا بیرون نماز.... جو شخص مخارج سے نہیں ادا کرتا اس کے پیچھے اس شخص کی نماز نہیں ہو سکتی جو صحیح پڑھ سکتا ہو.... جب شریعت مطہرہ یہ حکم دیتی ہے کہ جو قدرت نہ رکھتا ہو وہ دن رات کوشش کرے پھر بھی صحیح ادا نہ کر سکے تو زمانہ کوشش کی نماز ہو جائے گی تو جو باوجود قدرت صحیح ادا نہیں کرتا اس کی شناعت کا کیا پوچھنا یہ شخص تارک فرض ہے۔" [فتاوی امجدیہ جلد ۱ ص ۸۶۔۸۸]

(۲) مائک پر درود و سلام پڑھنا بلا شبہہ جائز ہے۔ فتاوی فیض الرسول وغیرہ میں جو بیان کیا گیا ہے وہ بھی درست ہے۔

حضور اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ

"ذکر بجہر صحیح یہ ہے کہ جائز ہے... مگر ایسا ہو جس سے کسی کی نماز یا تلاوت یا نیند میں خلل آئے یا مریض کو ایذا پہنچے ناجائز ہے"

[فتاوی رضویہ جلد نہم نصف آخر، ص ۱۲۶]

مگر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ جس طرح مائک پر پانچوں وقت اذان ہوتی ہے اور اذان سن کر کسی مسلمان کو تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ اس سے فرحت و سکون محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح مومن سنی صحیح العقیدہ بھی صلاۃ و سلام سن کر خوشی محسوس

کرتا ہے۔ اگر اذان سے بھی کسی مریض کو تکلیف ہو تو مائک پر اذان بھی درست نہیں ہوگی۔ چہ جائیکہ درودوسلام۔ تو جس طرح اذان سے کسی مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچتی ہے بالیقین صلاۃ وسلام سے بھی کسی کو تکلیف نہیں محسوس ہوتی ہوگی۔ پھر بھی اگر کسی سنی صحیح العقیدہ مریض کو تکلیف ہو تو اس کا خیال رکھا جائے۔ نیز سلام پڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ مسجد میں کوئی نمازی نماز میں تو نہیں ہے اور نمازیوں کو بھی کوشش کرنی چاہئے کہ سلام کے وقت خاص کر نماز اور تلاوت موقوف کر کے سلام میں شرکت کریں تاکہ سلام کی برکتیں بھی حاصل ہو جائیں۔ بعد میں نماز ادا کر لے۔

ہاں اگر وقت نہیں ہے تو نماز ادا کرے اور کوشش کرے ایسی جگہ نماز پڑھے جہاں نماز میں خلل واقع نہ ہو اس طرح نماز بھی ہو جائے اور سلام بھی۔ پھر بھی اگر نماز میں خلل واقع ہو تو لوگوں کو چاہئے اس کی نماز کے اختتام کا انتظار کریں بعد میں سلام پڑھیں ۔ مگر عام طور پر سنیوں کا معمول ہے کہ مساجد میں نماز کے بعد ہی صلاۃ وسلام پڑھتے ہیں تو اس وقت کسی سنی صحیح العقیدہ کو سلام سے کوئی تکلیف بظاہر نہیں ہونی چاہئے۔

الحاصل:۔ مائک پر سلام پڑھنا جائز ہے جس طرح اذان پڑھنا جائز ہے۔ کسی سنی صحیح العقیدہ کو واقعی تکلیف ہو کہ اس کی نماز میں خلل واقع ہو رہا ہے یا کسی مریض کو تکلیف واقعی ہو وغیرہ تو ایسی صورت میں مائک میں سلام پڑھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اور پھر اذان کی بھی مائک پر اجازت نہیں ہوگی کیوں کہ مائک پر اذان دینا ضروری نہیں ہے۔ اور اس سے کسی مریض کو تکلیف ہو رہی ہے یا اس شخص کی نیند میں خلل واقع ہو رہا ہے جو کسی ایسی مسجد میں نماز باجماعت ادا کر چکا ہے جہاں کچھ وقت پہلے نماز ہوتی ہے۔ یا کوئی شخص تلاوت قرآن کر رہا ہے۔ تو ایسی صورت میں اذان بھی مائک پر درست نہیں ہوگی۔ مائک پر سلام پڑھنے سے عام طور وہابیہ و دیابنہ کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ اس طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ سنی صحیح العقیدہ حضرات اس طرح کی باتیں نہیں کرتے ان کو سلام کا وقت معلوم ہوتا ہے اور یہ خبر ہوتی ہے کہ روزانہ اس وقت سلام پڑھا جاتا ہے تو وہ اپنا معمول اسی کے مطابق کر لیتے ہیں۔ ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

جھوٹی قسم کھانے، تراویح پر اجرت طے کرنے، فتنہ پھیلانے والے امام کی امامت کا حکم شرعی

فتوی ۳۳ مسئولہ: زید صدیقی E3 / 1729، شہید نگر آگرہ۔ ۲۶؍ رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

مسجد کے امام صاحب نے قرآن کی قسم کھائی کہ میں کمیٹی والوں کی برائی نہیں کروں گا اور پھر بھی برائی کی تو ایسے امام کے بارے میں آپ کا کیا جواب ہے ؟ قرآن سنانے کی اجرت طے کرنا گیارہ ہزار روپے اس کے بعد پتہ چلا کہ وہ امام جو گیارہ ہزار روپے مانگ رہا ہے وہ حافظ قرآن نہیں ہے تو دوسرے حافظ کے پیچھے سننے کے بھی گیارہ ہزار روپے مانگ رہا ہے ایسے امام کے بارے میں آپ کا کیا جواب ہے ؟ کمیٹی کے خلاف کام کرنا اور بستی میں جاکر کمیٹی کے خلاف برائی کرنا جب کہ انہوں نے کلام پاک کی قسم کھائی تھی کہ میں کمیٹی کی برائی نہیں کروں گا بستی میں فتنہ فساد پھیلانا یہ سب جائز ہے آپ ہی فیصلہ کیجئے۔

الجواب

سوال میں درج باتیں اگر سچ ہیں تو پھر ایسے امام کی امامت ہرگز درست نہیں ہے۔ امام مذکور جھوٹ بولنے، کلام پاک کی قسم کھاکر اس پر عمل نہ کرنے، وعدہ خلافی اور قرآن سنانے یا پھر سننے کی اجرت طے کرنے نیز لوگوں میں فتنہ وفساد پھیلانے کی وجہ سے فاسق ہے۔ اور فاسق کی امامت مکروہ تحریمی ہے، امام طحطاوی فرماتے ہیں:

''إمامة الفاسق مکروهة تحريما'' (یعنی فاسق کی امامت مکروہ تحریمی ہے)

[حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح: ص ۳۰۲، فصل فی بیان احق بالامامة]

اور فاسق کی امامت کے مکروہ تحریمی ہونے کی وجہ امداد الفتاح شرح نورالایضاح میں یہ بیان کی گئی ہے

''کره إمامة الفاسق العالم لانه لايهتم لامردينه ولان في تقديمه للامامة تعظيمه وقد وجب إهانته شرعا''

(یعنی فاسق عالم کی امامت مکروہ ہے اس لئے کہ وہ اپنے دینی معاملات کا اہتمام نہیں کرتا اور اس لئے کہ اس کو امامت کے لئے آگے بڑھانے میں اس کی تعظیم ہے حالانکہ ازروئے شرع اس کی توہین واجب ہے)

[امدادالفتاح شرح نورالایضاح: ص ۳۴۲ فصل فی بیان احق بالامامة]

لہٰذا نمازیوں کو چاہئے کہ اگر واقعی امام مذکور میں یہ خامیاں ہوں تو فورا امام کو امامت سے معزول کریں۔ اور دوسرے پابند شرع امام کا انتظام کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ان سرکم ان تقبل صلاتکم فليؤمكم خياركم''

یعنی اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری نماز قبول ہو تو چاہئے کہ تمہارے نیک تمہاری امامت کریں۔ [مستدرک للحاکم، ۲۲۲/۳]

هٰذا ماعندی والعلم عندالله تعالیٰ

جسم فروشی کا دھندا کرنے والے شخص سے دوستی رکھنے، اس سے اذان پڑھوانے، اسے مسجد کی دکان دینے والے شخص کی امامت کا حکم

فتوی ۳۴　مسئولہ: ارشاد حسین ممن چوک بدایوں۔ ۲۰ر رجب المرجب ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں

کہ ایسا شخص بحیثیت امام مسجد میں مقرر کیا جاسکتا ہے جو جسم فروشی کا دھندا چلانے والے شخص سے بحیثیت دوست کے قربت رکھتا ہو اور عوام کے اعتراض کے بعد بھی مسجد کے اندر اس شخص کی صحبت اختیار کرتا ہو۔

(۲) کیا مسجد کے امام کو ایسے شخص سے اذان دلوانا اور اس کے پاس مسجد کے حجرے کی چابی رکھنا جائز ہے جو جسم فروشی کا دھندا چلاتا ہو۔

(۳) کیا امام صاحب کو جسم فروشی کا دھندا چلانے والے کو مسجد کی دکان کرائے پر دینا جائز ہے جب کہ وہ دکان خود امام صاحب کے نام کرائے پر ہو۔ کیا ایسے امام کے پیچھے پڑھی گئی نمازیں ہوئیں یا ضائع ہوئیں۔

الجواب

جسم فروشی کا دھندا کرانے والا شخص فاسق وفاجر ہے۔ اور فاسق کی اہانت واجب وضروری ہے۔
تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق میں ہے: ''الفاسق....وجب علیهم اهانته شرعاً''
لوگوں پر ازروئے شرع فاسق کی توہین ضروری ہے۔ [تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق: ۱۵۷/۲، باب الاحق بالامامۃ]
امام مذکور کا ایسے شخص سے دوستی میل جول محبت اذان وغیرہ پڑھوا کر اس کی عزت افزائی اور بجائے اس کے کہ خود بھی اس کا بائیکاٹ کرتا اور دوسروں کو بھی اس سے مقاطعہ کا حکم دیتا اسے مسجد کے حجرے میں رکھنا اور مسجد کی دکان دینا اس کا ہر طور تعاون کرنا گویا اس کے گناہ پر مدد کرنا ہے، حالانکہ اللہ پاک نے گناہ پر مدد کرنے سے منع فرمایا ہے۔
''ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان'' گناہ اور زیادتی پر باہم مدد نہ دو۔ [ترجمہ کنز الایمان: پارہ ۶ سورہ مائدہ آیت ۲]
لہٰذا ایسا امام جو فاسق وفاجر کی صحبت میں رہتا ہو اور اسے دینی معاملات میں بھی شریک رکھتا ہو نیز اس کی اہانت کے بجائے اسے عزت دیتا ہو ہرگز ہرگز لائق امامت نہیں ہے۔ دینی معاملات میں لاپروائی برتنے والے کی اقتدا میں نماز پڑھنا ازروئے شرع جائز نہیں۔ امداد الفتاح شرح نور الایضاح میں ہے:
''کرہ إمامة الفاسق العالم لانه لایهتم لامردینه ولان فی تقدیمه للامامة تعظیمه وقد وجب إهانته شرعا''
(فاسق عالم کی امامت مکروہ ہے اس لئے کہ وہ اپنے دینی معاملات کا اہتمام نہیں کرتا اور اس لئے کہ اس کو امامت کے لئے آگے بڑھانے میں اس کی تعظیم ہے حالانکہ شرعاً اس کی توہین واجب ہے)
[امداد الفتاح: ص ۳۴۲ فصل فی بیان احق بالامامۃ]
ایسی صورت میں جو نمازیں اس امام کی اقتدا میں ادا کی گئیں انہیں دوبارہ ادا کرنا چاہیے۔
هٰذا ما عندی والعلم عند الله تعالیٰ

خلاف شرع حرکات پر توبہ کئے بغیر نماز پڑھانے والے امام کے پیچھے نماز نہیں ہو گی

فتوی ۳۵ مسئولہ: ساکنان روشن آباد سیڈ کل ہریدوار اتراکھنڈ۔ ۱۵/ جمادالاولیٰ ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں
کہ ایک گاؤں میں ایک امام صاحب تقریباً چھ سال سے امامت کر رہے تھے انہوں نے امامت پر آنے سے قبل اپنے کو حافظ بتایا۔ مگر معلوم ہوا وہ حافظ نہیں تھے۔ معلوم ہونے پر لوگوں نے اعتراض کیا کہ امام صاحب جھوٹ بول رہے ہیں لہٰذا ان کا استعفیٰ ہو گیا۔ اس کے بعد لوگوں میں مشورہ ہوا اور امام صاحب کو دوبارہ بلا لیا گیا۔ مگر کچھ لوگوں کا اعتراض اب یہ ہے کہ امام صاحب نے توبہ نہیں کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ امام صاحب کے اوپر اپنے جھوٹ سے توبہ لازم تھی یا نہیں؟

اور کیا توبہ سب کے سامنے کرنا لازم تھا۔ اور بغیر توبہ ان کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور یہ اعتراض پہلے بھی تھا امام مذکور ایک عامل بھی ہیں ان کے پاس مسلم اور غیر مسلم عورتیں بے پردہ آتی ہیں امام صاحب آسیب وجن اتارنے کے لئے ان عورتوں کی چوٹیاں پکڑتے ہیں۔ عورتیں خارج مسجد مدرسہ میں بلند آواز سے چلاتی ہیں۔ امام صاحب سے گفتگو کی گئی تو کوئی طرح کے حیلے بہانے کرکے خود کو بچالیتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ان کی طرف درای میں اتر آئے اور امام صاحب کو لے کر کافی تنازع بڑھ رہاہے لوگوں میں۔ آیا ایسا صورت میں امام مذکورہ کی اقتدا میں نماز ادا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

بینوا توجروا۔ چند ذمہ دراحضرات کے دستخط: نثار۔ عبد الغفار۔ وسیم احمد۔ شاہد احمد۔ حنیف۔ شاکر۔ افضل علی

الجواب

صورت مسئولہ میں امام مذکور کا جھوٹ بولنا اور غیر محرم عورتوں سے ملنا، ان کی چوٹیاں پکڑنا اور پھر عورتوں کا شوروغل کرکے غیر محرم مردوں تک اپنی آواز پہنچانا، یہ سب باتیں سخت خلاف شرع اور ناجائز وحرام ہیں۔ امام مذکور کو چاہئے کہ علی الاعلان اپنے جھوٹ سے توبہ کرے اور اپنی خلاف شرع حرکات سے باز آئے۔ اور اگر امام ایسا نہ کرے تو مسجد کے ذمہ داروں پر لازم ہے کہ فورا امام کو امامت سے معزول کریں ورنہ سخت مجرم وگنہگار مستحق عذاب نار ہوں گے۔

بحر العلوم جھوٹے امام کی امامت کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”امام علی الاعلان جھوٹ بول کر فاسق ہو گیا جب تک وہ توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی اس کو امام بنانا گناہ اور بشرط استطاعت اسے امامت سے علیحدہ کرنا ضروری“ [فتاوی بحر العلوم ۱/۴۲۶]

حدیث شریف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

”إن الناس إذا رأوا المنكر لا يغيرونه، أوشك أن يعمهم الله بعقابه، لوگ جب کوئی برا کام دیکھیں اور اس سے نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اپنا عذاب بھیج دے۔“

[سنن ابن ماجه، باب الامر بالمعروف والنهي عن المنكر ص ۲۸۹]

هٰذا ما عندي والعلم عند الله تعالىٰ

فتوی ۳۶ بداخلاق، فتنہ باز امام کی امامت کا حکم

مسئولہ: شفیع احمد، شرافت علی، شمشاد، وارث کمال، عمر علی، ناظر حسین، ساجد علی، محمد الیاس، معظم، محبوب علی، محمد شنی، حافظ علی، حیب الرحمن خاں، عبد العلیم، خلیل احمد، شمیم۔ قصبہ بازپور اتراکھنڈ۔ ۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

زید ایک مسجد کا امام ہے اور کچھ لوگ زید کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ کیوں کہ زید بداخلاق بدمزاج ہے اسی وجہ سے سخت نزاع وفتنہ اور خون خرابے کا اندیشہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آئے دن زید اپنی تقاریر میں موجودہ کمیٹی اور دیگر لوگوں کے لئے

طنز سے بھرے ہوئے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور جو لوگ زید کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے آج تک زید نے ان سے معلوم بھی نہیں کیا کہ وہ نماز کیوں نہیں پڑھتے۔ اور گاؤں میں پارٹی بندی زید کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ لہٰذا حضور والا سے عرض یہ ہے کہ زید کی امامت کا عند الشرع کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرمائیں۔ عین نوازش وکرم ہو گا۔

الجواب

استفتاء میں مذکور باتیں اگر واقعی سچ ہیں اور اس میں کوئی خاص وجہ شرعی نہیں ہے۔ تو بلاشبہ ایسے شخص کو امامت سے برطرف کرنا لازم ہے۔ زید کا لوگوں پر برسرعام طنز کرنا گویا ان کی تذلیل ہے اور یہ ان کی دل آزاری کا سبب ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''من اذی مسلما فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللہ عزوجل''

یعنی جس نے کسی مسلمان کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے بلاشبہ اللہ تعالی کو اذیت دی۔

[المعجم الصغیر للطبرانی، ۲۸۴/۱]

اور نمازیوں سے بالکل قطع تعلق کر لینا ان سے سلام کلام بند کر لینا بلا وجہ شرعی یہ بھی ناجائز وحرام ہے۔ البتہ اگر دنیاوی خصومت کے سبب لوگوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دی یا کوئی وجہ شرعی تھی مگر انہوں نے امام کو اس وجہ شرعی سے آگاہ نہ کیا اور مسجد میں جانا بند کر دیا تو اس میں زید کا ازروئے شرع کوئی قصور نہیں ہے۔ اور نہ امام پر لازم کہ وہ گھر گھر جا کر لوگوں سے نماز نہ پڑھنے کی وجہ پوچھے۔ نماز نہ پڑھنے والے لوگوں کو اگر واقعی زید کے خلاف شرع اعمال وافعال معلوم ہوں تو وہ یہ بات امام صاحب سے رکھیں اور ان سے کمی دور کرنے کی گزارش کریں اگر وہ دور کر لیں فبہا ورنہ کمیٹی سے کہیں کہ وہ کسی بہتر امام کا انتظا کرے۔ اور پھر کمیٹی پر لازم بھی ہے کہ خلاف شرع کرنے والے امام کو برطرف کریں۔

نیز زید کی بد اخلاقی کے سبب اگر نمازی کم ہو رہے ہیں تو یہ بھی غلط ہے کیوں کہ شریعت میں ایسے امام کو منتخب کرنے کا حکم ہے جو اکمل ہو اور جس کے سبب نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو، نا کہ کمی۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

''فکل من اکمل فھو افضل لان المقصود کثرۃ الجماعۃ و رغبۃ الناس فیہ اکثر''

جو اکمل ہو وہ امامت کے لئے زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ مقصد کثرت جماعت اور لوگوں کا نماز کی طرف راغب ہونا ہے"

[فتاوی عالمگیری جلد اول ص ۸۳ الفصل الثانی فی بیان من ھو احق بالامامۃ]

اور اگر زید کے سبب واقعی خون خرابہ، فتنہ وفساد ہونے کا اندیشہ ہو اور اس میں کوئی وجہ شرعی نہ ہو مثلاً دیوبندی وہابیوں سے متعلق امام صاحب تقریر کرتے ہوں اور لوگ فتنہ انگیزی کر رہے ہوں یا اور کوئی اہم شرعی مسئلہ نہ ہو تو فوراً امام کو امامت سے برطرف کرنا لازم وضروری ہے۔ کیوں کہ فتنہ قتل سے سخت ہے۔ اللہ پاک فرماتا ہے:

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ، فساد تو قتل سے بھی سخت ہے۔ [ترجمہ قرآن کنز الایمان پارہ ۲ سورہ بقرہ آیت ۲۷۲]

اور لوگوں میں بلا مصلحت شرعی پارٹی بندی کا ہونا بھی اگر امام کی طرف سے ہو تو یہ بات بھی امام کو معزول کرنے کو کافی ہے۔ اللہ کو یہ بات ہرگز پسند نہیں کہ مسلمانوں میں تفریق ڈالی جائے۔ حدیث شریف میں ہے:

إن أحبكم إلى الله عزوجل أحاسنكم أخلاقاً، وإن أبغضكم إلى الله عزوجل المشاؤون بالنميمة، المفرقون بين الإخوان''
اللہ تعالیٰ کو تم میں سے بہتر اخلاق والے پسند ہیں۔ اور غیبت کرنے اور مسلمان بھائیوں کے درمیان تفریق کرنے والے ناپسند ہیں۔[الترغیب والترہیب لقوام السنۃ، ۲۴۲/۳]

دوسری حدیث میں ہے: وَشِرَارُ عِبَادِ اللهِ الْمَشَّاؤُونَ بِالنَّمِيمَةِ، الْمُفَرِّقُونَ بَيْنَ الْأَحِبَّةِ
بدترین لوگ وہ ہیں جو غیبت کرتے ہیں اور احباب کے درمیان تفریق پیدا کرتے ہیں۔[مجمع الزوائد للهيثمي، ۹۳/۸]

الحاصل: اگر مذکورہ بالا امور زید کے اندر پائے جاتے ہوں اور اس کی کوئی خاص وجہ شرعی یا مصلحت شرعی نہ ہو تو زید کو فوراً معزول کر دینا لازم وضروری ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ دو چند لوگ ذاتی وجوہات کے سبب امام سے متنفر ہوں اور امام کے اندر کوئی شرعی خامی نہ پائی جاتی ہو تو پھر بلاوجہ زید کی مخالفت کرنا اور اسے امامت سے برطرف ومعزول کرنا بالکل جائز نہیں ہے

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"اگر واقع میں امام اول نہ وہابی ہے نہ غیر مقلد نہ دیوبندی نہ کسی قسم کا بدمذہب، نہ اس کی طہارت یا قرآت یا اعمال وغیرہ کی وجہ سے کوئی وجہ کراہت، بلاوجہ اس کو معزول کرنا ممنوع ہے۔ حتی کہ حاکم شرع کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا۔
ردالمحتار میں ہے ''ليس للقاضي عزل صاحب وظيفة بغير جنحة''
یعنی بلاوجہ شرعی قاضی بھی امام کو معزول نہیں کر سکتا"[فتاوی رضویہ قدیم، ۲۴۱/۳]

هٰذا ما عندي والعلم عند الله تعالىٰ

فتوی ۳۷ — نماز عید میں فاسق امام کی امامت کا حکم

مسئولہ: صدر عید گاہ کمیٹی حسین خاں وجملہ اہل کمیٹی کاشی پور۔ ۱۵ر رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ

کیا فرماتے ہیں اس مسئلہ کے بارے میں علمائے دین

کہ ایک مولانا ہیں جو کہ نہ تو کسی مسجد میں امام ہیں اور نا جماعت سے کبھی نماز پڑھتے ہیں اور ہر وقت تعویذ اور ڈوری گنڈے میں لگے رہتے ہیں۔ جو اچھا پیسہ دیتا ہے اس کو تعویذ دیتے ہیں اور غریب لوگوں کو ڈانٹ کر بھگا دیتے ہیں۔ اور ہر وقت پیسہ کمانے کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ اور چند شہر کے امیر لوگوں کو ساتھ لے کر ہٹ دھرمی کر کے عید گاہ پر نماز عید پڑھاتے ہیں۔ یہ سارے معاملات دیکھ کر شہر کے باقی لوگ ناراض رہتے ہیں اور عید گاہ کمیٹی بھی ناراض رہتی ہے۔ اور ان کو ہٹانا چاہتی ہے تب وہ کہتے ہیں مجھے کوئی ہٹا نہیں سکتا۔ اس بات کو لے کر مولانا نے شہر sdm کو ایک تحریر دی عید گاہ کمیٹی کے خلاف تب sdm.sp.cu اور کوتوال صاحبان نے شہر کوتوالی میں دونوں پارٹی کو بلا کر ایک میٹنگ لی جس میں تین گھنٹہ کی طویل جدوجہد کے بعد مولانا پر جھوٹ بولنا ثابت ہوا اور مع ثبوتوں کے۔ اس مٹنگ میں تقریباً شہر کے ایک سو لوگ موجود تھے اور ان کے بیچ میں جھوٹ بولا تب کوتوال نے معلوم کیا کہ ایسے حالات میں کہ لوگ آپ کے خلاف ہیں اس میں آپ کی کیا رائے ہے تب مولانا نے کہا کہ عید کی نماز تو میں ہی پڑھاؤں گا کہ مسجد میں جو نماز پڑھائی جاتی ہے وہ فرض ہوتی ہے

اور عید گاہ میں جو نماز ہوتی ہے وہ واجب ہوتی ہے، جس کو جھوٹا بھی پڑھا سکتا ہے اور داڑھی کٹوانے والا اور منڈوانے والا بھی پڑھا سکتا ہے۔ اس میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے ایسا کہنے والے کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے جواب عنایت فرمائیں آپ کی عین نوازش ہوگی۔ دستخط۔ حسین خاں، محمد فاروق، مختار، راحل، آرڈی خان، حاجی ابرار، اجمل خاں۔

الجواب

سوال میں درج باتیں اگر واقعی سچائی پر مبنی ہیں تو ایسی صورت میں مذکورہ امام ازروئے شرع گناہ کبیرہ کا مرتکب اور فاسق ہے۔ اور فاسق کو امام بنانا گناہ اور اس کے پیچھے نماز ادا کرنا مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہے۔ حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

''إمامة الفاسق مكروهة تحريما'' (فاسق کی امامت مکروہ تحریمی ہے) [كتاب الصلاة، ۳۰۲]

مراقی الفلاح شرح نورالایضاح میں ہے:

''كره إمامة الفاسق العالم لعدم اهتمامه بالدين فتجب إهانته شرعا فلا يعظم بتقديمه للإمامة''

فاسق عالم کی امامت دینی معاملات کا اہتمام نہ کرنے کے سبب مکروہ ہے اس کی اہانت شرعاً واجب ہے۔ لہٰذا امامت کے لئے اسے آگے بڑھا کر اس کی تعظیم نہیں کی جائے گی۔ [۱۱۵/۱]

فتاوی شامی میں ہے ''الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بانه لايهتم بامر دينه وبان في تقديمه للامامة تعظيمه وقد وجب عليهم اهانته شرعاً''

فاسق کو (امامت کے لئے) آگے بڑھانا مکروہ ہے۔ چونکہ وہ دینی معاملات کا اہتمام نہیں کرتا اس کو امامت کے لئے آگے بڑھانے میں اس کی تعظیم ہے حالانکہ مسلمانوں پر اس کی توہین شرعاً واجب ہے۔ [باب الامامة، ۲۹۹/۲]

اور رہا امام مذکور کا یہ کہنا کہ ''عید گاہ میں جو نماز ہوتی ہے وہ واجب ہوتی ہے جس کو جھوٹا بھی پڑھا سکتا ہے اور داڑھی کٹوانے والا اور منڈوانے والا بھی پڑھا سکتا ہے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے'' یہ امام مذکور کی خود کی اختراع ہے شریعت میں کہیں کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ بلکہ جھوٹے اور داڑھی منڈانے والے کے پیچھے نماز کے مکروہ تحریمی ہونے پر فقہائے کرام صراحت فرماتے ہیں۔ جھوٹے امام کی امامت کے متعلق حضور مفتی اعظم ہند فرماتے ہیں:

''وہ شخص اگر ایسا جھوٹا مشہور ہو چکا ہو علی الاعلان جھوٹ بولنے کا عادی ہو چکا ہو تو فاسق معلن ہے۔ اس کے پیچھے نماز گناہ ہے۔ اسے جب تک توبہ نہ کرے امام نہ بنایا جائے۔ [فتاوی مصطفویہ: ص ۳۱۹]

بحر العلوم جھوٹے امام کی امامت کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''امام علی الاعلان جھوٹ بول کر فاسق ہو گیا جب تک وہ توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی اس کو امام بنانا گناہ۔ اور بشرط استطاعت اسے امامت سے علیحدہ کرنا ضروری۔ [فتاوی بحر العلوم ۴۲۶/۱]

داڑھی کٹوانے اور منڈوانے والے امام کی امامت سے متعلق حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''داڑھی ترشوانے والے کو امام بنانا گناہ ہے اور اس کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی کہ پڑھنی گناہ اور پھیرنی واجب''

[فتاوی رضویہ جدید ۲۰۳/۶]

اور حضور صدر الافاضل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''داڑھی رکھنا شعائر اسلام میں سے ہے اور اس کا کاٹنا قدر قبضہ پہنچنے سے قبل حرام ہے...در مختار میں ہے ''یحرم علی الرجل قطع لحیتہ'' جب ثابت ہو گیا کہ داڑھی ایک مشت سے کم کتروانا یا منڈوانا ممنوع ہے تو اس کا عامل اور مصر فاسق معلن ہوا اور فاسق کی امامت مکروہ تحریمی۔ کمافی عامة المتون والشروح والفتاوی من کراھة امامة الفاسق اور فاسق کو امام بنانا گناہ ہے''[فتاوی صدرالافاضل، ۴۲۴]

مذکورہ بالا عبارات سے صاف ہو گیا کہ جھوٹے اور داڑھی منڈے کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے یعنی اس کے پیچھے نماز پڑھنی گناہ اور دوبارہ ادا کرنی واجب۔

لہٰذا امام مذکور کی استفتاء میں درج شرعی خامیوں کے علاوہ یہ ایک اور سب سے بڑی غلطی ہے کہ امام مذکور نے شریعت کے معاملہ میں اپنے مفاد کی خاطر جھوٹ کا سہارا لیا۔ اور جھوٹے داڑھی منڈانے والے کی امامت کے جواز کا مسئلہ گڑھ کر لوگوں کو فریب دینے کی کوشش کی ۔اور اگر امام مذکور کی یہ بات درست ہو کہ ہر جھوٹے داڑھی منڈھے فاسق کے پیچھے نماز جائز ہو تو پھر امام مذکور ہی کی کیا ضرورت؟ پھر تو کوئی بھی نماز پڑھا سکتا ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''اسی امامت کو ہر نیک وبد کا مساوی حق قرار دیں جب ہر صالح وطالح اس میں یکساں ہیں تو تمہارے خاندان کی خصوصیت کہاں ہے۔ اور جب ہر فاسق وبدکار کے پیچھے روا بتاتے ہو عالم دین صالح ثقہ متقی سے کیوں الجھتے ہو۔ معلوم ہوا کہ اپنے ہوائے نفس کے پیرو ہیں باقی بس اللہ تعالیٰ اتباع شرع واطاعت علمائے دین کی توفیق بخشے۔[فتاوی رضویہ قدیم ۳/۲۰۷]

امامت ایک عظیم منصب ہے اس کے لئے اس کے شایان شان امام ہی ضروری ہے۔اس کے لئے نیک اور مسائل شرع سے واقفیت رکھنے والا امام ہونا چاہئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ان سرکم ان تقبل صلاتکم فلیؤمکم خیارکم

اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری نماز قبول ہو تو چاہئے کہ تمہارے نیک تمہاری امامت کریں۔[مستدرک للحاکم، ۳/۲۲۲]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''امامت خاص حق علما ہے.....علمائے کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ احق بالامامۃ اعلم قوم ہے۔[فتاوی رضویہ قدیم ۳/۲۰۵]

الحاصل:۔ امام مذکور کے پیچھے نماز پڑھنا ہر گز ہر گز جائز نہیں۔ مسلمانانِ اہلسنّت پر لازم ہے کہ جب تک امام مذکور اپنے جملہ گناہوں سے علی الاعلان توبہ نہ کرلے اس وقت تک کوئی بھی نماز اس کے پیچھے نہ ادا کی جائے۔ بلکہ ایسے مخالف شرع امام کو فوراً معزول کرنا لازم وضروری ہے۔ ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم

اراضی مسجد میں خود کے لیے مکان بنوانا جائز نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کمزور کہنا کھلی گستاخی ہے
دیوبندی امام کے پیچھے نماز پڑھنے والے امام کے پیچھے نماز جائز نہیں، امام کی بیوی کا بے پردہ گھومنا
اور امام کا کچھ نہ کہنا جرم ہے۔مال گروی رکھنا جائز ہے۔

فتوی ۳۸

مسئولہ: محمد اقبال، قصبہ سکندرہ راؤ ضلع ہاتھرس۔۲۸ صفر المظفر ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے اسلام ومفتیان ذوی الاحترام مندرجہ ذیل مسائل میں کہ

(۱) زید ایک مسجد کا امام ہے اور مع فیملی قیام کا انتظام مسجد کی جانب سے ہے۔ اب زید اپنی مرضی سے مسجد کی مملوکہ زمین میں اپنے رہنے کے لیے ایک مکان بنوا رہا ہے۔ کمیٹی کے منع کرنے پر کہتا ہے کہ میں جو چاہوں گا وہ ہوگا۔ اس معاملہ کو لے کر لوگوں میں کافی اختلاف وانتشار برپا ہے، ایسی صورت میں زید کے بارے میں کیا حکم ہے؟

(۲) مذکورہ بالا اختلاف کے پیش نظر ایک دن اسی مسجد کے موذن صاحب نے امام صاحب سے کہا کہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح تکلیف پہنچاتے تھے، آپ پر کوڑا ڈالتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ ان کو دعائیں دیں اور ہدایت کی دعائیں کیں، لہٰذا آپ بھی تمام لوگوں کو خوش رکھیں اور جھگڑا، اختلاف ہونے سے بچائیں۔

اس بات کے جواب میں امام نے کہا کہ حضور تو اس وقت کمزور تھے میں کمزور نہیں ہوں، میں جو چاہوں گا وہ ہوگا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس گفتگو میں امام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو کچھ کہا ہے اس جملہ کے بارے میں عند الشرع کیا حکم ہے؟

(۳) اسی متنازع امام نے ایک دیوبندی امام کی اقتدا میں نمازِ جنازہ پڑھی، اہل سنت وجماعت کے لوگوں نے اعتراض کیا تو کہا میں نے اپنی نیت کی تھی، دیوبندی امام کی اقتدا نہیں کی تھی۔ اس صورت حال میں دیوبندی امام کی اقتدا میں نماز جنازہ پڑھنا اور الگ سے اپنی نیت کرنے کی بات کہہ کر تاویل کرنا کیسا ہے؟ امام کے بارے میں کیا حکم ہے؟

(۴) انھیں امام صاحب نے اپنے سونے چاندی کے زیورات ایک غیر مسلم صراف کے پاس گروی رکھے تو یہ زیورات گروی رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

(۵) زید کی بیوی بے پردہ رہتی ہے، چہرہ کھول کر بے پردہ بازار مارکیٹ وغیرہ میں گھومتی ہے۔ زید اپنی بیوی کو بے پردگی سے روکتا بھی نہیں ہے۔ تو ایسی صورت حال میں زید کی امامت کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟ مذکورہ بالا صورت میں زید امامت کے لائق ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو جو نمازیں زید کی اقتدا میں پڑھی ہیں ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور ایسی صورت میں جو لوگ امام کا ساتھ دیں، فتنہ وفساد کو بڑھائیں، تو ان کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟

قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل ومفصل جواب عنایت فرمائیں، مہربانی ہوگی۔

الجواب

(۱) مسجد کی زمین پر زید کا ناجائز قبضہ کرنا اور اس پر اپنی من مانی کرنا ہر گز ہر گز جائز نہیں ہے۔ مسجد کی زمین اگر وقف ہے اور عام طور پر وقف ہی ہوتی ہے تو اس پر کسی طرح کا قبضہ جائز نہیں ہو گا۔ کیوں کہ وقف کو اس کی اصل حالت پر رکھنا واجب ہے۔ فتاوی شامی میں ہے ''الواجب ابقاء الوقف علی ما کان علیہ دون زیادۃ''

وقف کو اپنی اصلی حالت پر رکھنا واجب ہے بغیر زیادتی کے [۵۸۹/۶، کتاب الوقف]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''لایجوز تغییر الوقف عن هیأته'' وقف کی ہیئت کو بدلنا جائز نہیں ہے، [فتاوی عالمگیری، ۴۹۰/۲]

زید پر لازم ہے کہ فوراً اپنی اس حرکت سے باز آئے اور توبہ کرے۔ اگر زید ایسا نہ کرے تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ زید کو امامت سے برخواست کریں اور اس کا بائیکاٹ کریں۔

(۲) معاذ اللہ زید کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کمزور کہنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تنقیص شان ہے۔ جو بلا شبہہ کفر ہے۔ شفا شریف میں ہے

''أجمع العلماء أن شاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المتنقص له کافر، والوعید جار علیه بعذاب الله له، وحکمه عند الأمة القتل.. ومن شك فی کفره وعذابه کفر'

علما کا اجماع ہے اس بات پر کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والا ان کی تنقیص شان کرنے والا کافر ہے۔ اور اس پر وعید جاری ہو گی اور اس کے لئے اللہ کا عذاب ہے اور امت کے نزدیک اس کے قتل کا حکم ہے جو شخص اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔''

[القسم الرابع، الباب الاول۔ الفصل الأول الحکم الشرعی فیمن سب النبی صلی اللہ علیہ وسلم أو تنقصه]

مزید لکھا ہے:

'' ولکنه تکلم فی جهته صلی اللہ علیہ وسلم بکلمة الکفر... یأتی بسفه من القول، أو قبیح من الکلام، ونوع من السب فی جهة، وإن ظهر بدلیل حاله أنه لم یعتمد ذمه ولم یقصد سبه، إما لجهالة حملته علی ما قاله، أو لضجر، أو سکر اضطره إلیه أو قلة مراقبة وضبط للسانه، وعجرفة وتهور فی کلامه، فحکم هذا الوجه حکم الوجه الأول القتل دون تلعثم،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی کلمہ کفر بکے... کوئی بے ادبی کا لفظ بولے یا کوئی بری بات کہے یا بری بات اور کسی طرح کی تنقیص کرے اگرچہ دلیل سے اس کا حال ظاہر ہو کہ اس نے مذمت و توہین کا ارادہ نہیں کیا ہے بلکہ جہالت یا جھنجھلاہٹ یا نشہ میں بک دیا یا بات کہنے میں زبان روکنے کی کمی یا بیباکی سے صادر ہوا، تو اس صورت میں بھی حکم بعینہ وہی پہلی صورت کا ہے یعنی بلا توقف قتل کیا جائے''

[القسم الرابع، الباب الاول، الفصل الرابع حکم من فعل ذلك دون قصد أو اعتقاد]

حضور اعلیٰ حضرت ذخیرۃ العقبیٰ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''قد اجمعت الامة علی ان الاستخفاف بنبینا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وبای نبی کان علیهم الصلٰوة والسلام کفر سواء فعله علی ذٰلك مستحلا ام فعله معتقد الحرمة ولیس بین العلماء خلاف فی ذٰلك ومن شك فی کفره وعذابه کفر۔
امت کا اجماع ہے اس بات پر کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی نبی کی تنقیص شان کرنے والا کافر ہے، خواہ اسے حلال جان کر اس کا مرتکب ہوا ہو یا حرام جان کر اور اس میں علما کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے اور جو اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔'' [فتاوی رضویہ جدید ج ۱۴ ص ۳۰۳]

لہٰذا امام پر توبہ تجدید ایمان تجدید بیعت تجدید نکاح لازم وضروری ہے۔ در مختار اور اس کے حاشیہ ردالمحتار میں ہے:

مایکون کفرا اتفاقا یبطل العمل والنکاح واولاده اولاد زنا، وما فیه خلاف یؤمر بالاستغفار والتوبة (ای تجدید الاسلام) وتجدید النکاح۔

متفق علیہ کفر سے عمل اور نکاح باطل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی حالت میں جو اولاد ہو گی وہ اولاد زنا ہو گی اور جس کے کفر ہونے میں اختلاف ہو اس میں توبہ، تجدید اسلام اور تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا۔ [باب المرتد، ۳۹۱/۶]

(۳) دیوبندی اپنے عقائد کفریہ کے سبب مرتد اور خارج از اسلام ہیں۔ ان کی نماز جنازہ پڑھنا اگر انہیں مسلمان سمجھ کر ہے تو پڑھنے والا بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے اس پر توبہ، تجدید ایمان، تجدیہ بیعت، اور تجدید نکاح لازم وضروری ہے۔ اور اگر لاعلمی میں یا انہیں کافر جانتے ہوئے پڑھے تو سخت گنہگار ہے۔ اس پر توبہ لازم ہے۔ دیوبندی جماعت سے منسلک افراد جو دیوبندی جماعت کے کفریہ عقائد سے واقف ہیں بلکہ وہی عقائد کفریہ رکھتے ہیں اور عقائد کفریہ رکھنے والوں کو مسلمان بلکہ اپنا پیشوا مانتے ہیں تو ایسے لوگ مرتد دائرہ اسلام سے باہر ہیں۔ ان کے عقائد سے آگاہ ہونے کے باوجود ان کو مسلمان سمجھ کر ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے والے پر حکم کفر ہے۔ اور اگر انہیں مرتد ہی سمجھتا ہے مگر رسمایا کسی دنیاوی غرض سے نماز میں اقتدا کر لی ہے تو سخت گنہگار ہے۔ اعلی حضرت فرماتے ہیں:

''جسے یہ معلوم ہو کہ دیوبندیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی ہے پھر ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہے اسے مسلمان نہ کہا جائے گا کہ پیچھے نماز پڑھنا اس کی ظاہر دلیل ہے کہ ان کو مسلمان سمجھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے والے کو مسلمان سمجھنا کفر ہے۔ اسی لئے علمائے حرمین شریفین نے بالاتفاق دیوبندیوں کو کافر مرتد لکھا اور صاف فرمایا کہ ''من شک فی کفره وعذابه فقد کفر'' جس نے ان کے کفر وعذاب میں شک کیا وہ بھی کافر ہے۔ جو ان کے عقائد پر مطلع ہو کر انہیں مسلمان جاننا درکنار ان کے کفر میں شک ہی کرے وہ بھی کافر۔ اور جن کو اس کی خبر نہیں اجمالاً اتنا معلوم ہے کہ یہ برے لوگ بدعقیدہ بدمذہب ہیں وہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے سخت اشد گنہگار ہوتے ہیں اور ان کی وہ نمازیں سب باطل وبیکار''

[فتاوی رضویہ جدید ۳۷۶/۱۴]

امام صاحب کی یہ تاویل کسی بھی صورت میں مسموع نہیں ہے۔ اگر وہ دیابنہ کو مسلمان نہیں مانتے ہیں بس کسی دنیاوی غرض سے نماز میں شامل ہو گئے تھے تب بھی وہ مجرم ہیں ان پر توبہ لازم ہے۔ جب تک وہ توبہ نہ کر لیں ان کی امامت جائز نہیں ہے۔

(۴) زیور گروی رکھنا جائز ہے۔ کمافی کتب الاحادیث والفقہ۔

(۵) بیوی کا بے پردہ اس طرح گھومنا جس سے سر کے بال اور دیگر اعضا جن کا چھپانا فرض ہے ظاہر ہوں اور زید بیوی کو روکتا بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں زید بحکم حدیث دیوث ہے۔ اور دیوث اسے کہتے ہیں جو اپنی بیوی پر غیرت نہ رکھے، ایسا شخص فاسق و گنہگار ہے اس کے پیچھے نماز ناجائز و مکروہ تحریمی ہے۔

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں۔

"جس کی عورت بے ستر باہر پھرتی ہے کہ بازو یا گلا یا پیٹ یا سر کے بال یا پنڈلی کا حصّہ غرض جس جسم کا چھپانا فرض ہے کُھلا ہوا ہے یا اس پر ایک باریک کپڑا ہو کہ بدن چمکتا ہو اور وہ اس حالت پر مطلع ہو کر عورت کو اپنی حدِ مقدور تک نہ روکتا ہو بند وبست نہ کرتا ہو وہ بھی فاسق و دیّوث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ثلثة لایدخلون الجنّة العاق لوالدیه والدیوث و رجلة النساء ۔ رواه الحاکم والبیهقی بسند صحیح عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما۔

تین شخص جنت میں نہ جائیں گے ماں باپ کو ایذا دینے والا اور دیّوث اور مردوں کی صورت بنانے والی عورت۔ اس کو حاکم اور بیہقی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بسند صحیح روایت کیا ہے۔

در مختار میں ہے:

دیوث من لایغار علی امرأته او محرمه، جو اپنی عورت یا اپنی کسی محرم پر غیرت نہ رکھے وہ دیوّث ہے۔ اسی طرح اگر عورت جوان اور محل فتنہ ہے اور اس کے باہر پھرنے سے فتنہ اٹھتا ہے اور یہ مطلع ہو کر باز نہیں رکھتا جب بھی کھلا دیوّث ہے۔ اگرچہ پورے ستر کے ساتھ باہر نکلتی ہو، ان سب لوگوں کو امام بنانا گناہ ہے اور ان کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی قریب بحرام ہے نہ پڑھی جائے اور پڑھ لی تو اعادہ ضرور ہے۔"

[فتاوی رضویه جدید، ۶/۴۸۸،۴۸۷]

هذا ماعندی والعلم عندالله تعالیٰ

احکام جنائز

فتوی ۳۹ گستاخ رسول کی نماز جنازہ پڑھنے والوں کا حکم

مسئولہ: عبد المجید، ناصر علی محلہ وجے نگر کاشی پور۔ ۲۱/ محرم الحرام ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع مسئلہ ذیل کے بارے میں
زید نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی اور غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں گستاخی کی ساتھ میں اولیائے کرام کی شان میں بھی گستاخی کی اور جو گستاخی کے الفاظ استعمال کئے ان کے گواہ بھی کافی لوگ ہیں۔ اب زید کا انتقال ہوگیا اور لوگوں نے زید کی نماز جنازہ پڑھی ہے۔ لہٰذا عرض یہ ہے کہ جن لوگوں نے نماز جنازہ پڑھی ہے ان کے لئے کیا حکم ہے؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں ادنی سی گستاخی بھی کفر ہے۔ زید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رفیع میں گستاخی کے سبب کافر و مرتد ہوگیا۔ اس کی نماز جنازہ پڑھنا حرام اور اسے مسلمان سمجھ کر پڑھنا کفر ہے۔ شفا شریف میں امام قاضی عیاض فرماتے ہیں:

''اجمع العلماء ان شاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المتنقص لہ کافر، والوعید جار علیہ بعذاب اللہ لہ، وحکمہ عند الامۃ القتل.. ومن شك فی کفرہ وعذابہ کفر''
یعنی علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والا، گستاخی کرنے والا کافر ہے۔ اور اس پر عذاب الٰہی کی وعید جاری ہے اور امت کے نزدیک وہ واجب القتل ہے اور جو اس کے کافر و مستحق عذاب ہونے میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔'' [کتاب الشفا، ۲/۲۷۶]
حضور اعلیٰ حضرت فتاوی خیریہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''من سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانہ مرتد وحکمہ حکم المرتدین ویفعل بہ مایفعل بالمرتدین ولاتوبۃ لہ اصلا واجمع العلماء انہ کافر ومن شك فی کفرہ کفر۔
یعنی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کریم میں گستاخی کرے وہ مرتد ہے۔ اس کا وہی حکم ہے جو مرتدوں کا ہے اس سے وہی برتاؤ کیا جائے گا، جو مرتدوں سے کرنے کا حکم ہے۔ اور اسے دنیا میں کسی طرح معافی نہ دیں گے اور باجماع تمام علمائے امت وہ کافر ہے اور جو اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر'' [فتاوی رضویہ جدید: ۳۰۳/۱۴]
ذخیر العقبی فی شرح صدر الشریعۃ العظمی کے حوالے سے اس کی نماز جنازہ کفن دفن وغیرہ کا حکم بیان کرتے ہوئے حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''لایغسل ولایصلی علیہ ولایکفن اما اذا تاب وتبرأ عن الارتداد ودخل فی دین الاسلام ثم مات غسل وکفن وصلی علیہ ودفن فی مقابر المسلمین۔

یعنی وہ گستاخی کرنے والا جب مر جائے تو نہ اسے غسل دیں نہ کفن دیں نہ اس پر نماز پڑھیں ،ہاں اگر توبہ کرے اور اپنے اس کفر سے برأت کرے اور دین اسلام میں داخل ہو اس کے بعد مر جائے تو غسل ، کفن ، نماز ، مقابر مسلمین میں دفن سب کچھ ہوگا۔"[مرجع سابق ص/۳۰۴]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ [سورہ توبہ آیت ۸۴]

(اور ان میں سے کسی کی میّت پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا بیشک اللہ اور رسول سے منکر ہوئے اور فسق ہی میں مر گئے)[کنز الایمان، پارہ ۱۰ ،سورہ توبہ آیت ۸۴]

حضور صدرالافاضل اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اس آیت میں سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے جنازے کی نماز اور ان کے دفن میں شرکت کرنے سے منع فرمایا گیا اس آیت سے ثابت ہوا کہ کافر کے جنازے کی نماز کسی حال میں جائز نہیں اور کافر کی قبر پر دفن وزیارت کے لئے کھڑے ہونا بھی ممنوع ہے"[تفسیر خزائن العرفان، پارہ ۱۰ ،سورہ توبہ آیت ۸۴]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''فلاتؤاکلوهم ولا تشاربوهم ولا تجالسوهم ولا تصلوا عليهم ولا تصلوا معهم''

یعنی بدمذہبوں کے ساتھ نہ کھاؤ نہ پیو نہ بیٹھو نہ ان کی نماز جنازہ پڑھو نہ ان کے ساتھ نماز پڑھو۔[کنز العمال ۱۱/۵۴۰]

حضور فقیہ ملت کافر کی نماز جنازہ پڑھانے اور پڑھنے والوں کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اگر امام مذکور نے زید کو مسلمان سمجھ کر اس کی نماز جنازہ پڑھائی تو اس پر توبہ تجدید ایمان و تجدید نکاح فرض ہے۔اور اگر کسی دباؤ میں یا چاپلوسی میں آکر اس کے جنازہ کی نماز پڑھائی تو اس پر پر لازم ہے کہ علانیہ توبہ کرے.....اور جن سنیوں نے ... نماز جنازہ پڑھی ہے ان کے لئے بھی وہی حکم ہے جو امام کے لئے ہے۔"[فتاوی فقیہ ملت، ۱/۲۶۱،۲۶۰]

الحاصل:۔ صورت مسئولہ میں اگر لوگوں کو میت کے کفر کا پتہ تھا اور اس کے بعد بھی اسے مسلمان سمجھ کر اس کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے تو ان لوگوں پر توبہ ، تجدید ایمان ، تجدید نکاح اور تجدید بیعت لازم وضروری ہے۔

اور جن لوگوں کو اس کے کفر کا علم تھا، مگر رشتہ داری، کے سبب یار سگیوں ہی پڑھ لی اسے مسلمان سمجھ کر نہ پڑھی تو اب معلوم ہو جانے کے بعد توبہ کریں۔اور رہا غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر اولیائے کرام کی شان میں گستاخی کرنا تو یہ کھلی گمراہی ہے اور موجب عذاب الٰہی ہے۔جب یہ بات واضح ہو گئی کہ اولیائے کرام اپنے مزارات میں زندہ ہیں تو پھر انہیں مٹی کا ڈھیر کہنا ان کی کھلی ہوئی توہین ہے۔اور جو اللہ کے ولیوں کی اہانت کرتا ہے حدیث قدسی ہے۔اللہ پاک فرماتا ہے:

من اهان لی ولیا فقد بارزنی بالعداوة۔ [المعجم الکبیر للطبرانی ۸/۲۶۴]

اور ''من عادی لی ولیا فقد آذنته بالحرب''[صحیح البخاری ۲/۹۶۳ کتاب الرقاق باب التواضع]

یعنی جس نے میرے ولی کی توہین کی اس سے دشمنی رکھی اس سے میں اعلانِ جنگ کرتا ہوں۔

ابن رجب حنبلی اس آخر الذکر حدیث کے تحت فرماتے ہیں: فاولیاء اللہ تجب موالاتھم وتحرم معاداتھم۔
اولیائے کرام کی محبت واجب اوران سے عداوت حرام ہے۔[جامع العلوم والحکم ۶۷۴ الحدیث الثامن والثلاثون]
علامہ ابن حجر ہیتمی اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:
قال الائمۃ ولم ینصب اللہ تعالیٰ المحاربۃ لاحد من العصاۃ الاللمنکرین علی اولیائہ۔
ائمہ کرام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے منکرین اولیائے کرام کے علاوہ کسی گنہگار سے اعلانِ جنگ نہیں فرمایا۔
[فتاوی حدیثیہ ج ۱ ص ۳۱۳]

علامہ ابن رجب بخاری کی شرح میں فرماتے ہیں:

فمحبۃ اولیاء اللہ واحبابہ عموما من الایمان وھی من اعلیٰ مراتبہ وبغضھم محرم فھومن خصال النفاق۔

اولیائے کرام اوران کے عقیدت مند حضرات سے محبت ایمان میں سے ہے اوروہ محب کے عالی مرتبت ہونے پر دال ہے اوران سے بغض حرام ہے اور بغض نفاق کی علامت ہے۔[فتح الباری، ۲۶/۱ کتاب الایمان]

بالجملہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخ کی نماز جنازہ پڑھنااس کے کفرپر مطلع ہوتے ہوئے اسے مسلمان سمجھ کرپڑھی ہے تولوگوں پرتوبہ، تجدید، ایمان، تجدید نکاح لازم وضروی ہے۔اوراس کے کفرپر اطلاع نہیں تھی یااطلاع تھی مگراسے مرتد سمجھتے ہوئے ہی رسمًایوں ہی پڑھ لی تو بھی توبہ لازم ہے۔اوراولیائے کرام کی شان میں گستاخی کے سبب وہ شخص سخت مجرم وگنہگار تھاایسے لوگوں کی بھی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم نہیں ہے۔ھٰذاماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ۔

فتوی ۴۰ — دیوبندی امام کے پیچھے دیوبندی میت کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم

مسئولہ: حافظ محمد نفیس ادے پوری چوپڑارام نگر۔۲۴ ررجب المرجب ۱۴۳۷ھ

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں
ہماری بستی میں ایک دیوبندی کاانتقال ہوگیااس کی نماز جنازہ اسی کے دیوبندی لڑکے نے پڑھائی جو حافظ مولوی ہے،
کچھ سنی حضرات نے اس کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔شریعت میں ایسے لوگوں کے لئے کیاحکم ہے؟
نیزجن لوگوں نے نمازجنازہ میں شرکت کی ان میں میلادپڑھنے والے لوگ بھی شامل تھے کیاایسے لوگوں سے میلادپڑھواناجائزہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب

دیوبندی جماعت اپنے باطل وفاسد نظریات اور کفریہ عقائد کی وجہ سے دین اسلام سے خارج ہے۔جولوگ دیوبندی جماعت کے کفریہ عقائدکوجانتے ہوئے بھی اس جماعت میں شامل ہیں اوراس جماعت کوحق پرمانتے اور جماعت کے علماکومسلمان سمجھتے ہیں تووہ بھی ازروئے شرع انہیں کے حکم میں مانے جاتے ہیں۔ایسے لوگوں کی نماز جنازہ پڑھنے والے اگرانہیں مسلمان سمجھ کرنماز جنازہ پڑھتے ہیں تووہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں ۔ان پرتوبہ، تجدید ایمان، تجدیہ بیعت،اور تجدید نکاح لازم و

ضروری ہے۔ اور اگر لاعلمی میں یا انہیں کافر جانتے ہوئے پڑھتے ہیں تو سخت مجرم و گنہگار ہیں ان پر توبہ لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ۔[سورہ توبہ آیت ۸۴]

(اور ان میں سے کسی کی میّت پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا بیشک اللہ اور رسول سے منکر ہوئے اور فسق ہی میں مر گئے)[کنز الایمان، پارہ ۱۰، سورہ توبہ آیت ۸۴]

حضور صدر الافاضل اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اس آیت میں سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے جنازے کی نماز اور ان کے دفن میں شرکت کرنے سے منع فرمایا گیا اس آیت سے ثابت ہوا کہ کافر کے جنازے کی نماز کسی حال میں جائز نہیں اور کافر کی قبر پر دفن و زیارت کے لئے کھڑے ہونا بھی ممنوع ہے"[تفسیر خزائن العرفان، پارہ ۱۰، سورہ توبہ آیت ۸۴]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"فلا تؤاکلوھم ولا تشاربوھم ولا تجالسوھم ولا تصلوا علیھم ولا تصلوا معھم"

(بدمذہبوں کے ساتھ نہ کھاؤ نہ پیو نہ بیٹھو نہ ان کی نماز جنازہ پڑھو نہ ان کے ساتھ نماز پڑھو)[کنز العمال ۱۱/۵۴۰]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"جسے یہ معلوم ہو کہ دیوبندیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی ہے پھر ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہے اسے مسلمان نہ کہا جائے گا کہ پیچھے نماز پڑھنا اس کی ظاہر دلیل ہے کہ ان کو مسلمان سمجھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توہین کرنے والے کو مسلمان سمجھنا کفر ہے اسی لئے علمائے حرمین شریفین نے بالاتفاق دیوبندیوں کو کافر مرتد لکھا اور صاف فرمایا کہ "من شك فی کفرہ وعذابه فقد کفر" جس نے ان کے کفر و عذاب میں شک کیا وہ بھی کافر ہے۔ جو ان کے عقائد پر مطلع ہو کر انہیں مسلمان جاننا درکنار ان کے کفر میں شک ہی کرے وہ بھی کافر اور جن کو اس کی خبر نہیں اجمالاً اتنا معلوم ہے کہ یہ برے لوگ بدعقیدہ بدمذہب ہیں وہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے سخت اشد گنہگار ہوتے ہیں اور ان کی وہ نمازیں سب باطل و بیکار"

الحاصل:۔ صورت مسئولہ میں دیوبندی کی نماز جنازہ دیوبندی امام کے پیچھے پڑھنے والوں نے اگر میت اور امام دونوں کو مسلمان سمجھ کر پڑھی ہے تو وہ لوگ توبہ، تجدید ایمان، تجدیہ بیعت، اور تجدید نکاح کریں، اور جن لوگوں نے میت اور امام دونوں کو ان کے عقائد کفریہ کے سبب کافر ہی جانا لیکن رسماً یا کسی اور سبب سے جنازہ میں شرکت کی وہ توبہ و استغفار کریں،

اور اگر وہ لوگ حکم شرعی پر عمل نہ کریں تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ان سبھی کا بائیکاٹ کریں۔ ان سے ہر طرح کا تعلق ختم کرلیں میلاد خواں حضرات سے بھی کسی طرح کا کوئی تعلق نہ رکھیں ان سے میلاد وغیرہ بھی نہ پڑھوائیں۔

قرآن پاک میں ہے: **"وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ"**

(اور جو کہیں تجھے شیطان بھلادے تو یاد آنے پر ظالموں کے پاس نہ بیٹھ)[کنز الایمان پارہ ۲۸، سورہ انعام آیت ۶۸]

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

فتوی ۴۱ دیوبندی میت کی نماز جنازہ کا اعلان کرنا جائز نہیں

اراکین کمیٹی غوثیہ مسجد محلہ خالصہ کاشی پور۔۱۳؍ ذوالقعدہ ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

ہمارے محلہ میں ایک دیوبندی مولوی کی بیوی کا انتقال ہوا مسجد میں اعلان کے لئے کہا گیا تو منع کر دیا گیا مگر جب کچھ لوگ سکریٹری صاحب کے پاس گئے اعلان کے لئے توانہوں نے اعلان کرنے کو کہہ دیا اس کے بعد مسجد سے دیوبندی کے انتقال اور میت کی نماز جنازہ کا اعلان کیا گیا۔ کچھ سنی حضرات نے نماز جنازہ بھی ادا کی وہ بھی دیوبندی امام کے پیچھے اور دفن وغیرہ میں بھی شامل ہوئے۔

اب سوال یہ ہے کہ مسجد سے کسی دیوبندی کے انتقال اوران کی نماز جنازہ کا اعلان کرنا اور سنی حضرات کا دیوبندی امام کے پیچھے نماز جنازہ ادا کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟ اور ایسے لوگوں کے بارے میں جنہوں اعلان کرایا اور اعلان کیا اور نماز جنازہ میں شامل ہوئے شریعت کا کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

دیوبندی جماعت اپنے باطل وفاسد نظریات اور کفریہ عقائد کی وجہ سے دین اسلام سے خارج ہے جو لوگ دیوبندی جماعت کے کفریہ عقائد کو جانتے ہوئے بھی اس جماعت میں شامل ہیں اوراس جماعت کو حق پر مانتے اور جماعت کے علماء کو مسلمان سمجھتے ہیں تو وہ بھی از روے شرع انہیں کے حکم میں مانے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے انتقال اوران کی نماز جنازہ کا مسجد سے اعلان کرنا اوران کی نماز جنازہ پڑھنا اگر انہیں مسلمان سمجھ کر ہے تو کفر ہے۔ اعلان کرنے والے کرانے والے نماز پڑھنے والے سب ہی دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ ان پر توبہ، تجدید ایمان، تجدید بیعت، اور تجدید نکاح لازم وضروری ہے۔ اور اگر لاعلمی میں یا یوں ہی رسماً انہیں گمراہ ومرتد جانتے ہوئے پڑھی ہے تو سخت مجرم وگنہگار ہیں ان پر توبہ لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ

(اور ان میں سے کسی کی میّت پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا بیشک اللہ اور رسول سے منکر ہوئے اور فسق ہی میں مر گئے) [کنز الایمان، پارہ ۱۰، سورہ توبہ آیت ۸۴]

حضور صدر الافاضل اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اس آیت میں سیدِعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے جنازے کی نماز اور ان کے دفن میں شرکت کرنے سے منع فرمایا گیا اس آیت سے ثابت ہوا کہ کافر کے جنازے کی نماز کسی حال میں جائز نہیں اور کافر کی قبر پر دفن وزیارت کے لئے کھڑے ہونا بھی ممنوع ہے" [تفسیر خزائن العرفان، پارہ ۱۰، سورہ توبہ آیت ۸۴]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''فلاتؤاکلوھم ولا تشاربوھم ولا تجالسوھم ولا تصلوا علیھم ولا تصلوا معھم''

(بد مذہبوں کے ساتھ نہ کھاؤنہ پیونہ بیٹھونہ ان کی نماز جنازہ پڑھونہ ان کے ساتھ نماز پڑھو)[کنز العمال ۱۱/۵۴۰]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''جسے یہ معلوم ہو کہ دیوبندیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی ہے پھر ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہے اسے مسلمان نہ کہا جائے گا کہ پیچھے نماز پڑھنا اس کی ظاہر دلیل ہے کہ ان کو مسلمان سمجھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے والے کو مسلمان سمجھنا کفر ہے اسی لئے علمائے حرمین شریفین نے بالاتفاق دیوبندیوں کو کافر مرتد لکھا اور صاف فرمایا کہ ''من شك فی کفرہ وعذابه فقد کفر''جس نے ان کے کفر وعذاب میں شک کیا وہ بھی کافر ہے۔جو ان کے عقائد پر مطلع ہو کر انہیں مسلمان جاننا درکنار ان کے کفر میں شک ہی کرے وہ بھی کافر اور جن کو اس کی خبر نہیں اجمالاً اتنا معلوم ہے کہ یہ برے لوگ بدعقیدہ بد مذہب ہیں وہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے سخت اشد گنہگار ہوتے ہیں''[فتاوی رضویه جدید، ۳۷۶/۱۴]

فتاوی فیض الرسول میں ہے:

اگر زید اور دیگر مسلم انوں نے وہابی کے پیچھے اس کی وہابیت جانتے ہوئے مسلمان اعتقاد رکھ کر نماز جنازہ ادا کی تو کفر ہے۔علی الاعلان توبہ، تجدید ایمان و نکاح ضروری ہے۔اور اگر وہابی امام کو مرتد و بد مذہب سمجھتے ہوئے پڑھی تو فسق ہے علانیہ توبہ لازم ہے یہی حکم وہابی یا صلح کل کی نماز جنازہ پڑھنے کا بھی ہے۔''[فتاوی فیض الرسول، ۱/۴۴۱]

لہٰذا سکریٹری صاحب جنہوں نے اعلان کرنے کی اجازت دی اور ان کے کہنے پر جس نے اعلان کیا اور اعلان پر جن لوگوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی سب کے سب سخت مجرم و گنہگار ہیں ۔دیوبندی جماعت کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے مسجد سے انتقال اور نماز جنازہ کے اعلان کی اجازت دینا اور اعلان کرنا ہرگز ہرگز جائز نہیں تھا۔دیوبندی کی نماز جنازہ پڑھنا حرام بلکہ ان کے عقائد سے مطلع ہو کر انہیں مسلمان سمجھ کر پڑھنا علمائے اہل سنت کے نزدیک کفر ہے۔تو سکریٹری صاحب کا ایک حرام کام کے اعلان کی اجازت دینا اور اعلان کے ذریعہ اعلان کرنے والے کا حرام کام کی طرف لوگوں کو بلانا اور لوگوں کا نماز جنازہ میں شریک ہونا یہ سارے کام حرام سخت حرام ہیں۔

<u>الحاصل</u>: سکریٹری صاحب اور اعلان کرنے والے اور دیوبندی کی نماز جنازہ دیوبندی امام کے پیچھے پڑھنے والوں نے اگر میت اور امام دونوں کو مسلمان سمجھ کر یہ سب کیا ہے تو وہ لوگ توبہ، تجدید ایمان، تجدیہ بیعت اور تجدید نکاح کریں۔اور اگر میت اور امام دونوں کو ان کے عقائد کفریہ کے سبب گمراہ و مرتد ہی جانا لیکن رسماً یا کسی اور سبب سے جنازہ کا اعلان کرایا اور کیا اور نماز میں شرکت کی تو توبہ واستغفار کریں۔اور جو لوگ حکم شرعی پر عمل نہ کریں تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ان سبھی کا بائیکاٹ کریں۔ان سے ہر طرح کا تعلق ختم کرلیں۔

قرآن پاک میں ہے ''وَاِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ''

(اور جو کہیں تجھے شیطان بھلادے تو یاد آنے پر ظالموں کے پاس نہ بیٹھ۔)[کنز الایمان پارہ ۲۸، سورہ انعام آیت ۶۸]

هٰذا ماعندی والعلم عند الله تعالیٰ۔

فتوی ۴۲ قبرستان میں اس جگہ جہاں قبریں نہ ہوں نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے

مسئولہ: (حافظ) محمد جاوید اختر (خطیب وامام) مسجد گاؤں کچھنال گوسائی کاشی پور۔ ۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۳۵ھ

کیافرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک قبرستان کی زمین جس میں ایک اسلامی مدرسہ ہے کیاوہاں پر نماز پنجگانہ یا نماز جنازہ ہوسکتی ہے یا نہیں وہاں کے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں پر کوئی قبر نہیں ہے اس لئے یہاں نماز ہوجائے گی اور کچھ لوگ منع کرتے ہیں کہ نماز کوئی سی بھی نہیں ہوگی۔ جب بھی وہاں کوئی جنازہ لاتے ہیں تولوگوں میں جھگڑا شروع ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے وہاں پر کوئی سی نماز نہیں ہوتی۔ اور نماز جنازہ کو سڑک پر پڑھاجاتاہے۔ اس بات پر تمام لوگوں نے یہ طے کیاہے کہ علمائے کرام سے صحیح مسئلہ پوچھاجائے کہ ایسی زمین جو قبرستان کی ہے لیکن وہاں پر کوئی قبر نہیں ہے کیاوہاں پر نماز پنجگانہ یا نماز جنازہ ہوجائے گی یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں قبرستان کی وہ جگہ جہاں قبریں نہ ہوں وہاں نماز جنازہ وغیرہ پڑھنے کی اجازت ہے۔

قبرستان میں نماز جنازہ پڑھنا صحابیِ رسول حضرت ابوبرزہ اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ثابت ہے۔

سنن بیہقی میں ہے:

''ان جنازة وضعت فی مقبرة اهل البصرة... فتقدم ابوبرزة، فصلی بهم المغرب وفی الناس انس بن مالك، وابوبرزة من الانصار من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم، ثم صلوا علی الجنازة''

یعنی بصریوں کے مقبرہ میں ایک جنازہ رکھا گیاتو حضرت ابوبرزہ نے پہلے لوگوں کو نماز مغرب پڑھائی لوگوں میں انس بن مالک اورابوبرزہ انصاری تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے پھر لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی۔

[السنن الکبری لبیہقی، ۵۱/۴]

فتاوی شامی میں خانیہ کے حوالے سے ہے:

''لا باس بالصلاة فیها اذاکان فیها موضع اعد للصلاة ولیس فیه قبرولا نجاسة کما فی الخانیة''

قبرستان میں جو جگہ نماز کے لئے مقرر کی جائے اس میں قبر اور نجاست نہ ہو تو نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

[فتاوی شامی کتاب الصلاۃ، ۴۲/۲]

ہاں جس جگہ قبر ہو وہاں نماز پڑھنا ہرگز جائز نہیں:

بدائع الصنائع میں ہے'' ویکرہ ان یصلی علی القبرلما روی عن النبی صلی الله علیه وسلم انه نهی ان یصلی علی القبر''

قبرپر نماز پڑھنامکروہ ہے جیساکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے قبرپر نماز پڑھنے سے منع فرمایاہے۔ [بدائع الصنائع، کتاب الصلاۃ فصل سنن الدفن، ۶۵/۲]

اور سڑک پر بھی علمائے کرام نے نمازاداکرنے کو مکروہ قرار دیاہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے ''تکرہ فی الشارع'' سڑک پر نماز مکروہ ہے۔

[فتاوی عالمگیری، فصل الصلاۃ علی المیت، ۱۶۵/۱]

اور جو قبرستان وقف شدہ ہو اس میں مدرسہ بنانا خواہ وہاں قبریں ہوں یا نہ ہوں ازروئے شرع ناجائز و حرام ہے۔

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''وقف کی تبدیل جائز نہیں جو چیز جس مقصد کے لئے وقف ہے اسے بدل کر دوسرے مقصد کے لئے کر دینا روا نہیں۔ جس طرح مسجد یا مدرسہ کو قبرستان نہیں کر سکتے یونہی قبرستان کو مسجد یا مدرسہ یا کتب خانہ کر دینا حلال نہیں۔ سراج وہاج پھر فتاوی ہندیہ میں ہے:

لایجوز تغییر الوقف عن هیأته (وقف کو اس کی ہیئت سے تبدیل کرنا جائز نہیں) [فتاوی رضویہ جدید، ۴۵۷/۹]

الحاصل: قبرستان میں اس جگہ جہاں قبریں نہ ہوں ازروئے شرع نماز ادا کی جا سکتی ہے۔

هٰذا ما عندی والعلم عند الله تعالیٰ

فتوی ۴۳ بعد دفن میت قبر پر اذان دینا جائز و مستحسن ہے

مسئولہ: (مولانا) محمد مشتاق احمد کلیر شریف۔ ۸ محرم الحرام ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں

اہل سنت کے یہاں میت کو دفن کرنے کے بعد اذان دی جاتی ہے بعض لوگ اسے ناجائز بتاتے ہیں اس سلسلے میں شریعت کا جو بھی حکم ہو تفصیل سے بیان فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

بعد دفن قبر پر اذان پڑھنا جائز بلکہ مستحسن و مستحب ہے۔ اور احادیث کریمہ سے اس کی اصل نکلتی ہے۔

حضرت جابر سے روایت ہے کہ

لما دفن سعد بن معاذ ونحن مع رسول الله صلى الله عليه وسلم سبح، فسبح الناس معه طويلا، ثم بر، فبر الناس معه، فقالوا:

يا رسول الله صلى الله عليه وسلم لم سبحت، قال: لقد تضايق على هذا الرجل الصالح قبره، حتى فرجه الله برحمته

یعنی جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالی عنہ دفن ہو چکے اور ان کی قبر درست کر دی گئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیر تک سبحان اللہ، سبحان اللہ فرماتے رہے۔ اور ساتھ میں صحابہ کرام بھی سبحان اللہ کہتے رہے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ اکبر، اللہ اکبر فرماتے رہے اور صحابہ کرام بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اللہ اکبر کہتے رہے۔ پھر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ نے پہلے تسبیح اور پھر تکبیر کیوں بیان فرمائی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس نیک مرد پر اس کی قبر تنگ ہو گئی تھی، یہاں تک کہ اللہ تعالی نے (ہمارے ذکر کے سبب) اپنی رحمت سے قبر کو کشادہ فرما دیا۔ [المعجم الکبیر للطبرانی، ۱۳/۶]

مظاہر حق شرح مشکوۃ جو دیوبندی مکتبہ فکر کے مسلم عالم مولانا غلام نواب قطب الدین خاں دہلوی صاحب کی لکھی ہوئی ہے اور جس کی تزئین وترتیب جدید فاضل دیوبند مولانا عبد اللہ جاوید غازی پوری نے کی ہے۔اس کتاب میں مذکورہ حدیث کی شرح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

”تسبیح و تکبیر سے خدا کا غضب رحمت میں اور غصہ شفقت میں بدل جاتا ہے۔ اور وہاں مقدس کلموں کی بدولت اپنی رحمت ونعمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ چنانچہ اسی لئے خوف ودہشت کے موقع پر یا کسی خوفناک چیز کو دیکھ کر تکبیر کہنی مستحب ہے تسبیح و تکبیر کا جتنا ورد رکھا جائے گا اتنا ہی خدا کی رحمت سے قریب ہو تا جائے گا۔ اور دنیاوی آفات وبلا نیز غضب خداوندی سے دور ہو تا جائے گا۔“ [مظاہر حق جدید، جلد اول، صفحہ ۱۸۸]

مذکورہ بالا حدیث پاک اور مظاہر حق کی تشریح کی روشنی میں یہ بات صاف ہوگئی کہ اللہ کی تسبیح و تکبیر خوب سے خوب بیان کرنے سے عذاب قبر اور قہر الٰہی سے نجات مل جاتی ہے۔ اور مقدس کلموں کی بدولت اللہ اپنی رحمت ونعمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ لہٰذا اذان جس میں تکبیر کی متعدد بار تکرار ہے۔ البتہ کچھ مزید الفاظ بھی ہیں لیکن ہیں تو مقدس کلمات ہی جس کے بارے میں خود دیوبندی مولانا نے اس پر جزم کیا ہے کہ مقدس کلموں سے رحمت ونعمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

تو بھلا اذان کے مستحسن و مستحب ہونے میں کیا شک رہ جاتا ہے۔ کوئی نامعقول اگر یہ کہتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنا ذکر کیا اتنا ہی ضروری ہے اس سے زیادہ جائز نہیں بدعت سیئہ ہے تو وہ سراسر غلطی پر ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ احادیث کریمہ سے الفاظ تلبیہ کی جو مقدار ہے صحابہ کرام نے اس میں اضافہ کو جائز رکھا اور انہیں کی اتباع میں فقہائے کرام نے بھی تلبیہ کے وہ الفاظ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں ان پر اضافہ کی اجازت عطا فرمائی ہے۔ جیسا کہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ شریف جو اہل سنت بریلوی اور مسلک دیوبند ہر دو مکتبہ فکر کے مدارس میں داخل نصاب ہے۔ اس میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے:

” ولا ینبغی ان یخل بشی من ہذہ الکلمات لانہ ھو المنقول باتفاق الرواۃ فلا ینقص عنہ ولو زاد فیھا جاز ... ولنا ان اجلا الصحابۃ کابن مسعود وابن عمر وابی ھریرۃ رضی اللہ عنھم زادوا علی الماثور ولان المقصود الثناء واظھار العبودیۃ فلا یمنع من الزیاد علیہ۔“

یعنی کلمات تلبیہ میں کمی نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ الفاظ راویوں کے اتفاق سے (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی قدر) منقول ہیں اس لئے اس سے کم نہ کیا جائے البتہ ان الفاظ میں اضافہ جائز ہے، ہماری دلیل یہ ہے کہ بڑے بڑے صحابہ جیسے عبد اللہ ابن مسعود عبد اللہ ابن عمر اور حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہم نے منقول تلبیہ میں اضافہ فرمایا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ اس زیادتی سے مقصود اللہ کی تعریف اور بندگی کا اظہار کرنا ہے لہٰذا کلمات تلبیہ میں اضافہ سے منع نہیں کیا جائے گا۔

[ہدایہ، ۱۳۵/۱، باب الاحرام]

دیوبندی عالم مولوی ثمیر الدین قاسمی اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”تلبیہ پڑھنے کا مطلب اللہ کے سامنے اپنی بندگی ظاہر کرنا ہے اس لئے تلبیہ میں بندگی کے کلمات زیادہ کرے تو اور اچھا ہے

اس لئے زیادہ کیا جا سکتا ہے۔"[اثمار الہدایہ، ۲۱۵/۳، باب الاحرام]

خلاصہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تلبیہ کے جو الفاظ ثابت ہیں صحابہ نے ان پر اضافہ کیا اور فقہائے کرام نے مزید اضافہ کی اجازت بھی عطا فرمائی تو پھر اذان میں کیا قباحت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تسبیح اور تکبیر پڑھنا ثابت ہے اور اذان میں چھ بار تکبیر بھی ہوتی ہے اس کے علاوہ اللہ کی وحدانیت رسول کی رسالت کی شہادت اور نماز کا ذکر ہے تو یہ زیادتی جو مقدس کلمات اور مفہوم پر مبنی ہے اس سے روکنا اسے بدعت وناجائز قرار دینا یقینا ظلم وزیادتی ہے۔

مزید براں بہت سے علمائے کرام ومشائخ کرام اور فقہائے کرام نے صراحتا اپنی کتب میں اذان قبر کے جواز بلکہ سنت اور اس پر مشائخ کرام کا عمل بیان فرمایا ہے۔

ہم ذیل میں چند حوالے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

'فتاوی شامی میں ہے:

"قد یسن الأذان لغیر الصلاۃ کما فی اذان المولود...وعند انزال المیت القبر قیاسا علی خروجہ للدنیا"

یعنی اذان نماز کے علاوہ بھی چند مقامات پر سنت ہے۔ جیسا کہ بچہ کے کان میں .....اور میت کو قبر میں اتارتے وقت اس کی پیدائش پر قیاس کرتے ہوئے۔[ردالمحتار علی درالمختار، باب الاذان، ۵۰/۲، مطبع زکریا بکڈپو دیوبند]

حاشیہ بیجوری میں امام ابن حجر علیہ الرحمہ کے حوالہ سے ہے

"قال ابن حجرو رددتہ فی شرح العباب لکن ان وافق انزالہ القبر اذان خفف عنہ فی السوال"

ابن حجر نے فرمایا میں نے شرح عباب میں اذان کے مسنون ہونے کا رد کیا ہے لیکن اگر میت کو قبر میں اتارنے کے بعد اذان پڑھی جائے تو سوالات قبر میں آسانی ہوگی۔[فتاوی نعیمیہ، ۷۲/۱]

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ جو اہل سنت کے نزدیک تو مسلم ہیں ہی دیوبندی وہابی حضرات کے نزدیک بھی مسلم الثبوت ہیں وہ فرماتے ہیں:

"عمل مشائخ است کہ اذان بر قبر بعد دفن می گویند" (دفن کے بعد قبر پر اذان پڑھنا بزرگوں کا معمول ہے)

[ملفوظات عزیزی فارسی، صفحہ ۸۴، مطبع مجتبائی میرٹھ]

علاوہ ازیں اس کے جائز ہونے کو اتنا کافی ہے کہ اس میں اللہ اور رسول کا ذکر مقدس ہے۔ اور اللہ اور اس کے رسول کا ذکر جب ہو جہاں ہو فائدہ سے خالی نہیں ۔ نیز شرع میں اس کی ممانعت پر کوئی دلیل نہ ہونا بھی اس کے جواز کے لئے بہت ہے۔ مزید تفصیل کے لئے اعلیٰ حضرت کے رسالہ مبارکہ "ایذان الاجر فی اذان القبر" کا مطالعہ فرمائیں۔

ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم

فتویٰ ۴۴ وقفی قبرستان میں کسی سنی مسلمان کو دفن ہونے سے روکنا جائز نہیں

مسئولہ: محمد مبارک حسین نظامی ارنیانظام الدین ضلع مندسور مدھیہ پردیش۔ ۲۴ ربیع النور ۱۴۳۸ھ

کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ

چند متصل چھوٹے چھوٹے گاوں سے ملکر سنی مسلمانوں کی ایک بستی ہے جہاں دو برادریاں آباد ہیں۔ دونوں کا زمانہ قدیم سے حکومت کے ذریعہ الاٹ کیا ہوا ایک مشترکہ قبرستان ہے۔ جہاں وہ قدیم زمانے سے آباد باشندوں میں سے کسی کا انتقال ہو تو دفن کرتے رہے ہیں۔ اوراس قبرستان کی دیکھ بھال وہاں کی منتخب ایک کمیٹی کرتی ہے۔ یہ کمیٹی اس کے لئے گاؤں کے لوگوں سے چندہ اکٹھا بھی کرتی ہیں۔ کمیٹی کے کارکن نے گاؤں والوں کے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ لیا کہ باہر سے آکر نئے بسنے والوں اور دوسری بستیوں کے مردوں کو اس قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ پابندی کی وجہ ایک تو جگہ کی قلت دوم اس مقصد کے مد نظر مستقبل میں مسلمانوں کی مختلف برادریوں کے مُردوں کے مدفون ہونے کے سبب برادرانہ جھگڑا بڑھے گا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ

ایسی صورت میں کہ قبرستان، گاؤں والوں کے لیے مخصوص ہے۔اس کا انتظام گاؤں والوں کے ذمہ ہے، نو آباد لوگ و دیگر بستی والوں سے کسی قسم کی مدد نہیں لیتے، نو آباد لوگ و دیگر بستیوں کے مُردوں کی تدفین کی صورت میں فساد کا اندیشہ۔

درج بالا صورت میں بستی کے قدیم باشندوں کا نو آباد لوگوں کو اور دیگر بستیوں کے مسلمان مردوں کی تدفین کو روکنا جائز ہے یا نہیں جواب باصواب سے نواز کر ممنون و مشکور فرمائیں۔

الجواب

حکومت کی طرف سے جب وہ زمین قبرستان کے لئے مسلمانوں کو دی گئی اور مسلمانوں نے اس جگہ میں قبرستان بناکر مردے دفنانا شروع کردئے تو وہ قبرستان ہمیشہ کے لئے وقف ہوگیا۔اس جگہ کوئی بھی تصرف خلاف شرع جائز نہ ہوگا۔ حضوراعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”جب وہ زمین مسلم انوں کو نسلاً بعد نسل ہمیشہ کیلئے دی گئی اور مسلمانوں نے اس پر بطور ملک قبضہ کرکے اسے قبرستان کردیا اور مردہ دفن ہوا وہ زمین ہمیشہ ہمیشہ قبرستان مسلمین کیلئے وقف ہوگئی، کسی زمیندار کا اس پر کوئی حق ودعویٰ نہ رہا، ہندو ہو یا مسلمان“[فتاوی رضویہ قدیم، ۴۹۲/۶]

لہٰذا موقوفہ قبرستان میں کسی بھی مسلمان کو تدفین سے روکنا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے۔خواہ وہ کسی بھی برادری کا ہو کہیں کا ہو، موقوفہ قبرستان کسی کی میراث نہیں ہے اس میں ہر سنی مسلمان کو دفن ہونے کی اجازت ہے۔ کمیٹی والوں اور گاؤں والوں کا اس خلاف شرع بات پر اتفاق جائز نہیں ہے۔ حضوراعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ اسی سے ملتے جلتے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

’’مقبرہ عام مسلمانوں کے لئے وقف ہوتا ہے، ہر مسلمان کو اس میں دفن کا حق پہنچتا ہے، مقبرہ کا متولی کوئی چیز نہیں، نہ اس کی اجازت کی حاجت نہ ممانعت کی پرواہ ہے۔ عالمگیری میں ہے۔ لافرق فی الانتفاع فی مثل هذه الاشیاء بین الغنی والفقیرحتی جازللکل النزول فی الخان والرباط والشرب من السقایة والدفن فی المقبرة کذافی التبیین۔
(ان اشیاء سے انتفاع میں غنی وفقیر کے درمیان کوئی فرق نہیں یہاں تک کہ ہر شخص کو سرائے اور خانقاہ میں آنے کا حق حاصل ہے یوں ہی ہر شخص کو موقوفہ سبیل سے پانی پینے اور قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت ہے۔ ایساہی تبیین میں ہے۔) اسی میں ہے: لوبنی مسجداً لاهل محلة وقال جعلت هذاالمسجد لاهل هذاالمحلة خاصة، کان لغیراهل تلك المحلة ان یصلی فیه هکذا فی الذخیرة۔ (اگر کسی نے ایک محلہ والوں کیلئے مسجد بنائی اور کہہ دیا کہ میں نے یہ مسجد خاص اس محلہ والوں کیلئے بنائی ہے تو اس محلہ والوں کے غیر کو بھی اس میں نماز پڑھنے کا اختیار ہے، اسی طرح ذخیرہ میں ہے۔)
بلکہ مقبرہ کا عموم مسجد کے عموم سے بھی بہت زیادہ ہے، بہت لوگ ہیں جنہیں مسجد سے روکنے کا حکم ہے مثلاً جذامی اور ابرص جس کا برص شائع ہو یا جس کے منہ یا بدن یا لباس میں بدبو ہو یا جس کے آنے سے فتنہ اٹھے جیسے غیر مقلد وہابی یا رافضی وغیرہم..... مگر مقبرہ اہلسنت میں کسی سنی مسلمان کو ممانعت نہیں ہوسکتی، لعدم الوجه وحصول الاذن من جهة الشرع، (ازروئے شرع ممانعت نہ ہونے کی وجہ سے اور شرع کی سے اجازت حاصل ہونے کے سبب)‘‘

[فتاوی رضویہ قدیم، ۶/۴۹۰]

الحاصل: موقوفہ قبرستان میں کسی سنی مسلمان کو دفن ہونے سے روکنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ موقوفہ قبرستان میں دفن ہونا ہر مسلمان کا حق ہے۔ جسے محض اس اندیشہ کے سبب کہ کبھی جھگڑا بڑھ سکتا ہے، تلف نہیں کیا جاسکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

فتوی ۴۵ — قبر کے پاس کتبہ لگانا جائز ہے

مسئولہ: (قاری) محمد اقرار رضوی خطیب وامام سنی تارہ مسجد کاشی پور یو ایس نگر اتراکھنڈ۔ یکم ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں
زید نے اپنی اہلیہ کی قبر کے سرہانے ایک پتھر پر اپنی اہلیہ کا نام مع تاریخ وصال کندہ کر نصب کر دیا ہے۔ جس کو لوگ ناجائز وحرام قرار دے رہے ہیں۔ کیا واقعی قبر کے سرہانے پتھر یا کسی اور نشانی کا لگانا ناجائز وحرام ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

قبر کے پاس پتھر وغیرہ لگانا جائز ہے اسے ناجائز وحرام کہنے والے لوگ غلطی پر ہیں۔
علامت قبر کی غرض سے قبر کے پاس پتھر لگانا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔
’’لما مات عثمان بن مظعون، أخرج بجنازته فدفن، فأمر النبی صلی الله علیه وسلم رجلا أن یأتیه بحجر، فلم یستطع حمله، فقام إلیها رسول الله صلی الله علیه وسلم، وحسر عن ذراعیه، قال کثیر: قال المطلب: قال الذی یخبرنی ذلك عن

رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: كأني أنظر إلى بياض ذراعي رسول الله صلى الله عليه وسلم، حين حسر عنهما ثم حملها فوضعها عند رأسه، وقال أتعلم بها قبر أخي وأدفن إليه من مات من أهلي''

یعنی جب حضرت عثمان بن مظعون وصال کے بعد دفن کردئے گئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ایک پتھر لانے کا حکم فرمایا وہ اسے اٹھانہ سکاتو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور آستین کو چڑھایا کثیر نے کہاکہ مطلب نے کہامجھے خبر دینے والے نے خبر دی کہاجب آپ نے کلائیوں سے کپڑا اٹھایاتو گویامیں میں آپ کی کلائیوں کی سفیدی دیکھ رہاہوں پھر آپ نے وہ پتھر اٹھاکر حضرت عثمان کی قبر کے سرہانے رکھ دیااور فرمایاکہ میں اس کے ذریعہ اپنے بھائی کی قبر پر نشان قائم کرتاہوں اور میرے گھر والوں میں سے جو وفات پائے گااس کواس کے پاس دفن کروں گا۔

[سنن ابوداؤد شریف، ۲۱۵/۳، کتاب الجنائز، باب فی جمع الموتی فی قبر والقبر یعلم،]

سنن ابن ماجہ میں حضرت انس بن مالک سے مروی:

''أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أعلم قبر عثمان بن مظعون بصخرة''

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعون کی قبر کو پتھر سے نشان زد فرمایا۔

[سنن ابن ماجہ، ۴۹۸/۱، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی العلامۃ فی القبر]

تبیین الحقائق شرح کنزالدقائق میں ہے:

''وقيل لا بأس بالكتابة أو وضع الحجر ليكون علامة لما روى أنه عليه الصلاة والسلام وضع حجرا على قبر عثمان بن مظعون''

اور کہاگیاہے کہ کوئی حرج نہیں قبر پر لکھنے یاپتھر رکھنے میں تاکہ پہچان ہو جائے جیساکہ مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعون کی قبر پر پتھر رکھا۔[باب الجنائز، ۲۴۶/۱]

فتاوی قاضی خاں میں ہے: ''وان كتب عليه شيئاً اووضع الاحجار لاباس بذلك عند البعض''

اوراگر قبر پر کچھ لکھایاپتھر رکھاتو بعض کے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

[۲۲۸/۱، باب فی غسل المیت ومایتعلق بہ من الصلاۃ علی الجنازۃ والتکفین وغیرذلک]

البتہ قبر پر لکھنے کے سلسلے میں چوں کہ نہی وارد ہے اس لئے بعض فقہائے کرام نے بلاحاجت لکھنے کو منع فرمایاہے۔

درمختار میں ہے:

''لا بأس بالكتابة إن احتيج إليها حتى لا يذهب الأثر ولا يمتهن''

قبر پر لکھنے میں کوئی حرج نہیں اگر حاجت ہو لکھنے کی تاکہ نشان نہ جائے اور پامال نہ ہو۔

اس کے تحت ردالمحتار میں ہے:

''(قوله لا بأس بالكتابة إلخ لأن النهي عنها وإن صح فقد وجد الإجماع العملي بها، فقد أخرج الحاكم النهي عنها من طرق، ثم قال: هذه الأسانيد صحيحة وليس العمل عليها، فإن أئمة المسلمين من المشرق إلى المغرب مكتوب على

قبورهم، وهو عمل أخذ به الخلف عن السلف اهـ ويتقوى بما أخرجه أبو داود بإسناد جيد أن رسول الله صلى الله عليه وسلم حمل حجرا فوضعها عند رأس عثمان بن مظعون وقال: أتعلم بها قبر أخي وأدفن إليه من مات من أهلي فإن الكتابة طريق إلى تعرف القبر بها، نعم يظهر أن محل هذا الإجماع العملي على الرخصة فيها ما إذا كانت الحاجة داعية إليه في الجملة كما أشار إليه في المحيط بقوله وإن احتيج إلى الكتابة، حتى لا يذهب الأثر ولا يمتهن فلا بأس به. فأما الكتابة بغير عذر فلا''

یعنیان کا قول قبر پر لکھنے میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ نہی اس بارے میں اگرچہ صحیح ہے لیکن اجماع عملی اس پر ہے، حاکم نے نہی تخریج کی اس سلسلے میں کئی طرق سے پھر کہا یہ اسانید صحیح ہیں۔ البتہ اس پر عمل نہیں ہے۔ پورب سے پچھم تک ائمہ مسلمین کی قبروں پر لکھا ہوا ہے اور یہ عمل اگلوں نے پچھلوں سے لیا ہے اور اس عمل کو تقویت ملتی ہے اس حدیث سے جسے ابو داؤد نے صحیح سند سے تخریج فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پتھر اٹھایا اور اسے عثمان بن مظعون کی قبر کے سرہانے رکھا اور فرمایا کہ میں اس کے ذریعہ اپنے بھائی کی قبر پر نشان قائم کرتا ہوں۔ اور میرے گھر والوں میں سے جو وفات پائے گا اس کو اس کے پاس دفن کروں گا۔ لہٰذا کتابت بھی قبر کی علامت کا ایک راستہ ہے، ہاں اس اجماع عملی کا محل اس سلسلے میں رخصت ہونے پر جب ہے کہ اس کی حاجت ہو، جیسا کہ اشارہ کیا محیط میں اپنے قول، اگر حاجت ہو لکھنے کی تاکہ نشان نہ جائے اور پامال نہ ہو تو اجازت ہے اور بغیر عذر نہیں۔

[در المختار مع رد المحتار، ۱۴۴/۳، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجنازۃ]

حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح میں محیط کے حوالے سے ہے:

''إن احتيج إلى الكتابة حتى لا يذهب الأثر ولا يمتهن به جازت فأما الكتابة من غير عذر فلا''

اگر حاجت ہو لکھنے کی تاکہ نشان نہ جائے اور پامال نہ ہو تو اجازت ہے اور بغیر عذر نہیں۔

[باب احکام الجنائز، فصل فی حملها و دفنها، ص، ۶۱۲، ۶۱۱]

الحاصل: قبر کی پہچان کی غرض سے تاکہ وہاں فاتحہ خوانی کے لئے جائے تو حرج نہ ہو یا کسی اور غرض صحیح سے قبر سے ہٹ کر قبر کے قریب پتھر وغیرہ لگانا یا اس پر لکھنا از روئے شرع جائز و درست ہے۔

هٰذا ما عندي والعلم عند الله تعالىٰ۔

احکام روزہ وزکاۃ

فتوی ۴۶ اعتکاف، سحری، زکاۃ وغیرہ سے متعلق چند اہم مسائل

مسئولہ: محمد عبد الرشید قادری پیلی بھیتی۔ ۲۲/رجب المرجب ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین درج ذیل مسائل میں

(۱) اعتکاف کسے کہتے ہیں اور اس کی کتنی قسمیں ہیں؟

(۲) ایک ہی بستی یا شہر میں بلکہ ایک ہی مسجد میں سو سو ۱۰۰ دو دو سو ۲۰۰ لوگوں کو اعتکاف میں بٹھانا اور ان کے کھانے وغیرہ کا بوجھ بستی پر ڈالنا یا زکاۃ و فطرہ کی رقوم سے اس خرچ کو پورا کرنا اگرچہ حیلہ شرعی کے بعد ہی یہ رقوم استعمال میں لی جاتی ہوں شرعاً درست ہے یا نہیں؟

(۳) رمضان المبارک میں سحری کے لئے کئی کئی گھنٹہ پہلے سے تیز آواز لاؤڈا سپیکر کے ذریعہ لوگوں کو جگانا اور مسلسل لاؤڈا سپیکر سے نظمیں، نعتیں، تقریریں سنانا اور ان کی کیسٹیں بجانا جس سے قرب و نزدیک کے لوگوں مریضوں بیماروں نیز عبادت گزاروں سونے والوں کو تکلیف ہو شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ شریعت اسلامیہ کی رو سے اس کی کوئی حد یا مقدار متعین ہو سکتی ہے۔ یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

(۴) آبادی کے اندر مجلس وعظ و تقریر میں اتنی تیز آواز لاؤڈا سپیکر کا استعمال کہ جس سے بستی میں رہنے والے مریضوں عبادت گزاروں نیز تصنیف و تالیف و کتب بینی میں مشغول رہنے والوں کو تکلیف ہو یا ان کے کاموں میں خلل پڑے شرعاً کیا حکم رکھتا ہے۔

(۵) جلسوں کانفرنسوں بارہ ربیع الاول شریف کے موقع پر سجاوٹ اور وعظ و تقریر کی محافل کا ایسے عام راستوں اور سڑکوں پر انعقاد کرنا کہ جس سے راہ گیروں اور مسافروں کو تکلیف ہو کیسا ہے حکومت سے اتنی دیر کے لئے ان عوامی راستوں کو بند کرنے کی اجازت لے لینا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا جواز شرعی کے لئے گورنمنٹی اجازت کافی ہے؟

(۶) انبیائے کرام علیھم السلام کا ترکہ تقسیم کیوں نہیں ہوتا اور ان کی ازواج پر عدت واجب کیوں نہیں؟

(۷) مذہب حنفی میں ادائے زکاۃ کے لئے تملیک فقیر شرط ہے کیا دیگر مذاہب ثلثہ میں بھی ادائے زکاۃ کے لئے تملیک فقیر شرط ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

(۱) اعتکاف مسجد جماعت میں بنیت اعتکاف ٹھہرنے کو کہتے ہیں۔

اور اس کی تین قسمیں ہیں واجب جس کی نذر مانی گئی ہو۔ سنت موکدہ علی وجہ الکفایہ وہ رمضان کے آخری عشرہ میں مسجد میں ٹھہرنا ہے، اور ان دونوں صورتوں کے علاوہ مسجد میں بنیت اعتکاف ٹھرنا مستحب ہے۔ نور الایضاح میں ہے:

''ھو الإقامة بنیته فی مسجد تقام فیه الجماعة بالفعل للصلوات الخمس... والاعتکاف علی ثلاثة أقسام، واجب فی المنذور وسنة کفایة مؤکدة فی العشر الأخیر من رمضان. ومستحب فیما سوا''

یعنی جس مسجد میں پانچ وقت کی نماز کا اہتمام ہو اس میں اعتکاف کی نیت سے ٹھہرنے کا نام اعتکاف ہے۔ اور اس کی تین قسمیں ہیں۔ واجب جس کی نذر مانی گئی ہو۔ سنت کفایہ موکدہ رمضان کے اخیر عشرہ میں۔ اور مستحب ان دونوں صورتوں کے علاوہ۔

[نور الایضاح، کتاب الصوم، باب الاعتکاف، صفحہ ۲۲۴]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''فهو اللبث في المسجد مع نية الاعتكاف... وينقسم إلى واجب، وهو المنذور تنجيزا أو تعليقا، وإلى سنة مؤكدة، وهو في العشر الأخير من رمضان، وإلى مستحب، وهو ما سواهما''

یعنی مسجد میں اعتکاف کی نیت سے ٹھہرنا اعتکاف ہے۔ اور اعتکاف کی تین قسمیں ہیں واجب اور وہ نذر مانا ہوا ہے خواہ فی الفور ہو یا معلق۔ اور سنت موکدہ اور وہ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف ہے اور مستحب جو ان دونوں صورتوں کے علاہ ہے۔

[فتاوی عالمگیری، کتاب الصوم الباب السابع فی الاعتکاف، ۱/۲۱۱]

(۲) ایک مسجد میں بہت سے لوگوں کا اعتکاف میں بیٹھنا جائز ہے، البتہ بستی والوں پر ان کے کھانے وغیرہ کا بوجھ لادنا ضرور زیادتی ہے۔ شریعت اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتی۔ اور چندہ دہندگان سے زکاۃ وفطرہ مدرسہ ومسجد وغیرہ کے لئے جن مقاصد کے تحت لیا جائے حیلہ شرعی کے بعد انہیں مقاصد میں صرف کیا جائے اس کے علاوہ میں صرف کرنا از روئے شرع درست نہیں۔ اب اگر مسجد میں اعتکاف میں بیٹھنے والوں کے کھانے وغیرہ کا انتظام بھی اس میں شامل ہو تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ عمل غیر مناسب ہے۔

(۳) سحری کے وقت لاؤڈ اسپیکر پر نعت وغیرہ پڑھنا باعث ثواب کام ہے، لیکن واجب وفرض نہیں۔ اس لئے لاؤڈ اسپیکر کی آواز اگر بستی کے مریضوں، عبادت گزاروں، سونے والوں اور تصنیف وتالیف وغیرہ کا کام کرنے والوں کے لئے باعث تکلیف ہو تو ہرگز اس کے استعمال کی اجازت نہیں ہوگی۔ اور اس میں وقت کی حد بندی بھی از حد دشوار ہے۔ پتہ نہیں کون کب کیا کر رہا ہو۔ ہاں البتہ لوگوں کو رمضان میں اس کی عادت سی پڑ جاتی ہے اگر لاؤڈ اسپیکر سے اعلان اور نعت وغیرہ کی آواز نہ آئے تو لوگوں کا سحری کے لئے بیدار ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ تو ہلکی آواز میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اگر نعت خوانی کی جائے اور لوگوں کو جگایا جائے تو ممکن ہے کسی کو تکلیف نہ ہو۔

(۴) آبادی میں جلسہ منعقد کرنا اور اس میں تیز آواز لاؤڈ اسپیکر کا استعمال کرنا جس سے مریضوں کو تکلیف ہو عبادت گزاروں کتب بینی میں مشغول لوگوں اور سونے والوں کی نیند میں خلل واقع ہو جائز نہیں۔

فتاوی شامی میں حاشیہ حموی کے حوالے سے ہے۔ ''وفي حاشية الحموي عن الإمام الشعراني: أجمع العلماء سلفا وخلفا على استحباب ذكر الجماعة في المساجد وغيرها إلا أن يشوش جهرهم على نائم أو مصل أو قارئ إلخ''

حاشیہ حموی میں امام شعرانی سے ہے کہ علمائے سلف وخلف نے مساجد اور اس کے علاوہ میں اجتماعی ذکر کے مستحب ہونے پر اجماع کیا ہے۔ البتہ اس قدر جہر نہ ہو کہ سونے والے یا نمازی یا قرآن کی تلاوت کرنے والے کو پریشانی لاحق ہو۔

[ردالمحتار، کتاب الصلاۃ مطلب فی رفع الصوت بالذکر، ۲/۴۳۴]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"ایسا جہر جس سے کسی کی نماز یا تلاوت یا نیند میں خلل آوے یا مریض کو ایذا پہنچے ناجائز ہے"

[فتاوی رضویہ قدیم، جلد ۹ نصف آخر، ص ۱۲۶]

فقیر کی فہم ناقص کے مطابق یہ حکم تب ہو گا جب قاری وذاکر تنہا ہے اگر اس کے ساتھ مجمع کثیر ہو تو پھر بقدر ضرورت جہر ناجائز نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ مجمع کثیر تک آواز بغیر لاؤڈ اسپیکر پہنچنا مشکل ہے۔ ہاں البتہ اس میں احتیاط کی ضرورت ہے لاؤڈ اسپیکر کی آواز ضرورت سے زائد نہ رکھی جائے کہ لوگ پریشان ہوں۔

(۵) جلسے وغیرہ عام راستوں میں منعقد کرنا اور راستے مسدود کر دینا کہ راہ گیروں کو تکلیف ہو ہرگز جائز نہیں۔ نماز جنازہ جب کہ فرض کفایہ ہے مگر راہ گیروں کی پریشانی کے سبب عام راستہ میں نماز جنازہ کی بھی اجازت نہیں ہے۔ علما نے مکروہ قرار دیا ہے۔ حاشیہ طحطاوی میں ہے:

"تکرہ صلاۃ الجنائز فی الشارع لشغل حق العامۃ"

(عام لوگوں کے حق میں خلل انداز ہونے کے سبب سڑک پر نماز جنازہ مکروہ ہے)

[حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح کتاب الصلاۃ، باب احکام الجنائز، ۵۹۲]

لہٰذا راستے بند کر دینا جس سے راہ گیروں کو پریشانی ہو از روئے شرع جائز نہیں۔

(۶) تملیک چاروں مذاہب میں شرط ہے۔

(۷) انبیائے کرام کے ترکہ کے تقسیم نہ ہونے کے کئی اسباب ہیں۔ عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں علامہ عینی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان عالیشان "لا نورث ما ترکنا صدقۃ" کے تحت انبیائے کرام کی میراث جاری نہ ہونے کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"الحکمۃ فی سبب عدم میراث الأنبیاء، علیہم الصلاۃ والسلام، أنہ لا یظن بہم أنہم جمعوا المال لورثتہم، وقیل: لئلا یخشی علی وارثہم أن یتمنی لہم الموت فیقع فی محذور عظیم. وقیل: لأنہم کالآباء لأمتہم، فمالہم لکل أولادہم، وہو معنی الصدقۃ"

انبیائے کرام کی میراث نہ ہونے کے سلسلے میں حکمت یہ ہے کہ ان کے بارے میں یہ گمان نہ کیا جائے کہ انہوں نے اپنے وارثین کے لئے مال جمع کیا۔ اور کہا گیا ہے کہ انبیائے کی میراث نہیں ہے تاکہ ان کے وارث پر ان کی موت کی تمنا کر کے بڑی مصیبت میں پڑ جانے کا کوئی خوف نہ ہو۔ اور کہا گیا ہے کہ انبیائے کرام اپنی امت کے لئے باپ کے درجہ میں ہیں تو ان کا مال اپنی کل اولاد کے لئے ہے اور یہ صدقہ کا مفہوم ہے۔

[عمدۃ القاری شرح بخاری، کتاب الخمس، ۴۲۳/۱۰]

علامہ ابن حجر نے بھی فتح الباری شرح بخاری میں باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا نورث ما ترکنا صدقۃ" کے تحت متذکرہ بالا حدیث پاک کی شرح میں انہیں دو حکمتوں کا ذکر کیا ہے۔ ابو الاشبال حسن زہیری شرح صحیح مسلم میں امام نووی کے حوالے سے انبیائے کرام کی میراث تقسیم نہ ہونے کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الحکمة فی أن الأنبیاء صلوات اللہ علیهم لا یورّثون: أنه لا یؤمن أن یکون فی الورثة من یتمنی موته فیهلك أی: لأن المورث إذا کبر فی السن تمنی بعض الورثة موته، ولو تمنی أحد موت النبی لهلك ودخل النار۔ وهذا باب من أبواب بغض النبی صلی اللہ علیه وسلم، ومن أبغض النبی کفر باللہ، فبغض النبی کفر علیه الصلاة والسلام...''

انبیائے کرام کے وارث نہ ہونے کی حکمت یہ کہ وہ مومن نہیں ہو سکتا جو کہ وارثین میں ہو اوران کی موت کی تمنا کرے وہ ہلاک ہو جائے گا۔ یعنی انبیاء کرام کا کوئی وارث نہیں ہو تا کیوں کہ مورث جب زیادہ عمر کو پہنچ جاتا ہے تو بعض ورثا مورث کی موت کی تمنا کرتے ہیں اوراگر کوئی نبی کی موت کی تمنا کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا اور جہنم میں داخل ہو گا۔ اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض کے ابواب میں سے ایک باب ہے اور جس شخص نے نبی سے بغض رکھا اللہ کے ساتھ کفر کیا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض کفر ہے۔ [۸۸/۱۲]

اور نبی کی ازواج پر عدت واجب ہونے نہ ہونے کے سلسلے میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں عدت واجب ہے بعض منع کرتے ہیں البتہ عدت واجب نہ ہونے پر اکثر متفق ہیں۔، اوراس کی حکمت کیا ہے اس سلسلے میں شیخ ابوعبد اللہ شمس الدین قرطبی اپنی تفسیر میں سورہ احزاب کی آیت ۵۳ کے تحت فرماتے ہیں۔

''اختلف العلماء فی أزواج النبی صلی اللہ علیه وسلم بعد موته، هل بقین أزواجا أم زال النکاح بالموت، وإذا زال النکاح بالموت فهل علیهن عدة أم لا، فقیل: علیهن العدة، لأنه توفی عنهن، والعدة عبادة. وقیل: لا عدة علیهن، لأنها مدة تربص لا ینتظر بها الإباحة وهو الصحیح''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد آپ کی بیویوں کے سلسلے میں علماء نے اختلاف کیا ہے آیا آپ کی ازواج کا نکاح باقی ہے یا وصال سے زائل ہو گیا؟ اور اگر وصال کے سبب نکاح زائل ہو گیا تو کیا ان پر عدت ہے یا نہیں؟

پس کہا گیا ہے کہ ان پر عدت ہے اس لئے کہ وہ ان سے وفات پا گئے اور عدت عبادت ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ عدت (نکاح کے) انتظار کی مدت ہے (اورازواج مطہرات کے لئے) عدت سے نکاح کے جائز ہونے کا انتظار نہیں ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔

عمدۃ القاری شرح بخاری میں علامہ عینی ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدت نہ ہونے کی حکمت بیان فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''لا عدة علیهن لأنها مدة تربص تنتظر بها الإباحة''

ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عدت نہیں ہے کیوں کہ عدت انتظار کی مدت کا نام ہے۔ اور عدت سے نکاح کے جائز ہونے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ [عمدۃ القاری شرح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، ۲۴۸/۱۳]

اور چوں کہ ازواج نبی کا کسی سے نکاح جائز نہیں اس لئے عدت کی بھی ضرورت نہیں۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں۔ ''لا عدة علیهن لأنه صلی اللہ علیه وسلم حی فی قبره، وکذلك سائر الأنبیاء''

ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عدت نہیں ہے کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مزار اقدس میں زندہ ہیں۔ اور یہی حکم تمام انبیائے کرام کا ہے۔ [مرقاۃ المفاتیح، کتاب الفضائل والشمائل، باب بالرفع والاسکان، ۱۲۸/۱۱]

هٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

فتوی ۴۷

آنکھ میں دواڈالنے سے روزہ فاسد نہیں ہوگا
کان میں دواڈالنے سے روزہ فاسد ہوجائے گا

مسئولہ: محمد اشفاق احمد نظامی کرلا ممبئی۔۸ر رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ

کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان ذوی الاحترام درج ذیل مسائل میں

(۱) آنکھ میں دواڈالنے سے روزہ فاسد ہوگایانہیں؟

(۲) روزے کی حالت میں اگر کسی شخص نے کان میں پانی ڈالا توکیاروزہ فاسد ہوجائے گا؟ایک مفتی صاحب نے اپنے فتوی میں لکھاہے کہ روزہ فاسد نہیں ہوگاکچھ علماء کہتے ہیں روزہ فاسد ہوجائے گا۔جولوگ کان میں پانی ڈالنے سے روزہ نہ ٹوٹنے اورآنکھ میں دواڈالنے سے روزہ ٹوٹ جانے کاحکم دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ جدید تحقیق ہے۔طب کے ماہرین کی تحقیقات کی روشنی میں ہم نے یہ فیصلہ لیاہے۔لہٰذااس تعلق سے جوبھی صحیح حکم ہودلائل کی روشنی میں بیان فرمائیں اورعنداللہ ماجورہوں۔

الجواب

(۱) آنکھ میں دواڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتاجیساکہ محیط برہانی میں ہے:

''أقطر شيئاً من الدواء في عينه لا يفسد صومه عندنا''

اپنی آنکھ میں دواڈالی توہمارے نزدیک روزہ فاسد نہیں ہوگا[۳۸۴/۲]

بحرالرائق میں ہے:

''كذا لو صب في عينه لبن أو دواء مع الدهن فوجد طعمه، أو مرارته في حلقه لا يفسد صومه كذا في الظهيرية''

یعنی ایسے ہی اگردودھ یادواتیل کے ساتھ اپنی آنکھ میں ڈالی اس کاذائقہ یااس کی کڑواہٹ حلق میں پائی توروزہ فاسد نہیں ہوگا ایساہی ظہیریہ میں ہے''[البحرالرائق، ۴۷۷/۲،باب مایفسدالصوم ومالایفسدہ]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''أقطر شيئا من الدواء في عينه لا يفطر صومه عندنا، وإن وجد طعمه في حلقه''

یعنی آنکھ میں دواڈالی توہمارے نزدیک روزہ فاسد نہیں ہوگااگرچہ اس کاذائقہ اپنے حلق میں پائے۔

[فتاوی عالمگیری، ۲۰۳/۱ باب مایفسدالصوم ومالایفسدہ]

امام طحطاوی فرماتے ہیں:

''كذا لو صب في عينه لبنا أو دواء مع الدهن فوجد طعمه، أو مرارته في حلقه لا يفسد صومه كذا في الظهيرية''

یعنی ایسے ہی اگردودھ یادواتیل کے ساتھ اپنی آنکھ میں ڈالی اس کاذائقہ یااس کی کڑواہٹ حلق میں پائی توروزہ فاسد نہیں ہوگا ایساہی ظہیریہ میں ہے"[حاشیۃ الطحطاوی علی الدر، ۴۵۰/۱،باب مایفسدالصوم ومالایفسدہ]

الحاصل:۔ مذکورہ بالاعبارات فقہیہ سے ثابت ہواکہ آنکھ میں دواڈالنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتاہے۔

(۲) کان میں پانی بالقصد داخل کرنے سے روزہ کے فساد کے سلسلے میں فقہائے کرام کے مختلف آراء ونظریات ہیں بعض کے نزدیک کان میں عمداً پانی داخل کرنا مفسد صوم ہے بعض کے نزدیک نہیں۔

فتاوی قاضی خاں میں ہے:

"لوخاض الماء فدخل الماء اذنه لایفسد صومه وان صب الما فی اذنه اختلفوا فیه والصحیح هو الفساد لانه وصل الی الجوف بفعله فلا یعتبر فیه صلاح البدن۔

یعنی اگر پانی میں غوطہ لگایا اور پانی کانوں میں داخل ہو گیا تو روزہ فاسد نہ ہوگا اور اگر کان میں پانی خود ڈالا اس بارے میں اختلاف ہے، مذہب صحیح یہی ہے کہ روزہ فاسد ہو جائے گا کیوں کہ اس صورت میں پانی پیٹ تک اس کے عمل سے پہنچا ہے لہذا اس میں اصلاح بدن کا اعتبار نہیں ہوگا۔[فتاوی قاضی خاں، ۱/۲۴۴]

تبیین الحقائق کے حاشیہ میں علامہ شلبی فرماتے ہیں:

"ویظهران الاصح فی الما التفصیل الذی اختاره القاضی رحمه الله"

ظاہر ہوتا ہے کہ پانی کے سلسلے میں سب سے صحیح وہ تفصیل ہے جس کو قاضی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار فرمایا ہے۔[۱/۳۲۹]

نورالایضاح میں وہ ستاون باتیں جن سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے مگر کفارہ لازم نہیں ہوتا انہیں میں سے ایک کان میں پانی داخل کرنا بھی ہے ملاحظہ فرمائیں:

"اقطر فی اذنه دهنا او ماء فی الاصح" یعنی کان میں تیل یا پانی ڈالا تو مذہب اصح میں (روزہ فاسد ہو جائے گا)

[۲۱۳، باب مایفسد الصوم من غیر کفارۃ]

مجمع الانھر شرح ملتقی الابحر میں ہے "فی الخانیۃ وان صب الماء فی اذنه اختلفوا فیه والصحیح هو الفساد."

یعنی خانیہ میں ہے کہ اگر پانی داخل کیا اپنے کان میں تو اس میں اختلاف کیا گیا ہے اور صحیح فساد ہے۔[۱/۳۶۱]

شرح فتح القدیر میں ہے "ویظهران الاصح فی الما التفصیل الذی اختاره القاضی رحمه الله"

یعنی ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے صحیح پانی کے سلسلے میں وہ تفصیل ہے جس کو قاضی علیہ الرحمہ نے اختیار فرمایا ہے۔[۲/۳۴۷]

حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے "الحاصل نه لا خلاف فی افطاره باقطار الدهن واما الماء فاختار فی الهدایة وشروحها والولوالجی عدم الافطار مطلقا دخل بنفسه او ادخله وفصل قاضیخان بین الادخال قصدا فافسد به الصوم والدخول فلم یفسد"

یعنی حاصل یہ کہ کان میں تیل ڈالنے سے فساد روزہ کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ پانی کے سلسلے میں ہدایہ اور اس کی شروحات اور ولولوالجی میں روزے کے عدم فساد کو اختیار کیا ہے مطلقاً خواہ خود سے چلا جائے یا ڈالا ہو۔ اور قاضی خاں نے تفصیل کی ہے جان بوجھ کر پانی ڈالنے میں کہ اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا اور خود سے داخل کرنے میں کہ اس سے روزہ فاسد نہیں ہوگا۔[کتاب الصوم باب مایفسد الصوم ویوجب القضاء، ۶۷۲]

حاشیۃ الطحطاوی علی الدر میں ہے "وفی الخانیة التفصیل بین الدخول والادخال فصح الفساد فی الثانی ورجهه الکمال

فتحصل ان الفساد بادخال الماء بفعله قولین مصححین فالاحوط تجنبه نہارا''
یعنی اور خانیہ میں پانی داخل ہونے اور داخل کرنے کے درمیان تفصیل ہے تو دوسری صورت میں فساد صحیح ہے اسی کو کمال نے ترجیح دی ہے پس ماحصل یہ کہ فساد پانی از خود داخل کرنے میں ہے دونوں قول صحیح ہیں زیادہ احتیاط یہ ہے کہ دن میں اس سے (پانی کانی میں داخل کرنے سے) پرہیز کرے۔[۱/۴۵۰،باب مایفسدالصوم]

فتاوی شامی میں ہے:

''فصل فی الخانیة بانه ان دخل لایفسدوان ادخله یفسدفی الصحیح لانه وصل الی الجوف بفعله فلایعتبرفیه صلاح البدن ومثله فی البزازیة واستظهره فی الفتح والبرهان شرنبلالية ملخصاً'' والحاصل الاتفاق علی الفطربصب الدهن وعلی عدمه بدخول الماء واختلف التصحيح فی ادخاله''
یعنی خانیہ میں تفصیل کی گئی ہے کہ اگر کان میں پانی داخل ہوا تو روزہ فاسد نہیں ہو گا اور اگر داخل کیا تو فاسد ہو جائے گا مذہب صحیح میں ،اس لئے کہ وہ پیٹ تک اس کے عمل سے پہنچا ہے تو اس میں بدن کی اصلاح کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اور اسی کے مثل بزازیہ میں ہے اور اسی کو فتح میں اور برہان میں شرنبلالیہ نے ظاہر کیا اور حاصل یہ ہے کہ کان میں تیل ڈالنے سے روزہ کے فاسد ہونے اور پانی داخل ہو جانے سے روزہ فاسد نہ ہونے پر اتفاق ہے اور کان میں پانی داخل کرنے سے روزہ کے فاسد ہونے میں اختلاف ہے۔[باب مایفسدالصوم،۳/۳۶۷]

نہرالفائق میں ہے:

''ذکرقاضی خان انه لودخل بجوفه الماء یفسدولوصبه اختلفواوالصحیح انه یفسدوهوالموافق لاطلاق الکتاب''
قاضی خاں نے ذکر کیا کہ اگر پانی پیٹ میں داخل ہو گیا روزہ فاسد ہو جائے گا۔اور اگر (پانی کان میں) داخل کیا تو اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ روزہ فاسد ہو جائے گا۔اور یہی موافق ہے اطلاق کتاب کے سبب۔[باب مایفسدالصوم،۲/۲۱]

دررالحکام شرح غررالاحکام میں قاضی خاں کے حوالے سے ہے:

''وقال قاضی خان لو خاض نهرا فدخل الماء اذنه لا یفسد صومه، ون صب الماء فی اذنه اختلفوا فیه والصحیح هو الفساد؛ لانه وصل الی الجوف بفعله فلا یعتبر فیه صلاح البدن ، قال الکمال ویظهر ان الاصح فی الما التفصیل الذی اختاره القاضی - رحمه الله''
یعنی اور قاضی خاں نے فرمایا اگر اگر پانی میں غوطہ لگایا اور پانی کانوں میں داخل ہو گیا تو روزہ فاسد نہ ہو گا۔اور اگر کان میں پانی خود ڈالا تو اس بارے میں اختلاف ہے،مذہب صحیح یہی ہے کہ روزہ فاسد ہو جائے گا کیوں کہ اس صورت میں پانی پیٹ تک اس کے عمل سے پہنچا ہے۔لہذا اس میں اصلاح بدن کا اعتبار نہیں ہو گا۔اور کمال نے فرمایا اور ظاہر ہوتا ہے کہ اصح پانی میں وہ تفصیل ہے جسے قاضی علیہ الرحمہ نے اختیار فرمایا ہے۔[دررالحکام شرح غررالاحکام،۱/۲۰۲]

النتف فی الفتاوی میں ہے:

''واما من الاذن فالتقطیرفیه من الادویة ودخول الماء فیه وهوذاکرلصومه فان فی قول الفقهاء یفسدمنهما الصوم وفی

قول عبد اللہ لا یفسد''

یعنی کان میں دواڈالنااور پانی ڈالناروزہ یاد ہوتے ہوئے فقہا کے قول کے مطابق ان دونوں سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔ اور شیخ عبد اللہ کے قول کے مطابق روزہ فاسد نہیں ہوتا۔[النتف فی الفتاوی للسغدی، ۱۰۱]

حضور اعلیٰ حضرت فتاوی رضویہ میں فرماتے ہیں:

''حجت ساطعہ لیجئے کان میں بالقصد پانی کا ادخال اصح الاقوال پر مفسد صوم ہے۔ مگر یہی ائمہ کرام جو بحالتِ قصد ادخال افساد وابطال کی تصحیح فرماتے ہیں نہانے یادریا کے اندر جانے میں اگر پانی کان میں چلا جائے توروزہ نہ جانے کی تصریح فرماتے ہیں۔ ائمہ نے اصلا اس کا اعتبار نہ فرمایا کہ اس دخولِ آب کا سبب نہانا یا غوطہ لگانا ہوا اور یہ افعال اس نے بالقصد کئے تو گویا بالقصد پانی کان میں پہنچایا وجہ وہی ہے کہ یہ افعال غالبا دخولِ آب کے موجب نہیں ہوتے اگرچہ کبھی واقع ہوتا بھی ہے توان کا قصد اس کا قصد نہیں ہوسکتا۔ خانیہ میں ہے:لوخاض الماء فدخل الما فی اذنه لایفسد صومه وان صب الما فی اذنه اختلفوا فیه والصحیح هو الفساد لانه وصل الی الجوف بفعله فلا یعتبر فیه صلاح البدن۔ اگر پانی میں غوطہ لگایا اور پانی کانوں میں داخل ہو گیا توروزہ فاسد نہ ہو گا اور اگر کان میں پانی خود ڈالا اس بارے میں اختلاف ہے، مذہب صحیح یہی ہے کہ روزہ فاسد ہو جائے گا کیوں کہ اس صورت میں پانی پیٹ تک اس کے عمل سے پہنچا ہے لہذا اس میں اصلاح بدن کا اعتبار نہیں ہو گا۔

فتاوی امام بزازی میں ہے:

خاض الما فدخل اذنه لایفسد بخلاف دخول الدهن وان صب الما فی اذنه افسده فی الصحیح لوجود الفعل لایعتبر فیه صلاح البدن۔

روزہ دار پانی میں غوطہ زن ہوا، اس کے کان میں پانی داخل ہو گیا توروزہ فاسد نہ ہو گا بخلاف تیل کے دخول کے، اور اگر پانی کان میں ڈالا تو یہ صحیح قول کے مطابق روزہ کو فاسد کردے گا۔ کیوں کہ یہ اس کے اپنے عمل سے ہوا ہے، پس اس صورت میں اصلاحِ بدن کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ جواہر الاخلاطی میں ہے:

لو اغتسل اوخاض فی الما فدخل الما اذنه لا یفسد صومه بلاخلاف ولو ادخل الما فی اذنه ففیه الاختلاف والاصح هو الفساد دلوصوله الی الراس و وصول مالافیه صلاح البدن غیرمعتبر کمالوادخل خشب فی دبره وغیبها۔

یعنی اگر غسل کیا یا پانی میں غوطہ زن ہوا تو پانی کان میں داخل ہو گیا بالاتفاق روزہ فاسد نہ ہو گا۔ اور اگر پانی کان میں داخل کیا تو اس میں اختلاف ہے اصح قول یہ ہے کہ روزہ فاسد ہو جائے گا، کیوں کہ یہ دماغ تک پہنچ جاتا ہے اور دماغ تک ایسی چیز کا پہنچنا جس میں اصلاحِ بدن نہ ہو غیر معتبر ہے۔ جیسا کہ اگر کسی نے اپنی دبر میں لکڑی داخل کی اور وہ غائب ہو گئی۔

فتح القدیر میں ہے: الفساد اذادخل الما ذنه لااذا دخل بغیرصنعه کما اذا خاض نهرا۔

یعنی روزے کا فساد تب ہو گا جب خود اپنے کان میں پانی داخل کرے، اپنے عمل کے بغیر پانی داخل ہونے سے فاسد نہ ہو گا جیسا کہ نہر میں غوطہ زن ہوا۔

[فتاوی رضویہ جدید جلد ۱۰/ ۴۹۹،۴۹۸]

بالجملہ:۔ عبارات مذکورہ میں کان میں پانی داخل کرنے کے سلسلے میں اختلاف ظاہر کیا گیا ہے بعض فقہانے اس اختلاف کو یوں ہی بیان کر دیا ہے کسی ایک پر جزم نہیں فرمایا۔ بعض فقہانے عدم فساد کو ترجیح دی ہے۔ بعض نے امام قاضی خاں کی تفصیل کو صحیح قرار دیا ہے یعنی پانی داخل ہونے سے عدم فساداور داخل کرنے سے فساد کو صحیح قرار دیا ہے۔ بعض فقہانے دونوں قولوں کو صحیح قرار دیتے ہوئے پانی داخل کرنے سے بہت زیادہ احتیاط برتنے کا حکم فرمایا ہے، گویا قاضی خاں کے قول کی صحت کی جانب میلان ظاہر کیا ہے۔ اوراعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے بھی اس مسئلہ میں مفسد صوم کو اصح الاقوال قرار دیا ہے۔ گویا قاضی خاں کے قول ہی کو ترجیح دی ہے۔

اوراحقر کا رجحان بھی اسی طرف ہے چونکہ امام قاضی خاں صاحب ترجیح ہیں ان کی تصحیح اوروں کی تصحیحات پر مقدم ہوا کرتی ہے نیز یہ معاملہ ایک اہم فرض کا ہے اس میں احتیاط کی ہر ممکن کوشش ضروری ہے۔ کسی بھی دینی مسئلہ میں چند کفاروفساق کی نت نئ تحقیقات کے سبب نصوص فقہاسے عدول جائز نہ ہو گا۔ جب تک موجودہ دور کے علما کی اکثریت تحقیقات جدیدہ کو تسلیم کر کے کسی مسئلہ پر متفقہ فیصلہ نہ لے اس وقت تک ایسے ضروری مسائل میں خلاف احتیاط قدم نہ اٹھایا جائے ورنہ قوم انتشار کا شکار ہو کر علما کی بدگوئی کی مرتکب ہو جاتی ہے۔ تحقیق کا حق ہر عالم کو حاصل ہے البتہ عوامی سطح پر اس تحقیق کی اشاعت اس وقت تک مناسب نہیں جب تک مفتیان کرام کی اکثریت اسے تسلیم نہ کر لے۔ علما ومفتیان کرام کی قبولیت کے بغیر کسی تحقیق کا منظر عام پر لانا دین کے لئے بہت مضر ثابت ہوتا ہے۔ ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

فتوی ۴۸

حالت روزہ میں آب دست لیتے وقت روزہ فاسد نہیں ہوتا ایک مولانا صاحب کی غلط فہمی کا ازالہ

مسئولہ: (قاری) محمد اسرار الحق خطیب وامام محمدی مسجد کاشی پور، (حافظ) محمد رضوان خاں رضوی رامپور، حاجی محمد ایوب ازہری۔ کاشی پور، حاجی اشرف ازہری کاشی پور۔ ۳؍رمضان المبارک ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں

روزہ کی حالت میں اگر بیت الخلاء جائے تو کیا آب دست لیتے وقت سانس روک لینا ضروری ہے؟

ایک مولانا صاحب کا کہنا ہے کہ پاخانہ سے فارغ ہو کر جب دھوئے تو دھوتے وقت سانس روک لے ورنہ روزہ ٹوٹ جائے گا۔ کیوں کہ اس سے پانی معدہ تک پہنچ جاتا ہے۔ کیا یہ مسئلہ ایسا ہی ہے یا اس میں کچھ وضاحت ہے اس مسئلہ سے عوام میں کافی تشویش پائی جارہی ہے۔ اس لئے اس کا مفصل جواب عنایت فرمائیں اور عند اللہ ماجور رہوں۔

الجواب

فقہ حنفی میں آب دست لیتے وقت سانس روک لینے کا حکم تو ہے لیکن یہ حکم وجوبی نہیں ہے کہ اگر ایسا نہیں کرے گا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ سانس لینے کا جہاں جہاں حکم ہے وہاں مراد یہی ہے کہ پانی لیتے وقت حقنہ کے مقام تک پانی نہ پہنچ جائے۔ اس لئے احتیاطا سانس روک لینے کا حکم کیا گیا مگر سانس لے گا تو روزہ فاسد ہو جائے گا ایسا کہیں نہیں۔ بلکہ عام طور پر فقہ کی کتابوں

میں روزہ کے فساد کا سبب مقام حقنہ تک پانی پہنچنے کو بیان کیا گیا ہے۔

اور مقام حقنہ تک پانی عموماً تب پہنچتا ہے جب کہ استنجاء میں خوب مبالغہ کیا جاتا ہے۔ اور مقام نجاست کو شدت سے دھویا جاتا ہے۔ اور ایسا بھی عام طور پر نہیں ہوتا ہے بلکہ بہت کم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس سے تکلیف ہوتی ہے اور بیماری کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ صاحب در مختار لکھتے ہیں:

''ولو بالغ فی الاستنجاء حتی بلغ موضع الحقنة فسد وهذا قلما یکون ولو کان فیورث داء عظیما''

یعنی اور اگر استنجا میں مبالغہ کیا یہاں تک کہ مقام حقنہ تک پانی پہنچ گیا تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔ اور یہ کم ہوتا ہے اور اگر ہوتا ہے تو مورث مرض عظیم ہوتا ہے۔ [در مختار، ۳۶۹/۳، کتاب الصوم، باب مایفسد الصوم ومالا یفسده]

صدر الشریعہ لکھتے ہیں:

''مبالغہ کے ساتھ استنجا کیا یہاں تک کہ حقنہ رکھنے کی جگہ تک پانی پہنچ گیا روزہ جاتا رہا۔ اور اتنا مبالغہ چاہئے بھی نہیں کہ اس سے سخت بیماری کا اندیشہ ہے۔'' [بہار شریعت حصہ ۵، ص ۹۸۷]

لہٰذا سانس نہ روکنے پر مطلقا فساد صوم کا حکم لگانا درست نہیں ہے۔ بلکہ سانس روک لینے کو اولیٰ قرار دے کر مبالغہ وشدت سے منع کیا جائے اور مطلقا مقام حقنہ تک پانی پہنچنے ہی کو فساد صوم قرار دیا جائے۔

جیسا کہ فقہانے حکم دیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔ بحر الرائق، اور شرح فتح القدیر میں ہے:

''فالأولی أن یقعد مسترخیا کل الاسترخاء إلا أن یکون صائما وکان الاستنجاء بالماء ولا یتنفس إذا کان صائما ویحترز من دخول الأصبع المبتلة کل ذلك یفسد الصوم وفی کتاب الصوم من الخلاصة إنما یفسد إذا وصل إلی موضع الحقنة وقلما یکون ذلك.''

یعنی اولی یہ ہے کہ تمام مفاصل کو ڈھیلا کر کے بیٹھے مگر یہ کہ روزہ دار ہو اور استنجا پانی سے ہو۔ اور سانس نہ لے جب کہ روزہ دار ہو۔ اور بھیگی انگلی داخل کرنے سے احتراز کرے کہ ہر وہ کام فاسد کر دے گا روزہ کو۔ اور خلاصہ کے کتاب الصوم میں ہے کہ فاسد کرے گا جب کہ مقام حقنہ تک پہنچے اور یہ کم ہوتا ہے۔

[۲۵۳/۱، الاستنجاء بحجر، شرح فتح القدیر، ۲۱۳/۱، فصل فی الاستنجاء]

محیط برہانی میں ہے:

''أنه ینبغی أن یجلس کأفرج ما یکون ویرخی کل الإرخاء حتی یطهر ما بداخل فرجه من النجاسة، فیغسلها وإن کان صائماً لا یبالغ فی الإرخاء حتی لا یصل الماء إلی باطنه، فیفسد صومه. وعن هذا قیل: لا ینبغی أن یقوم عن موضع الاستنجاء حتی ینشف ذلك الموضع بخرقة حتی لا یصل الماء إلی باطنه، وکذلك قیل: لا ینبغی أن یتنفس فی الاستنجاء للمعنی الذی ذکرنا''

یعنی مناسب ہے کہ کشادہ ہو کر بیٹھے تمام مفاصل کو ڈھیلا چھوڑ دے یہاں تک کہ پاک ہو جائے فرج داخل کی نجاست تو دھوئے اسے۔ اور اگر روزدار ہو تو مبالغہ نہ کرے تا کہ پانی اس کے باطن تک نہ پہنچ جائے۔ ورنہ اس کا روزہ فاسد ہو جائے گا۔

اوراسی وجہ سے کہا گیاہے کہ مناسب نہیں کہ استنجا کی جگہ سے مقام استنجا پوچھے بغیر کھڑا ہو جائے تاکہ پانی اس کے باطن تک نہ پہنچ پائے۔ اورایسے ہی کہا گیاہے کہ نہیں مناسب ہے کہ سانس لے استنجا کے وقت اس کا معنی وہی جو ہم نے ذکر کیا(یعنی کہ پانی کہیں اندر تک داخل نہ ہو جائے)[محیط برہانی، ۱/۴۴، کتاب الطہارات]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"روزہ دار کو یہ بہتر تو ہے کہ استنجا کرنے میں اوپر کو سانس بقوت نہ لے مگر اس قدر سے روزہ نہ جائے گا، نہ مطلقاپانی چڑھنے سے جب تک پانی موضع حقنہ تک نہ پہنچے، اور ایسا ہو گا تو درد شدید پیدا ہو گا"[فتاوی رضویہ جدید، ۲۳/۶۸۰]

الغرض: سانس روک لیناضروری امر نہیں ہے۔ بس فقہانے یہ حکم احتیاطا دیاہے۔ بلکہ اگر امام طحطاوی کی مانیں تو سانس لینے نہ لینے سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ سانس روکنے میں ان کے نزدیک حرج ہے اور کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کا ماننا ہے کہ سانس لینے سے پانی اندر داخل نہیں ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

''وماقیل انه لایتنفس شدیداحفظاللصوم فحرج ولافائدة فیه فانه لایصل بالتنفس شیء الی الداخل اصلا أفاده العلامة نوح وفی السراج وغیره''

یعنی اور یہ جو کہا گیاہے کہ سانس تیز نہ لے روزہ کی حفاظت کے سبب تو اس میں حرج ہے۔ اوراس میں کوئی فائدہ بھی نہیں ہے کیوں کہ سانس لینے سے اندر تک کچھ بھی نہیں پہنچتاہے۔ علامہ نوح نے یہی افادہ فرمایااور سراج وغیرہ میں ایساہی ہے۔

[حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، کتاب الطہارۃ، فصل فی الاستنجاء ص۴۸]

الحاصل: استنجا کے وقت سانس روک لینااولی ہے واجب نہیں ہے۔ کہ سانس نہ روکنے پر روزہ کے فساد کا حکم ہو۔ ہاں البتہ جن لوگوں کا مقام خاص کافی ڈھیلا پڑ گیاہو انہیں کافی احتیاط ضروری ہے۔ کہ کہیں ایسانہ ہو سانس لینے سے پانی مقام حقنہ تک پہنچ جائے اوراس طرح روزہ فاسد ہو جائے۔

هٰذا ماعندی والعلم عندالله تعالیٰ

احکام حج و عمرہ

فتوی ۴۹ ترک سعی پر عذر شرعی کے سبب دم واجب نہیں ہے

مسئولہ: محمد عبد الصبور رضا ازہری، بریلی شریف۔ ۲۹/ جمادی الاولی،۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں
زید نے عمرہ کیا لیکن صفا اور مروہ کی سعی کا ایک چکر لگاتے ہی طبیعت بگڑ گئی، جس کے سبب باقی چکر پورے نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو ڈاکٹر نے بھی چکر لگانے کو منع کیا۔ اگر چکر لگائے جاتے تو طبیعت مزید بگڑ جاتی تو ایسی صورت میں زید کے لئے شرعاً کیا حکم ہے۔ بکر کا کہنا ہے کہ سعی کے ترک پر دم واجب ہوتا ہے تو کیا زید پر دم واجب ہو گا۔ ازروئے شرع جو حکم ہو بیان فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔ المستفتی

الجواب

حج و عمرہ دونوں میں سعی واجب ہے، اور واجب کے ترک پر دم واجب ہوتا ہے۔ جیسا کہ فقہ حنفی کی معتبر کتاب مبسوط سرخسی میں ہے:

''وإن ترك السعي فيما بين الصفا، والمروة رأسا في حج أو عمرة فعليه دم عندنا، وهذا لأن السعي واجب، وليس بركن عندنا، الحج والعمرة في ذلك سواء، وترك الواجب يوجب الدم''

یعنی حج یا عمرہ میں اگر صفا اور مروہ کے درمیان کی سعی چھوڑ دی تو اس پر دم واجب ہے ہمارے نزدیک کیوں کہ سعی واجب ہمارے نزدیک رکن نہیں ہے خواہ حج ہو یا عمرہ، اور ترک واجب دم کو واجب کر دیتا ہے۔

[مبسوط سرخسی۔۴/۵۰،باب السعی بین الصفا والمروۃ]

اور فتاوی عالمگیری میں ہے:

''من ترك السعي بين الصفا والمروة فعليه دم''

یعنی اگر صفا اور مروہ کی سعی چھوڑ دی تو اس پر دم واجب ہے۔ [فتاوی عالمگیری، ۱/۲۴۷، کتاب المناسک]

لیکن یہ حکم تب ہوتا جب کہ یہ ترک واجب بغیر عذر کے ہوتا اگر عذر شرعی کے سبب ترک واجب پایا جائے تو دم واجب نہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ فتاوی شامی میں ہے: ''لو ترك شيئاً من الواجبات بعذر لاشيء عليه''

یعنی اگر واجبات میں کچھ عذر کے سبب ترک ہوا تو اس پر کچھ لازم نہیں۔ [ردالمحتار، کتاب الحج، باب الجنایات، ۳/۵۷۳]

اور عذر بھی وہ جب من اللہ ہو من العباد نہ ہو مطلب وہ مانع عمل اللہ کی طرف سے لاحق ہو بندہ کی طرف سے نہ ہو اگر بندہ کی طرف سے لاحق ہوا تو وہ عذر شرعی نہیں قرار پائے گا۔ فتاوی شامی میں ہے: ''ان المراد بالعذر مالا یکون من العباد''

یعنی عذر سے مراد وہ ہے جو بندوں کی طرف سے نہ ہو [مرجع سابق]

صورت مسئولہ میں چونکہ زید کا معذور ہونا ظاہر ہے اس لئے زید کا عمرہ ہو گیا اور زید پر صفا و مروہ کی سعی ترک کر دینے پر دم واجب نہیں ہوا۔ ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

فتوی ۵۰ حائضہ عورت افعال حج کیسے کرے؟ چند اہم مسائل

مسئولہ: شمشاد حسین انصاری، دہرادون اترا کھنڈ۔۸ ذوالحجہ ،۱۴۳۸ھ

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسائل میں

(۱) عورت کو احرام باندھنے کے وقت حیض شروع ہو گیا تو کیا وہ اب احرام باندھے گی یا نہیں؟ اور کیا ارکان حج اسی حالت میں ادا کرے گی؟

(۲) طواف قدوم کے وقت عورت حائضہ ہے تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟

(۳) طواف زیارت کے وقت بھی حیض آرہاہے اور ٹکٹ کنفرم ہے حیض ختم ہونے تک رکنے کی کوئی سبیل نہیں ہے ایسی صورت میں طواف زیارت کرے یا نہیں؟

(۴) طواف عمرہ کے وقت بھی عورت حائضہ ہے تو اب کیا کرے؟

(۵) طواف وداع کے وقت عورت حیض سے ہے تو کیا طواف وداع کئے بغیر جاسکتی ہے کوئی کفارہ وغیرہ تو نہیں ہے؟

(۶) اگر حیض کا خون ایام عادت سے پہلے رک جائے اور عورت طواف کرلے اور پھر خون جاری ہو جائے تو اس صورت میں کئے ہوئے طواف کا کیا حکم ہے؟

(۷) اگر طواف کے دوران حیض آجائے تو عورت کیا کرے؟

(۸) اگر کوئی طواف مکمل یا اس کے چند چکر دوران حیض کئے تو کیا حکم ہے؟

الجواب

(۱) عورت اگر احرام کے وقت حائضہ ہو تو غسل کر کے احرام باندھے گی اور طواف کعبہ اور سعی کے علاوہ سارے ارکان ادا کرے گی۔ ہدایہ میں ہے:

وإذا حاضت المراة عند الإحرام اغتسلت واحرمت وصنعت كما يصنعه الحاج غير انها لا تطوف بالبيت حتى تطهر

اور جب عورت احرام کے وقت حائضہ ہو تو غسل کرے اور احرام باندھیاور وہ تمام کام کرے جو حاجی کرتے ہیں۔ البتہ طواف کعبہ نہ کریہاں تک کہ پاک ہو جائے۔[ہدایہ، جلداول ص ۱۵۶]

ملتقی الابحر میں ہے: ''ولو حاضت عند الإحرام اغتسلت واتت بجميع المناسك إلا الطواف'' اگر عورت احرام کے وقت حائضہ ہو جائے تو غسل کرے اور سوائے طواف کے تمام اعمال حج ادا کرے۔[ملتقی الابحر، کتاب الحج، ۵۲/۱]

فتاوی قاضی خاں میں ہے:

''المراة إذا حاضت فی الحج إن حاضت قبل ان تحرم وانتهت إلى الميقات فإنها تغتسل وتحرم وإذا قدمت مكة وهي حائض تصنع كما يصنع الحاج غير انها لا تطوف بالبيت ولا تسعى بين الصفا والمروة وتشهد جميع المناسك۔

یعنی عورت جب دوران حج حائضہ ہو جائے تو اگر وہ احرام باندھنے سے پہلے حائضہ ہوئی ہے اور میقات تک حیض ختم ہو گیا تو وہ

غسل کرے اوراحرام باندھے اور جب حالت حیض ہی میں مکہ پہنچ گئی توسوائے طواف کعبہ اور صفاومروہ کی سعی کے تمام کام کرے جوحاجی لوگ کرتے ہیں"[فتاوی قاضی خاں، ۱/۲۴۷،فصل فی کیفیة اداء الحج]
ردالمحتار میں ہے:
تنبیه قدمناعن المحیط ان تقدیم الطواف شرط صحة السعی فعن هذا قال القهستانی فلوحاضت قبل الإحرام اغتسلت واحرمت وشهدت جمیع المناسك إلا الطواف والسعی اه ای لان سعیها بدون طواف غیرصحیح''
یعنی خبر دار ہم محیط کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں کہ طواف کا مقدم ہونا سعی کے صحیح ہونے کی شرط ہے اسی وجہ سے قہستانی نے کہا کہ اگر عورت احرام باندھنے سے پہلے حائضہ ہو جائے تو غسل کرے اوراحرام باندھے اور طواف وسعی کے علاوہ تمام مناسک اداکرے اس لئے کہ بغیر طواف کے سعی کرنا صحیح نہیں ہے۔[ردالمحتار،۳/۵۵۲، کتاب الحج]
الحاصل: حائضہ عورت غسل کرکے احرام باندھ لے اور تمام ارکان حج اداکرے البتہ جب تک پاک نہ ہو جائے تب تک طواف کعبہ وسعی نہ کرے۔
(۲) حالت حیض میں کسی طرح کا طواف کرنے کی اجازت نہیں ہے۔طواف قدوم سنت ہے اور سنت کی ادائیگی کے لئے حرام کاارتکاب نہیں کیاجائے گا۔بلکہ اس کو چھوڑ دیاجائے گا۔اوراس کو چھوڑنے سے دم وغیرہ لازم نہیں آئے گا۔
بحرالرائق میں ہے:''طواف التحیة سنة وترکه لایوجب الدم''یعنی طواف تحیۃ سنت ہے اوراس کاترک دم واجب نہیں کرتا۔[بحرالرائق جلد۲ ص ۳۸۶]
بنایہ شرح ہدایہ میں ہے:"(طواف التحیة)وهو طواف القدوم.(وانه)ای وإن طواف القدوم(سنة ولیس برکن حتی لایلزمه بترکه شیء)لانه إذترك السنة اصلًا لایلزمه شیء
طواف تحیۃ اوروہ طواف قدوم ہے سنت ہے رکن نہیں ہے حتی کہ اسے کے ترک سے کچھ لازم نہیں آئے گااس لئے کہ ترک سنت سے کچھ لازم نہیں آتاہے[جلد۴ص ۲۳۲]
جوہرہ نیرہ میں ہے:''حتی لوترکه لم یکن علیه شیء''
یعنی طواف قدوم کواگر چھوڑ دیاتوچھوڑنے والے پرکچھ لازم نہیں ہے۔[جلد ۱ ص ۵۴]
(۳) طواف زیارت حج کااہم رکن ہے اس کے بغیرحج پورانہیں ہوتاہے۔اورحالت ناپاکی میں طواف کرناحرام ہے۔تواگرحیض کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی مکہ سے روانگی ضروری ہو اوررکنے کی کوئی گنجائش نہ ہو توایسی صورت میں اگر حالت حیض ہی میں عورت طواف کرلے گی توحج اداہو جائے گالیکن اس پراس جرم کے سبب بدنہ لازم ہوگا۔البتہ اس طرح حج کی تکمیل ہو جائے گی۔مبسوط سرخسی میں ہے:''طواف الزیارة رکن الحج''
یعنی طواف زیارت حج کارکن ہے۔[مبسوط سرخسی جلد۴ص ۲۲]
بدائع الصنائع میں ہے:''طواف الزیارة فرض''یعنی طواف زیارت فرض ہے۔"[بدائع الصنائع،جلد۲ ص ۱۵۰]
حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

إذا جامع بعد الوقوف بعرفة قبل الحلق والثاني إذا طاف للزيارة جنبا او حائضا او نفساء فإن الواجب في هذين الموضعين البدنة''

یعنی جب وقوف عرفہ کے بعد حلق سے پہلے جماع کیا اور جب ناپاک یا حائضہ یا نفساء نے طواف زیارت کیا تو ان دونوں صورتوں میں بدنہ واجب ہے۔[حاشیہ طحطاوی علی مراقی الفلاح، جلد ۱ ص ۷۴۱]

فتاوی شامی میں ہے:

لو هم الركب على القفول ولم تطهر فاستفتت هل تطوف ام لا، قالوا يقال لها لا يحل لك دخول المسجد وإن دخلت وطفت اثمت وصح طوافك وعليك ذبح بدنة وهذه مسالة كثيرة الوقوع يتحير فيها النساء

یعنی اگر سواریاں کوچ کا اردہ کریں اور عورت حیض سے پاک نہ ہو تو وہ استفتا کرے کہ کیا وہ طواف کر سکتی ہے یا نہیں؟ تو کہا فقہا نے کہ اس سے کہا جائے گا کہ تیرے لئے مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ اور اگر تو داخل ہو گئی اور طواف کر لیا تو گنہگار ہو گی۔ البتہ تیرا طواف درست ہو جائے گا اور تجھ پر بدنہ لازم ہو گا۔ اور یہ مسئلہ اکثر واقع ہوتا ہے اور عورتیں اس میں مبتلا رہتی ہیں۔

[ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد ۳ ص ۵۳۹، کتاب الحج]

بحر الرائق میں ہے:

'' طوافها حرام، وهو من وجهين دخولها المسجد وترك واجب الطهارة فإن الطهارة واجبة في الطواف فلا يحل لها ان تطوف حتى تطهر فإن طافت كانت عاصية مستحقة لعقاب الله ولزمها الإعادة فإن لم تعد كان عليها بدنة، وتم حجها

یعنی حائضہ عورت کا طواف حرام ہے۔ دو وجہوں سے ایک تو مسجد میں داخل ہونے اور دوسرے پاکی کے واجب کا ترک کرنے کے سبب۔ کیوں کہ طہارت طواف میں واجب ہے۔ اس لئے حائضہ عورت کے لئے پاک ہوئے بغیر طواف کرنا حلال نہیں ہے۔ البتہ اگر اسی حالت میں طواف کرے گی تو گنہگار مستحق عقاب الٰہی ہو گی۔ اور اس پر اس کا اعادہ لازم ہو گا۔ اگر اعادہ نہیں کیا تو بدنہ لازم ہو گا اور حج پورا ہو جائے گا۔[بحر الرائق جلد ۲ ص ۳۹۸]

(۴) طواف عمرہ رکن ہے طواف زیارت کی طرح اس لئے اگر عورت حائضہ ہو جائے تو اس سے طواف عمرہ ساقط نہیں ہو گا کسی بھی صورت میں اور اسی لئے اس کے ترک پر کفارہ بھی نہیں ہے بلکہ اس کا ادا کرنا لازم قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر حائضہ عورت کے پاس وقت کی گنجائش نہ ہو تو اگر وہ حالت حیض ہی میں طواف عمرہ کر لے گی تو طواف ادا ہو جائے گا۔ البتہ حالت جنابت میں طواف کرنے کے سبب جزا اور توبہ لازم ہو گی۔ بدائع الصنائع میں ہے:

''لان الطواف ركن في العمرة فاشبه طواف الزيارة في الحج

یعنی یوں کہ طواف عمرہ میں رکن ہے تو وہ حج میں طواف زیارت کے مشابہ ہے۔''[بدائع الصنائع جلد ۲ ص ۱۵۴]

محیط برہانی میں ہے:

'' إذا طاف للعمرة محدثاً او جنباً، فما دام بمكة يعيد الطواف ركن في العمرة كطواف الزيارة في الحج، فإن رجع إلى اهله

ولم يعد، ففي المحدث يلزمه البدنة، وفي الاستحسان يكفيه بدنه
یعنی جب عمرہ کا طواف بے وضو یا ناپاکی کی حالت میں کیا تو جب تک مکہ میں ہے طواف کا اعادہ کرے کیوں کہ عمرہ کا طواف حج میں طواف زیارت کی طرح ہے اگر لوٹ گیا اپنے گھر والوں کی طرف اور اعادہ نہیں کیا تو بے وضو ہونے کی صورت میں بدنہ لازم ہے۔ اور ناپاکی میں بھی بطور استحسان بدنہ ہی کافی ہے۔ [محیط برہانی، جلد ۲ ص ۴۶۴]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''إذا طاف للعمرة محدثا او جنبا فما دام بمكة يعيد الطواف فإن رجع إلى اهله ولم يعد ففي المحدث تلزمه الشاة وفي الجنب تكفيه الشاة استحسانا هكذا في المحيط
یعنی عمرہ کا طواف اگر بے وضو یا حالت ناپاکی میں کیا تو جب تک مکہ میں ہے طواف کا اعادہ کرے۔ اور اگر اپنے گھر لوٹ گیا اور اعادہ نہ کیا تو بے وضو طواف کرنے کی صورت میں بکری کی قربانی لازم ہے۔ اور حالت ناپاکی میں بھی بطور استحسان بکری کی قربانی کافی ہے ایسا ہی محیط میں ہے۔ [فتاوی ہندیہ جلد ۱ ص ۲۴۷]

بہار شریعت میں ہے:

''طواف عمرہ کا ایک پھیرا بھی ترک کرے گا تو دم لازم ہوگا۔ اور بالکل نہ کیا یا اکثر ترک کیا تو کفارہ نہیں بلکہ اس کا ادا کرنا لازم ہے۔'' [بہار شریعت جلد ۲ حصہ ۶ ص ۱۳۲] اسی میں ہے:

''طواف فرض کل یا اکثر یعنی چار پھیرے جنابت یا حیض و نفاس میں کیا تو بدنہ ہے۔'' [مرجع سابق ص ۱۳۱]

(۵) طواف وداع جسے طواف صدر بھی کہتے ہیں حیض کی حالت میں معاف ہے۔ البتہ پاک ہو جائے اور مکہ ہی میں ہو تو معاف نہیں ہے بلکہ اس کا ادا کرنا واجب ہے۔

مبسوط سرخسی میں ہے: '' طواف الصدر واجب، وليس بركن، ويجوز تركه بعذر الحيض،
طواف صدر واجب ہے رکن نہیں ہے اور حیض کے عذر کے سبب اس کا ترک جائز ہے۔ [مبسوط سرخسی، جلد ۴ ص ۶۳]

محیط برہانی میں ہے:

وكذلك ليس على الحائض والنفساء طواف الصدر.... إذا طهرت الحائض والنفساء قبل ان تخرج من بيوت مكة، فعليها طواف الصدر'' یعنی حائضہ اور نفساء پر طواف صدر نہیں ہے..... جب حائضہ اور نفساء مکہ کی آبادی سے نکلنے سے پہلے پاک ہو جائے تو اس پر طواف صدر لازم ہے۔ [محیط برہانی جلد ۲ ص ۴۶۴]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''وطواف الصدر.... لا يجب على الحائض والنفساء'' یعنی طواف وداع حیض و نفاس والی عورت پر واجب نہیں ہے''

[فتاوی عالمگیری، جلد ۱ ص ۲۳۴، الباب الخامس في كيفية اداء الحج]

اسی میں ہے:

''حائض طهرت قبل ان تخرج من مكة يلزمها طواف الصدر، وإن جاوزت بيوت مكة مسيرة سفر وطهرت فليس عليها

ان تعود و کذا لو انقطع دمها فلم تغتسل ولم یذهب وقت الصلاة حتی خرجت من مکة لم یلزمها العود، وإن خرجت وهی حائض ثم اغتسلت ثم رجعت إلی مکة قبل ان تجاوز المیقات فعلیها الطواف کذا فی محیط السرخسی،

یعنی حائضہ مکہ سے نکلنے سے قبل پاک ہوگئی تو اس پر طواف صدر واجب ہے اور اگر مکہ کی آبادی سے سفر کی مساحت طے کر کے نکل گئی تو اس کو لوٹنے کا حکم نہیں ہے۔ اور یوں ہی اگر اس کا خون حیض بند ہو گیا اس نے غسل بھی نہیں کیا اور کسی نماز کا وقت بھی نہیں گزرا اور وہ مکہ سے نکل گئی تب بھی اس پر لوٹنا لازم نہیں ہے۔ اور اگر نکل گئی پھر غسل کر کے میقات سے باہر نکلے بغیر مکہ کو واپس آئی تو اس پر طواف ہے۔ ایسا ہی محیط سرخسی میں ہے۔ [مرجع سابق، ص ۲۳۵]

جوہرہ نیرہ میں ہے:

(قوله فإن حاضت بعد الوقوف و طواف الزیارة انصرفت من مکة ولا شیء علیها لترك طواف الصدر) فإن طهرت قبل ان تخرج من مکة لزمها طواف الصدر فإن جاوزت بیوت مکة ثم طهرت فلیس علیها ان تعود،

یعنی ان کا قول کہ اگر وقوف عرفہ اور طواف زیارت کے بعد عورت حائضہ ہو جائے تو عورت مکہ سے جا سکتی ہے اور اس کے طواف وداع چھوڑ دینے سے کچھ لازم نہیں آئے گا۔ تو اگر مکہ سے نکلنے سے پہلے پاک ہو جائے تو اس پر طواف وداع لازم ہے اور اگر مکہ کی آبادی سے نکل جائے پھر پاک ہو تو اس عورت پر لوٹنا ضروری نہیں ہے۔" [الجوہرۃ النیرۃ، جلد ۱ ص ۱۶۷]

بہار شریعت میں ہے:

"حیض والی مکہ معظمہ سے جانے کے قبل پاک ہو گئی تو اس پر یہ طواف واجب ہے اور اگر جانے کے بعد پاک ہوئی تو اُسے یہ ضرور نہیں کہ واپس آئے۔ اور واپس آئی تو طواف واجب ہو گیا جب کہ میقات سے باہر نہ ہوئی تھی۔ اور اگر جانے سے پہلے حیض ختم ہو گیا مگر نہ غسل کیا تھا، نہ نماز کا ایک وقت گزرا تھا تو اُس پر بھی واپس آنا واجب نہیں۔

[بہار شریعت ج ۲ حصہ ۶ ص ۱۱۴]

(۶) اگر عادت کے ایام پورے ہونے سے قبل حائضہ کا خون رک جائے خواہ کسی طرح سے بھی۔ اور وہ اس صورت میں طواف کر لے اور پھر عادت کے ایام پورے ہونے سے پہلے دوبارہ خون جاری ہو جائے تو اس کا طواف صحیح ہو جائے گا، البتہ اس پر بدنہ اور توبہ لازم ہو گی۔ اور اگر بعد طہارت طواف کا اعادہ کر لے تو بدنہ ساقط ہو جائے گا البتہ توبہ اب بھی لازم ہو گی۔

المسلک المتقسط فی المنسک المتوسط، میں ہے:

"(ولو انقطع دمها) ای دم الحائض (بدواء اولا) ای لابدواء (اولم ینقطع) ای بالکلیة (فاغتسلت اولا) ای او ما اغتسلت (وطافت ثم عاد دمها فی ایام عادتها یصح طوافها ولزمها بدنة وکانت عاصیة) ای من وجهین لدخول المسجد ونفس الطواف (وعلیها ان تعیده طاهرة) ای من الحدثین (فان اعادته سقط ما وجب) ای من البدنة وعلیها التوبة من جهة المعصیة ولو مع البدنة

یعنی اگر حائضہ کا خون رک جائے دوا سے یا بغیر دوا کے یا بالکلیہ نہ رکے وہ غسل کرے یا نہ کرے اور طواف کرے پھر عادت کے دنوں میں اس کا خون جاری ہو جائے تو اس کا طواف صحیح ہے البتہ اس پر بدنہ لازم ہے اور وہ گنہگار ہے۔ مسجد میں داخل ہونے اور نفس طواف کی وجہ سے۔ اور اس پر پاک ہو کر طواف کا اعادہ لازم ہے۔ تو اگر طواف کا اعادہ کر لیا تو بدنہ جو واجب

ہوا تھا ساقط ہو جائے گا اور اس پر گناہ کے سبسب بدنہ کے باوجود توبہ لازم ہو گی۔

[المسلک المتقسط فی المنسک المتوسط لملا علی القاری، ص ۱۷۹]

(۷) اگر طواف کے لئے مسجد میں داخل ہوئی اور حیض شروع ہو گیا تو فوراً طواف کئے بغیر مسجد سے باہر آ جائے۔ حیض کی حالت میں وہیں رکے رہنا حرام ہے۔ بحر الرائق میں ہے:

''لوحاضت بعد ما دخلت وجب علیھا ان لا تطوف وحرم مکثھا،

یعنی اگر مسجد میں داخل ہونے کے بعد حائضہ ہوئی تو اس پر واجب ہے کہ طواف نہ کرے اور وہاں ٹھہرنا حرام ہے''

[بحر الرائق، جلد ا ص ۲۰۷]

(۸) حیض و نفاس کی صورت میں طواف فرض ادا کرنے کا حکم بیان کرتے ہوئے حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''اگر طواف فرض کل یا اکثر جنابت میں یا حیض و نفاس میں کیا تو بدنہ ہے اور بے وضو تو دم ہے۔ اور پہلی صورت میں طہارت کے ساتھ اس کا اعادہ واجب ہے دوسری میں مستحب ہے۔''

[فتاوی رضویہ قدیم، جلد ۶ ص ۷۱۷]

مزید، طواف فرض کے علاوہ کوئی اور طواف ناپاکی کی صورت میں کرنے کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''طواف فرض کے سوا اور کوئی طواف ناپاکی میں کیا تو دم اور بے وضو تو صدقہ'' [مرجع سابق، ص ۷۱۸]

فرض طواف حیض وغیرہ ناپاکی کی حالت میں کرنے کا حکم بیان کرتے ہوئے صدر الشریعہ فرماتے ہیں:

''طوافِ فرض کُل یا اکثر یعنی چار پھیرے جنابت یا حیض و نفاس میں کیا تو بدنہ ہے اور بے وضو کیا تو دَم۔ اور پہلی صورت میں طہارت کے ساتھ اعادہ واجب۔ اگر مکہ سے چلا گیا ہو تو واپس آ کر اعادہ کرے اگرچہ میقات سے بھی آگے بڑھ گیا ہو۔ مگر بارھویں تاریخ تک اگر کامل طور پر اعادہ کر لیا تو جرمانہ ساقط اور بارھویں کے بعد کیا تو دَم لازم، بدنہ ساقط۔ لہٰذا اگر طوافِ فرض بارھویں کے بعد کیا ہے تو دم ساقط نہ ہو گا کہ بارھویں تو گزر گئی اور اگر طوافِ فرض بے وضو کیا تھا تو اعادہ مستحب پھر اعادہ سے دَم ساقط ہو گیا اگرچہ بارھویں کے بعد کیا ہو۔''

نیز ناپاکی کی حالت میں فرض طواف چار پھیروں سے کم کرنے کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چار پھیرے سے کم بے طہارت کیا تو ہر پھیرے کے بدلے ایک صدقہ اور جنابت میں کیا تو دَم۔ پھر اگر بارھویں تک اعادہ کر لیا تو دَم ساقط اور بارھویں کے بعد اعادہ کیا تو ہر پھیرے کے بدلے ایک صدقہ۔''

فرض کے علاوہ جو طواف ہیں ان کو اگر بحالت جنابت کیا تو اس کا حکم بہار شریعت میں درج ذیل بیان کیا گیا ہے:۔

''فرض کے سوا کوئی اور طواف کل یا اکثر جنابت میں کیا تو دَم دے اور بے وضو کیا تو صدقہ اور تین پھیرے یا اس سے کم جنابت میں کیے تو ہر پھیرے کے بدلے ایک صدقہ پھر اگر مکہ معظمہ میں ہے تو سب صورتوں میں اعادہ کر لے، کفارہ ساقط ہو جائے گا۔'' [بہار شریعت، جلد ۲ حصہ ۶ ص ۱۳۴، ۱۳۳]

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

احکام نکاح، طلاق، خلع، مہر، عدت وغیرہ

فتوی ۵۱ بیوہ عورت سے نکاح کار ثواب ہے

مسئولہ: شوکت علی بیل جوڑی کاشی پور۔ مسئولہ: ۱۷ر ربیع النور ۱۴۳۵ھ۔

جناب مفتی صاحب عرض خدمت یہ ہے کہ میرے یہاں کوئی اولاد نہیں ہے پہلی بیوی سے۔ میں نے ایک لڑکی گودلی چھ روز کی اس کی شادی کردی میں نے اپنامکان بھی اس کو دے دیا۔ میں اپنے سالے کی بیوہ سے شادی کرناچاہتاہوں اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں مجھے ان بچوں کی محبت ہے کیوں کہ وہ یتیم ہیں۔ مگر میری بیوی دوسرے نکاح کرنے سے منع کرتی ہے۔ اور کچھ لوگ بھی کہتے ہیں کہ صوفی شوکت علی کیا کررہے ہیں؟

کیایہ غلط ہے یا صحیح اس کاجواب شریعت کی روشنی میں عنایت کریں۔

الجواب

قرآن پاک میں ہے ''وَأُحِلَّ لَكُمْ مَاوَرَآءَ ذٰلِكُمْ''

(اور اُن کے سوا جو رہیں وہ تمہیں حلال ہیں)[سورہ نساء آیت ۲۴]

اس آیت کے تحت آپ کو اپنے سالے کی بیوہ سے نکاح کی ازروئے شرع بالکل اجازت ہے۔ بیوہ سے نکاح اور وہ بھی اس نیک نیتی کے ساتھ کہ یتیم بچوں سے آپ کو محبت ہے یہ تو بہت ہی ثواب کی بات ہے۔ اور بیوی یادوسرے لوگوں کا آپ کو دوسرے نکاح سے روکنا سراسر غلط ہے قرآن میں چار بیویاں ایک ساتھ رکھنے کی اجازت دی گئی۔

''فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ''

(تو نکاح میں لاؤ جو عورتیں تمہیں خوش آئیں دو دو اور تین تین اور چار چار)[ترجمہ کنزالایمان، پارہ ۴ سورہ نساء آیت ۳]

لہٰذا آپ ازروئے شرع دوسرا نکاح کرسکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۵۲ فرضی نکاح کی شرعی حیثیت

مسئولہ: مبین عالم انصاری طفیل باغ کاشی پور۔ ۲۷ر رجب المرجب ۱۴۳۵ھ

کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان ذوی الاحترام درج ذیل مسئلہ میں

میں مبین عالم بن محمد ظفر انصاری محلہ طفیل باغ کاشی پور کا رہنے والا ہوں۔ میری ایک لڑکی نیلوفر جو ایک کالج میں پڑھتی ہے ایک لڑکا صدام حسین بن شہاب الدین ساکن دڑھیال رامپور، میری لڑکی کو بہت دنوں سے بلیک میل کر رہا تھا۔

اس لڑکے نے میری بیٹی کے کچھ فوٹو تیار کر رکھے تھے جسے دکھاکر وہ میری بیٹی کو بلیک میل کرتا رہتا تھا۔ اسے ڈراتا دھمکاتا رہتا تھا اور کہتا کہ تیرے فوٹو انٹرنیٹ پر ڈال دوں گا تجھے سرعام بے عزت کروں گا بلکہ مارنے تک کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ اوراب کچھ دنوں سے وہ فرضی نکاح نامہ دکھاکر میری بیٹی کے ساتھ نکاح ہونے کا دعوی کر رہا ہے۔ اس معاملہ سے متعلق میں چند باتوں کا خلاصہ کر رہا ہوں جن پر غور کیا جائے۔

(۱) نکاح نامہ کی کاپی جو میں نے آپ کو پیش کی ہے اس میں نکاح پڑھائے جانے کا پتہ ''ٹانڈا ضلع رامپور'' درج ہے۔ اور میری لڑکی نے کبھی ٹانڈہ دیکھا ہی نہیں وہ کبھی وہاں گئی ہی نہیں نکاح کے وقت بھی وہ وہاں نہیں تھی وہاں کون لڑکی تھی پتہ نہیں۔

(۲) جس نکاح نامہ پر میری بیٹی کے دستخط ہیں وہ اردو میں ہے اومیری بیٹی اردو پڑھنا لکھنا نہیں جانتی۔ وہ جب دوپہر کو کالج سے نکلی تو اسے ڈرا دھمکا کر وہ ایک ریسٹورینٹ میں لے گیا اور یہ کہہ کر کہ اب تجھے پریشان کرنا بند کر دوں گا اسی نکاح کے کاغذ پر جس میں اس وقت کوئی خانہ پری نہیں ہوئی تھی کسی کا نام و پتہ درج نہیں تھا اور کسی کے دستخط بھی نہیں تھے۔ میری بیٹی سے دستخط کرا لئے۔ اس کو اس کا علم بھی نہیں تھا کہ میں نکاح نامہ پر دستخط کر رہی ہوں۔

(۳) نکاح نامہ پر نکاح پڑھائے جانے کا وقت گیارہ بجے لکھا ہے۔ اور میری بیٹی کے دستخط دن میں دو بجے لئے گئے ہیں۔ جب کہ اس وقت نکاح نامہ میں کسی نام وغیرہ کا اندراج بھی نہیں ہوا تھا۔

(۴) نکاح نامہ میں جن نکاح خواں اور گواہوں کے نام ہیں وہ ہمارے مسلک سے بھی نہیں دیوبندی مسلک سے ہیں۔

(۵) نکاح نامہ میں وکالت اور شہادت کے خانوں میں جن کے نام لکھے ہوئے ہیں وہ پیشہ ور مجرم ہیں۔ اور اسی طرح کے الٹے سیدھے کام کرتے رہتے ہیں ان پر کئی مقدمے بھی چل رہے ہیں۔

(۶) میں نے جب اپنی بیٹی کو خدا اور رسول کا واسطہ دے کر نکاح سے متعلق معلوم کیا تو بیٹی نے نکاح سے سراسر انکار کر دیا اور نکاح سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ مجھے جان سے مار دو مگر مجھے اس ظالم کے حوالے مت کرو میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

میں آپ سے اپیل کر رہا ہوں کہ شریعت کی روشنی میں اس فرضی نکاح کا حکم بیان فرمائیں۔ اور میری بیٹی اور میرے پورے پریوار کو اس جھوٹی سازش سے بچانے میں میری مدد فرمائیں۔

الجواب

اگر صورت مسئلہ درست اور سچائی پر مبنی ہے تو از روئے شرع یہ نکاح باطل ہے۔

اولاً اس لئے کہ نکاح میں ایجاب وقبول رکن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مبسوط سرخسی میں ہے:

''رکن العقد هو الإيجاب والقبول'' (نکاح کا رکن ایجاب وقبول ہے) [۱۵/۵: باب الوكالة في النكاح]

لہٰذا اگر ان میں سے ایک بھی مفقود ہو تو نکاح منعقد نہیں ہو سکتا۔ اور صورت مسئولہ میں ایجاب کا ذکر تو ہے مگر قبول کا نہیں۔ لڑکی کا نکاح کے علم کے بغیر بس سادہ کاغذ پر دستخط کر دینا قبول نہیں ہے۔ مزید یہ کہ نکاح نامہ میں جن گواہوں کے نام درج ہیں اگر واقعی وہ دیوبندی جماعت سے ہیں جیسا کہ سوال میں درج ہے تب بھی نکاح باطل ہے اس لئے کہ اہل سنت کے نزدیک دیوبندی جماعت اپنے عقائد کفریہ کے سبب مرتد دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اور مرتد کی شہادت شریعت میں مقبول نہیں۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب محیط برہانی میں ہے:

''شهادة المرتد والمرتدة .... الاصح انها لا تقبل على كل حال''

(مرتد اور مرتدہ کی گواہی اصح یہ ہے کہ کسی بھی حال میں مقبول نہیں)[جلد ۸ صفحہ ۴۰۷]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"رہی شہادت، عوام میں دو شخص جن کو گواہی نکاح سے نامزد کیا جاتا ہے وہ اگر دونوں مرتد وہابی تھے....اور اگر صرف یہی حاضر وسامع وفاہم تھے یااور جتنے ہیں وہ بھی ایسے ہی ہیں ایک نصاب مسلمانوں سے پورا نہیں تو نکاح صحیح نہ ہوا فاسد محض ہوا۔ لان من شرائط الصحة الشهود ولا شهادة لمرتد كما فى الدر المختار وغيره(کیوں کہ صحت کے لیے گواہی شرط ہے اور مرتد شہادت دینے کا اہل نہیں ہے جیسا کہ در مختار میں ہے"[فتاوی رضویہ قدیم ۱۴۵/۵]

ازروئے شرع نکاح میں گواہ کے طور پر دو مسلمان مرد یا ایک مسلمان مرد اور دو مسلمان عورتیں درکار ہیں۔ غیر مسلم، مرتد یا نصاب شہادت سے کم گواہ ہونے پر نکاح منعقد نہیں ہوتا ہے۔ جوہرہ نیرہ میں ہے:

''لا ينعقد نكاح المسلمين إلا بحضرة شاهدين حرين مسلمين بالغين عاقلين''

یعنی دو مسلمانوں کا نکاح دو آزاد مسلم بالغ عقلمند گواہوں کے بغیر منعقد نہیں ہوتا ہے۔[کتاب النکاح، الجزء الثالث، ص ۵]

بر سبیل تنزل وہ دیوبندی نہ ہوں سنی ہی ہوں تب بھی ان کی شہادت صورت مسئولہ میں غیر مقبول ہے۔ اس لئے کہ غیر شرعی کام کرنے اور مجرم پیشہ اپنانے کے سبب وہ ازروئے شرع فاسق ہوئے۔ اور جب لڑکی نکاح سے انکاری ہو تو اثبات نکاح میں فساق کی گواہی شرعی قانون کے مطابق ناقابل قبول ہوتی ہے۔

بہار شریعت میں صدر الشریعہ تحریر فرماتے ہیں:

"نکاح کے گواہ فاسق ہوں تو ان کی گواہی سے نکاح منعقد ہو جائے گا مگر عاقدین میں سے اگر کوئی انکار کر بیٹھے تو ان کی شہادت سے نکاح ثابت نہیں ہو گا۔[بہار شریعت، حصہ ہفتم]

الحاصل: نیلوفر کا نکاح صدام کے ساتھ منعقد ہی نہیں ہوا اس طرح فرضی نکاح نامہ تیار کر لینا اور دھوکہ دہی دغابازی سے نکاح کا دعوی کرنا باطل وبے بنیاد ہے۔ کسی پاکباز لڑکی کو اس طرح بلیک میل کرنا اس کی بے عزتی، اور جان سے مارنے کی دھمکی دے کر اس سے اپنے ناجائز مطالبات پورے کرنا شرعاً اخلاقاً قانوناً کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ نکاح کے لئے اس طرح زورزبردستی کرنا سراسر ظلم اور حرام ہے۔ اس طرح کی غیر شرعی حرکات کے سبب صدام اور اس کے معاونین حق اللہ اور حق العباد میں گرفتار اور مستحق عذاب نار ہیں۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

'لا يحل لمسلم ان ياخذ عصا اخيه بغير طيب نفس منه' مسلمان کو حلال نہیں کہ اپنے بھائی مسلمان کی لکڑی بغیر اس کی دلی مرضی کے لے لے۔ جب بے مرضی لکڑی لینی حرام ہے لڑکی لینی کس درجہ حرام واشد حرام ہو گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: من اذى مسلما فقد اذانى ومن اذانى فقد اذى الله جس نے کسی مسلمان کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ عزوجل کو ایذا دی۔ گواہ ووکیل ومعین جتنے لوگ اس واقعہ پر آگاہ ہو کر زید کی اعانت کریں گے سب اس کی مثل ظلم وحرام واستحقاق عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

قال اللہ تعالیٰ: ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان

(اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: گناہ وعداوت میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔)" [فتاوی رضویہ قدیم: ۱۳۵/۵]

صورت مسئولہ میں نکاح کے باطل ہونے کی اور بھی کئی وجوہات شرعیہ ہیں ہم انہیں چند مانع نکاح وجوہات پر اکتفا کرتے ہیں۔

بالجملہ: سوال میں ذکر کردہ باتوں کے مبنی بر صداقت ہونے کی صورت میں نکاح مذکور باطل وبے بنیاد ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۵۳ — لڑکی کا ماں باپ کی مرضی کے بغیر نکاح کرنے کا حکم

مسئولہ: فقط غلام شہنشاہ عالم ساکن بابر کھیڑا تحصیل جسپور ضلع اودھم سنگھ نگر۔ ۱۶/ ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ

کیافرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں

کہ ایک کنواری بالغہ لڑکی کسی غیر محرم مرد کے ساتھ گھر سے چلی گئی اب وہ لڑکی اس مرد کے ساتھ شریعت کے مطابق نکاح کرناچاہتی ہے لڑکی کے ماں باپ نکاح سے راضی نہیں ہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں لڑکی کا اپنے ماں باپ اور خاندان کی مرضی کے بغیر اس مرد سے نکاح ہو جائے گا یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں لڑکی جس مرد کے ساتھ نکاح کرناچاہتی ہے اگر وہ اس کا کفو ہے مطلب اس مرد کی قوم یا پیشہ یا مذہب وغیرہ میں ایسی کوئی کمی نہیں ہے جو لڑکی کے باپ وغیرہ اولیاء کے لئے ذلت کا سبب بنے تب تو ماں باپ اور اہل خاندان کی مرضی کے بغیر لڑکی کا نکاح از روئے شرع صحیح ہو جائے گا۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

"نفذ نکاح حرۃ مکلفۃ بلا ولی" یعنی آزاد بالغہ عاقلہ کا نکاح بغیر ولی نافذ ہے۔ [ج ۱ ص ۲۸۷، الباب الرابع فی الاولیاء]

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

"(نفذ) أی صح (نکاح حرۃ....(مکلفۃ) بکرا کانت، أو ثیبا (بلا ولی) أی ولو کان النکاح بلا إذن ولی"

یعنی آزاد مکلفہ باکرہ ہو یا ثیبہ اس کا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر صحیح ہے۔ [باب الاولیاء والاکفاء، ۴۸۸/۱]

در مختار میں ہے:

"فنفذ نکاح حرۃ مکلفۃ بلا رضا ولی" یعنی آزاد بالغہ عاقلہ کا نکاح بغیر ولی نافذ ہے۔ [الدر المختار، ۱۵۵/۴، باب الولی]

درالحکام میں ہے:

"فینعقد نکاح حرۃ مکلفۃ أی عاقلۃ بالغۃ بکرا کانت أو ثیبا بلا ولی"

یعنی آزاد مکلفہ عاقلہ بالغہ باکرہ یا ثیبہ کا نکاح بغیر ولی کے منعقد ہو جاتا ہے۔ [درالحکام شرح غرر الاحکام، ۳۳۴/۱]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"اگر وہ شخص جس سے ہندہ بہ ناراضی پدر اپنا نکاح بطور خود کیا چاہتی ہے ہندہ کا کفو ہے یعنی اس کی قوم یا پیشہ یا مذہب وغیرہا میں

یہ نسبت ہندہ کے کوئی ایسا قصور و عیب نہیں جس کی وجہ سے ہندہ کا اس کی مناکحت میں آنا پدر ہندہ کے لئے موجب عار ہو تو بلاشبہ نکاح صحیح ودرست ہو جائے گا۔ اور والدین کی ناراضی اگر چہ ہندہ کو نقصان کرے مگر جواز نکاح میں خلل نہ آئے گا۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الایم احق بنفسھا من ولیھا''

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بالغہ لڑکی اپنے ولی کے مقابلہ میں اپنے بارے میں فیصلہ کی زیادہ حقدار ہے۔

[فتاوی رضویہ قدیم، ۳۴۲/۵]

اور اگر وہ مرد غیر کفو ہے تو بغیر ولی نکاح منعقد نہیں ہو گا۔ جیسا کہ در مختار میں ہے:

''ویفتی فی غیر الکفوء بعدم جوازہ اصلا وھو المختار للفتوی لفساد الزمان'' یعنی غیر کفو میں نکاح کے بالکل جائز نہ ہونے کا فتوی دیا جائے گا، اور فساد زمان کی وجہ سے فتوی کے لئے یہی مختار ہے۔ [الدرالمختار، باب الولی، ۱۵۷/۴، ۱۵۶]

اس کے تحت ردالمختار میں ہے:

''لو تزوجت غیر کفؤ فالمختار للفتوی روایۃ الحسن أنہ لا یصح العقد'' یعنی اگر عورت غیر کفو میں نکاح کرلے تو فتوی کے لئے روایت حسن مختار ہے کہ نکاح صحیح نہیں ہو گا۔ [ردالمحتار، باب الکفاءۃ، ۲۲۱/۴]

الحاصل:۔ صورت مسئولہ میں اگر وہ مرد اس لڑکی کا کفو ہے جس کا ذکر اوپر ہوا تو یہ نکاح ازروئے شرع ہو جائے گا ورنہ نہیں ہو گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۵۴

کفو و غیر کفو میں نکاح کا حکم
دور شتوں میں تفریق جرم ہے
سچے تائب کو مطعون کرنا جائز نہیں

مسئولہ: قاری اشتیاق احمد مقام وپوسٹ بارون بازار تیراہا ضلع فیض آباد۔ ۱۹/رجب المرجب ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام مسئلہ ہذا کے تعلق سے

کہ زید جو کہ ایک سنی صحیح العقیدہ شخص ہے وہ عشق ومحبت کی بنیاد پر غیر کفو میں شادی کرنے پر مصر ہوا بہر حال سمجھانے بجھانے پر زید کلی طور پر اس شادی سے باز آگیا اور پختہ عہد کیا کہ ہم اب ایسا نہیں کریں گے۔ تب زید کے والدین نے اپنے اہل خانہ کی آپسی اتفاق رائے سے اپنی ہی قرابت میں رشتے کا پیغام بھیج دیا۔ رشتہ چونکہ ہر لحاظ سے نہایت مناسب رہا اس لئے طرفین بہت خوش ہوے۔ لیکن لڑکی اور لڑکے کی رضامندی کے باوجود لڑکی کے سگے ماموں ونانا کو رشتہ چلنے کی خبر ہوئی تو انہوں نے زید کی وہی گئی گزری خطاء مذکورہ کی بنا پر اس مناسب رشتہ کو جبراً رد فرمادیا۔ جب کہ خود کو مولوی ہی نہیں جید عالم دین شمار کرتے ہیں۔ یہ تو حق ہے اس رشتہ عقد ومناکحت کی رکاوٹ لڑکی کے سگے ماموں ونانا کی نفسیاتی اور خلاف شرع شدید ترین جبر وتشدد ہی ہے۔ جو ابیض من اللبن الخالص ہے۔ مگر ممکن ہے کہ تقدیر الٰہیہ کی تکمیل کا سبب ہو مذکورہ رشتہ

ہو اور چاہے نہ ہو وہ اپنی جگہ۔ امر مطلوب یہ ہے

(۱) جو مومن شخص اپنی خطاؤں سے کلی اور دائمی طور پر باز آ گیا ہو پھر بھی انہیں خطاؤں کا ورد و ذکر کرنا کیسا ہے؟ فضیلت وعالمیت یا کہ سفاہت وجاہلیت نیز ایسوں پر شرعاً کیا حکم ہے؟

(۲) عاقل وبالغ مسلم ومسلمہ کو شریعت طاہرہ نے آپسی رضامندی کے عقد ومناکحت کا جو اختیار دیا ہے اس کو جبراً وظلماً سلب ورد کرنا کیسا ہے؟

(۳) تائب صادق پر پھر انہیں خطاؤں کا جس سے سچی توبہ کر چکا ہے اتہام والزام لگانا کیسا ہے؟

(۴) صلہ رحمی منقطع کرنے والے شرع شریف کی نگاہ میں کیسے ہیں؟

جو آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ وارد وثابت ہیں بیان فرما کر ہماری رہنمائی فرمائیں۔ بینوا توجروا

الجواب

نکاح شریعت مطہرہ کا ایک پاکیزہ قانون ہے، نکاح میں لڑکی اور لڑکے کی رضامندی اور دونوں کے اولیاء کی مرضی شامل ہونے کے بعد کسی کو بھی کسی طرح کی دخل اندازی از روئے شرع روا نہیں ہے۔ رشتہ ہو جانے کے بعد ماموں یا نانا کو اس طرح کی بے جا دخل اندازی اور زید کے سابقہ امور مطعونہ کو ہدف تنقید بنا کر زید کی ہتک عزت اور اپنی قربت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر لڑکی کے اہل خانہ کو زید سے ترک تعلق پر مجبور کر کے جڑے ہوئے رشتہ کو توڑنا بلاشبہہ خلاف شرع عمل ہے۔

زید کا اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف غیر کفو میں نکاح کرنا یقیناً خلاف شرع عمل تھا لیکن زید نے جب اپنی غلطی سے رجوع وتوبہ کر لی تو وہ بے گناہ ہو گیا۔

حدیث شریف میں ہے التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ" یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہے۔

[سنن ابن ماجہ، باب ذکر التوبۃ، ۲/۱۴۱۹]

زید کے بے گناہ ہونے کے باوجود اس کی تذلیل اس کی دل آزاری کا موجب ہے اور کسی مسلمان کی دل شکنی ودل آزاری کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "من آذی مسلما فقد آذانی، ومن آذانی فقد آذی اللہ"

(جس نے کسی مسلمان کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے بلاشبہ اللہ تعالی کو اذیت دی)

[المعجم الصغیر للطبرانی، ۱/۲۸۴]

نیز زید اور زید کے نئے رشتہ داروں کے درمیان تفریق یہ بھی عمل حرام اور مورث غضب الٰہی ہے۔ ایسے لوگوں کو اللہ پاک پسند نہیں فرماتا۔ بلکہ ایسے لوگوں کو حدیث پاک میں بدترین لوگوں میں شمار کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

إن أحبكم إلى الله عزوجل أحاسنكم أخلاقاً، وإن أبغضكم إلى الله عزوجل المشاؤون بالنميمة، المفرقون بين الإخوان"

یعنی اللہ تعالیٰ کو تم میں سے بہتر اخلاق والے پسند ہیں۔ اور غیبت کرنے اور مسلمان بھائیوں کے درمیان تفریق کرنے والے ناپسند ہیں۔ [الترغيب والترهيب لقوام السنة، ۳/۲۴۲]

مزید فرماتے ہیں: "وشرار عباد الله المشاؤون بالنميمة المفرقون بين الاحبة"

یعنی بدترین لوگ وہ ہیں جو غیبت کرتے ہیں اوراحباب کے درمیان تفریق پیدا کرتے ہیں۔[مجمع الزوائدلھیثمی، ۹۳/۸]
علاوہ ازیں اپنے خود کے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اوران کی بھلائی جسے شرع میں صلہ رحمی کہاجاتا ہے کی بجائے ان کی مرضی پر اپنی مرضی تھوپنااورانہیں زید کے ساتھ ترک تعلق پر مجبور کرنااوران کی خوشی میں شامل ہونے کے بجائے اس کی خوشی کورد کرناقطع رحمی ہے اور قطع رحمی کرنے والے شخص کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کاارشاد گرامی ہے:
''لایدخل الجنة قاطع رحم''،یعنی قطع رحمی کرنے والاجنت میں داخل نہیں ہوگا۔

[سنن ابوداؤد،باب فی صلة الرحم، ۱۳۳/۲]

الحاصل۔ لڑکی کے ماموں ونانا،زید کے تائب ہوجانے کے بعد بھی زید کو سابقہ غلطی سے مطعون کرنے نیز دورشتوں میں تفریق اور قطع رحمی جیسے عظیم جرم کی وجہ سے ازروئے شرع مجرم وگنہگار ہیں۔ دونوں کوچاہئے توبہ کریں اوراحباب کے درمیان تفریق کے بجائے اتحاد کی کوشش کریں۔اور حق صلہ رحمی اداکرنے میں کوتاہی نہ کریں۔

ھٰذاماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ

فتوی ۵۵
بیوی پر ظلم کرنے والا شوہر سخت مجرم وگنہگار ہے
خلع کا حکم

مسئولہ: حاجی نزاکت حسین، صدیقی برادری سمتی کاشی پور۔ ۲۲/ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ

کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں
کہ خدیجہ کی شادی زید سے ہوئی۔ شادی کے بعد سے ہی زید کابرتاؤ خدیجہ کے ساتھ اچھانہیں رہا۔طرح طرح کے طعنے دئے جانے لگے کہ تیرے ماں باپ نے دیاہی کیاہے۔ جو دیاہمیں پسند نہیں آیا۔کچھ سامان سسرال والوں نے گونے میں بکوالیا۔خاص بات یہ ہے کہ زید صحبت کے وقت دواکھاکر صحبت کرتاہے اوراس کی ویڈیوگرافی کرائی گئی اور صحبت کے وقت چیخ وپکار کی آوازیں ٹیپ کی گئی اوردھمکی دی گئی اگر کسی سے کہاتوتیری ویڈیوانٹرنیٹ پرڈال دوں گا۔ خدیجہ نے ہمت کرکے اپنی جٹھانی سے شکایت کی لیکن اس شکایت پر کوئی دھیان نہیں دیاگیا۔اور خدیجہ اس کھیل کو جھیلتی رہی آخرکار بیمار ہوگئی خدیجہ کاعلاج کرانے کے بجائے مارپیٹ کرگھر سے نکال دیاگیا۔
جب بیمار خدیجہ اپنے گھر پہنچی توخدیجہ کے ماں باپ حالات کی تحقیق کے لئے خدیجہ کی سسرال پہنچے توشمیم جہاں خدیجہ کی ساس نے صاف کہدیا کہ تم نے ہماری بات نہیں مانی ہماری بے عزتی کردی اب توہم خدیجہ کواپنے گھرلائیں گے اورنہ ہی ہمیں رشتہ داری رکھنی ہے، اور جو سامان تم نے دیاتھاوہ ہم نے ساراکباڑے میں ڈال دیا۔لڑکی تمہارے گھرہے فیصلہ کرلو۔خدیجہ کی جٹھانی نے خدیجہ کی ماں سے کہاکہ پانچ لاکھ روپئے ۵۰۰۰۰۰ فیصلہ کے لئے رکھاہے تمہاری لڑکی کواس گھرمیں رہنے نہیں دوں گی۔اس کے بعد خدیجہ کے ماں باپ برادری کے پاس شکایت کی جس پر برادری کے عہدیداران زید کے گھر حالات معلوم کرنے گئے کیابات ہوئی خدیجہ کوگھر سے کیوں نکال دیاتوبرادری کے لوگوں کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔

اور بے رخی اختیار کی گئی۔ نکاح تو شیطان کے طریقہ پر خدیجہ کے گھر والوں کو پریشان کر کے کیا اور فیصلہ قرآن سے زید چاہتا ہے۔ جب فریقین میں معاملہ طے ہو گیا تو لڑکی والوں نے شادی کی تاریخ بھیجی۔ جس کے بعد زید کے گھر والوں نے لڑکی والوں پر زور دیا کہ شادی میں کھانا کھڑے ہو کر لیں گے اور جس طرح آج کل شادیاں ہو رہی ہیں اسی طرح پوری خاطر داری کرائیں گے، سب کچھ شیطانوں کی طرح ہوا تھا اور فیصلہ زید شریعت کی روشنی میں چاہتا ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب تحریر فرمادیں اس مسئلہ میں برادری کیا کرے۔ ایسے حالات میں لڑکی اپنے شوہر کے پاس جانا نہیں چاہتی ہے اور لڑکا خلع چاہتا ہے۔

الجواب

بر تقدیر صدق مستفتی زید بیوی کے ساتھ زیادتی کرنے کے سبب سخت مجرم و گنہگار ہے۔ زید پر لازم ہے کہ یا تو بیوی کو اچھائی کے ساتھ روک لے یعنی اسے اپنے پاس رکھے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے یا پھر نکوئی کے ساتھ خوشی کے ساتھ اس کا حق مہر ادا کرتے ہوئے اسے چھوڑ دے۔

برادری والوں کو چاہیئے کہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے فیصلہ کریں خدیجہ اگر واقعی زید کے ظلم کا شکار ہو رہی ہے اور واقعی اب نباہ کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے تو بہتر ہے کہ دونوں کے درمیان فیصلہ کرا دیا جائے۔ خدیجہ کا حق مہر بھی دلوایا جائے۔ اور زید جب خود خدیجہ کو رکھنا نہیں چاہتا تو خلع کا مطالبہ مناسب نہیں۔ پھر بھی اگر زید خلع کے بغیر فیصلہ پر راضی نہ ہو اور لڑکی والوں کو فیصلہ ہی کرنا ہو تو خلع کی صورت میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ خلع کا مطلب ہے شوہر سے مہر وغیرہ مال کے عوض طلاق لی جائے۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"خلع شرع میں اسے کہتے ہیں کہ شوہر برضائے خود مہر وغیرہ مال کے عوض عورت کو نکاح سے جدا کر دے"

[فتاوی رضویہ جدید، ۱۳/۲۶۴]

برادری والے زید سے ایک طلاق دینے کو کہیں زید خدیجہ کے پاک ہونے کی صورت میں ایک طلاق دے۔ اب عدت یعنی تین ماہواری پوری ہونے سے قبل اگر حالات سازگار ہو جائیں تو زید کو از روئے شرع اجازت ہوگی کہ وہ خدیجہ کو اپنے نکاح میں لوٹا لے۔ اور اگر عدت پوری ہو گئی تو پھر خدیجہ کو مکمل اختیار ہوگا وہ چاہے تو زید سے دوبارہ نکاح کر لے بغیر حلالہ کے، یا کسی اور سے نکاح کر لے، وہ عدت پوری ہونے کے بعد بہر صورت آزاد و مختار ہے۔

اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے:

الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ

(یہ طلاق دو بار تک ہے پھر بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا نکوئی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔ اور تمہیں روا نہیں کہ جو کچھ عورتوں

کو دیا اس میں سے کچھ واپس لو مگر جب دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ کی حدیں قائم نہ کریں گے پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں ٹھیک انہیں حدوں پر نہ رہیں گے تو ان پر کچھ گناہ نہیں اس میں جو بدلہ دے کر عورت چھٹی لے یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو وہی لوگ ظالم ہیں)

[ترجمہ قرآن کنز الایمان پارہ ۲ سورہ بقرہ، آیت ۲۲۹]

الحاصل: سوال میں درج باتوں کے سبب خدیجہ کو رکھنے نہ رکھنے کا زید کو اختیار ہے مگر جدائی کی صورت میں زید پر لازم ہے کہ خدیجہ کا مہر اور جہیز اسے دے۔ ہاں البتہ وہ یا تو یوں ہی معاف کر دے یا پھر خلع کر لے کہ مہر کے عوض طلاق لے لے تو ازروئے شرع یہ صورت جائز ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

فتوی ۵۶ فون پر نکاح کی درست صورت

مسئولہ: سلیم احمد جس پور کاشی پور۔ ۲۸ر ربیع النور ۱۴۴۰ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں
ایک لڑکے کا نکاح ایک لڑکی سے بذریعہ فون ہوا لڑکی نے اپنے نکاح کی اجازت فون پر وکیل و گواہوں کو دی لڑکی نکاح ہونے کے بعد دبئی چلا گیا لڑکے نے ایک ماہ بعد فون پر لڑکی سے بات کر کے اس کا نام لے کر تین مرتبہ طلاق دے دی۔ مسئلہ یہ دریافت کرنا ہے کہ ایسی حالت میں فون پر طلاق ہوئی یا نہیں۔ جب کہ لڑکے کی آواز لڑکی نے بھی سنی اور اس کے گھر والوں نے بھی سنی اب دوبارہ اس سے لڑکے سے اس لڑکی کا نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟
لڑکی والے اس طلاق کو ماننے پر راضی نہیں ہیں وہ پھر دوبارہ اسی لڑکے سے اسی لڑکی کا نکاح کرنا چاہتے ہیں لہٰذا آپ اس مسئلہ کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل و مفصل طریقہ پر دینے کی زحمت فرمائیں۔

الجواب

اگر لڑکی نے کسی کو اپنے نکاح کا وکیل کیا کہ وہ نکاح پڑھا دے تو نکاح ہو گیا۔ اور صورت مسئولہ سے صاف ظاہر ہے کہ لڑکی نے وکیل کو نکاح کی اجازت دی۔ تو ازروئے شرع یہ نکاح ثابت ہے۔ فتاوی ہندیہ میں ہے:

"یصح التوکیل بالنکاح وان لم یحضر الشھود"

نکاح کا وکیل بنانا درست ہے اگرچہ گواہ نہ ہوں۔ [فتاوی عالمگیری، ۲۹۴/۱]

اور جب نکاح ثابت ہے تو طلاق بھی واقع ہوگی۔ خواہ کوئی سنے نہ سنے، اور کوئی مانے یا نہ مانے۔ اگر لڑکا اقرار کرے کہ اس نے طلاق دی ہے تو طلاق واقع ہوگی۔ اب اگر تین طلاق الگ الگ دی ہیں اس طرح کہ میں نے طلاق دی، میں نے طلاق دی، میں نے طلاق دی، تو پھر یہ طلاق بائن ہے۔ اور اس صورت میں اگر لڑکی راضی ہو تو نکاح کافی ہوگا۔ اور لڑکی چوں کہ غیر مدخولہ ہے اس لیے عدت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر ایک ہی بار میں تینوں طلاق اس طرح دی ہیں کہ میں نے تجھے تین طلاقیں دیں۔ تو یہ طلاق مغلظہ ہو جائے گی۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

''اذا طلق الرجل امرأته ثلاثا قبل الدخول بها وقعن علیها فان فرق الطلاق بانت بالاولی ولم تقع الثانیة والثالثة''
یعنی جب مرد اپنی عورت کو دخول سے پہلے تین طلاق دے تو تینوں اس پر پڑ جائیں گی۔ البتہ متفرق طلاق دینے کی صورت میں پہلی طلاق ہی سے عورت بائنہ ہو جائے گی اور دوسری اور تیسری طلاق لغو قرار دی جائے گی۔

[فتاوی عالمگیری، ۳۷۳/۱، الفصل الرابع فی الطلاق قبل الدخول،]

طلاق مغلظہ کی صورت میں بغیر حلالہ نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

زانی اور زانیہ کے اصول وفروع کا آپس میں نکاح ہو سکتا ہے

فتوی ۵۷ مسئولہ: محمد سلیم لاہور پاکستان۔ ۱۳ر شوال المکرم ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے متعلق کہ
زید نے ہندہ سے متعدد بار زنا کیا ہے۔ اب زید اپنے بیٹے کا اپنی مزنیہ ہندہ کے شوہر سے پیدا ہونے والی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتا ہے، تو کیا ان کا نکاح شرعا منعقد ہو جائے گا؟ اور اگر زید کا ہندہ سے کوئی ناجائز بچہ بھی ہو تو اس کا نکاح پر کوئی اثر ہو گا یا نہیں؟ مفصل جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع دیں اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہم پر تادیر قائم رکھے۔

آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم

الجواب

نکاح مذکور از روئے شرع جائز و درست ہے۔ اور ناجائز بچہ کے سبب نکاح پر کوئی اثر واقع نہیں ہو گا۔
اصل مسئلہ یہ ہے کہ زانی کے لئے مزنیہ کے اصول و فروع اور مزنیہ کے لئے زانی کے اصول و فروع حرام ہو جاتے ہیں۔
البتہ زانی و مزنیہ دونوں کے اصول و فروع آپس میں ایک دوسرے کے لئے حلال ہیں۔
مجمع الانھر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

''حتی لو زنی بامرأة حرمت علیه أصولها وفروعها وحرمت المزنیة علی أصوله وفروعه ولا تحرم أصولها وفروعها علی ابن الواطی وأبیه كما فی المحیط للسرخسی''
یعنی اگر کسی نے کسی عورت سے زنا کیا تو زانی پر مزنیہ کے اصول و فروع حرام ہیں اور مزنیہ زانی کے اصول و فروع کے لئے حرام ہے۔ البتہ مزنیہ کے اصول و فروع زانی کے لڑکے اور باپ پر حرام نہیں ہیں۔ جیسا کہ محیط سرخسی میں ہے۔

[مجمع الانھر شرح ملتقی الابحر، کتاب النکاح، باب المحرمات، ۴۸۱/۱]

فتاوی شامی اور بحر الرائق شرح کنز الدقائق میں ہے:
''یحل لأصول الزانی وفروعه أصول المزنی بها وفروعها'' زانی کے اصول و فروع مزنیہ کے اصول و فروع کے لئے حلال ہیں۔

[ردالمحتار، ۱۰۷/۴، کتاب النکاح، فصل فی المحرمات، بحر الرائق، ج۳ ص ۱۷۹، کتاب النکاح]

الحاصل:۔ صورت مسئولہ میں زید کے بیٹے کا نکاح زید کی مزنیہ کی بیٹی سے جائز و حلال ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

فتوی ۵۸

مفقود الخبر شوہر یا قومہ والے کی بیوی کیا کرے؟ طلاق، مہر وغیرہ کے مختلف مسائل

مسئولہ: احمد جان بیر کھیڑا کاشی پور۔۱۸؍ شوال المکرم ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ان مسائل میں

(۱) کسی لڑکی کی شادی ہو کر آئی اس کا شوہر کسی کام سے گھر گیا پھر واپس نہیں آیا۔ گھر والوں نے اس کی تلاش کی مگر اس کا کوئی پتہ نہیں چل پایا زندہ ہے یا مر گیا۔ اب اس کی بیوی کو کتنے عرصہ تک اس کا انتظار کرنا چاہئے؟

(۲) کسی کا شوہر قومہ میں چلا جاتا ہے تو اس کی بیوی کو کب تک انتظار کرنا چاہئے

(۳) طلاق رجعی بائن اور مغلظہ ان تینوں طلاقوں کا حکم تفصیل سے بیان فرمائیں۔

(۴) کسی کی بیوی گھر میں کسی بات کو لے کر اپنے شوہر سے اتنا ناراض ہو گئی کہ اس سے سارے رشتے توڑ لئے قریب آٹھ سال ہو گئے ایسی عورت کے لئے کیا حکم ہے؟

(۵) ہمارے گاؤں میں بارات گھر ہے آبادی کے لئے ہے مسجد بہت چھوٹی ہے عیدین کی نماز میں مسجد میں نمازی نہیں آپاتے کچھ پڑھے لکھے لوگ کہتے ہیں کہ اس برات گھر میں نماز نہیں ہو گی۔

(۶) میرے پاس کچھ روپئے ہیں جو میں نے بینک میں ڈال رکھے ہیں ان کا جو فائدہ ملتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟

(۷) کیا طلاق کے بعد عورت اور شوہر ایک گھر میں رہ سکتے ہیں؟

(۸) دل اور زبان سے طلاق دینے سے طلاق ہو جائے گی؟

(۹) کیا طلاق دینے کے لئے دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے؟

(۱۰) مہر معجل اور غیر معجل کا کیا فرق ہے اور مؤجل کیا ہے؟

الجواب

(۱) مسلک حنفی کے مطابق عورت پر لازم ہے کہ شوہر کی ولادت سے ستر سال گزر جانے تک انتظار کرے، اس کے بعد نکاح کی اجازت ہے۔ لیکن متاخرین حنفیہ نے اس مسئلہ میں امام مالک کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے عورت کے لئے گنجائش نکالی ہے۔ اس سلسلے میں امام مالک کا مسلک کیا ہے اس تعلق سے حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"ان کا مذہب یہ ہے کہ عورت حاکم شرع کے حضور مستغیثہ ہو وہ بعد ثبوت مفقودی روز مرافعہ سے چار سال کی مہلت دے۔ اس کے گزرنے پر قاضی تفریق کرے۔ اب عورت عدت پوری کر کے نکاح کر سکتی ہے پیش از حکم قاضی شرع اگر بیس برس گزر گئے تو وہ معتبر نہیں" [فتاوی رضویہ قدیم، ۲۳۹/۵]

(۲) شوہر اگر قومہ میں ہے تو بیوی طلاق یا وفات سے پہلے جدا ہونے کا اختیار نہیں رکھتی، حضور اعلیٰ حضرت سے ایک ایسے مریض کے بارے میں جو مرض کے سبب چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے پیشاب و پاخانہ سے بولنے وغیرہ سے معذور ہے اور بالکل

باؤلہ سا ہو گیا ہے اور عورت کے نفقہ وغیرہ سے بھی عاجز ہے اسے خود اپنے جسم کا بھی بالکل خیال نہیں ہے، دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

''لایتخیراحدالزوجین بعیب الاخر ولوفاحشا کجنون وجذام وبرص ورتق وقرن،
(میاں بیوی سے کسی کو دوسرے میں عیب کی بنا پر فسخ کا اختیار نہیں ہے اگر وہ عیب واضح ہو مثلاً جنون، جذام، برص یا عورت کی شرمگاہ میں تنگی یا اس میں ہڈی یا غدود پیدا ہو گئے ہوں،) اسی میں ہے:

لایفرق بینهما بعجزه عنها ای عن النفقة ولوقضی به حنفی لم ینفذ''(شوہر اگر نفقہ دینے سے عاجز ہو تو بھی تفریق جائز نہیں، اگر حنفی قاضی نے ایسا فیصلہ دیا تو نافذ نہ ہوگا)[فتاوی رضویہ قدیم، ۶۸۵/۵]

(۳) طلاق رجعی میں عورت شوہر کے نکاح میں رہتی ہے اگر شوہر چاہے تو عدت کے اندر رجعت کر لے ورنہ عدت گزرنے کے بعد بغیر عورت کی مرضی اور تجدید نکاح کے شوہر کے لئے عورت حلال نہیں ہوگی۔ طلاق بائن میں عورت فی الفور نکاح سے نکل جاتی ہے۔ اب عدت کے اندر یا عدت کے بعد عورت کی مرضی سے نکاح کر کے اسے رکھ سکتا ہے۔ طلاق مغلظہ میں بھی عورت نکاح سے نکل جاتی ہے۔ اب اگر عورت راضی ہو تو عدت کی تکمیل کے بعد حلالہ کرائے اور پھر عدت گزار کر اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ ایسا ہی کتب فقہیہ حنفیہ میں ہے۔ مزید تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

(۴) جو عورت ناحق شوہر سے تعلقات ختم کر کے اس سے علیحدگی اختیار کرے ایسی عورت شریعت میں ناشزہ کہلاتی ہے جب تک وہ عورت شوہر کے یہاں نہیں آتی گنہگار ہے اور نفقہ وغیرہ کی بھی حقدار نہیں ہے۔

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"اگر شوہر کے گھر سے باہر بلاوجہ رہتی ہو تو شوہر پر نفقہ واجب نہیں۔ اس لئے کہ وہ اس صورت میں شوہر کے گھر واپس نہ آنے تک نافرمان مانی جائے گی"[فتاوی رضویہ جدید ۱۳/ ۴۲۵]

(۵) جس جگہ عیدین کی نماز جائز و صحیح ہے وہاں کسی بھی صحیح مقام پر نماز عید ادا کی جاسکتی ہے۔

امام طحطاوی نے لکھا ہے:

''لا یشترط الصلاة فی البلد بالمسجد فتصح بفضاء فیها''نماز صحیح ہونے کے لئے شہر کی مسجد ہونا ہی شرط نہیں بلکہ میدان میں بھی ہو سکتی ہے۔[حاشیہ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، کتاب الصلاۃ ص، ۵۱۳]

(۶) ہندوستان دارالاسلام ہے اور یہاں کے کافر حربی ہیں اور عموماً بینکوں پر وہی قابض ہیں لہٰذا ان کی مرضی سے اگر بینک سے فائدہ ملے تو جائز ہے۔ حضور مفتی اعظم ہند ہدایہ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"غیر مسلموں کی بینک سے جو زائد رقم ملے گی وہ سود نہیں نفع حلال ہے۔ ہدایہ میں ہے:

''مالهم مباح فی دارهم فبای طریق اخذه المسلم اخذ مالا مباحاً اذا لم یکن فیه غدر''

(حربی کافروں کا مال ان کے یہاں جائز ہے مسلمان اسے جس طرح بھی لے البتہ اس میں دھوکہ دھڑی نہ ہو)

[فتاوی مفتی اعظم، ۷۷/۵]

مزید فرماتے ہیں:

''گورنمنٹ سے جو روپیہ زائد ملتاہے سود نہیں کہ سود ہونے کے لئے مال کا معصوم ہوناضروری ہے' ومال الحربی لیس بمعصوم' اورمال حربی معصوم نہیں جب گورنمنٹ ایک رقم اپنی رضا سے خودزائد دیتی ہے اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ سود نہیں مگر سود سمجھ کر لیناضرور گناہ ہو گا۔ اس سمجھنے سے وہ سود نہ ہو جائے گا جوزائد مال اخذ کیامال حلال ہے، مگر حرام سمجھ کر لیااس کا گناہ ہوا'' [مرجع سابق،ص ۵۸]

(۷) طلاق کے بعد عدت تک عورت کو شوہر کے گھر میں پردہ کے اہتمام کے ساتھ رہنے کا حکم ہے۔ لیکن اگر طلاق کی عدت گزر جائے تو میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو جاتے ہیں ۔لہٰذا اس کے بعد ایک ہی گھر میں دونوں کو رہنا ہر گز ہر گز جائز نہ ہو گا۔

(۸) دل میں طلاق دینے سے طلاق نہیں ہو گی جب تک کہ زبان سے الفاظ طلاق استعمال نہ کرے۔ اور زبان سے بھی اتنی تیز کہ الفاظ طلاق کہنا طلاق ہونے کو ضروری ہے جو وہ خود سن سکے۔ مجمع الانہر میں ہے:

''کأدنی المخافتة إسماع نفسه فقط وکذا کل ما یتعلق بالنطق کالطلاق... أی أدنی المخافتة فی هذه الأشیاء إسماع نفسه حتی لو طلق بحیث صحح الحروف ولکن لم یسمع نفسه لا یقع۔

یعنی ہلکی آواز کم سے کم اتنی کہ خود سن سکے بس۔ اوراسی طرح ہر وہ معاملہ جس میں بولی کو دخل ہے جیسے طلاق....اس میں کم از کم اتنی آواز ہو کہ خود سن سکے یہاں تک کہ اگر کسی نے طلاق دی کہ حروف بھی صحیح تھے لیکن اس نے خود سنا نہیں تو طلاق نہیں واقع نہیں ہو گی'' [مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر: کتاب الصلوۃ، ۱/۱۵۷]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''اگر فقط دل میں طلاق دی تھی یُوں کہ زبان سے کچھ کہا ہی نہ تھا یا کہا مگر فقط زبان کو حرکت تھی اتنی آواز نہ تھی کہ اپنے کان تک آنے کے قابل ہو جب تو طلاق ہوئی ہی نہیں ،اور اگر ایسی آواز سے کہا کہ اپنے کان تک آنے کے قابل تھی اگرچہ مینہ یا ہوا یا کسی غل شور کے سبب اپنے کان تک نہ پہنچی تو طلاق ہو گئی'' [فتاوی رضویہ قدیم، ۵/۶۲۱]

(۹) طلاق دینے کے لئے کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہے ہاں البتہ طلاق کے انکار وغیرہ کی صورت میں دو شرعی گواہوں کی ضروت ہو گی۔

(۱۰) حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''مہر تین قسم ہے۔ معجل کہ پیش از رخصت دینا قرار پالیا ہو اُس کے لئے عورت کو اختیار ہے کہ جب تک وصول نہ کرلے رخصت نہ ہو، اور اگر رخصت ہو گئی تو اسے اب بھی اختیار ہے کہ جب چاہے مطالبہ کرے اور اس کے وصول تک اپنے نفس کو شوہر سے روک لے اگرچہ رخصت کو بیس برس گزر گئے ہوں۔ دوسرا مؤجل جس کی میعاد قرار پائی ہو کہ دس برس یا بیس برس یا پانچ دن کے بعد ادا کیا جائے گا اس میں جب تک وُہ میعاد نہ گزرے عورت کو مطالبہ کا اختیار نہیں اور بعد انقضائے میعاد ہر وقت مطالبہ کر سکتی ہے۔ تیسرا مؤخر کہ نہ پیشگی کی شرط ٹھہری ہو نہ کوئی میعاد معین کی گئی ہو، یُوں ہی مطلق و مبہم طور پر

بندھا ہو جیسا کہ آج کل عام مہریوں ہی بندھتے ہیں، اس میں تاوقتیکہ موت یا طلاق نہ ہو' عورت کو مطالبہ کا اختیار نہیں۔ مہر معجل و مؤجل کے لئے شرع مطہر نے کوئی تعداد معین نہ فرمائی، جتنا پیشگی دینا ٹھہرے اس قدر معجل ہو گا باقی کی کوئی میعاد قرار پائی تو اتنا مؤجل ہو گا ورنہ مؤخر رہے گا" [فتاوی رضویہ قدیم، ۵/۵۰۷]

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

فتوی ۵۹ — شرابی کی طلاق کا حکم

مسئولہ: عالیہ خاتون کاشی پور۔ ۳۰/ جمادی الاخری ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں

زید شراب پی کر گھر میں آیا تھا۔ رات میں شراب کی حالت میں اپنی بیوی ہندہ کو تین مرتبہ کہا کہ تمہیں طلاق طلاق طلاق۔ صورت مسئولہ میں کیا ہندہ کو طلاق ہوئی یا نہیں ؟ اگر ہوئی تو کون سی؟ نیز اگر طلاق ہو گئی ہو تو جائے عدت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اور نان ونفقہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کی بیوی ہندہ پر طلاق مغلظہ پڑ گئی۔ اور اب ہندہ بغیر حلالہ زید کے لئے حلال نہ ہو گی۔ شراب کی حالت میں بھی طلاق پڑ جاتی ہے۔ جیسا کہ محیط برہانی میں ہے:

''وطلاق السکران واقع إذا سکر من الخمر والنبیذ، وھو مذھب أصحابنا''

یعنی شراب یا نبیذ کے نشہ میں طلاق واقع ہو جاتی ہے یہی ہمارے ائمہ کرام کا مذہب ہے۔

[محیط برہانی کتاب الطلاق الفصل الثالث: فی بیان من یقع طلاقه ومن لا یقع طلاقه، ۳/۲۰۶]

اور فتاوی ہندیہ میں ہے:

''وطلاق السکران واقع إذا سکر من الخمر والنبیذ، وھو مذھب أصحابنا رحمھم اللہ تعالیٰ کذا فی المحیط''

یعنی شراب یا نبیذ کے نشہ میں طلاق واقع ہو جاتی ہے یہی ہمارے ائمہ کرام (اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے) کا مذہب ہے۔ ایسا ہی محیط میں ہے۔ [فتاوی ہندیه، ۱/۳۵۳: کتاب الطلاق، الباب الاول فصل فیمن یقع طلاقه وفیمن لا یقع طلاقه]

اور جب نشہ کی حالت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے تو صورت مستفسرہ میں طلاق واقع ہو گئی۔ اور چوں کہ زید نے تین طلاقیں دی ہیں اس لئے طلاق مغلظہ واقع ہوئی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اب ہندہ زید کے لئے بغیر حلالہ کسی بھی صورت میں حلال نہیں ہو سکتی۔ قرآن مقدس میں ہے:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ

پھر اگر تیسری طلاق اسے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہو گی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔

[ترجمہ کنزالایمان، سورہ بقرہ، آیت، ۲۳۰]

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مفسر اعظم حضور صدرالافاضل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"تین طلاقوں کے بعد عورت شوہر پر بحرمت مغلظہ حرام ہو جاتی ہے اب نہ اس سے رجوع ہو سکتا ہے نہ دوبارہ نکاح جب کہ حلالہ ہو یعنی بعد عدت دوسرے سے نکاح کرے اور وہ بعد صحبت طلاق دے پھر عدت گزارے دوبارہ نکاح کر لیں۔

[تفسیر خزائن العرفان، سورہ بقرہ، آیت، ۲۳۰]

اور رہا ہندہ مطلقہ کی عدت کا مسئلہ تو ہندہ کے لئے عدت زید کے گھر پر ہی واجب ہے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

"علی المعتدة أن تعتد فی المنزل الذی یضاف إلیها بالسکنی حال وقوع الفرقة والموت کذا فی الکافی لوکانت زائرة أهلها أو کانت فی غیر بیتها لأمرحین وقوع الطلاق انتقلت إلی بیت سکناها بلا تأخیر۔

یعنی (فرقت (طلاق وغیرہ) اور شوہر کی موت) واقع ہو جانے پر معتدہ پر واجب ہے کہ جس گھر میں رہتی تھی اسی گھر میں عدت گزارے۔ ایساہی کافی میں ہے اگر وہ گھر والوں کو دیکھنے گئی ہو یا کسی کام سے دوسرے کے گھر میں گئی ہو اور اس وقت طلاق واقع ہو جائے تو فوراً اپنے گھر میں واپس آجائے۔ [فتاوی ہندیہ، ۵۳۵/۱، باب الحداد]

اس دوران مطلقہ کے خرچ وغیرہ کی ذمہ داری زید پر لازم ہے۔ فتاوی ہندیہ میں ہے:

"المعتدة عن الطلاق تستحق النفقة والسکنی کان الطلاق رجعیا أو بائنا، أو ثلاثا حاملا کانت المرأة، أو لم تکن کذا فی فتاوی قاضی خان"

یعنی معتدہ طلاق نفقہ اور سکنی کی کی مستحق ہے خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن یا تین طلاق۔ مطلقہ حاملہ ہو یا نہ ہو۔ ایساہی فتاوی قاضی خاں میں ہے۔ [الفصل الثالث فی نفقة المعتدة، ۵۵۷/۱ الباب السابع عشر فی النفقات]

الحاصل: زید کی بیوی طلاق مغلظہ کے سبب زید پر حرام ہو چکی ہے اور اب بغیر حلالہ اس کے لئے حلال نہیں، زید کی بیوی پر زید کے گھر عدت گزارنا لازم ہے اور اس دوران رہنے کھانے پینے کا انتظام زید کے ذمہ واجب ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۲۰ — نشہ کی حالت میں طلاق اور بعد میں انکار پر حکم شرعی

مسئولہ: مطلوب حسین موضع دھیمر کھیڑا کاشی پور۔ ۱۴؍ شعبان المعظم ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں

کہ زید نے اپنی بیوی ہندہ کو نشہ کی حالت میں تین طلاق دیں۔ تین عورتیں گواہ ہیں۔ مگر نشہ اترنے کے بعد زید طلاق سے انکار کر رہا ہے۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں زید کے لئے کیا حکم ہے؟ تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں عین کرم ہوگا۔

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاق مغلظہ پڑ گئی۔ اور اب زید کی بیوی بغیر حلالہ زید کے لئے حلال نہ ہوگی۔ کیوں کہ

ازروئے شرع شراب کی حالت میں بھی طلاق پڑ جاتی ہے۔ فقہ حنفی کی معتبر کتاب فتاوی عالمگیری میں ہے:

''وطلاق السکران واقع إذا سکر من الخمر والنبیذ، وھو مذھب أصحابنا رحمھم اللہ تعالی کذا فی المحیط''

یعنی شراب یا نبیذ کے نشہ میں طلاق واقع ہو جاتی ہے یہی ہمارے ائمہ کرام (اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے) کا مذہب ہے۔ ایسا ہی محیط میں ہے۔ [فتاوی ہندیہ، ۱/۳۵۳: کتاب الطلاق، الباب الاول فصل فیمن یقع طلاقہ وفیمن لا یقع طلاقہ]

البتہ زید کو اگر طلاق سے انکار ہے تو اس کے لئے یا تو طلاق کا دعوی کرنے والے کے پاس شرعی گواہ ہوں۔ اور اگر شرعی گواہ نہ پائے جائیں تو پھر زید سے قسم لی جائے۔ اگر زید قسم کھالے تو پھر طلاق واقع نہ مانی جائے گی۔ اور ہندہ بدستور اس کی بیوی رہے گی۔ حدیث شریف میں ہے:

''البینة علی المدعی والیمین علی من انکر'' یعنی دعوی کرنے والے پر گواہ اور انکار کرنے والے پر قسم ہے۔

[السنن البیہقی الکبریٰ کتاب الدعوی والبینات، ۱۰/۴۲۷]

چونکہ شہادت کا نصاب نکاح وطلاق میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہیں۔ لہٰذا دو گواہ خواہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں پرہیزگار نمازی عادل غیر فاسق یعنی جو علی الاعلان گناہ نہ کرتے ہوں مثلا مرد داڑھی نہ منڈاتے ہوں عورتیں بے پردہ نہ گھومتی ہوں اس کے علاوہ کوئی کام خلاف شرع نہ کرتے ہوں، تو وہ اگر گواہی دیں کہ زید نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے تو ان کی گواہی قابل قبول ہوگی اور شرعانافذ مانی جائے گی، اور زید کا طلاق سے انکار قابل قبول نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے طلاق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: واشھدوا ذوی عدل منکم۔ اور اپنے میں دو ثقہ کو گواہ کرلو۔ (اور اپنے میں دو ثقہ گواہ کرلو)

[ترجمہ قرآن کنز الایمان: پارہ ۲۸، سورہ طلاق، آیت ۲]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"اگر دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں نمازی پرہیزگار ثقہ عادل قابلِ قبول شرع گواہی دیں گے تو تین طلاقیں ثابت ہو جائیں گی زید کا انکار نہ سنا جائے گا۔" [فتاویٰ رضویہ جدید، ۱۲/۴۴۴] مزید فرماتے ہیں:

"اور اگر ایسے گواہ نہیں تو زید سے قسم لی جائے گی اگر اس نے قسم کھانے سے انکار کر دیا جب بھی تین طلاقیں ثابت ہو جائیں گی۔ اور اگر قسم کھالے گا کہ میں نے صرف دو ہی طلاق دی ہیں تیسری طلاق نہ دی تو دو ہی ثابت ہوں گی۔ پھر اگر جھوٹی قسم کھالی تو اس کا وبال زید پر ہوگا" [۱۲/۴۴۴]

الحاصل:۔ نشہ کی حالت میں زید نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اس لئے وہ زید کے نکاح سے نکل گئی۔ اور اب بغیر حلالہ شرعی کے وہ زید کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ بصورت انکار طلاق گواہ شرعی موجود نہ ہونے کے سبب زید پر قسم لازم ہے اگر وہ قسم کھالے گا تو طلاق واقع نہ مانی جائے گی۔ البتہ زید کی بیوی کو اگر اس بات کا یقین ہے کہ زید نے اسے تین طلاقیں دی ہیں تو وہ زید سے کسی بھی حال میں چھٹکارے کی کوشش کرے اور اپنی مرضی سے اس کو خود پر قدرت نہ دے ورنہ وہ بھی گنہگار ہوگی اور اگر اس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہ ہو تو وہ اگر بغیر مرضی کے اس کی ساتھ رہے گی تو اس سے کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا۔ کما فی الفتاوی الرضویہ الجدیدہ [۱۲/۳۹۶] ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

فتوی ۶۱ بے ہوشی کی حالت میں طلاق کا حکم

مسئولہ: حافظ رئیس احمد انصاری منڈیا پستور باز پور۔ ۲۹/ ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

زید کے جوان بچے ہیں کسی بات پر بچوں اور بیوی سے زید کا جھگڑا ہو گیا۔ بچوں نے زید کو مارنا شروع کر دیا اتنا مارا کہ زید کے سر پر اور سینے پر چوٹ آئی۔ چوٹ اتنی تھی کہ زید بے ہوش ہو گیا اور اسی بے ہوشی میں زید کی زبان سے گالیاں نکلنا شروع ہو گئیں اور اسی بے ہوشی میں طلاق کے الفاظ بھی نکل گئے۔ زید کو جب ہوش آیا تو زید کو بتایا گیا کہ اس نے طلاق دے دی ہے۔ زید کو اس کا بالکل بھی علم نہیں ہے۔ بیوی عدت میں بیٹھ گئی۔ پوچھنا یہ ہے کہ ایسی صورت میں کیا زید کی بیوی پر طلاق پڑ گئی؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت کریں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں اگر واقعی زید بے ہوش ہو گیا تھا کہ اسے کچھ پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ الفاظ طلاق بول رہا ہے تو از روئے شرع زید کی بیوی پر طلاق نہیں پڑی۔ در مختار میں ہے:

''لایقع طلاق...... المغشی علیہ'' بے ہوش کی طلاق واقع نہیں ہو گی۔'' [درمختار، ۲۴۳/۳]

فتاوی شامی میں ہے:

''أنہ لا یقع طلاق المدھوش. بے ہوش آدمی کی طلاق واقع نہیں ہوتی ہے۔'' [فتاوی شامی، ۳۶۹/۳]

دماغ میں تیزی، غصہ، نشہ تینوں صورتوں میں طلاق ہو جاتی ہے

فتوی ۶۲

مسئولہ: ذاکر حسین جس پور نسیم جہاں جس پور۔ ۲۳/ جمادی الاخری ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین درج ذیل مسئلہ میں

میں ذاکر حسین ولد مہدی حسن میرے دماغ میں تیزی رہتی ہے اور کئی بار میں پوری طرح سے پاگل بھی رہ چکا ہوں۔ اور اب بھی میرے دماغ کی دوائی چل رہی ہے۔ میں نے اپنے غصہ اور دماغ سے پریشان ہونے کی حالت میں اپنی بیوی کو ایک ہی سانس میں تین بار طلاق طلاق کہہ دیا ہے۔ اور میں نے اپنی بیوی کا نام بھی نہیں لیا اور ایک ہی سانس میں بولا ہے بیچ میں سانس بھی نہیں لی ہے۔ لہٰذا مفتی صاحب سے گزارش ہے کہ شریعت کا جو حکم ہو بیان کریں۔

میں نسیم جہاں بنت محمد نظام، میرے شوہر ذاکر حسین کئی سال سے دماغی پریشانی میں ہیں۔ اور کئی بار پوری طرح سے پاگل بھی رہ چکے ہیں۔ اور اب بھی دماغی توازن ٹھیک کرنے کی دوائی کھا رہے ہیں اور میرے کچھ ان بن پر مجھے غصہ میں ایک ہی سانس میں میرا نام لئے بغیر تین بار طلاق طلاق طلاق کہہ دیا۔ اور اس حادثے کے وقت وہ دوائی کے نشہ میں بھی تھے۔ لہٰذا مفتی صاحب سے گزارش کرتی ہوں کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں شریعت کا جو حکم ہو بیان کریں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں چار باتیں ہیں ایک تو دماغ میں تیزی، دوسرا غصہ، تیسرا نشہ اور چوتھی بات بغیر اضافت کے طلاق۔
زید کے دماغ میں تیزی اور غصہ میں طلاق دینا اور دوائی کے نشہ میں ہونا ان تینوں باتوں میں سے کوئی بھی بات ایسی نہیں جس کی وجہ سے طلاق واقع نہ ہونے کا حکم دیا جائے۔ بلکہ ان تینوں صورتوں میں طلاق ہو جاتی ہے۔ دماغ میں تیزی ہونا پاگل پن نہیں ہے۔ اور کئی بار پاگل ہونا اور اب دوا کا چلنا بتا رہا ہے کہ پاگل پن ختم ہے بس دماغ میں تیزی ہے ایسا آدمی پاگل نہیں مانا جاتا۔ پاگل اسے کہتے ہیں جو عام طور پر ایسے کام کرتا ہو جو خلاف معتاد ہوں البتہ کبھی کبھار سمجھ داروں والے کام بھی کر لیتا ہو۔ لیکن اکثر اس کے اقوال وافعال ٹھیک نہ ہوں تو وہ پاگل ہے۔ اگر زید واقعی زیادہ تر ایسی ہی حالت میں رہتا ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ کیوں کہ اب اسے بالکل پاگل کے حکم میں مانا جائے گا اور پاگل کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

بدائع الصنائع میں ہے:

''فلا یقع طلاق المجنون'' یعنی پاگل کی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ [فصل فی شرائط رکن الطلاق، ۹۹/۳]

اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ بس دماغی گرمی کی وجہ سے طلاق دی ہے تو طلاق واقع ہو گئی۔ دماغی تیزی کا عذر مسموع نہیں ہوگا۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''فقط گھبراہٹ یا دماغ پر گرمی کا نام جنون نہیں اگر واقعی مجنوں نہ تھا تو طلاق واقع ہو گئی۔''

[فتاوی رضویہ قدیم، جلد ۵/ ۶۳۰]

اور غصہ میں ہونا بھی عذر نہیں۔ فتاوی شامی میں ہے: ''یقع الطلاق من غضب'' غصہ میں طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

[ردالمحتار، جلد ۴ ص ۴۵۱: کتاب الطلاق، مطلب فی طلاق المدھوش]

اور دوا کے نشہ میں طلاق دینے کا عذر بھی قابل قبول نہیں ہے۔ ہاں اگر دوا کا نشہ اتنا ہوتا ہو کہ زید بالکل بے ہوش ہو جاتا ہو اسے کسی چیز کی سدھ بدھ نہ رہتی ہو، عقل بالکل زائل ہو جاتی ہو تو ایسی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر وہ نشہ اتنا نہ ہو بلکہ ہوش وحواس درست رہتے ہوں تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ یہی صورت غصہ اور دماغی تیزی کی بھی ہے کہ اگر غصہ اس حد تک ہو جاتا ہو کہ ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہو عقل زائل ہو جاتی ہو تو ایسی صورت میں بھی طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا ہو تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور رہا ایک سانس میں طلاق دینا تو اس سے بھی طلاق ہو جائے گی۔ البتہ اس طرح طلاق دینا خلاف شرع وناجائز ہے۔ اور طلاق کے وقت بیوی کا نام نہ لینا بغیر اضافت ونسبت کے طلاق دینا اگر زید قسمیہ کہے کہ اس نے بیوی کو طلاق کی نیت نہیں کی تھی تو طلاق نہیں ہوگی ورنہ طلاق ہو جائے گی۔ بحر العلوم فرماتے ہیں:

اگر شوہر یہ تسلیم کرے کہ میں نے طلاق طلاق طلاق کے الفاظ اپنی عورت کے لئے کہے تھے تو طلاق واقع ہو گئی۔ اور عورت زید کے لئے بے حلالہ حلال نہ ہوگی۔ اور اگر وہ یہ کہے کہ میں نے ان جملوں سے اپنی عورت کی نیت نہیں کی تھی تو قسم کھلا کر اس کا قول تسلیم کر لیا جائے گا۔ اور عورت پر طلاق نہ ہوگی۔'' [فتاوی بحر العلوم۔ جلد ۳ ص ۳۱۷۔۳۱۸]

الحاصل: زید اگر کہے کہ میں نے طلاق کے الفاظ بیوی سے کہے ہیں اور اس وقت غصہ یا نشہ کا اثر اتنا نہیں تھا کہ بالکل عقل نے کام کرنا بند کر دیا ہو تو طلاق ہو جائے گی۔ اور بغیر حلالہ کے نسیم جہاں اس کے لئے حلال نہ ہو گی۔ اور اگر قسم کھا کر کہے کہ میں نے الفاظ طلاق اپنی بیوی کے لئے نہیں کہے اور میری نیت بیوی کو طلاق دینے کی نہیں تھی تو طلاق واقع نہیں ہو گی۔

فتوی ٦٣ — غصہ کی حالت میں بھی طلاق ہو جاتی ہے

مسئولہ: محمد عرفان محلہ کٹوراتال کاشی پور۔ ۸/ ذیقعدہ ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں

میں نے غصہ کی حالت میں نے اپنی بیوی سے دو بار کہا میں تجھے طلاق دے دوں گا۔

تو کیا ایسی صورت میں میری بیوی پر طلاق پڑ جاے گی؟

الجواب

صورتِ مسئولہ میں آپ کی بیوی پر طلاق نہیں پڑی۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"وعدے سے طلاق نہیں ہوتی جواہر الاخلاطی میں:

''طلاق میکنم طلاق بخلاف قوله کنم لانه یتمحض الاستقبال'' طلاق میکنم (یعنی طلاق کرتا ہوں)

حال ہونے کی وجہ سے طلاق ہے اس کے بر خلاف طلاق کنم (طلاق کروں گا) کہا تو طلاق نہ ہو گی، کیوں کہ یہ محض استقبال ہے

[فتاوی رضویہ جدید، ۱۱۸/۱۳]

الحاصل: بس اس قدر کہنے سے کہ طلاق دے دوں گا طلاق واقع نہیں ہو گی۔

ھٰذا ماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ

فتوی ٦٤ — غصہ میں بھی طلاق ہو جاتی ہے

مسئولہ: ریشم جہاں، جس پور۔ ۱۵/ ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل مسئلہ میں

میرے شوہر نے کئی بار میں تین طلاقیں مجھے دے دیں۔ ایک سال سے میں اپنے گھر ہوں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ میں نے یوں ہی غصہ میں طلاق دے دی تھی۔ اور مجھے بلا رہے ہیں۔ کیا شریعت کی طرف سے مجھے اپنے شوہر کے پاس جانا چاہئے؟ کیا مجھے طلاق ہو گئی؟ اگر میں دوبارہ ان کے پاس جانا چاہوں تو کیا صورت ہو گی؟ جو بھی شریعت کا حکم ہو بیان فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں آپ پر طلاق مغلظہ واقع ہو گئی ہے۔ اور آپ اپنے شوہر کے نکاح سے نکل چکی ہیں۔ لہٰذا اب بغیر حلالہ آپ ان کے نکاح میں دوبارہ نہیں جا سکتی ہیں۔ فتاوی نوازل میں ہے:

اذا طلق الرجل امرته المدخول بها ثلاثاً یقع الطلاق

جب کسی شخص نے اپنی مدخولہ بیوی کو تین طلاقیں دیدیں تو طلاق واقع ہوگئی۔[فتاوی نوازل، کتاب الطلاق،۱۹۷]

اب شوہر کے ساتھ دوبار نکاح کی بس ایک ہی صورت ہے شرعاًوہ ہے حلالہ۔ بغیر اس کے آپ اپنے شوہر کے ساتھ دوبارہ نکاح نہیں کر سکتیں۔ قرآن پاک میں ہے:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ۔

پھر اگر تیسری طلاق اسے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔

[ترجمہ کنزالایمان،سورہ بقرہ،آیت،۲۳۰]

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں صدرالافاضل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"تین طلاقوں کے بعد عورت شوہر پر بحرمت مغلظہ حرام ہوجاتی ہے اب نہ اس سے رجوع ہوسکتا ہے نہ دوبارہ نکاح جب کہ حلالہ ہو یعنی بعد عدت دوسرے سے نکاح کرے اور وہ بعد صحبت طلاق دے پھر عدت گزارے دوبارہ نکاح کرلیں۔"

[تفسیر خزائن العرفان،سورہ بقرہ،آیت،۲۳۰]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

وإن كان الطلاق ثلاثا في الحرة .... لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره نكاحا صحيحا ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها كذا في الهداية۔ اگر آزاد عورت تین طلاق سے مطلقہ ہو تو اپنے شوہر کے لئے جب تک حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرلے اور وہ اس سے مجامعت نہ کرلے پھر وہ دوسرا شوہر طلاق دے یا انتقال کر جائے ایسا ہی ہدایہ میں ہے۔

[۴۷۳/۱،فصل فیما تحل فی المطلقة]

الحاصل: آپ پر طلاق مغلظہ واقع ہوچکی ہے۔ اور اب آپ کا اپنے شوہر سے کوئی تعلق نہیں آپ ان کے نکاح سے نکل چکی ہیں۔ اب آپ آزاد ہیں جہاں چاہیں نکاح کریں۔ البتہ اپنے اسی شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں تو حلالہ کے بغیر جائز نہیں ہوگا۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۶۵ — طلاق رجعی کا مسئلہ

مسئولہ: حافظ رئیس احمد منڈیا پستور باز پور۔ یکم ر صفر المظفر ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

زید نے اپنے بیوی سے لڑائی کے دوران کہا میں نے تجھے طلاق دی دی کیا ان الفاظ سے طلاق پڑ جائے گی؟ اگر پڑے گی تو کون سی طلاق پڑے گی؟ اور اب زید کے لئے کیا حکم ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاق رجعی واقع ہوگئی۔

قرآن پاک میں ہے: الطلاق مرتانِ فِامساكِ بِمعروف او تسرِیح بِاحسان ''
یہ طلاق دو بار تک ہے۔ پھر بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا نکوئی (اچھے سلوک) کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔
[ترجمۂ قرآن کنز الایمان پارہ ۲ سورہ بقرۃ، آیت ۲۲۹]

اس آیت کے تحت صدر الافاضل فرماتے ہیں:
یعنی طلاق رجعی ..... ارشاد فرمایا کہ طلاق رجعی دو بار تک ہے اس کے بعد طلاق دینے پر رجعت کا حق نہیں۔
مزید فرماتے ہیں:
یعنی طلاق رجعی میں عدت کے اندر شوہر عورت سے رجوع کر سکتا ہے خواہ عورت راضی ہو یا نہ ہو"[
خزائن العرفان، پارہ ۲ سورہ بقرۃ، آیت ۲۲۹]

لہٰذا اگر ابھی عدت پوری نہ ہوئی ہو تو زید اپنی بیوی سے رجعت کر سکتا ہے۔ اور رجعت کا بہتر طریقہ کیا ہے اس سے متعلق اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"رجعت کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ زید عدت کے دوران ہی بیوی سے یہ الفاظ کہے کہ میں نے تجھ سے رجعت کی یا میں نے تجھے پھیر لیا یا اس جیسے دوسرے الفاظ کہے۔ اور رجعت میں بیوی کی رضامندی ضروری نہیں ہے۔
"[فتاوی رضویہ جدید ۱۲/۴۴۴]

اور اگر عدت پوری ہو گئی ہے تو پھر عورت نکاح سے نکل چکی ہے۔ اور وہ خود مختار ہے اگر وہ چاہے تو اس کی مرضی سے اس سے نکاح کر سکتے ہو۔ بدائع الصنائع میں ہے: '' فإن طلقها ولم يراجعها بل تركها حتى انقضت عدتها بانت ''
یعنی اگر طلاق دی اور عدت پوری ہونے سے پہلے اس سے رجوع نہ کیا تو وہ عورت بائنہ ہو جائے گی۔
[بدائع الصنائع، فصل فی بیان حکم الطلاق]

البتہ عدت گزر جانے کے بعد وہ آزاد و مختار ہو جاتی ہیں اور پہلے شوہر کے لئے اجنبیہ ہو جاتی ہیں۔
تفسیر قرطبی میں آیت '' والمطلقت یتربصن انفسھن ثلثۃ قرؤ '' کی تفسیر میں ہے:
حتى انقضت عدتها فهي احق بنفسها وتصيرا جنبية منه۔
یعنی جب عدت پوری ہو جاتی ہے تو وہ خود مختار ہیں اور پہلے شوہر کے لئے اجنبیہ ہیں۔ [تفسیر قرطبی ۳/۱۲۰]
حضور اعلیٰ حضرت اسی طرح کے ایک مسئلہ میں حکم شرعی بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:
'صورت مسئولہ میں دو طلاقیں رجعی واقع ہوئیں۔ حکم ان کا یہ ہے کہ مابین عدت کے رجعت کا اختیار ہے اور بعد انقضائے عدت عورت اگر چاہے اس سے نکاح جدید کر سکتا ہے۔ [فتاوی رضویہ قدیم۔۵/۲۲۲]
<u>الحاصل</u>: زید کی بیوی اگر عدت میں ہو تو زید رجعت کر سکتا ہے اور اگر عدت پوری ہو چکی ہے تو بیوی کی مرضی سے نکاح جدید کا حکم ہو گا۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

میں نے تجھے اپنے نکاح سے آزاد کیا، بنیت طلاق کہنے سے طلاق پڑ جائے گی

فتوی ٦٦ مسئولہ: شاکر صدیقی محلہ علی خاں کاشی پور۔ ۲۸/ شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین

میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نے تجھے اپنے نکاح سے آزاد کیا اور کچھ دیر کے بعد دی دی کہا۔

آزاد کیا کہنے سے طلاق مراد تھی مگر دی دی کچھ دیر کے بعد کہا تھا، اس سے طلاق مراد نہیں تھی۔ بس یہ بتانے کے لئے کہ میں نے طلاق دے دی یہ الفاظ کہے تھے۔ اور یہ بات بالکل سچ ہے میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ لفظ دی دی سے کوئی طلاق کی نیت بالکل نہیں تھی۔ لہٰذا ایسی صورت میں کون سی طلاق واقع ہوگی براے کرم جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں طلاق بائن واقع ہوگی۔

''لوقال اعتقتك طلقت بالنية'' یعنی اگر کہا میں نے تجھے آزاد کیا تو نیت کے ساتھ طلاق واقع ہو جاے گی۔

[فتاوی عالمگیری، جلد ۱ ص ۳۷۶، الفصل الخامس فی الکنایات]

اگر کہا کہ میں نے تجھے آزاد کیا تو طلاق کی نیت سے طلاق واقع ہو جاے گی۔

''إذا قال لامرأته: أعتقتك تطلق إذا نوى''

یعنی جب کہا اپنی عورت سے کہ میں نے تجھے آزاد کیا تو اگر نیت کی تو طلاق ہو جاے گی۔ [ردالمحتار۔ ۴/۴۵۵]

ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''یہ لفظ کہ "مرد نے عورت سے کہا" اگر ان سے طلاق کے معنی مراد نہ تھے جب تو طلاق اصلاً نہ ہوئی اور اگر بہ نیتِ طلاق کہے تو ایک طلاق پڑ گئی عورت نکاح سے نکل گئی مگر حلالہ وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں، نہ اسے کچھ انتظار کی حاجت، دونوں آپس میں راضی ہوں تو اسی وقت پھر نئے سرے سے نکاح کر لیں'' مزید فرماتے ہیں:

''صورتِ مسئولہ میں عورت پر ایک طلاق بائن واقع ہوئی یعنی عورت نکاح سے نکل گئی، زوج کو اس پر کوئی اختیار جبر نہ رہا وہ عدّت کے بعد جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ مگر حلالہ کی اصلاً حاجت نہیں جب کہ اس بار سے پہلے کبھی دو طلاقیں اس عورت کو نہ دے چکا ہو، زن و مرد اگر راضی ہوں تو شوہر عدت میں اور بعد عدت اس سے نکاح جدید کر سکتا ہے''

[فتاوی رضویہ قدیم، ۵/ ۷۲۹، ۷۲۸]

اور لفظ دی دی چونکہ بلا نیت وبلا اضافت ہیں اور اس پر حلف بھی لیا جا چکا ہے تو ان الفاظ دی دی سے طلاق کا حکم نہیں ہوگا۔ یہ تاکید کے لئے بھی ہو سکتے ہیں اور خبر کے لئے بھی۔ دونوں احتمال ہیں۔ مگر انشاء کے لئے نہیں ہیں۔ انشاء کے لئے تب ہوتے جب طلاق کی نیت واضافت ہوتی اور جب ایسا نہیں ہے تو ان الفاظ سے طلاق کا حکم نہیں ہوگا۔

الحاصل: آپ کی بیوی پر طلاق بائن پڑ گئی ہے اور آپ کی بیوی آپ کے نکاح سے نکل گئی ہے۔ اگر آپ اسے اپنے نکاح میں دوبارہ لانا چاہتے ہیں تو آپ کی بیوی اگر راضی ہو تو عدت کے اندر بغیر حلالہ اس سے نکاح کی شرعاً اجازت ہے۔ اور اگر وہ کسی اور سے نکاح کرنا چاہے تو عدت کے بعد کسی سے بھی نکاح کر سکتی ہے اس پر کوئی جبر نہیں ہے۔ بلکہ عورت طلاق بائن کے بعد مکمل مختار ہوتی ہے، جس سے چاہے نکاح کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

بیوی سے بنیت طلاق ”تم یہاں سے چلی جاؤ“ کہنے سے طلاق ہو جائے گی

فتوی ٦٧ مسئولہ: شفیق احمد، نیاز نگر سابق تھانہ۔ ۲۸؍ ربیع النور ۱۴۴۰ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ کہ

زید نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں پھر زید رونے لگا اور بیوی بھی رونے لگی زید کی ساس بھی وہیں تھیں۔ تو زید نے یوں ہی کہا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اسے لے جاؤ یہاں سے اور اس واقعہ کو کئی سال گزر گئے ہیں۔ اس صورت میں زید کی بیوی پر کون سی طلاق پڑی۔ شریعت کا حکم بیان فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں اگر ”تم یہاں سے چلی جاؤ“ کے الفاظ بیوی سے طلاق کی نیت سے کہے ہیں تو زید کی بیوی پر طلاق مغلظہ واقع ہو گئی۔ اور اس صورت میں بغیر حلالہ زید کی بیوی زید کے لیے حلال نہ ہو گی۔ اور اگر ساس سے کہے یا بیوی سے ہی کہے مگر زید بقسم کہے کہ میں نے یہ الفاظ بیوی سے طلاق کی نیت سے نہیں کہے تو زید کی بیوی پر دو طلاق رجعی ہی واقع ہوئیں۔
زید عدت کے اندر اپنی بیوی سے رجوع کر سکتا تھا۔ اب جب کہ کئی سال گزر گئے ظاہر ہے عدت جو کہ تین ماہواری یا وضع حمل ہے پوری ہو چکی ہو گی۔ اگر عدت پوری ہو گئی ہے تو اب زید اپنی مطلقہ سے اس کی مرضی سے بغیر حلالہ نکاح کر سکتا ہے۔ فتاوی فقیہ ملت میں اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے:
”جب زید نے کہا میں تجھے طلاق دیتا ہوں اور لفظ ”جاؤ“ سے طلاق کی نیت نہیں کی تو ایک طلاق رجعی پڑی اس صورت میں عدت کے اندر اس سے رجعت کر سکتا ہے۔ یعنی بغیر نکاح اس کے ساتھ میاں بیوی جیسا تعلق رکھ سکتا ہے نکاح کی ضرورت نہیں۔ اور بعد عدت بغیر حلالہ اس کی مرضی سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔“ [فتاوی فقیہ ملت، ۴۶/۲]
حبیب الفتاوی میں پہلے طلاق کہنے اور پھر اس کے بعد دوبار چلی جاؤ کہنے کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:
”شخص مذکور نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دی ہے، لہٰذا اس کی بیوی پر ایک طلاق رجعی ہو گئی.... اس کے بعد شوہر کا یوں کہنا کہ ”تم چلی جاؤ“ یہ لفظ ان کنایات طلاق میں سے ہے جس سے ہر حال میں ایک یا دو طلاق کی نیت کی جائے تو ایک طلاق بائنہ واقع ہوتی ہے اور تین طلاق کی نیت سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ اور بغیر نیت طلاق کے طلاق واقع ہی نہیں ہوتی.... اور اگر شوہر اپنا بیان شرعی قسم کے ساتھ یہ دے کہ میں نے ”تم چلی جاؤ“ کا لفظ دونوں مرتبہ بغیر نیت طلاق کہا تو اس

صورت میں اس کی بیوی پر فقط ایک طلاق رجعی واقع ہوئی.... در مختار جلد ثانی ص ۵۱۳ میں ہے:

''(فنحو اخرجی واذہبی وقومی).... (یحتمل ردا، ونحو خلیة بریة حرام بائن).... (یصلح سبا، ونحو اعتدی واستبرئی رحمك، أنت واحدة.... ففی حالة الرضا.... (تتوقف الأقسام) الثلاثة تأثیرا (علی نیة... وفی الغضب) توقف.... وإلا لا''

نکل جا، چلی جا، کھڑی ہو.... جیسے الفاظ رد کا احتمال رکھتے ہیں۔ خالی، بری، حرام، بائن گالی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ عدت گزار، رحم خالی کر، تو اکیلی ہے، حالت رضا میں تینوں اقسام نیت پر موقوف رہیں گے۔ اور حالت غضب میں پہلے دو نیت پر موقوف ہوں گے اگر نیت کی تو طلاق واقع ہوگی ورنہ نہیں واقع ہوگی۔" [حبیب الفتاوی ۲/۶۲۵، ۶۲۴]

اسی میں ایک مقام پر فتاوی شامی کے حوالے سے درج ذیل عبارت نقل کی گئی ہے:

''قالوا بعضها لا یقع بها الا بالنیة، وارادبھذا البعض مایحتمل الرد کاخرجی واذہبی وقومی۔

بعض ایسے الفاظ کنایہ ہیں کہ ان سے دلالت حال کے باوجود اگر نیت نہیں ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اس بعض سے مراد وہ لفظ ہے جو رد کا احتمال رکھتا ہے اور جیسے یہ الفاظ 'نکل جا، چلی، جا، کھڑی ہو جا۔" [حبیب الفتاوی، ۲/۵۹۶]

الحاصل: جاؤ یہاں سے اگر بیوی سے طلاق کی نیت سے کہا تو اب زید کی بیوی بغیر حلالہ زید کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ اور اگر زید حلف لے کر کہے کہ میں نے یہ الفاظ بیوی کو بغیر نیت طلاق کے کہے ہیں یا بیوی کو نہیں کہے ہیں تو پھر بس دو طلاق رجعی ہی مان کر نکاح کا حکم ہوگا۔ حلالہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۶۸ — ایک بار میں تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں

مسئولہ: قاری محمد ذاکر خطیب وامام چمن مسجد سرور کھیڑ اکاشی پور۔ ۲۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں

زید نے اپنی بیوی ہندہ کو ایک ہی بار میں تین طلاق دی ہیں تو کیا ہندہ مطلقہ ہو جائے گی؟ اور اگر مطلقہ ہو جائے گی تو اب ایسی صورت میں کیا حلالہ کی ضرورت ہوگی؟ بعض لوگ اس کا انکار کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک بار میں تین طلاقیں واقع نہیں ہوں گی۔ اور نہ حلالہ ہوگا۔ شریعت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب

ازروئے شرع تین طلاق ایک بار میں دینا جائز نہیں۔ لیکن اگر کسی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں تو طلاق مغلظہ واقع ہو جائے گی۔ پھر عورت بغیر حلالہ کے مرد کے لئے جائز نہ ہوگی۔ صحابی رسول حضرت عبد اللہ ابن عمر سے مروی ہے فرماتے ہیں: من طلق امرأته ثلاثا فقد بانت منه امرأته وعصی ربه تعالی وخالف السنة

جس نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی تو طلاق ہو گئی اور اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور سنت کی مخالفت۔

[سنن دار قطنی ۵/۵۸، کتاب الطلاق]

بخاری شریف میں حضرت عائشہ سے مروی فرماتی ہیں:

''أن رجلا طلق امرأته ثلاثا، فتزوجت فطلق، فسئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم أتحل للأول، قال: لا، حتی یذوق عسیلتها کما ذاق الأول''

یعنی ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں تو اس نے دوسرے شخص سے نکاح کرلیا اس نے بھی طلاق دیدی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا وہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہوگئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، جب تک کہ دوسرا شوہر اس کا مزہ نہ چکھ لے جیسے پہلے نے چکھا ہے"[بخاری شریف، کتاب الطلاق[باب من أجاز طلاق الثلاث]

سنن ترمذی میں ہے:

''والعمل علی هذا عند عامة أهل العلم من أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرهم: أن الرجل إذا طلق امرأته ثلاثا فتزوجت زوجا غیره فطلقها قبل أن یدخل بها أنها لا تحل للزوج الأول إذا لم یکن جامع الزوج الآخر''

یعنی صحابہ کرام اور ان کے علاوہ اہل کے علم نزدیک عمل اس بات پر ہے کہ مرد جب اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدے تو وہ عورت دوسرے مرد سے نکاح کرے وہ دخول کرے پھر طلاق دے اس لئے کہ پہلے شوہر کے لئے وہ عورت تب تک حلال نہیں ہوگی جب تک دوسرا شوہر اس سے مجامعت نہ کرلے۔

[سنن ترمذی، ۳/ ۴۸۱باب ما جاء فیمن یطلق امرأته ثلاثا فیتزوجها آخر]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"شریعت کا حکم یہ ہے جس شخص نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دی ہوں ایک دفعہ میں خواہ برسوں میں کہ ایک کبھی دی اور رجعت کرلی پھر دوسری دی اور رجعت کرلی اب تیسری دی دونوں صورتوں میں عورت اس پر بغیر حلالہ حرام ہے۔

"[فتاوی رضویہ جلد ۱۲ صفحہ ۴۰۷]

مزید فرماتے ہیں:

ایک بار تین طلاق دینے سے نہ صرف نزد حنفیہ بلکہ اجماعِ مذاہبِ اربعہ تین طلاقیں مغلظہ ہو جاتی ہیں۔

فتح القدیر میں ہے: ذهب جمهور الصحابة والتابعین ومن بعدهم من ائمة المسلمین الی انه یقع ثلث، وفی سُنن ابی داؤد عن مجاهد قال کنت عند عباس رضی اللہ تعالیٰ عنهما فجاء رجل فقال انه طلق امرأته ثلثا قال فسکت حتی ظننت انه رادها الیه ثم قال ایطلق احدکم فیرکب الحموقة ثم یقول یا ابن عباس یا ابن عباس فان اللہ عزّوجل قال ومن یتق اللہ یجعل له مخرجا عصیت ربك وبانت منك امرأتك۔

جمہور صحابہ، تابعین اور ان کے بعد والے مسلمانوں کے ائمہ کرام کا مسلک ہے بیک لفظ تین طلاقیں تین ہوں گی۔

امام مجاہد سے سُنن ابو داؤد میں مروی ہے کہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس موجود تھا تو ایک شخص آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں، مجاہد کہتے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کچھ دیر خاموش رہے تو میں نے خیال کیا کہ شاید عباس سائل کو بیوی واپس کردیں گے، تو کچھ دیر بعد آپ نے فرمایا تم میں سے بعض لوگ بیوی کو طلاق دیتے ہوئے حماقت سے کام لیتے ہیں۔ اور پھر اے ابن عباس اے ابن عباس کہتے ہیں، تو یاد رکھو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی سبیل پیدا فرمادیتا ہے، جبکہ تو نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے تیری بیوی تجھ سے لاتعلق ہوچکی ہے۔" [فتاوی رضویہ جلد ۱۱ صفحہ ۴۱۱، ۴۱۰]

الحاصل: جمہور صحابہ خصوصاً فقہاء صحابہ حضرت عمر حضرت عثمان حضرت علی حضرت عبد اللہ ابن مسعود حضرت عبد اللہ ابن عمر حضرت عمر بن صامت حضرت ابوہریرہ حضرت عبد اللہ ابن عباس حضرت عبد اللہ بن زبیر اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ائمہ اربعہ اور جمہور علمائے اہل سنت کا اس بات پر اجماع واتفاق ہے کہ ایک بار میں تین طلاقیں تین ہی ہیں۔ لہٰذا زید کی بیوی تین طلاق مغلظہ کے سبب زید کے لئے بغیر حلالہ کسی بھی صورت جائز نہ ہو گی۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب و رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم

فتوی ۶۹ — طلاق مغلظہ کا حکم

مسئولہ: محمد شاہ رخ خان، ابن محمد انیس خاں، محلہ کھتاڑی چھپر والی مسجد رام نگر۔ ۳۰؍ربیع النور ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں
میں نے اپنی بیوی کو کئی لوگوں کی موجودگی میں تین بار طلاق دے دی ہے۔ تو کیا میری بیوی میرے نکاح سے نکل گئی ہے؟ شریعت کا جو بھی حکم ہو بیان فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں آپ کی بیوی پر طلاق مغلظہ پڑ گئی ہے۔ اور آپ کی بیوی آپ کے نکاح سے نکل چکی ہے۔

فتاوی نوازل میں ہے:" اذا طلق الرجل امرتہ المدخول بھا ثلاثاً یقع الطلاق "

یعنی جب کسی شخص نے اپنی مدخولہ بیوی کو تین طلاقیں دیدیں تو طلاق واقع ہو گئی۔ [فتاوی نوازل، کتاب الطلاق، ۱۹۷]

عدت کے بعد آپ کی بیوی کو اختیار ہے کہ وہ جس سے چاہے نکاح کرے البتہ اگر آپ اور بیوی راضی ہوں اور پھر نکاح کرنا چاہیں تو حلالہ شرعی لازم ہے۔ قرآن پاک میں ہے: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ۔

پھر اگر تیسری طلاق اسے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہو گی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔

[ترجمہ کنز الایمان، سورہ بقرہ، آیت، ۲۳۰]

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں صدر الافاضل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"تین طلاقوں کے بعد عورت شوہر پر بحرمت مغلظہ حرام ہو جاتی ہے اب نہ اس سے رجوع ہو سکتا ہے نہ دوبارہ نکاح جب کہ حلالہ ہو یعنی بعد عدت دوسرے سے نکاح کرے اور وہ بعد صحبت طلاق دے پھر عدت گزارے دوبارہ نکاح کرلیں۔"

[تفسیر خزائن العرفان، سورہ بقرہ، آیت، ۲۳۰]

الحاصل: آپ کی بیوی تین طلاقیں مغلظہ پڑنے کے سبب آپ کے نکاح سے نکل چکی ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۷۰

میں نے تجھے چھوڑ دیا، طلاق صریح ہے
تین بار کہنے پر طلاق مغلظہ واقع ہو جائے گی

مسئولہ: حاجی عبد الحفیظ محلہ خالصہ کاشی پور۔ ۱۵ر رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

زید نے اپنی بیوی کو لڑائی کے دوران چار یا پانچ بار کہہ دیا "میں نے تجھے چھوڑ دیا" جب کہ زید کا کہنا یہ بھی ہے کہ میری نیت چھوڑنے کی نہیں تھی اس کو ڈرانے کے لیے کہا تھا اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسی صورت میں طلاق ہو گئی؟

اگر ہو گئی ہے تو پھر اب زید کے لیے کیا صورت ہے کہ دوبارہ بیوی اس کے نکاح میں آسکتی ہے۔ شریعت مطہرہ کی روشنی میں جواب عنایت کریں عین نوازش ہو گی۔

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاق مغلظہ واقع ہو گئی۔ اوراب اس کے لیے بغیر حلالہ بیوی کو نکاح میں لانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

إذا قال الرجل لامرأته: بهشتم ترا ازنی فاعلم بأن هذه اللفظة استعملها أهل خراسان وأهل عراق فی الطلاق وأنها صريحة عند أبي يوسف رحمه الله تعالى حتى كان الواقع بها رجعيا ويقع بدون النية. وفی الخلاصة وبه أخذ الفقيه أبو الليث وفی التفريد وعليه الفتوى كذا فی التتارخانية''

جب مرد اپنی بیوی سے کہے کہ تجھ کو چھوڑ دیا تو اس بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ اس لفظ کو اہل خراسان اور اہل عراق نے طلاق کے لیے استعمال کیا ہے۔ اوراسی لیے امام ابو یوسف کے نزدیک یہ لفظ صریح ہے۔ اس سے طلاق رجعی پڑ جائے گی اور بغیر نیت کے پڑ جائے گی۔ فتاوی خلاصہ میں ہے کہ فقیہ ابو اللیث نے اسی کو اختیار فرمایا۔ تفرید میں ہے کہ اسی پر فتوی ہے۔ اور ایسا ہی فتاوی تتار خانیہ میں ہے"[فتاوی ہندیہ، ج ۱ ص ۳۷۹، الفصل السابع فی الطلاق بالالفاظ الفارسية]

مزید اسی میں ہے:

''ولو قال الرجل لامرأته: ترا جنك باز داشتم أو بهشتم أو يله كردم ترا أو باى كشاده كردم ترا فهذا كله تفسير قوله طلقتك عرفا حتى يكون رجعيا ويقع بدون النية كذا فی الخلاصة. وكان الشيخ الإمام ظهير الدين المرغيناني -رحمه الله تعالى- يفتي فی قوله بهشتم بالوقوع بلا نية''

اوراگر مرد نے اپنی بیوی سے کہا کہ تیرا پنجہ میں نے باز رکھا، چھوڑ دیا یارا کیا، تجھے کھلے پاؤں کر دیا۔ یہ سارے الفاظ عرفاً شوہر کے قول طلقتکِ کی تفسیر ہیں ۔ ان سے بغیر نیت طلاق رجعی واقع ہو جائے گی۔ ایسا ہی فتاوی خلاصہ میں ہے شیخ امام ظہیر الدین مرغینانی علیہ الرحمہ اس قول پر بغیر نیت طلاق کے واقع ہونے کا فتوی دیتے تھے۔"[مرجع سابق]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''میں نے تجھ کو چھوڑ دیا یہ لفظ صریح ہے''[فتاوی رضویہ قدیم،ج ۵/۴۲۷]

اور جب کسی نے یہ یہ لفظ تین بار کہے تو اس کا حکم بیان کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''اگر تین بار کہا تین طلاقیں ہو گئیں اب بے حلالہ اس سے نکاح نہیں کر سکتا۔''[فتاوی رضویہ قدیم،ج ۵/۴۵۲]

صدالشریعہ فرماتے ہیں:

''خود یہ لفظ طلاق کے لیے ہے اور عرف میں یہ بمنزلہ لفظ طلاق صریح ہے۔اس سے طلاق واقع ہونے کے لیے نیت وارادہ کی بھی حاجت نہیں ہے۔اور جب اس نے تین بار کہے تو تین طلاقیں واقع ہو گئیں ۔اب بغیر حلالہ وہ عورت زید کے نکاح میں نہیں آسکتی۔''[فتاوی امجدیہ،ج ۲/۲۱۵]

الحاصل: زید کی بیوی زید کے نکاح سے نکل چکی ہے۔اب زید کی بیوی عدت گزار کر جس سے چاہے نکاح کرے وہ آزاد ہے۔ہاں البتہ اگر وہ زید ہی سے نکاح کرنا چاہے تو شرعاً اس پر عدت کے بعد دوسرے سے نکاح وصحبت اوراس کے بعد اس سے طلاق حاصل کر کے عدت گزارنا لازم ہے۔ حلالہ سے متعلق قرآن پاک میں ہے۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ۔

پھر اگر تیسری طلاق اسے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہو گی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔

[ترجمہ کنز الایمان،سورہ بقرہ،آیت،۲۳۰]

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں صدرالافاضل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''تین طلاقوں کے بعد عورت شوہر پر بحرمت مغلظہ حرام ہو جاتی ہے اب نہ اس سے رجوع ہو سکتا ہے نہ دوبارہ نکاح،جب کہ حلالہ ہو۔یعنی بعد عدت دوسرے سے نکاح کرے اور وہ بعد صحبت طلاق دے پھر عدت گزارے دوبارہ نکاح کر لیں''

[تفسیرخزائن العرفان،سورہ بقرہ،آیت،۲۳۰]

واللہ اعلم بالصواب و رسولہ اعلم صلی اللہ علیہ وسلم

تین طلاق کے بعد بغیر حلالہ اسی بیوی سے نکاح منعقد نہیں ہو گا

فتوی ۷۱ مسئولہ: حاجی محمد یعقوب انصاری محلہ خالصہ کاشی پور۔۴/ شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسئلہ ذیل کے بارے میں

زید نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیں۔ طلاق کے بعد مطلقہ نے عدت زید کے گھر میں ہی پوری کی جب کہ زید کے پاس ایک ہی کمرہ ہے۔ عدت کے بعد زید نے بغیر حلالہ کے اس سے نکاح کر لیا۔اس کے کچھ دن بعد پھر تین بار طلاق دے دی۔ اب کی بار مطلقہ عدت اپنے باپ کے گھر کر رہی ہے زید اس سے پھر بغیر حلالہ نکاح کرنا چاہتا ہے قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیں کہ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ عین کرم ہو گا۔

الجواب

تین طلاق کے بعد بیوی اپنے شوہر کے نکاح سے نکل جاتی ہے ،اب اگر وہ دوبارہ اسی شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہے تو قرآن وحدیث کے حکم کے مطابق اس کے لئے حلالہ ضروری ہوتا ہے اس کے بعد اس کے بعد اس دوسرے شوہر سے طلاق اور پھر عدت کے بعد ہی وہ پہلے شوہر کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ صورت مسئولہ میں زید کی بیوی تین طلاق کے بعد عدت کرکے بغیر حلالہ زید کے ساتھ رہ رہی تھی یہ بالکل ناجائزو حرام تھا۔ زید اور وہ عورت دونوں زنا کے مرتکب ہیں دونوں کو چاہئے کہ توبہ کریں اورآئندہ اگر ساتھ رہنا چاہیں تو حلالہ کے حکم پر عمل کریں۔ اور دوبارہ جو طلاق دی گئی ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس کی عدت بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ عدت تو پہلے پوری ہوچکی تھی۔ حلالہ سے متعلق قرآن پاک میں ہے:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ

پھر اگر تیسری طلاق اسے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔

[ترجمہ کنزالایمان، سورہ بقرہ، آیت، ۲۳۰]

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں صدرالافاضل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

”تین طلاقوں کے بعد عورت شوہر پر بحرمت مغلظہ حرام ہوجاتی ہے اب نہ اس سے رجوع ہوسکتا ہے نہ دوبارہ نکاح جب کہ حلالہ ہو یعنی بعد عدت دوسرے سے نکاح کرے اور وہ بعد صحبت طلاق دے پھر عدت گزارے دوبارہ نکاح کرلیں“

[تفسیر خزائن العرفان، سورہ بقرہ، آیت، ۲۳۰]

مبسوط سرخسی میں ہے:

ولا تحل له المرأة بعد ما وقع عليها ثلاث تطليقات حتى تنكح زوجا غيره يدخل بها

یعنی تین طلاق سے مطلقہ عورت اپنے شوہر کے لئے حلال نہیں جب تک کہ دوسرے سے نکاح نہ کرلے۔ اور وہ اس سے ہم بستر نہ ہوجائے۔ [۱۴/۶، کتاب الطلاق]

فتاوی عالمگیری میں ہے: وإن كان الطلاق ثلاثا في الحرة .... لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره نكاحا صحيحا ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها كذا في الهداية

یعنی اگر آزاد عورت تین طلاق سے مطلقہ ہو تو اپنے شوہر کے لئے جب تک حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرلے اور وہ اس سے مجامعت نہ کرلے پھر وہ دوسرا شوہر طلاق دے یا انتقال کرجائے ایسا ہی ہدایہ میں ہے۔

[۴۷۳/۱، فصل فيما تحل في المطلقة]

اور اگر زید اور اس کی بیوی اس حکم شرعی پر عمل نہ کریں تو لوگوں کو چاہئے کہ ان دونوں کا بائیکاٹ کریں۔

حضور اعلیٰ حضرت تین طلاق کے بعد بغیر حلالہ بیوی رکھنے والے کے بارے میں فرماتے ہیں:

”اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت گنہگار اور زانی حرامکار ہے۔ وہ صاف صاف تین طلاق کا اقرار کرچکا ہے اس سے پھرنے

کااسے کوئی اختیار نہیں ۔پہلی عورت اس پر ہمیشہ کو حرام ہو گئی۔ جب تک حلالہ نہ ہوان مرد وعورت پر فرض ہے کہ فوراجدا ہو جائیں۔اوراگر نہ مانیں تو مسلمان ان کو چھوڑدیں کہ وہ زانی وزانیہ ہیں“[فتاوی رضویہ قدیم،۶۴۰/۵]

تین طلاق کے بعد عورت حلالہ کے بغیر شوہر اول کے لیے حلال نہ ہو گی

فتوی ۷۲ مسئولہ: محمد فہیم محلہ گنج چونا گلی کاشی پور-۸/ شعبان المعظم ۱۴۳۷ھ

کیافرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ

میں محمد فہیم ولد مرحوم محمد شریف محلہ گنج چونا گلی کا رہنے والا ہوں۔ میری اپنی بیوی سے آپسی غلط فہمی میں کچھ کہاسنی ہو گئی تھی اوروہ اتنی بڑھ گئی کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں ایک ساتھ دے دیں۔ وہاں کوئی گواہ نہ تھا۔اب ہمیں پچھتاواہو رہاہے اور ہم ایک ساتھ رہناچاہتے ہیں اس تعلق سے شریعت کاجو بھی حکم ہو بیان فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں آپ کے اقرار کی بنیاد پر آپ کی بیوی پر تین طلاقیں مغلظہ واقع ہو چکی ہیں۔اورآپ کی بیوی آپ کے نکاح سے نکل چکی ہے۔اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوبارہ اسی عورت کے ساتھ نکاح کریں تو شریعت کی رو سے حلالہ لازم ہے۔ حلالہ کامطلب یہ ہے کہ آپ نے جس عورت کو طلاق دی ہے وہ طلاق کی عدت گزارے،اس کے بعد وہ کسی اور سے نکاح کرے،وہ اس سے ہمبستر ہو اوراپنی مرضی سے طلاق دے، پھر وہ عورت عدت گزارے،اس کے بعد آپ سے نکاح ہو سکتا ہے۔

حلالہ سے متعلق اللہ پاک نے قرآن پاک میں حکم فرمایا:”فَإِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُۥ مِنۢ بَعۡدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهُۥ“

پھر اگر تیسری طلاق اسے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہو گی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔

[ترجمہ کنزالایمان،سورہ بقرہ،آیت،۲۳۰]

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں صدرالافاضل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

”تین طلاقوں کے بعد عورت شوہر پر بحرمت مغلظہ حرام ہو جاتی ہے اب نہ اس سے رجوع ہو سکتا ہے نہ دوبارہ نکاح جب کہ حلالہ ہو یعنی بعد عدت دوسرے سے نکاح کرے اوروہ بعد صحبت طلاق دے پھر عدت گزارے دوبارہ نکاح کرلیں“

[تفسیرخزائن العرفان،سورہ بقرہ،آیت،۲۳۰]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

”وإن كان الطلاق ثلاثا في الحرة .... لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره نكاحا صحيحا ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها

اگر آزاد عورت تین طلاق سے مطلقہ ہو تو اپنے شوہر کے لئے جب تک حلال نہ ہو گی جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرلے اوروہ اس سے مجامعت نہ کرلے پھر وہ دوسرا شوہر طلاق دے یاانتقال کر جائے۔

[۴۷۳/۱،فصل فیماتحل فی المطلقة]

تین طلاق والی عورت بغیر عدت وحلالہ شوہر اول کے لیے حلال نہیں

فتوی ۷۳ مسئولہ: افضال احمد بن شمیم احمد محلہ علی خاں کاشی پور۔۱۳/ شعبان المعظم،۱۴۳۹ھ

جناب مفتی ذوالفقار صاحب

میری شادی صبیحہ بنت غضنفر علی ساکن محلہ علی خاں کاشی پور سے ہوئی تھی۔ صبیحہ سے میری اولاد کی پیدائش ہوئی۔ کسی سبب میرے اور صبیحہ کے درمیان رنجش ہوئی اور اسی حالت میں طلاق ہوگئی۔ طلاق کے بعد صبیحہ مجھ سے کئی سال دور رہی۔ صبیحہ نے مجھ سے نکاح کی بات کی تو میں نے صبیحہ کے کہنے پر پھر صبیحہ سے نکاح کرلیا۔ صبیحہ نے عدت بھی نہیں کی اور حلالہ بھی نہیں کیا۔ بغیر عدت اور بغیر حلالہ مجھ سے نکاح کیا۔ تو کیا یہ نکاح شریعت کے قانون کے مطابق ہوا یا نہیں؟

شریعت میں اس نکاح کے بارے میں جو بھی حکم ہو بیان فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں اگر صبیحہ کو تین طلاق دے چکے تھے تو صبیحہ سے بغیر حلالہ نکاح جائز نہیں تھا۔ طلاق کے بعد اگر کئی سال گزر گئے تھے اور اس دوران صبیحہ کو تین ماہواری ہوگئی تھیں تو عدت تو ہوگئی۔ کیوں کہ مطلقہ غیر حاملہ کی عدت تین ماہواری ہوتی ہے۔

''إذا طلق الرجل امرأته طلاقا بائنا أو رجعیا أو ثلاثا أو وقعت الفرقة بینهما بغیر طلاق وهی حرة ممن تحیض فعدتها ثلاثة أقراء سواء کانت الحرة مسلمة أو کتابیة''

یعنی جب مرد نے اپنی بیوی کو طلاق بائن یا رجعی یا تین طلاقیں دیں یا ان دونوں کے درمیان جدائی واقع ہوئی بغیر طلاق کے اور وہ حیض والی عورت ہے تو اس کی عدت تین حیض ہے خواہ ہو وہ عورت آزاد مسلمہ ہو یا کتابیہ ہو۔''

[فتاوی عالمگیری، الباب الثالث عشر فی العدة، ۵۲۶/۱]

اور اگر بالفرض اس دوران صبیحہ کو تین ماہواری نہیں ہوئیں اور صبیحہ آئسہ بھی نہیں اور تم نے نکاح کرلیا تو یہ نکاح جائز نہیں۔

فتاوی شامی میں ہے: ''نکاح المعتدة لا یصح''یعنی عدت والی کا نکاح صحیح نہیں ہے۔[۴۸/۳]

بنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

''نکاح المعتدة لا یجوز''یعنی عدت والی کا نکاح جائز نہیں۔[بنایہ شرح ہدایہ، ۲۲۳/۵]

اور اگر عدت مکمل ہوگئی تھی اور حلالہ کے بغیر دوبارہ نکاح کرلیا تو یہ نکاح بھی جائز نہیں تھا۔ کیوں کہ طلاق مغلظہ کے بعد بغیر حلالہ کے عورت اپنے شوہر اول سے نکاح نہیں کرسکتی۔ حلالہ سے متعلق قرآن پاک میں ہے:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ

پھر اگر تیسری طلاق اسے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔

[ترجمہ کنز الایمان، سورہ بقرہ، آیت، ۲۳۰]

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں صدر الافاضل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"تین طلاقوں کے بعد عورت شوہر پر بحرمت مغلظہ حرام ہو جاتی ہے اب نہ اس سے رجوع ہو سکتا ہے نہ دوبارہ نکاح جب کہ حلالہ ہو یعنی بعد عدت دوسرے سے نکاح کرے اور وہ بعد صحبت طلاق دے پھر عدت گزارے دوبارہ نکاح کرلیں"

[تفسیر خزائن العرفان، سورہ بقرہ، آیت، ۲۳۰]

مبسوط سرخسی میں ہے:

ولا تحل له المرأة بعد ما وقع عليها ثلاث تطليقات حتى تنكح زوجا غيره يدخل بها۔

یعنی تین طلاق سے مطلقہ عورت اپنے شوہر کے لئے حلال نہیں جب تک کہ دوسرے سے نکاح نہ کرلے اور وہ اس سے ہم بستر نہ ہو جائے۔ [مبسوط سرخسی، ۱۴/۶، کتاب الطلاق]

بدائع الصنائع میں ہے: ''لا يجوز له نكاحها قبل التزوج بزوج آخر''

یعنی شوہر اول کے لیے مطلقہ سے نکاح دوسرے شوہر سے نکاح سے پہلے جائز نہیں ہے۔ بدائع الصنائع، ۳/۱۸۷]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

وإن كان الطلاق ثلاثا في الحرة ... لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره نكاحا صحيحا ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها كذا في الهداية'' یعنی اگر آزاد عورت تین طلاق سے مطلقہ ہو تو اپنے شوہر کے لئے جب تک حلال نہ ہوگی جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرلے اور وہ اس سے مجامعت نہ کرلے پھر وہ دوسرا شوہر طلاق دے یا انتقال کر جائے ایسا ہی ہدایہ میں ہے۔

[فتاوی عالمگیری، ۱/۴۷۳، فصل فيما تحل في المطلقة]

الحاصل:۔ بغیر حلالہ کے یہ نکاح نہیں ہوا۔ اس طرح نکاح کرنا اور دونوں کا ایک ساتھ رہنا سخت ناجائز و حرام ہے۔ تم دونوں پر لازم ہے کہ فوراً ایک دوسرے سے دور ہو جاؤ۔ اور جب تک حلالہ نہ ہو تب تک نکاح وغیرہ کے مرتکب نہ ہو۔ اور جو جرم و گناہ کیا ہے اس پر اللہ سے توبہ کرو ورنہ عذاب شدید کے مستحق ہو گے۔

حضور اعلیٰ حضرت تین طلاق کے بعد بغیر حلالہ بیوی رکھنے والے کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت گنہگار اور زانی حرامکار ہے وہ صاف صاف تین طلاق کا اقرار کر چکا ہے۔ اس سے پھرنے کا اسے کوئی اختیار نہیں ۔ پہلی عورت اس پر ہمیشہ کو حرام ہو گئی۔ جب تک حلالہ نہ ہو ان مرد و عورت پر فرض ہے کہ فوراً جدا ہو جائیں۔ اور اگر نہ مانیں تو مسلمان ان کو چھوڑ دیں کہ وہ زانی و زانیہ ہیں" [فتاوی رضویہ قدیم، ۵/۶۴۰]

مطلقہ کا بعد وفات شوہر، دعوی کہ مجھے طلاق نہیں ہوئی تھی

فتوی ۷۴ مسئولہ: محمد اسمٰعیل محلہ مہیش پورہ کاشی پور اترا کھنڈ۔ ۱۹/ ذوالقعدہ ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

میرے بیٹے محمد مہربان نے چار سال پہلے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی تھیں ۔ ہماری برادری ماہی گیر ان کی پنچایت میں

طلاق کے اقرار کے بعد طلاق ہونے پر فیصلہ بھی ہو گیا تھا۔ پنچایت کے سامنے مہر بھی ادا کر دیا گیا تھا۔ اس کے دو سال بعد میرے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ اب میرے بیٹے کے انتقال کے دو سال بعد اس کی بیوی نے پولیس تھانہ میں دعوی کر دیا کہ مجھے طلاق نہیں ہوئی ہے۔

حالانکہ یہ بالکل جھوٹ بات ہے طلاق کے پنچایت کے پنچوں کے علاوہ برادری کے بہت سے ذمہ دار حضرات گواہ ہیں۔

چند گواہوں کے نام یہ ہے: محمد اصغر۔ ذاکر حسین۔ جعفر حسین

اب ایسی صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ محمد مہربان کے انتقال کے بعد اس کی بیوی کا یہ دعوی کس حد تک جائز ہے؟

کیا مرحوم کی جائداد میں اس کا کوئی حصہ ہے اگر ہے تو کتنا؟ شریعت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں مرحوم محمد مہربان کی بیوی کا دعوی سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ جب لوگوں کے سامنے طلاق کا اقرار اور اس پر فیصلہ ہو چکا تھا تو اب چار سال بعد طلاق نہ ہونے کا دعوی کرنا یقیناً غلط ہے۔ طلاق کے بعد عدت گزر جائے تو نکاح اور اس کے سبھی حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔ مبسوط سرخسی میں ہے:

''فإن بانقضاء العدۃ قد ارتفع النکاح بحقوقه''

یعنی عدت پوری ہونے کے بعد نکاح اپنے تمام تر حقوق کے ساتھ ختم ہو گیا۔ [مبسوط سرخسی، ۱۶۳/۱۷]

محیط برہانی میں ہے:

''لأنّ بعد انقضاء العدّۃ ارتفع النکاح بأثرہ''

یعنی عدت پوری ہونے کے بعد نکاح اپنے اثر کے ساتھ ختم زائل ہو گیا۔ [محیط برہانی، ۳۶۱/۳]

اور جب نکاح اپنے سبھی حقوق کے ساتھ زائل ہو چکا ہے تو اب نکاح کے باقی رہنے کا دعوی کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

محیط برہانی میں ہے:

''لا یمکن دعوی حقوق النکاح بعد انقطاعه''، یعنی نکاح کے حقوق کا دعوی نکاح کے ختم ہونے کے بعد ممکن ہی نہیں ہے۔ [محیط برہانی، ۱۸۶/۳]

اور جب نکاح ہی باقی نہ رہا تو نکاح سے ملحق حقوق بھی ختم ہو گئے۔ اس لئے مرحوم کی جائداد سے مرحوم کی بیوی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ مرحوم کی جائداد اس کے وارثین میں بانٹی جائے گی۔ بیوی کو چونکہ طلاق ہو چکی تھی اور عدت کے بعد شوہر کا انتقال ہوا ہے تو بیوی کو جائداد میں سے ازروئے شرع کچھ نہیں ملے گا۔

بدائع الصنائع میں ہے: ''لو مات الزوج بعد انقضاء عدتها لا ترث''

یعنی اگر شوہر بیوی کی عدت پوری ہونے کے بعد مر گیا تو عورت وارث نہیں ہو گی۔

[بدائع الصنائع، ۲۲۱/۳، فصل فی احکام العدۃ]

جوہرہ نیرہ میں ہے:

''إذا طلقها ثلاثا وإن مات بعد انقضاء عدتها فلا ميراث لها''

جب شوہر نے بیوی کو تین طلاقیں دیں اور بیوی کی عدت پوری ہونے کے بعد انتقال کر گیا تو اس کی بیوی کے لئے میراث نہیں ہے۔[الجوہرۃ النیرۃ، ۴۸/۲]

الحاصل:۔ مرحوم محمد مہربان کی بیوی کا دعوی غلط ہے۔ ازروئے شرع وہ گنہگار ہے۔ چاہئے کہ توبہ کرے اور اس طرح کی ناپاک حرکت سے باز آئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

بیوی کا طلاق سے انکار اور سسرال والوں کا دعوی طلاق

فتوی ۷۵ مسئولہ: مہتاب جہاں محلہ مہیش پورہ کاشی پور۔ ۲/ ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں

میرا نام مہتاب جہاں ہے میرا نکاح محمد مہربان سے ۲۰۰۷ء میں ہوا۔ ان سے میری دو بیٹیاں ہیں۔ ۲۰۱۵ء میں میرے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ میں شوہر کے گھر ہی میں رہتی ہوں۔ مجھے میرے سسرال والے تنگ کر رہے ہیں اور مجھے یہ کہہ کر گھر سے نکال رہے ہیں کہ تجھے طلاق ہو گئی ہے۔ حالانکہ یہ جھوٹ ہے۔ میرے پتی نے مجھے طلاق نہیں دی ہے۔ اور یہ بات سبھی اہل محلہ جانتے ہیں۔ وہ پنچایت کا حوالہ دے کر لوگوں سے کہتے ہیں کہ پنچایت میں طلاق ثابت ہو گئی ہے حالانکہ پنچایت کے لوگ بھی جانتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی ہے۔ نیچے پنچایت کے چودھری صاحب وغیرہ کا نام بھی لکھا ہے جو اس بات کے گواہ ہیں کہ مجھ پر طلاق کا الزام جھوٹا ہے ایسی صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے بیان فرمائیں۔ فقط

گواہان۔ چودھری زاہد حسین۔ محمد شاہد۔ مطلوب حسین۔ امجد علی۔ محمد ناظم۔ محمد مستقیم

الجواب

صورت مسئولہ میں طلاق کا دعوی کرنے والوں پر گواہ شرعی پیش کرنا لازم ہے۔ جو یہ گواہی دیں کہ مرحوم مہربان نے آپ کو ان کے سامنے طلاق دی ہے۔ یا طلاق کا اقرار ان کے سامنے کیا ہے۔ اور اگر وہ گواہ شرعی پیش نہ کر سکیں تو آپ قسم کھائیں کہ آپ کے شوہر نے آپ کو طلاق نہیں دی ہے۔ اگر ان کے گواہ پیش نہ کرنے پر آپ نے قسم کھالی تو طلاق نہیں مانی جائے گی۔ اور دعوی کرنے والوں کا دعوی بے بنیاد مانا جائے گا۔ حدیث شریف میں ہے:

البينة على المدعي واليمين على المدعى عليه۔

یعنی دعوے کرنے والے کے لئے گواہ اور جس پر دعوی کیا گیا ہے اس پر قسم ہے۔[ترمذی ابواب الاحکام، ۲۴۹/۱]

دوسری حدیث میں ہے: البينة على المدعي واليمين على من انكر۔

یعنی دعوے کرنے والے پر گواہ اور منکر پر قسم ہے۔[السنن البیہقی الکبریٰ کتاب الدعوی والبینات، ۴۲۷/۱۰]

اور طلاق کے سلسلے میں دو گواہ خواہ دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں پرہیز گار نمازی عادل غیر فاسق یعنی جو علی الاعلان گناہ

نہ کرتے ہوں، مثلا مرد داڑھی نہ منڈاتے ہوں، عورتیں بے پردہ نہ گھومتی ہوں، اس کے علاوہ کوئی کام خلاف شرع نہ کرتے ہوں لازم ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِنْكُمْ '' اوراپنے میں دو ثقہ کو گواہ کرلو۔[ترجمۂ قرآن کنزالایمان، پارہ ۲۸، سورہ طلاق، آیت ۲]

دوسرے مقام پر ہے: وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ من رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ

اور دو گواہ کرلو اپنے مردوں میں سے پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد دو عورتیں۔

[ترجمہ قرآن کنزالایمان، سورئہ بقرہ آیت ۲۸۲]

ہدایہ میں ہے:

'' یقبل فیها شهادة رجلین أو رجل وامرأتین سواء کان الحق مالا أو غیر مال" مثل: النکاح والطلاق ''

یعنی اس میں دو مرد و یا ایک مرد دو عورتوں کی گواہی قبول کی جائے گی۔ خواہ وہ حق مال ہو یا غیر مال جیسے نکاح اور طلاق۔

[ہدایہ شرح بدایہ، کتاب الشہادات ۱۱۶/۳]

بحر الرائق میں ہے: '' وقال الإمام الأعظم لا بد من شهادة رجلین أو رجل وامرأتین ''

یعنی امام اعظم نے فرمایا دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ضروری ہے۔

[البحر الرائق، باب التعلیق فی الطلاق، ۲۸/۴]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

'' وشرط فیها شهادة رجلین، أو رجل وامرأتین سواء کان الحق مالا، أو غیر مال کالنکاح والطلاق ''

یعنی اور اس میں دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں کی گواہی شرط ہے۔ چاہے وہ حق مال کے اعتبار سے ہو یا غیر مال کے اعتبار سے جیسے نکاح اور طلاق۔[فتاوی عالمگیری، کتاب الشہادات، ۴۵۱/۳]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"اگر دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں نمازی پرہیز گار ثقہ عادل قابلِ قبول شرع گواہی دیں گے تو تین طلاقیں ثابت ہو جائیں گی۔"[فتاویٰ رضویہ جدید، ۴۴۴/۱۲]

اور اگر گواہ پیش نہ ہوئے تو آپ قسم کھائیں اگر قسم کھانے سے انکار کریں گی تب بھی طلاق مان لی جائے گی۔ ہاں البتہ قسم کھانے کے بعد شرعاً طلاق نہیں مانی جائے گی۔ اور آپ کے جو حقوق شوہر سے متعلق ہوں گے اس کی آپ حقدار ہوں گی۔

فتاوی رضویہ جدید میں ہے:

"اور اگر ایسے گواہ نہیں تو زید سے قسم لی جائے گی اگر اس نے قسم کھانے سے انکار کر دیا جب بھی تین طلاقیں ثابت ہو جائیں گی۔ اور اگر قسم کھالے گا کہ میں نے صرف دو ہی طلاق دی ہیں تیسری طلاق نہ دی تو دو ہی ثابت ہوں گی۔ پھر اگر جھوٹی قسم کھالی تو اس کا وبال زید پر ہو گا"[۴۴۴/۱۲]

الحاصل: طلاق کا دعوی کرنے والے دو شرعی گواہ پیش کریں۔ اور اگر وہ شرعی گواہ پیش نہیں کرتے تو آپ قسم کھائیں اس کے بعد دعوی بے بنیاد قرار دیا جائے گا۔ اگر آپ جھوٹی قسم کھائیں گی یا وہ جھوٹے گواہ پیش کریں گے تو سخت گنہگار اور مستحق عذاب نار ہوں گے۔

فتوی ۷۶ — شوہر طلاق کا منکر ہو تو کیا حکم ہو گا

مسئولہ: جمعہ عرف اکبر کچھی پور پٹی کاشی پور۔ ۱۴؍ربیع الغوث ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں

زید کا کہنا ہے کہ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ جا طلاق لے لئے۔ مگر زید کی بیوی اور دو عورتیں دعوی کر رہی ہیں کہ زید نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے۔ تو اس صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں طلاق واقع نہیں ہوئی۔ ایسی صورت میں جب کہ شوہر طلاق کا انکار کرے اور بیوی طلاق کا دعوی کرے تو بیوی کے لئے دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں بطور گواہ پیش کرنا ضروری ہے۔ اور صورت مسئولہ میں ایسا نہیں ہے بیوی کے دعوی پر فقط دو عورتیں گواہ ہیں جو ازروئے شرع ناکافی ہیں۔ لہٰذا اب زید کو قسم کھلائی جائے گی کہ اس نے طلاق نہیں دی اگر وہ اس پر قسم کھالے تو پھر طلاق ثابت نہ ہو گی۔ جھوٹی قسم کھانے کا وبال و گناہ زید پر ہو گا۔

حدیث شریف میں ہے: ''البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعی علیہ''

یعنی دعوے کرنے والے کے لئے گواہ اور جس پر دعوی کیا گیا ہے اس پر قسم ہے۔ [ترمذی ابواب الاحکام، ۲۴۹/۱]

فتاوی رضویہ شریف میں ہے:

''اور اگر ایسے گواہ نہیں تو زید سے قسم لی جائے گی اگر اس نے قسم کھانے سے انکار کر دیا جب بھی تین طلاقیں ثابت ہو جائیں گی۔ اور اگر قسم کھالے گا کہ میں نے صرف دو ہی طلاق دی ہیں تیسری طلاق نہ دی تو دو ہی ثابت ہوں گی۔ پھر اگر جھوٹی قسم کھالی تو اس کا وبال زید پر ہو گا'' [۴۴۴/۱۲]

فتوی ۷۷ — شوہر طلاق کا اقرار کرنے بعد انکار کرے تو کیا حکم ہے

مسئولہ: حافظ شاداب علی۔ محلہ وجے نگر نئی بستی کاشی پور۔ ۷؍جمادی الاولی ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام مسئلہ ذیل کے بارے میں

زید سعودی عرب میں تھا کسی بات کو لے کر فون پر ہی تو تو میں میں ہوئی۔ جس کے عوض میں اس نے فون پر ہی تین بار سے زیادہ طلاق کے الفاظ اپنی بیوی کو بولے۔ اس کے بعد اس نے اپنے کئی رشتہ داروں کو فون کر کے بتایا جو رشتہ دار اس کی آواز اور اس کے نمبر کو پہچانتے ہیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد زید کے خالہ زاد بہن اور بہنوئی عمرہ شریف کرنے گئے تو زید سے ان

کی ملاقات مدینہ شریف کے اندر ہوٹل میں رات کو ایک بجے ہوئی۔ بہن اور بہنوئی نے اس سے پوچھا کہ کیا تونے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے؟

تو اس نے اپنے دوست وسیم کی موجودگی میں کہا کہ ہاں میں نے اپنی بیوی کو کئی بار طلاق دے دی ہے۔

اب وہ ڈیڑھ سال بعد انڈیا میں آیا اور آنے کے بعد بھی اس نے کہا کہ ہاں میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ بہت لوگوں سے تین مہینہ تک کہا۔ مگر اب زید اپنی بیوی کو گھر لے آیا اور کہتا ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی۔ اس سارے معاملہ میں بہت سارے گواہ ہیں۔ براہ کرام اس کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں عنایت فرمائیں۔ زید اور جو لوگ زید کے ساتھ اس عمل میں اس کے شریک ہیں ان سب کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے بیان فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں جب کہ زید طلاق دینے کے بعد طلاق کا منکر ہے تو اس پر شرعی گواہ پیش کئے جائیں۔ یعنی دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں پرہیزگار نمازی غیر فاسق۔ اگر یہ گواہی دیں تو زید کی بیوی پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"اگر دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں نمازی پرہیزگار ثقہ عادل قابلِ قبول شرع گواہی دیں گے تو تین طلاقیں ثابت ہو جائیں گی زید کا انکار نہ سنا جائے گا۔" [فتاوی رضویہ جدید، ۱۲/۴۴۴]

اور اگر شرعی گواہ نہ ہوں تو زید سے قسم لی جائے گی اگر وہ قسم کھالے گا تو شرعا طلاق کے واقع نہ ہونے کا حکم ہوگا۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"اور اگر ایسے گواہ نہیں تو زید سے قسم لی جائے گی اگر اس نے قسم کھانے سے انکار کر دیا جب بھی تین طلاقیں ثابت ہو جائیں گی۔ اور اگر قسم کھالے گا کہ میں نے صرف دو ہی طلاق دی ہیں تیسری طلاق نہ دی تو دو ہی ثابت ہوں گی۔ پھر اگر جھوٹی قسم کھالی تو اس کا وبال زید پر ہوگا۔" [فتاوی رضویہ جدید، ۱۲/۴۴۴]

اور یہ حکم اس لئے ہے کہ حدیث شریف میں اسی طرح حکم دیا گیا ہے، یعنی اگر کوئی شخص دعوی کرے تو گواہ پیش کرے اور گواہ پیش نہیں کر سکتا تو جس پر دعوی کیا گیا ہے وہ قسم کھائے۔

حدیث شریف میں ہے: البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعی علیہ۔

یعنی دعوی کرنے والے کے لئے گواہ اور جس پر دعوی کیا گیا ہے اس پر قسم ہے۔ [ترمذی ابواب الاحکام، ۱/۲۴۹]

لہٰذا صورت مسئولہ میں بھی یہی حکم ہوگا کہ زید کے طلاق دینے پر شرعی گواہ پیش کئے جائیں۔ اگر شرعی گواہ گواہی دے دیں تو طلاق ہو جائے گی۔ زید پر لازم ہوگا کہ فوراً اپنی بیوی سے الگ ہو جائے اور بغیر حلالہ و تجدید نکاح اس کے قریب نہ جائے۔ ورنہ شرعاً مجرم و گنہگار ہوگا وہ بھی اور جو اس کا ساتھ دیں گے وہ بھی۔ اور ایسی صورت میں مسلمانوں کو ان سے دور رہنے اور ان کا بائیکاٹ کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ اور اگر شرعی گواہ نہ ہوں تو زید کو قسم کھلائی جائے اگر زید قسم کھالے تو زید کی بیوی بدستور اس کے نکاح میں رہے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۷۸ — طلاق کا اقرار طلاق کے لیے کافی ہے

مسئولہ: محمد اسمعیل حضرت نگر کالی بستی کاشی پور۔ ۲۴/ ربیع الغوث ذوالقعدہ ۱۴۳۸ھ

کیافرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں

میرے بیٹے پرویز نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ اب لڑکی والے انکار کررہے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی۔ میرے بیٹے کو بھی اس کا اقرار ہے اوراس نے سب کے سامنے بھی طلاق کا اقرار کیا ہے۔ ایسی صورت میں کیا میرے بیٹے کی بیوی پر طلاق پڑی یانہیں کیامیری بہو میرے بیٹے کے نکاح میں ہے؟ یا نکاح سے نکل گئی؟ شریعت کا جو بھی حکم ہو بیان فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں پرویز کی بیوی پر طلاق مغلظہ واقع ہوگئی اوروہ اپنے شوہر کے نکاح سے نکل چکی ہے۔ اوراب بغیر حلالہ ایک دوسرے کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتے ہیں۔ فتاوی نوازل میں ہے: اذا طلق الرجل امرتہ المدخول بھاثلاثاًیقع الطلاق

جب کسی شخص نے اپنی مدخولہ بیوی کو تین طلاقیں دیدیں تو طلاق واقع ہوگئی۔ [فتاوی نوازل، کتاب الطلاق، ۱۹۷]

تفسیر خزائن العرفان میں ہے:

”تین طلاقوں کے بعد عورت شوہر پر بحرمت مغلظہ حرام ہوجاتی ہے اب نہ اس سے رجوع ہوسکتا ہے نہ دوبارہ نکاح جب کہ حلالہ ہو یعنی بعد عدت دوسرے سے نکاح کرے اوروہ بعد صحبت طلاق دے پھر عدت گزارے دوبارہ نکاح کرلیں۔

[تفسیر خزائن العرفان، سورہ بقرہ، آیت، ۲۳۰]

الحاصل: پرویز کی بیوی پر طلاق واقع ہوگئی ہے۔ اوروہ اب پرویز کے نکاح سے نکل چکی ہے۔ البتہ عدت تک نکاح سے یک گونہ تعلق رہے گا۔ کہ اگر وہ اپنے شوہر کے گھر میں عدت گزارتی ہے تو شوہر پر اس کا نفقہ وغیرہ لازم ہوگا۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۷۹ — فون پر طلاق دینے سے طلاق ہوجاتی ہے

مسئولہ: حافظ وزیرالدین احمد بیل جوڑی کاشی پور۔ ۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ

کیافرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں

زید نے فون پر اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، خود زید اس بات کا اقرار کررہا ہے اوراس کے علاوہ اس بات کے تین لوگ گواہ بھی ہیں ایسی صورت میں بعض لوگ کہتے ہیں طلاق نہیں ہوئی لہٰذا جو بھی صورت ہو بیان فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاق واقع ہوگئی۔ زید کے اقرار کے بعد نا کسی گواہ کی ضرورت نا کسی اور ثبوت کی۔ زید کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ اس نے طلاق کا اقرار کرلیا۔ لہٰذا زید کی بیوی پر طلاق مغلظہ واقع ہوگئی ہے اوراب بغیر حلالہ کے وہ زید کے لئے کسی بھی صورت میں حلال نہ ہوگی۔ قرآن مقدس میں ہے:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ

پھر اگر تیسری طلاق اسے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہو گی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔

[ترجمہ کنزالایمان، سورہ بقرہ، آیت، ۲۳۰]

موبائل پر بھی طلاق ہو جاتی ہے اور بیوی کے الفاظ طلاق نہ سننے پر بھی طلاق ہو جاتی ہے

فتوی ۸۰ مسئولہ: اکرام علی، محلہ قاضی باغ کاشی پور۔ ۳/ جمادی الاولی ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں

زید نے ایک، ڈیڑھ سال پہلے موبائل پر اپنی بیوی کو ایک طلاق دی، بیوی کہتی ہے میں نے سنا نہیں۔ زید کہتا ہے کہ ایک بار طلاق دی ہے تو ایسی صورت میں کیا طلاق واقع ہوئی؟ اگر ہوئی تو کون سی طلاق؟ اور اس میں حلالہ ہو گا یا نہیں؟ یا کیا صورت ہو گی شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاق واقع ہو گئی ہے۔ زید کی بیوی کے سننے نا سننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور چونکہ طلاق دئے ہوئے ڈیڑھ سال ہو گیا ہے اس صورت میں عدت کی تکمیل ہو گئی ہو گی۔ اس لئے یہ طلاق بائن ہو گئی اور ایسی صورت میں بغیر حلالہ کے فقط تجدید نکاح سے کام چل جائے گا۔ بدائع الصنائع میں ہے:

''فإن طلقها ولم يراجعها بل تركها حتى انقضت عدتها بانت''

یعنی اگر طلاق دی اور عدت پوری ہونے سے پہلے اس سے رجوع نہ کیا تو وہ عورت بائنہ ہو جائے گی۔

[بدائع الصنائع، فصل فی بیان حکم الطلاق]

اور پھر اگر وہ عورت اس کے ساتھ ہی رہنا چاہے گی تو نکاح جدید کرنا ہو گا۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

إذا كان الطلاق بائنا دون الثلاث فله أن يتزوجها في العدة وبعد انقضائها

یعنی جب کہ طلاق بائن غیر ثلاثہ ہو تو شوہر عورت سے عدت میں اور عدت کے بعد نکاح کر سکتا ہے۔

[فتاوی عالمگیری، جلد ۱/ ۴۷۳، ۴۷۲]

الحاصل: زید کی بیوی اس وقت زید کے نکاح میں نہیں ہے بلکہ بالکل آزاد ہے۔ اب وہ زید سے نکاح کرے یا کسی اور سے شرعاً اسے اختیار ہے۔ زید کے پاس ہی اگر آنا چاہتی ہے تو سوائے نکاح جدید کے کوئی صورت نہیں ہے۔

فتوی ۸۱ بیوی اگر طلاق کے الفاظ نہ سنے تو بھی طلاق ہو جاتی ہے

مسئولہ: اقبال احمد تاج مسجد روڈ کھتاڑی رام نگر اتراکھنڈ۔ ۲۳؍ربیع الغوث ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں

زید نے اپنی بیوی کو کئی مرتبہ طلاق دی۔ بیوی کہتی ہے کہ میں نے سنا نہیں تھا۔ زید کئی بار اقرار کر چکا ہے کہ اس نے طلاق دے دی ہے۔ شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے کیا زید کی بیوی کو طلاق ہوئی یا نہیں؟ جو بھی حکم ہو بیان فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاق واقع ہوگئی۔ زید کے اقرار کے بعد تو کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔ اور زید کے اقرار کے بعد گواہ کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ اور رہا زید کی بیوی کا سننے سے انکار کرنا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لئے کہ ازروئے شرع طلاق دینے والے کا خود سننا ضروری ہے بیوی یا کوئی اور سنے یا نہ سنے۔ فتاوی نوازل میں ہے:

''اذا طلق الرجل امرته المدخول بهاثلاثاًيقع الطلاق

یعنی جب کسی شخص نے اپنی مدخولہ بیوی کو تین طلاقیں دیدیں تو طلاق واقع ہوگئی۔ [فتاوی نوازل، کتاب الطلاق، ۱۹۷]

مجمع الانھر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

''أدنى المخافتة إسماع نفسه فقط وكذا كل مايتعلق بالنطق كالطلاق.... أى أدنى المخافتة فى هذه الأشياء إسماع نفسه حتى لو طلق بحيث صحح الحروف ولكن لم يسمع نفسه لايقع ولو طلق جهرا ووصل به إن شاء الله بحيث لم يسمع نفسه يقع الطلاق۔

یعنی ہلکی آواز کم سے کم اتنی کہ خود سن سکے بس۔ اور اسی طرح ہر وہ معاملہ جس میں بولی کو دخل ہے، جیسے طلاق....اس میں کم از کم اتنی آواز ہو کہ خود سن سکے۔ یہاں تک کہ اگر کسی نے طلاق دی کہ حروف بھی صحیح تھے لیکن اس نے خود سنا نہیں تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر اتنی زور سے دی اور اس میں ان شاء اللہ بھی ملالیا اور الفاظ طلاق کو سن لیا لیکن ان شاء اللہ کو خود نہ سنا تو طلاق واقع ہوگئی۔ [کتاب الصلوۃ، ۱/۱۵۷] اعلیٰ حضرت اپنے فتاوی میں فرماتے ہیں:

"طلاق کے لئے زوجہ خواہ کسی دوسرے کا سننا ضرور نہیں۔ جبکہ شوہر نے اپنی زبان سے الفاظ طلاق ایسی آواز سے کہے جو اس کے کان تک پہنچنے کے قابل تھے۔ [فتاوی رضویہ ۱۲/۳۶۲]

مزید فرماتے ہیں: "ہاں اگر آواز اتنی تھی کہ اپنے کان تک پہنچ سکتی اگر چہ کسی مانع مثلاً غل شور چکی، مینہ، بہرے پن وغیرھا کے سبب نہ پہنچی طلاق ہو جائے گی۔ ادنی الحد خروج صوت یصل الی اذنه ولوحکماً کمالوکان هناك مانع من صمم او جلبة اصوات اونحوذالك، (آواز کی کم سے کم حد یہ ہے کہ اس کے اپنے کانوں تک پہنچے اگر چہ حکماً ایسا ہو مثلاً آواز تو پہنچ جاتی مگر بہرے پن یا شور وغل کی وجہ سے نہ پہنچی۔) [فتاوی رضویہ ۱۲/۳۷۴]

الحاصل: زید کی بیوی پر طلاق واقع ہو چکی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

طلاق کے لیے بیوی کا سامنے ہونا یا سننا ضروری نہیں ہے

فتوی ۸۲ مسئولہ: بابو احمد قصار تاج مسجد، محلہ کھتاڑی رام نگر، نینی تال۔ ۲/ربیع الغوث ۱۴۳۵ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں

محمد آصف بن بابو احمد نے اپنی بیوی شاہین پروین بنت محمد حنیف کو کئی بار طلاق دی۔ فون پر بھی اور اس کے علاوہ پنچایت میں بھی لڑکے نے طلاق کا اقرار کیا۔ لیکن شاہین پروین کے والدین کا کہنا یہ ہے کہ طلاق کے الفاظ لڑکی نے نہیں سنے اور طلاق کے وقت لڑکی لڑکے کے سامنے نہیں تھی۔ تو اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا ایسی صورت میں زید کی بیوی پر طلاق پڑ گئی یا نہیں؟ اور کیا زید اپنی بیوی کو رکھ سکتا ہے؟ اس تعلق سے جو بھی فیصلہ ہو اسلامی قانون کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں اسلامی قانون کے مطابق محمد آصف کی بیوی شاہین پروین پر طلاق مغلظہ واقع ہو گئی۔ اور وہ اپنے شوہر کے نکاح سے نکل چکی ہے۔ اور اب ایک ساتھ رہنے کے لئے حلالہ اور اس کے بعد نکاح جدید لازم وضروری ہے۔

قرآن پاک میں ہے: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ

پھر اگر تیسری طلاق اسے دی تو اب وہ عورت اسے حلال نہ ہو گی جب تک دوسرے خاوند کے پاس نہ رہے۔

[ترجمہ کنز الایمان، سورہ بقرہ، آیت، ۲۳۰]

مفسر اعظم حضور صدر الافاضل علیہ الرحمہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

تین طلاقوں کے بعد عورت شوہر پر بحرمت مغلظہ حرام ہو جاتی ہے۔ اب نہ اس سے رجوع ہو سکتا ہے نہ دوبارہ نکاح، جب کہ حلالہ ہو۔ یعنی بعد عدت دوسرے سے نکاح کرے اور وہ بعد صحبت طلاق دے پھر عدت گزارے دوبارہ نکاح کر لیں۔

[تفسیر خزائن العرفان، سورہ بقرہ، آیت، ۲۳۰]

فتاوی نوازل میں ہے: اذا طلق الرجل امرتہ المدخول بھا ثلاثاً یقع الطلاق

یعنی جب کسی شخص نے اپنی مدخولہ بیوی کو تین طلاقیں دیدیں تو طلاق واقع ہو گئی۔ [فتاوی نوازل، کتاب الطلاق، ۱۹۷]

اب رہا شاہین پروین کے والدین کا یہ کہنا کہ ان کی لڑکی سامنے نہیں تھی یا اس نے الفاظ طلاق نہیں سنے تو از روئے شریعت لڑکی کا طلاق کے الفاظ سننا یا اس کا سامنے ہونا ضروری نہیں ہے۔ لڑکا اقرار کرتا ہے کہ اس نے طلاق دی ہے طلاق کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: "طلاق کے لئے زوجہ خواہ کسی دوسرے کا سننا ضرور نہیں جبکہ شوہر نے اپنی زبان سے الفاظ طلاق ایسی آواز سے کہے جو اس کے کان تک پہنچنے کے قابل تھے۔ [فتاوی رضویہ ۱۲/۳۶۲]

ناشزہ عورت کو طلاق دینے نہ دینے کا شوہر کو اختیار ہے

فتوی ۸۳

مسئولہ: گل محمد مظفر نگر یوپی۔۸/ ذیقعدہ ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں

گل محمد کی شادی کو ۱۱، سال ہوگئے۔ گل محمد کے تین بچے ہیں۔ گل محمد کی بیوی نے نکاح سے پہلے تین بار زنا کیا۔ ۱۱ سال میں کبھی رمضان شریف کے روزے نہیں رکھے۔ کبھی جمعہ کی نماز نہیں پڑھی۔ کبھی پنج وقتہ نماز نہیں پڑھی بہت بد دین ہے۔ گیارہ سال کی مدت میں پانچ مرتبہ گھر سے بھاگ گئی۔ گل محمد کو سب کچھ حالات معلوم ہونے کے باوجود بھی پوری نبھاؤ کی کوشش کی ہے۔ فی الوقت ۶/ اگست ۲۰۱۶ء بروز ہفتہ کو رات ساڑھے دس بجے گھر سے چلی گئی۔ آج تک اس کو گل محمد کی اور اپنے بچوں کی کوئی فکر نہیں ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں ایسی عورت کو شریعت اسلام میں کیا حکم ہے۔ اس کو رکھنا درست ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب

سوال میں درج باتیں اگر سچ ہیں تو گل محمد کی بیوی ازروئے شرع فاسقہ، فاجرہ ناشزہ ہے۔ اور ایسی عورت کے لئے شوہر کو اختیار دیا گیا ہے چاہے تو رکھے یا چھوڑ دے۔ فاسقہ وفاجرہ عورت کو طلاق دینا شوہر کے لئے واجب وضروری نہیں ہے۔

بحر الرائق میں ہے ''لا یجب علی الزوج تطلیق الفاجرۃ'' فاجرہ عورت کو طلاق دینا شوہر پر واجب نہیں ہے۔

[بحر الرائق شرح کنز الدقائق، فصل فی المحرمات، ۱۸۸/۳]

البتہ علمانے ایسی عورت کو طلاق دینا مستحب قرار دیا ہے۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''ایں جا کہ آوارگی زناں متحقق ست ہر سہ قول بر اباحت طلاق متفق آمد بلکہ چوں فسق وارتکاب چیزے از محرمات ثابت شود طلاق مستحب گردد فی الدر المختار بل یستحب لو موذیۃ او تارکۃ صلٰوۃ کذا فی الغایۃ وفی رد المحتار الظاہر ان ترک الفرائض غیر الصلوۃ کالصلوۃ اما واجب نیست اگر شوئے دادن نخواہد ندہد فی الدر المختار لایجب علی الزوج تطلیق الفاجرۃ''

مسئولہ صورت میں جب آوارگی پائی جاتی ہے تو تینوں اقوال پر طلاق کا مباح ہونا محقق ہے۔ بلکہ عورت کا فسق اور کسی حرام فعل کا ارتکاب ثابت ہے تو طلاق مستحب ہے۔ در مختار میں ہے، بلکہ عورت اگر موذی ہے یا نماز کو ترک کرنے کی عادی ہے تو مستحب ہے۔ غایہ میں اسی طرح ہے۔ اور ردالمحتار میں ہے کہ نماز کے علاوہ دیگر فرائض کا ترک بھی نماز کی طرح ہے، تاہم اس صورت میں طلاق دینا واجب نہیں ہے۔ اگر خاوند طلاق نہ دینا چاہے تو نہ دے۔ در مختار میں ہے کہ فاسقہ عورت کا طلاق دینا خاوند پر واجب نہیں ہے۔ [فتاوی رضویہ قدیم، ۵۹۹/۵]

الحاصل:۔ گل محمد کو اختیار ہے، کہ وہ اس کو رکھے یا طلاق دے کر چھٹکارہ حاصل کرے۔ لیکن اگر وہ اسی حال پر قائم رہے اور اسی طرح فسق وفجور کا ارتکاب کرتی رہے تو ایسی عورت کو طلاق دے دینا ہی بہتر ہے۔ ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

فتوی ۸۴ شوہر سے طلاق لینے پر بھی مہر اور جہیز پر بیوی کا حق ہے

مسئولہ: خورشید احمد ولد عبد الرشید فتح اللہ گنج گولر گٹی رام نگر نینی تال۔۹؍جمادی الاخری ۱۴۳۶ھ

مفتی صاحب سے گزارش ہے کہ میں نے اپنے بیٹے راشد حسین کی شادی کوثر جہاں بنت مرحوم محمد رفیع ساکن ٹھاکر دوارہ مراد آباد سے کی تھی۔ میرے بیٹے کی بیوی کوثر جہاں میرے بیٹے کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی اور اپنے میکے میں رہ رہی ہے۔ رام نگر اور ٹھاکر دوارہ کے سمجھدار لوگوں کے ذریعہ کوثر جہاں کو سمجھانے پر ایک بار میرے بیٹے کے گھر آگئی تھی۔ لیکن پھر کچھ دن بعد کوثر جہاں نے سب ذمہ دار لوگوں کے سامنے یہ کہا کہ مجھے راشد کے ساتھ نہیں رہنا ہے۔ راشد سے میرا دل نہیں ملتا مجھے راشد حسین سے آزادی چاہئے۔ جناب مجھے شریعت اسلام کی روشنی میں جواب سے نوازئے۔ کہ جب لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی اور اس سے آزادی چاہتی ہے تو ان حالات میں لڑکے کو اپنی بیوی کو مہر ادا کرنا پڑے گا یا نہیں؟ جہیز کا سامان واپس کرنا پڑے گا یا نہیں؟ جب کہ لڑکا اپنی بیوی کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ جناب مجھے شریعت اسلام کی روشنی میں مجھے فتوی دے دیں۔ تاکہ شریعت اسلام کے لحاظ سے کچھ غلط نہ ہوسکے۔

الجواب

ازروئے شرع مہر اور جہیز دونوں بیوی کا حق ہیں خواہ وہ خود الگ ہونا چاہے یا شوہر طلاق دے کر الگ کرے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: ''والمهر يتأكد بأحد معان ثلاثة: الدخول، والخلوة الصحيحة، وموت أحد الزوجين سواء كان مسمى أو مهر المثل حتى لا يسقط منه شيء بعد ذلك إلا بالإبراء من صاحب الحق''

یعنی دخول، خلوت صحیحہ اور میاں بیوی میں سے کسی ایک کی موت، ان تینوں میں سے کوئی ایک بات بھی پائے جائے تو مہر خواہ مقرر ہو یا مہر مثل لازم ہو جاتا ہے۔ اور حقدار کے بری کر دینے کے علاوہ کسی چیز سے ساقط نہیں ہوتا ہے۔

[جلد ۱ صفحہ ۳۰۳، الباب السابع في المهر]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''مہر بنفس عقد زن وشوئی واجب شود و بوطی یا خلوت صحیحہ یا موت احد الزوجین تاکد وتقرر یابد کہ بعد وقوع یکے از ینہا ہیچ وجہ پارہ ازاں بے ادا یا ابراء ساقط نہ گردد اگرچہ زن معاذ اللہ فسق و فجور در زد یا عیاذ باللہ مرتدہ شود فی الدر المختار یتاکد عند وطء او خلوۃ صحت او موت احدھما''

مہر نکاح سے لازم ہو جاتا ہے اور صحبت یا خلوت صحیحہ یا زوجین میں سے کسی کی موت ہو جانے سے مہر پکا ہو جاتا ہے کہ ان کے بعد مہر کا کوئی حصہ بغیر ادا یا بغیر بیوی کے معاف کیے ساقط نہیں ہو گا اگرچہ بیوی فاسقہ فاجرہ یا معاذ اللہ مرتدہ ہو جائے۔ در مختار میں ہے کہ صحبت یا خلوت صحیحہ یا زوجین میں سے کسی کی موت سے مہر پکا ہو جاتا ہے۔

[فتاوی رضویہ جدید، ۱۲/۱۲۶]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"وہ عورت فاسقہ ہے سخت گنہگار ہے مگر ان حرکات کے سبب مہر ساقط نہ ہو گا رکھنے نہ رکھنے کا مرد کو اختیار ہے۔"

[فتاوی رضویہ جدید، ۱۴۴/۱۲]

ردالمحتار میں ہے:

''فإن كل أحد يعلم أن الجهاز ملك المرأة وأنه إذ طلقها تأخذه كله، وإذا ماتت يورث عنها''

یعنی سبھی جانتے ہیں کہ جہیز عورت کی ملکیت ہوتا ہے، جب شوہر اس کو طلاق دے دے تو وہ سب لے لیتی ہے اور اگر وہ عورت مر جائے تو جہیز اس کے وارثوں کو ملتا ہے۔[باب النفقہ، ۲۹۹/۵]

لہٰذا مہر اور جہیز جب کہ عورت کا حق ہیں تو وہ اسے دینا لازم ہے۔ اس کی مذمومہ حرکات کے سبب بھی مہر ساقط نہیں ہو گا۔

رہا یہ معاملہ کہ مرد رکھنا چاہتا ہے لیکن وہ عورت نہیں رہنا چاہتی تو یہ شوہر کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو رکھے چاہے تو چھوڑ دے۔

لیکن جب نباہ کی کوئی صورت ہی نظر نہ آتی ہو تو پھر دائرۂ شریعت میں رہتے ہوئے جیسے بھی ممکن ہو معاملہ نمٹانے کی کوشش کی جائے۔ خواہ عورت خلع یعنی مال کے عوض طلاق لینے کی کوشش کرے۔ یا شوہر خلع کی صورت میں مہر کی معافی کا مطالبہ کرے۔

قرآن مجید میں ہے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسٰنٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـًٔا اِلَّآ اَنۡ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ

یہ طلاق دو بار تک ہے پھر بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے، یا نکوئی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔ اور تمہیں روا نہیں کہ جو کچھ عورتوں کو دیا اس میں سے کچھ واپس لو مگر جب دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ کی حدیں قائم نہ کریں گے پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں ٹھیک انہیں حدوں پر نہ رہیں گے تو ان پر کچھ گناہ نہیں اس میں جو بدلہ دے کر عورت چھٹی لے، یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

[ترجمہ قرآن کنزالایمان، پارہ ۲ سورہ بقرہ آیت ۲۲۹]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"خلع شرع میں اسے کہتے ہیں کہ شوہر برضائے خود مہر وغیرہ مال کے عوض عورت کو نکاح سے جدا کر دے"

[فتاوی رضویہ جدید، ۲۶۴/۱۳]

الحاصل: سوال میں درج باتوں کے سبب عورت کو رکھنے نہ رکھنے کا مرد کو اختیار ہے مگر جدائی کی صورت میں مہر اور جہیز بیوی کو دینا لازم ہے۔ ہاں البتہ وہ یا تو یوں ہی معاف کر دے یا پھر خلع کر لے کہ مہر کے عوض طلاق لے لے تو ازروئے شرع یہ صورت جائز ہو گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فتوی ۸۵

مشروط طلاق کا حکم

مسئولہ: انتظار حسین ولدیت چاند حسین، محلہ کٹورہ تال قاضی باغ کاشی پور۔ ۲؍ جمادی الاولی ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علماے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں
زید نے اپنی بیوی ہندہ سے بوقت تکرار کہا اگر تونے میری بات نہیں مانی یعنی اگر تو فلاں کے گھر گئی تو تجھے طلاق دے دوں گا، اس نے زید کی بات نہیں مانی اور وہ گھر چلی گئی تو کیا اس صورت میں طلاق واقع ہو جاے گی۔ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوئی کیوں کہ زید نے صرف طلاق دینے کا وعدہ کیا ہے اور صرف وعدہ کرنے سے شرعاً طلاق نہیں پڑتی فتاوی عالمگیری میں ہے:

سئل نجم الدین عن رجل قال لامرأته اذهبی الی بیت امك فقالت طلاق ده تا بروم فقال توبرو من طلاق دادم فرستم قال لاتطلق لانه وعد،

یعنی حضرت نجم الدین سے سوال کیا گیا اس آدمی کے بارے میں جس نے اپنی بیوی سے کہا اپنی ماں کے گھر چلی جا بیوی نے کہا طلاق دے تاکہ میں جاؤں تو شوہر نے کہا تو جا میں طلاق بھجوا دوں گا۔ تو حضرت نجم الدین نے فرمایا کہ طلاق واقع نہیں ہوگی اس لئے کہ وہ وعدہ ہے۔ [۱/۳۸۴ باب ایقاع الطلاق فصل الطلاق بالفاظ الفارسیة]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”وعدے سے طلاق نہیں ہوتی جواہر الاخلاطی میں ”طلاق میکنم طلاق بخلاف قوله کنم لانه یتمحض الاستقبال“ ”طلاق میکنم (یعنی طلاق کرتا ہوں) حال ہونے کی وجہ سے طلاق ہے اس کے برخلاف طلاق کنم (طلاق کروں گا) کہا تو طلاق نہ ہوگی کیوں کہ یہ محض استقبال ہے“ [فتاوی رضویہ جدید، ۱۳/۱۱۸]

حضور صدر الشریعہ فرماتے ہیں:

”دوسرا لفظ چونکہ صیغہ مستقبل ہے اس سے بھی طلاق کیوں کر واقع ہو سکتی ہے اس لفظ کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ میں طلاق دوں گا اور جب آئندہ زمانہ میں طلاق نہ دی تو طلاق نہ ہوئی۔....زید کے کلام میں یہ مستقبل بھی معلق بالشرط ہے کہ جب مہر معاف کر دے گی تو یہ طلاق دے گا مگر نہ ہندہ نے مہر معاف کیا نہ زید نے طلاق دی پھر طلاق کیوں کر ہو سکتی ہے کہ یہاں تو شرط ہی پائی نہیں گئی۔

بلکہ اگر وہ مہر معاف کرتی جب بھی طلاق دینے سے طلاق پڑتی، اس کلام سے طلاق نہیں پڑتی۔“

[فتاوی امجدیہ جلد ۲ ص ۱۸۴]

الحاصل: مذکورہ صورت میں زید کی بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوئی۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

فتوی ۸۶ — مشروط طلاق سے طلاق ہو جانے پر حکم شرعی

مسئولہ: پپو، ٹھاکر دوارہ۔ ۲/ جمادی الاولی ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں

زید نے اپنی بیوی سے جو اپنے بہن اور بہنوئی کو لے کر دہلی علاج کرانے کے لئے گئی تھی یہ کہا کہ اگر اب تو اپنے بہن بہنوئی کے ساتھ واپس آئی تو میری طرف سے تجھے طلاق ہے۔ زید کی بیوی اپنے بہن اور بہنوئی کے ساتھ ہی واپس آئی۔ اب مذکورہ صورت میں زید کی بیوی پر طلاق پڑی یا نہیں؟ اگر زید کی بیوی پر طلاق پڑ گئی ہو تو واپس زید کے نکاح میں جانے کی کیا صورت ہوگی۔ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاق واقع ہو گئی ہے۔ محیط برہانی میں ہے:

''إذا علّق طلاق امرأته بفعل.... حتّی لو فعلت ذاك الفعل مرّة وقع الطلاق''

یعنی جب طلاق کو عورت کے کسی کام سے معلق کیا...اور وہ کام اس عورت نے ایک مرتبہ بھی کیا تو طلاق پڑ جائے گی۔

[محیط برہانی جلد ۳/۳۶۴]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

وإذا أضافه إلی الشرط وقع عقیب الشرط اتفاقا مثل أن یقول لامرأته: إن دخلت الدار فأنت طالق

یعنی اور جب طلاق کو شرط کی طرف مضاف کیا تو طلاق شرط کے پیچھے واقع ہو جائے گی بالاتفاق۔"

[فتاوی عالمگیری، جلد ۱/ ۴۲۰]

مطلب یہ کہ جب طلاق کو کسی شرط پر معلق کیا تو شرط پاتے ہی طلاق واقع ہو جائے گی۔ صورت مسئولہ میں چونکہ شرط پائی گئی ہے لہٰذا ایک طلاق رجعی واقع ہو گئی۔ اگر عدت نہ گزری ہو تو زید عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے۔ اور اگر عدت گزر گئی ہے تو صرف نکاح کرنا ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۸۷ — بغیر اضافت طلاق کا حکم

مسئولہ: شاہد علی ماہی گیر محلہ بانسپھوڑان کاشی پور۔ ۳/ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۵ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں

زید نے شراب پی جب اس کے چند رشتہ داروں نے اسے سمجھایا کہ شراب مت پیا کرو تو اس نے کہا کہ میں نے طلاق دی میں نے طلاق دی میں نے طلاق دی۔ اس وقت سامنے بیوی بھی نہیں تھی اور اس نے طلاق میں بیوی کا نام بھی نہیں لیا۔ اور جب نشہ اتر گیا اور اس سے پوچھا گیا کہ کیا تم نے بیوی کو طلاق دی تو زید نے کہا مجھے طلاق کے بارے میں کچھ یاد نہیں کہ طلاق دی

بھی ہے یا نہیں۔ سبھی گواہوں کا کہنا یہی ہے کہ زید نے طلاق کس کو دی یہ پتہ نہیں۔ زید نے قسم بھی کھائی کہ مجھے طلاق کے بارے میں معلوم نہیں اور میں نے بیوی کو طلاق نہیں دی۔ کیا ایسی صورت میں زید کی بیوی پر طلاق پڑ جائے گی۔؟

ازروئے شرع جواب دیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں زید کی بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ زید نے جو الفاظ طلاق ادا کئے وہ اضافت سے خالی ہیں نیز نیت میں بھی بیوی کی طرف اضافت طلاق ثابت نہیں۔ حالانکہ بیوی پر طلاق واقع ہونے کے لئے الفاظ میں یا نیت میں بیوی کی طرف طلاق کی اضافت ضروری ہے۔ اور وہ صورت مسئولہ میں مفقود ہے لہٰذا زید کی بیوی پر طلاق نہیں پڑی۔

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”اضافت بسوئے زن نیست، اگر در دل ہم قصد اضافت نہ کردہ باشد قطعاً طلاق نیست وذٰلك لان الطلاق لاوقوع له الابالایقاع ولا ایقاع الاباحداث تعلق الطلاق بالمرأة ولایتاتی ذلك الابالاضافة ولوفی النیة“

[فتاوی رضویہ قدیم۔ کتاب الطلاق۔ جلد ۵ صفحہ ۲۰۵]

یعنی بیوی کی طرف طلاق کی اضافت نہ ہو تو اگر دل میں بھی بیوی کی طرف طلاق کی اضافت کا ارادہ نہ ہو تو قطعاً طلاق نہ ہوئی، کیوں کہ طلاق کا وقوع بغیر ایقاع (واقع کرنے کے) نہیں ہوتا اور ایقاع اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک طلاق کا تعلق بیوی سے نہ کیا جائے اور یہ اضافت کے بغیر ممکن نہیں اس لئے اضافت ضروری ہے خواہ نیت ہی میں ہو۔

مزید فرماتے ہیں:

”الاضافة لابد منها امر فی اللفظ واما فی النیة“ یعنی بیوی کو طلاق دینے میں اضافت ضروری ہے لفظوں میں ہو خواہ نیت میں ہو۔ [مرجع سابق صفحہ ۲۰۷]

الحاصل: زید کی بیوی پر ازروئے شرع طلاق واقع نہیں ہوئی۔ زید کی بیوی بدستور زید کے نکاح میں ہے۔

فتوی ۸۸ — بے اضافت طلاق کا حکم

مسئولہ: حافظ غلام حسین موضع مصروالا کاشی پور: ۳۰؍ شعبان ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں مفتیان دین مسئلہ ذیل میں کہ

زید اور زید کی بیوی کے درمیان جھگڑا ہو رہا تھا اسی درمیان زید کے سالے آگئے اور زید کو سمجھانے لئے اسی وقت زید نے غصہ کی حالت میں کہا نکل جا میرے گھر سے طلاق طلاق طلاق اس طرح کئی بار طلاق کے الفاظ استعمال کئے۔ زید کا کہنا ہے کہ میں نے اپنی بیوی سے یہ الفاظ نہیں کہے بلکہ اپنے سالے سے کہے تھے اور سالے کا کہنا بھی یہی ہے کہ یہ الفاظ مجھ سے ہی کہے تھے۔ بیوی تو دور تھیں اور اس وقت بیوی سے لڑائی نہیں ہو رہی تھی بلکہ مجھ سے بات چل رہی تھی۔ ایسی صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے جواب عنایت فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب

سالا محل طلاق نہیں ہے۔ قرینہ تو یہی بتارہا ہے کہ طلاق بیوی کو ہی دی گئی ہوگی۔ البتہ زید نے جب بے اضافت طلاق دی ہے تو قرائن کے باوجود بھی شرعاً زید کی بات حلف شرعی کے ساتھ مانی جائے گی۔ مطلب یہ کہ اگر زید قسم کھالے کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی۔ نیت میں بیوی کو طلاق دینا نہیں تھا بس یوں ہی بے اضافت لفظ ونیت طلاق کے الفاظ استعمال کئے ہیں یا سالے کے لئے بولے ہیں اور بیوی کے لئے نہیں تو زید کی بیوی پر قضاءً طلاق واقع نہیں ہوگی۔ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”حکم ہر دو گونہ است حکم دیانت وحکم قضاء، دیانت آنکہ فیما بین العبد وربہ باشد ایں جا دیگراں را دخل نیست او داند وخدائے او، دریں سخن اضافت بسوئے زن نیست، اگر دردل ہم قصد اضافت نہ کردہ باشد قطعاً طلاق نیست۔

وذٰلك لان الطلاق لاوقوع له الابالایقاع ولا ایقاع الاباحداث تعلق الطلاق بالمرأة ولایتاتی ذلك الابالاضافة ولوفی النية، فاذا خلیاعنه لم یکن احداث تعلق اذلا تعلق الا بمتعلق فلم یکن ایقاعا فلم یورث وقوعا۔

حکم دو۲ طرح ہوتا ہے ایک دیانۃً اور دوسرا قضاءً۔ دیانۃً حکم کا معنیٰ یہ ہے کہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان معاملہ ہے یہاں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں، بندہ جانے اور اس کا خدا جانے۔ اور مسئولہ صورت میں بیوی کی طرف طلاق کی اضافت کا قصد نہ کیا ہو تو قطعاً طلاق نہ ہوئی، کیوں کہ طلاق کا وقوع بغیر واقع کرنے (ایقاع) کے نہیں ہوتا اور ایقاع اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک طلاق کا تعلق بیوی سے نہ کیا جائے اور یہ اضافت کے بغیر ممکن نہیں اس لئے اضافت ضروری ہے خواہ نیت میں ہو، تو طلاق جب اضافت لفظی یا قلبی سے خالی ہو تو طلاق کا تعلق پیدا نہ ہوگا کیوں کہ تعلق بغیر متعلق نہیں ہوسکتا، اس لئے ایقاع نہ ہوگا، تو وقوع بھی نہ ہوگا۔“

مزید فرماتے ہیں:

قضاءً نیز حکم بوقوع طلاق را از تحقق اضافت باگزیر ست، کمافی کتب المذھب لایحصی عددھا ولاینقطع مددھا ومن فقیر در تعلیقات خودم بر ردالمحتار بعد تحقیق آں کہ اضافت در لفظ ہر چند گونہ است تحقیق آں کہ اضافت در لفظ ہر چند گونہ است تحقیق نمودہ ام کہ چوں لفظ از ہمہ وجوہ اضافت تہی باشد آنگاہ بنگرند اگر ایں جا قرینہ باشد کہ باوراجح تر ارادہ اضافت ست قضاءً حکم بطلاق کنند نظر الی الظاہر واللہ یتولی السرائر اگر شوہر بہ قسم انکار ارادہ آں را کند پس اورامصدق دارند وزن رامطلقہ نانگارند لکنونه امینا فی الاخبار عن نفسه وقداتی بما یحتمله کلامه در ہندیہ از فتاوٰی می آرد رجل قال لامرأتہا گر توزن منی سہ ۳ طلاق مع حدف الیاء لایقع اذا قال لم انو الطلاق لانہ لماحذف فلم یکن مضیفا الیھا۔

قضاءً بھی طلاق کو واقع کرنے کے حکم کے لئے اضافت کا تحقق ضروری ہے.... اگر لفظ ہر طرح اضافت سے خالی ہوں تو وہاں دیکھا جائے گا کہ یہاں کوئی ایسا قرینہ موجود ہے جس سے اضافت کا ارادہ راجح طور پر معلوم ہوتا ہو تو قضاءً ظاہر قرینہ کی بناء پر طلاق کا حکم کر دیا جائے گا، باطنی امور اللہ تعالیٰ کے سپرد ہیں۔ ارادے کا انکار کرتا ہو تو اس کی بات مان لی جائے گی اور اس کی

بیوی مطلقہ نہ ہوگی، کیوں کہ وہ اپنے بارے میں خبر دینے میں امین متصور ہوگا جبکہ وہ بات بھی ایسی ہی کہتا ہے جس کا کلام میں احتمال موجود ہے۔" اور فرماتے ہیں:

والذی تحصل للعبد الضعیف بتوفیق المولی اللطیف جل وعلا، ان الاضافة لابد منها امر فی اللفظ واما فی النیة اذ لا طلاق الا بالایقاع الاباحداث تعلق الطلاق بالمرأة، ولیس ذٰلك الا بالاضافة وهذا ضروری لاشك فیه اذ لولاہ لزم الطلاق علی کل من تلفظ بلفظ طلاق او طالق ونحوهما وان لم یرد علی هذا شیئا اولم یرد طلاق امرأته وهو باطل قطعًا فاشتراط الاضافة حق لامریة فیه، نعم قد توجد الاضافة فی اللفظ فلایحتاج فی الحکم الی النیة وقد لاتوجد فی اللفظ فیحتاج الی ظهور النیة۔

اور عبد ضعیف کو اللہ تعالیٰ لطف فرمانے والے جلّ وعلا کی توفیق سے جو حاصل ہوا ہے وہ یہ ہے کہ بیوی کو طلاق دینے میں اضافت ضروری ہے لفظوں میں ہو خواہ وُہ نیت میں ہو، کیونکہ طلاق کا وقوع، ایقاع پر موقوف ہے۔ اور ایقاع کا وجود نہیں ہوتا تاوقتیکہ طلاق کو عورت سے متعلق نہ کیا جائے، اور یہ چیز ہے جس میں شک نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر طلاق کو عورت کی طرف منسوب کرنا اور اس کی طرف اضافت کرنا ضروری نہ ہو تو پھر طلاق یا طالق کا تلفظ کرنے والے ہر شخص کی بیوی کو طلاق لازم ہو جائے اگرچہ وُہ اس پر کسی چیز کا ارادہ نہ کرے یا اپنی بیوی کو طلاق دینے کا لہٰذا طلاق کے وقوع کے لئے نسبت اور اضافت کے شرط ہونے میں کوئی شک نہیں، ہاں اضافت کبھی لفظوں میں موجود ہوتی ہے تو اس وقت حکم کے لئے نیت کی ضرورت نہیں ہوتی اور کبھی لفظوں میں اضافت نہیں ہوتی اس وقت نیت کو ظاہر کی حاجت ہوتی ہے۔"

مزید فرماتے ہیں:

"طلاق بے اضافت میں جبکہ ایقاع مفاد ہو اُس کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہے، اگر بحلف کہہ دے گا کہ زوجہ کو طلاق مقصود نہ تھی مان لیں گے، یہی مفادِ قاضی خاں ہے اور یہی شامی نے تحقیق کیا، ان میں تخالف نہیں،"

[فتاوی رضویہ جدید: جلد ۱۲، ص ۳۳۶۔۳۳۷۔۳۳۸۔۳۴۴۔۳۵۸]

الحاصل: صورت مسئولہ میں اگر زید بیوی کی طرف اضافت کا منکر ہے تو اس کی بات قسم لے کر مان لی جائے گی۔ اور طلاق کا حکم نہیں ہوگا۔ اب اگر زید جھوٹ بولے گا تو وبال اس کے سر ہوگا۔ دوسرا کوئی اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

هٰذا ما عندی والعلم عند الله تعالیٰ

فتوی ۸۹ — معتدہ وفات کی عدت کا حکم

مسئولہ: محمد شاہد حسین محلہ علی خاں کاشی پور۔ ۲۵ربیع النور ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں

میرے ساڑھو ناصر خاں عرب شریف میں کام کرتے ہیں وہ وہاں سے ۱۴ر اگست کو اپنے گھر لوٹ کر آئے۔ اور ۲۵ر اگست کو ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ ناصر خاں کے انتقال کے کچھ دنوں کے بعد دوران عدت ان کی بیوی کو حمل ظاہر ہوا تو اب وہ کون سی عدت گزاریں چار مہینے دس دن یا وضع حمل؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں ناصر مرحوم کی بیوی چار ماہ دس دن کی عدت پوری کرے گی۔ وضع حمل کی نہیں۔
قرآن پاک میں ہے:
وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا
اور تم میں جو مریں اور بیبیاں چھوڑیں وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں"[

ترجمہ قرآن کنز الایمان، پارہ ۲ آیت ۲۳۴ سورہ بقرہ]

محیط برہانی میں ہے:

''قد ذكرنا أن المطلقة إذا حبلت بعد الطلاق، فعدتها أن تضع حملها، فأما المتوفى عنها زوجها فعدتها الشهور إذا حبلت''
ہم نے ذکر کیا کہ مطلقہ جب طلاق کے بعد حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہے لیکن وفاتِ شوہر کی عدت مہینوں کے اعتبار سے ہے جب کہ وہ حاملہ ہو (یعنی شوہر کی موت کے بعد حاملہ ہو)"[محیط برہانی، جلد ۳ ص ۴۶۵]
بدائع الصنائع میں ہے:

''ولو حبلت المعتدة في عدتها ذكر الكرخي أن من حبلت في عدتها فالعدة أن تضع حملها ولم يفصل بين المعتدة عن طلاق أو وفاة وقد فصل محمد بينهما فإنه قال فيمن مات عن امرأته وهو صغير أو كبير ثم حبلت بعد موته فعدتها الشهور، فهذا نص على أن عدة المتوفى عنها زوجها لا تنتقل بوجود الحمل من الأشهر إلى وضع الحمل، والصحيح ما ذكره محمد أن عدة المتوفى عنها زوجها لا تتغير بوجود الحمل بعد الوفاة ولا تنتقل من الأشهر إلى وضع الحمل بخلاف عدة الطلاق.''
اگر معتدہ دوران عدت حاملہ ہوئی تو کرخی نے ذکر کیا کہ وہ دورانِ عدت حاملہ ہوئی تو عدت وضع حمل ہے۔ اور طلاق کی معتدہ یا وفات کی معتدہ کے درمیان کوئی فرق بیان نہیں کیا۔ البتہ امام محمد نے دونوں کے درمیان فرق کرتے ہوئے کہا کہ جس کا شوہر چھوٹا ہو یا بڑا انتقال کر گیا اس کی موت کے بعد بیوی حاملہ ہوئی تو اس کی عدت مہینوں سے ہے۔ یہ نص ہے اس بات پر کہ جس عورت کا شوہر وفات پا گیا اس کی عدت حمل کے پائے جانے کے سبب مہینوں سے وضع حمل کی طرف منتقل نہیں ہوگی۔ اور صحیح وہ ہے جو امام محمد نے ذکر کیا کہ معتدۂ وفات کی عدت وفات کے بعد حمل پائے جانے سے نہیں بدلے گی۔ اور مہینوں سے وضع حمل کی طرف منتقل نہیں ہوگی برخلاف طلاق کی عدت کے۔"

[بدائع الصنائع، جلد ۳ ص ۲۰۱]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''لو حدث الحمل في العدة بعد الموت ذكر الكرخي أنه يتعلق بانقضاء العدة والصحيح أنه لا يتعلق''
اگر موت کے بعد عدت میں حمل ظاہر ہوا تو کرخی نے ذکر کیا کہ عدت کی تکمیل حمل سے ہوگی۔ البتہ صحیح یہ ہے کہ حمل سے

عدت پوری نہیں ہوگی۔"[فتاوی عالمگیری، جلد ا ص ۵۲۸]

فتاوی رضویہ میں ہے:

"حمل جو اثنائے عدت وفات میں حادث ہو اس سے عدت موت کہ چار مہینے دس دن ہے نہیں بدلتی،

ردالمحتار میں ہے: فی النهران المعتدة لوحملت فی عدتها ذکر الکرخی ان عدتها وضع الحمل ولم یفصل و الذی ذکره محمد ان هذا فی عدة الطلاق اما فی عدة الوفاة فلا تتغیر بالحمل وهو الصحیح کذا فی البدائع"

(نہر میں ہے کہ اگر عدت کے دوران معتدہ کو حمل ہو جائے تو کرخی نے کہا کہ اس کی عدت وضع حمل یعنی بچے کی پیدائش تک ہوگی، اس کی تفصیل بیان نہ کی کہ کون سی عدت میں یہ حکم ہے، اور امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو ذکر فرمایا وہ یہ ہے کہ مذکورہ حکم طلاق کی عدت کا ہے لیکن عدت وفات ہو تو اس کا حکم تبدیل نہیں ہوگا، یہی صحیح ہے جسا کہ بدائع میں ہے)

[فتاوی رضویہ جدید: جلد ۵ ص ۲۸۹]

بہار شریعت میں ہے:

"موت کے بعد اگر حمل قرار پایا تو عدت وضع حمل سے نہ ہوگی بلکہ دنوں سے"[بہارشریعت، جلد ۱۱ ص ۲۳۱]

الحاصل: صورت مسئولہ سے ظاہر ہے کہ شوہر کی زندگی میں حمل ظاہر نہیں ہوا ہوگا بلکہ شوہر کی موت کے بعد ظاہر ہوا لہٰذا ایسی صورت میں از روئے شرع چارہ ماہ دس دن کی عدت لازمی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۹۰ غیر مدخولہ مطلقہ پر عدت نہیں

مسئولہ: محمد سلیم احمد سیفی ٹانڈہ ملورام نگر نینی تال اتراکھنڈ۔ ۱۹/ جمادی الاخری ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین

محشر جہاں کے شوہر کا انتقال ہوگیا، کچھ دنوں کے بعد نور حسن کے ساتھ محشر جہاں کا نکاح ہوگیا رات کو محشر جہاں اپنے پہلے شوہر کے دو بچوں کے ساتھ جن میں ایک بارہ اور دوسرا چودہ سال کا تھا ان کے ساتھ اپنے کمرے میں سوئی اور نور حسن کمرے کے باہر سوگیا۔ رات بھر دونوں میں کوئی جسمانی تعلق نہیں ہوا۔ صبح کو اٹھ کر کسی بات پر نور حسن نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی کہا میں نے تجھے طلاق دی دی دی۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس صورت میں محشر جہاں پر کونسی طلاق واقع ہوئی۔ اور اس میں عدت حلالہ وغیرہ کی ضرورت تو نہیں ہے کیا بغیر عدت وحلالہ کے نکاح پڑھایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں محشر جہاں پر طلاق بائن واقع ہوئی ہے وہ اگر نور حسن کے ساتھ رہنا چاہتی ہے تو نکاح کافی ہوگا۔ عدت وحلالہ کی ضرورت نہیں ہے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

"اذا طلق الرجل امرأته ثلاثا قبل الدخول بها وقعن علیها فان فرق الطلاق بانت بالاولی ولم تقع الثانیة والثالثة"

یعنی جب مرد اپنی عورت کو دخول سے پہلے تین طلاق دے تو تینوں اس پر پڑ جائیں گی۔ البتہ متفرق طلاق دینے کی صورت میں پہلی طلاق ہی سے عورت بائنہ ہو جائے گی اور دوسری اور تیسری طلاق لغو قرار دی جائے گی۔

[فتاوی عالمگیری، ۱/۳۷۳، الفصل الرابع فی الطلاق قبل الدخول]

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"اگر اب تک شوہر سے خلوت نہ ہوئی تھی تو اصلاً عدت نہیں اسی وقت اس کا نکاح کیا جاسکتا ہے"

[فتاوی رضویہ جدید: ج۱۳ص۲۹۱]

الحاصل:۔ محشر جہاں مطلقہ بائنہ ہے وہ جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے خواہ نور حسن سے یا کسی اور سے عدت وحلالہ نہیں ہو گا۔

فتوی ۹۱ مطلقہ عورت کا مہر اور عدت تک نفقہ لازم ہے

مسئولہ: ننھے حسن بیل جوڑی کاشی پور۔ ۲۹/ محرم الحرام ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسائل میں

میں نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی ہیں۔ اب وہ مجھ سے مہر اور گھر، نان نفقہ وغیرہ مانگ رہی ہے۔ کیا میری بیوی کا یہ مطالبہ درست ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔ اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں اگر مہر ادا نہیں کیا گیا ہے تو آپ کی بیوی کا مہر مانگنا جائز ہے۔ اور آپ پر لازم ہے کہ اس کا مہر ادا کریں اور اگر بیوی عدت میں ہو اور عدت آپ کے گھر پر کر رہی ہو تو اس کا نان نفقہ بھی آپ پر لازم ہے۔ اس کے علاوہ گھر وغیرہ یا بعد عدت نان نفقہ یہ سب آپ پر لازم نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا:

انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول للمطلقة الثلاث النفقة والسکنٰی ما دامت فی العدة،

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جسے تین طلاقیں ہو چکی ہوں جب تک وہ عدت میں ہے اس کے لئے نفقہ اور سکنٰی ہے، یعنی کھانے پینے پہنے اور رہنے کا انتظام شوہر کے ذمہ ہے۔"

[عمدة القاری کتاب العدة ۱۴/۳۴۴، نصب الرایہ کتاب الطلاق، ۳/۲۷۳]

مبسوط سرخسی میں ہے:

"ولکل مطلقة بثلاث اوواحدة السکنی والنفقة ما دامت فی العدة۔"

ہر مطلقہ کے لئے جو مطلقہ تین طلاق سے ہو یا ایک سے سکنیٰ اور نفقہ ہے جب تک وہ عدت میں ہے۔"

[۵/۲۰۱، باب النفقة فی الطلاق]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"مہر بنفس عقد زن وشوئی واجب شود وبوطی یا خلوت صحیحہ یا موت احد الزوجین تاکد وتقرر یابد کہ بعد وقوع یکے ازینہا بہیچ وجہ

پارہ ازاں بے ادایاابراء ساقط نہ گردد اگرچہ زن معاذاللہ فسق و فجور در زد یاعیاذ باللہ مرتدہ شود فی الدر المختار یتاکد عندوطء اوخلوۃ صحت اوموت احدھما"

یعنی مہر نکاح سے لازم ہو جاتا ہے اور صحبت یاخلوت صحیحہ یازوجین میں سے کسی کی موت ہو جانے سے مہر پکا ہو جاتا ہے کہ ان کے بعد مہر کا کوئی حصہ بغیر ادایابغیر بیوی کے معاف کیے ساقط نہیں ہو گا اگرچہ بیوی فاسقہ فاجرہ یامعاذاللہ مرتدہ ہو جائے۔ در مختار میں ہے کہ صحبت یاخلوت صحیحہ یازوجین میں سے کسی کی موت سے مہر پکا ہو جاتا ہے۔

"[فتاوی رضویہ جدید، ۱۲/۱۲۶]

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"مہر ونفقہ ایام عدت کے سوا اور کوئی حق واجب شرعاً نہیں۔"[فتاوی رضویہ جدید، ۱۳/۴۷۵]

مزید فرماتے ہیں:

"مطلقہ کا نفقہ عدت تک ہے بعد عدت کوئی علاقہ باقی نہیں جس کے سبب نفقہ لازم ہو"[فتاوی رضویہ جدید، ۱۳/۴۱۵]

شریعت میں نفقہ وغیرہ موت اور طلاق سے ساقط ہو جاتا ہے۔

العقود الدریہ میں ہے: ''وبموت احدهما وطلاقها يسقط المفروض'' نفقہ موت اور طلاق سے ساقط ہو جاتا ہے۔"

[العقود الدریۃ فی تنقیح الفتاوی باب النفقۃ، ۱/۴۸۸]

لہٰذا بعد عدت بیوی نان نفقہ کا مطالبہ نہیں کر سکتی ہے ازروئے شرع۔ اوراس کا سبب یہ ہے کہ نفقہ عدت تک واجب ہے عدت ختم نفقہ ختم۔ فتاوی شامی میں ہے:

النفقة تابع للعدة'' یعنی نفقہ عدت کے تابع ہے۔"[کتاب الطلاق باب النفقۃ، ۵/۳۳۳]

محیط برہانی میں ہے:

''لانفقة لها بعد مُضى مدة العدة'' یعنی عدت گزر جانے کے بعد عورت کے لئے نفقہ نہیں ہے۔

[الفصل فی نفقۃ المطلقات، ۴/۲۳۸]

دراصل نفقہ پابندی کا بدلہ ہے عدت کے بعد پابندی نہیں رہتی اسی لئے نفقہ بھی نہیں ہے۔

فتاوی شامی ہے:

''نفقة الزوجة جزاء الاحتباس'' یعنی بیوی کا نفقہ پابندی کا بدلہ ہے۔[باب النفقۃ، ۵/۳۶۶]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"مطلقہ کا نفقہ عدت تک ہے بعد عدت کوئی علاقہ باقی نہیں جس کے سبب نفقہ لازم ہو"[فتاوی رضویہ جدید، ۱۳/۴۱۵]

الحاصل: بیوی کا مہر اگر ادا نہیں کیا ہے تو وہ ادا کرنا لازم ہے۔ البتہ ایام عدت کے گزر جانے کے بعد بیوی کا خرچ، رہنے کا گھر وغیرہ یہ سب کچھ شرعاً لازم نہیں ہے۔ اگر حسن سلوک کے طور یہ سب کچھ کریں تو آپ کو اجازت ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۹۲ بیٹے کی بیوی کو بشہوت چھونے کا حکم

مسئولہ:(حافظ و قاری) محمد رفیق رضوی شیری خطیب وامام جامع مسجد کاشی پور۔۲۸؍شوال المکرم ۱۴۳۵ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ زید نے اپنے بیٹے کی بیوی ہندہ کا ہاتھ شہوت کی نیت سے پکڑا اور جسم سے جسم بھی مس کیا۔ شہوت کی خواہش کا اظہار کیا تو کیا ایسی حالت میں ہندہ اپنے شوہر پر حلال ہے یا حرام ہو گئی؟

اگر حرام ہو گئی تو کیا اپنے شوہر کے طلاق دئے بغیر کسی دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟

کیوں کہ ہندہ کو اسی حالت میں کئی سال کا عرصہ گزر گیا ہے مگر ہندہ کا شوہر کسی حالت میں بھی ہندہ کو چھوڑنے اور طلاق دینے پر راضی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہندہ کیا کرے؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں نوازش و کرم ہو گا۔

الجواب

صورت مسئولہ میں اگر زید نے اپنے بیٹے کی بیوی کے جسم کے کسی بھی حصہ کو شہوت کی نیت سے اس طرح چھوا کہ دونوں کے اعضاء کے درمیان کوئی کپڑا حائل نہ تھا یا کپڑا حائل تھا مگر وہ اس قدر باریک تھا کہ عورت کے بدن کی گرمی زید کو محسوس ہو رہی تھی تب تو از روئے شرع حرمت ثابت ہو جائے گی۔ اور عورت اپنے شوہر پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائے گی۔ اور اگر جسم کو مس کرنے میں یہ دونوں باتیں نہ پائی گئیں تو پھر صرف چھونے سے حرمت ثابت نہیں ہو گی۔

حضور اعلیٰ حضرت در مختار کے حوالے سے فرماتے ہیں:

”اسی طرح یہ بھی ضرور ہے کہ مس برہنہ جسم پر ہو یا کسی ایسے باریک کپڑے پر سے کہ عورت کے جسم کی حرارت اس کے ہاتھ کو پہنچنے سے مانع نہ ہو، جیسے اس زمانے میں جالی یا تنزیب کی کرتیاں، ورنہ اگر ایسا سنگین کپڑا حائل تھا کہ جسم زن کی گرمی ہاتھ کو محسوس نہ ہونے دے تو حرمت نہیں اگرچہ مس بہزار شہوت واقع ہوا ہو۔

فی الدر المختار واصل ممسوسة بشهوة ولو بشعر على الراس بحائل لايمنع الحرارة فی ردالمحتار فلو كان مانعا لاتثبت الحرمة'' در مختار میں ہے کہ شہوت کے ساتھ مس شدہ عورت خواہ یہ مس عورت کے سر کے بالوں کا کسی ایسے پردہ اور کپڑے کے حائل ہونے کے باوجود ہو جو بدن کی حرارت پہنچنے کے لیے مانع نہ ہو، تو بھی اس عورت کے اصول حرام ہو جائیں گے، ردالمحتار میں ہے کہ اگر وہ کپڑا بدن کی حرارت کے لیے مانع ہو تو حرمت ثابت نہ ہو گی، اکثر کتب میں ایسا ہی ہے۔

[فتاوی رضویہ جدید ۱۱/ ۳۲۰]

اور اگر زید نے اپنے بیٹے کی بیوی کی فرج داخل کی طرف شہوت سے دیکھا تو اس سے بھی حرمت ثابت ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ کسی اور عضو کی طرف بشہوت نظر کرنے سے حرمت ثابت نہ ہو گی۔ حضور صدر الشریعہ ہدایہ اور فتاوی عالمگیری کے حوالے سے فرماتے ہیں:

نظر بشہوت سے حرمت مصاہرت اس وقت ہوتی ہے جب کہ نظر فرج داخل کی طرف ہو اس کے منھ اور کسی اور عضو کی طرف حتی کہ فرج خارج کی طرف بھی نظر سے حرمت نہ ہو گی۔ ہدایہ میں ہے، والمعتبر النظر الى الفرج الداخل،

اگر پہلی قسم کا دیکھنا پایا گیا یا اسے شہوت کے ساتھ چھوا تو عورت ہمیشہ کو حرام ہو گئی اب پھر نکاح بھی نہیں ہو سکتی عالمگیری میں ہے، کماتثبت هذه الحرمة بالوطی تثبت باللمس والتقبیل والنظرالی الفرج بشهوة'' [فتاوی امجدیہ ۲/۷۱]

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر چھونا اور دیکھنا ذکر کردہ صورتوں کے مطابق ہے تو زید کی بیوی ہمیشہ کے لئے زید پر حرام ہو گئی۔ اس پر لازم ہے کہ فوراً اس سے متارکہ کرے یعنی اس سے کہے میں نے تجھے چھوڑا۔ اور اس سے بالکل علیحدہ ہو جائے اس کے بعد زید کی بیوی عدت گزار کر زید کے علاوہ کسی اور سے نکاح کرنا چاہے تو ازروئے شرع اسے اجازت ہے۔ مگر زید سے کسی بھی صورت ملاپ ممکن نہیں ہے۔ حضور اعلیٰ حضرت ایسے ہی ایک مسئلہ پر فیصلہ فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں''

اس وقت حکم صرف اس قدر ہوگا کہ ہندہ بکر پر حرام ابدی ہو گئی، بکر پر فرض کہ اسے چھوڑ دے اگر نہ چھوڑے گا سخت گناہ گار ہوگا اور ہندہ کے حق میں بھی گرفتار ہوگا۔

قال الله تعالی: فامساك بمعروف او تسریح باحسان، واذقد فاته الامساك بالمعروف لزمه التسریح باحسان۔
بھلائی سے پاس رکھو یا اچھے انداز میں اس کو آزاد کر دو،)القرآن) اس صورت میں پاس رکھنا ممکن نہیں رہا۔ لہٰذا اس کو چاہئے کہ چھوڑ دے۔'' [فتاوی رضویہ جدید ۱۱/۳۲۱]

فتوی ۹۳ بہنوئی سے حلالہ جائز نہیں

مسئولہ: محمد اسلام ولد جناب حاجی ضمیر احمد محلہ علی خاں کاشی پور۔ ۲۸/ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ

محترم حضرت جناب مفتی صاحب عرض یہ ہے ایک عورت کو شوہر نے طلاق دے دی اور اب وہ دوبارہ شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہے جس کے لئے حلالہ کی ضرورت ہے تو کیا اس عورت کا نکاح حلالہ کی نیت سے اس کے سگے بہنوئی سے کرایا جا سکتا ہے؟

اور اگر نکاح کرا دیا تو اس عورت کا حلالہ ہو جائے گا یا نہیں؟ اور اس کی بہن کے نکاح پر تو کچھ اثر نہیں پڑے گا؟ اس سلسلے میں جو بھی شریعت کا حکم ہو بیان فرمائیں۔

الجواب

ازروئے شرع دو بہنیں ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام قطعی ہے۔ قرآن مقدس میں ہے:
وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ اور دو بہنیں اکٹھی کرنا (تم پر حرام ہے)

[ترجمہ قرآن کنز الایمان، پارہ ۴، سورہ نساء آیت ۲۳]

امام بخاری نے بخاری شریف میں اس آیت کریمہ کو باب بنا کر اس کے تحت حدیث روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت ام حبیبہ نے خواہش ظاہر کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بہن عزہ سے نکاح کر لیں سرکار نے فرمایا'' ذلك لایحل لی'' (یہ میرے لئے حلال نہیں) [بخاری شریف]

فقہ حنفی کی معتبر کتاب مبسوط سرخسی میں اس آیت کریمہ کے تحت ہے:

''معناہ حرم علیکم اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْن''، یعنی تمہارے اوپر دو بہنوں کو جمع کرنا حرام ہے۔

[مبسوط سرخسی، ۲۰۱/۴]

حضور اعلیٰ حضرت فتاوی رضویہ میں فرماتے ہیں:

''زوجہ جب تک زوجیت یا عدت میں ہے اس کی بہن سے نکاح حرام قطعی ہے'' [فتاوی رضویہ قدیم، ۵۱۹/۵]

اور اگر معاذاللہ حلالہ کی نیت سے بہنوئی سے نکاح کرادیا تو یہ جرم عظیم تو ہے ہی مگر اس سے حلالہ بھی نہیں ہوگا اس لئے کہ حلالہ کے لئے نکاح کا صحیح ہونا ضروری ہے اور بہنوئی سے نکاح صحیح نہیں بلکہ فاسد ہے لہٰذا نکاح نہیں ہوا۔ اعلیٰ حضرت درمختار کے حوالے سے فرماتے ہیں ''درمختار میں ہے:

لاینکح مطلقۃ بالثلاث حتی یطأھا غیرہ بنکاح نافذ خرج الفاسد والموقوف''، یعنی تین طلاقوں سے مطلقہ عورت سے دوبارہ اس وقت تک نکاح نہیں ہو سکتا جب تک دوسرا خاوند صحیح اور نافذ نکاح کے ساتھ اس عورت سے جماع نہ کرلے، صحیح اور نافذ نکاح کی قید سے نکاح فاسد اور نکاح موقوف خارج ہو گیا۔ [فتاوی رضویہ جدید، ۴۲۳/۱۲]

البتہ سالی کے ساتھ بہنوئی کا نکاح کرلینا بلکہ اس سے صحبت بھی کرلینا بیوی کے نکاح میں کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ ہاں لیکن سالی سے نکاح کرکے اس سے اگر صحبت کرلی ہے تو پھر جب تک سالی کو چھوڑ نہ دے اور اس کی عدت نہ گزر جائے تب تک کے لئے بیوی سے صحبت حرام ہو جاتی ہے۔ اور سالی کی عدت ہوتے ہی وہ پھر حلال ہو جاتی ہے اور اس میں دوبارہ نکاح کی بھی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''بموجودی زوجہ سالی سے نکاح حرام ہے۔ اور اس پر فرض ہے کہ اسے ہاتھ نہ لگائے اور فوراً چھوڑ دے اور زنا تو ہر حال حرام ہی ہے مگر سالی سے نکاح یا زنا کرنے سے زوجہ مطلقہ نہیں ہوتی، اور پھر آگے ردالمحتار کے حوالے سے فرماتے ہیں

''فی ردالمحتار فی مسئلۃ نکاح المرأۃ علی اختھا الثانی باطل ولہ وطی الاولی الاان یطأ الثانیۃ فتحرم الاولی الی انقضاء عدۃ الثانیۃ''

یعنی ردالمحتار میں بہن کی موجودگی میں سالی سے نکاح کے مسئلہ میں فرمایا کہ دوسرا نکاح باطل ہے۔ اور جب تک دوسری سے وطی نہ کی ہو پہلی سے جماع جائز ہے۔ اگر دوسری سے وطی کرلی ہو تو پہلی سے جماع اس وقت تک حرام ہے جب تک دوسری کی عدت نہ گزر جائے۔ [فتاوی رضویہ جدید ۳۱۸/۱۱]

الحاصل: صورت مسئولہ میں بہنوئی کے ساتھ نکاح کرنے سے حلالہ کا حکم ختم نہیں ہوا۔ اگر وہ عورت اپنے پہلے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہے تو اسے کسی ایسے مرد سے جس سے نکاح جائز و صحیح ہو نکاح کرنا اور بعد صحبت اس شوہر سے طلاق حاصل کرکے عدت گزارنا لازم وضروری ہے۔ اور اس حرام کاری کے سبب اس عورت پر اور اس کے بہنوئی پر اور جن لوگوں نے اس حرام کاری میں تعاون کیا ان سب پر توبہ واستغفار لازم وضروری ہے۔ اور اس عورت کا بہنوئی جب تک سالی کو نہ چھوڑے اور اس کی عدت پوری نہ ہو جائے تب تک اپنی بیوی سے دور رہے قربت نہ کرے ورنہ شرعی جرم کا مرتکب ہوگا۔

فتوی ۹۴

سوتیلی خالہ کے ساتھ بھانجے کا نکاح جائز نہیں

مسئولہ: محمد ثاقب قادری لاہور پاکستان۔ ۲/ جمادی الاولی ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں

زید کی دو بیویاں ہیں دونوں بیویوں سے ایک ایک بیٹی ہے۔ ایک بیٹی کے ایک لڑکا ہے تو کیا زید اپنی بیٹی کا نکاح دوسری بیٹی کے لڑکے سے کر سکتا ہے؟ یعنی کیا اپنے نواسہ کا نکاح اپنی بیٹی کے ساتھ کر سکتا ہے، شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

یہ نکاح ازروئے شرع جائز نہیں۔ زید کا نواسہ اور اس کی بیٹی آپس میں سوتیلے خالہ بھانجہ ہوئے۔ اور شریعت میں سوتیلی خالہ سے نکاح حرام ہے۔ قرآن مقدس میں ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ

(حرام ہوئیں تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں)

[ترجمہ کنز الایمان، پارہ ۴، سورہ نساء، آیت ۲۳]

اس آیت کے تحت صدر الافاضل فرماتے ہیں:

"یہ سب سگی ہوں یا سوتیلی" [تفسیر خزائن العرفان، پارہ ۴، سورہ نساء، آیت ۲۳]

تفسیر روح البیان میں اس کی تفسیر میں ہے:

"وکذا الخالات تعم أخوات الأمهات والجدات سواء کن من قبل الأب والام او من قبل أحدهما"

اور ایسے ہی خالات عام ہیں ماں اور نانیوں کی بہنوں کو برابر ہے ماں باپ کی طرف سے ہوں یا ان میں سے کسی ایک کی طرف سے۔

[تفسیر روح البیان، پارہ ۴، سورہ نساء، آیت ۲۳]

مبسوط سرخسی میں ہے

"الخالات تثبت حرمتهن بقوله تعالی (وخالاتکم) ویدخل فی ذلك أخوات الأم لأب وأم أو لأب أو لأم"

یعنی خالاؤں کی حرمت اللہ پاک کے فرمان "وخالاتکم" سے ثابت ہے۔ اور ماں کی بہنیں ایک ماں باپ سے ہوں یا ایک باپ سے یا ایک ماں سے خالاؤں میں داخل ہیں۔ [مبسوط سرخسی، جلد ۴ ص ۱۹۹، کتاب النکاح]

اس مسئلہ میں شریعت کا ضابطہ یہ ہے کہ اپنی اصل بعید کی فرع قریب حرام ہے۔

بحر الرائق میں ہے: "وحرم.... صلبية أصله البعيد"

مرد پر اصل بعید کی صلبیہ عورتیں حرام ہیں۔ [بحر الرائق، جلد ۳/۹۸، فصل فی المحرمات]

حضور اعلیٰ حضرت اسی مسئلہ سے متعلق تفصیل بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"زوجہ دوم کی وہ لڑکی اگر زید ہی کے نطفہ سے ہے بلا شبہہ زید کے نواسے پر حرام قطعی ہے۔ اور اگر کسی دوسرے شوہر سے ہے تو جائز ہے۔ جزئیت کے بارے میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اپنی فرع اور اپنی اصل کتنی بعید ہو مطلقاً حرام ہے، اور اپنی اصل قریب کی فرع اگرچہ بعید ہو حرام ہے، اور اپنی اصل بعید کی فرع بعید حلال، اپنی فرع جیسے بیٹی پوتی نواسی کتنی ہی دور ہو اور اصل ماں دادی نانی کتنی ہی بلند ہو اور اصل قریب کی فرع یعنی اپنی ماں اور باپ کی اولاد یا اولاد کی اولاد کتنی ہی بعید ہو اور اصل بعید کی فرع قریب جیسے اپنے دادا، پردادا، نانا، دادی، پردادی، نانی، پرنانی کی بیٹیاں یہ سب حرام ہیں، اور اصل بعید کی فرع بعید جیسے انہی اشخاص مذکورہ آخر کی پوتیاں نواسیاں جو اپنی اصل قریب کی نوع نہ ہوں حلال ہیں۔ صورت مذکورہ میں جبکہ زوجہ دوم کی لڑکی زید کے نطفہ کی ہو تو وہ اس کے اصل بعید کی فرع قریب ہوئی، زید اس کا نانا ہے وہ اس کی اصل بعید ہوا اور یہ لڑکی اس کی بیٹی، یہ اس کی فرع قریب ہوئی، لہذا حرام ہوئی۔ اور اگر دوسرے شوہر سے ہے تو اس سے کوئی تعلق نہ ہوا لہذا حلال ہوئی، چچا، خالہ، ماموں، پھوپھی کی بیٹیاں اس لیے حلال ہیں کہ وہ اس کی اصل بعید کی فرع بعید ہیں یعنی دادا نانا کی پوتیاں نواسیاں جو اپنی اصل قریب سے نہیں۔ نقایہ میں ہے: حرم علی المرء اصله وفرعه وفرع اصله القریب وصلبیة اصله البعید (مرد پر اس کے اصول و فروع اور اصل قریب کی فرع اور اصل بعید کی صلبیہ عورتیں حرام ہیں)"

[فتاوی رضویہ جدید، جلد ۱۱ ص ۵۱۷، ۵۱۶]

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں

"خالہ سگی ہو یا سوتیلی، مثل ماں کے حرام قطعی ہے، قال اللہ تعالیٰ: وخالتکم (اور تمھاری خالائیں)

در مختار میں ہے: الاشقاء وغیرهن (سوتیلی وغیرہ)" [فتاوی رضویہ جدید، جلد ۱۱ ص ۴۳۷]

الحاصل:۔ صورت مسئلہ میں نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے۔ زید کا اپنے نواسے سے اپنی بیٹی کا نکاح خالص حرام ہے۔ کیوں کہ ازروئے شرع خالہ بھانجے کا نکاح خواہ خالہ سگی ہو یا سوتیلی ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۹۵ — شوہر والی عورتوں سے نکاح حرام ہے

مسئولہ: اشفاق علی ولد اسحاق علی، مقام ۵۷۱ ر گیتا نگر روڈ اندور ایم پی۔ ۳ ر ذوالحجہ ۱۴۳۹ھ

محترم جناب مفتی صاحب!

عرض یہ ہے کہ میں اشفاق علی ولد اسحاق علی مقام ۵۷۱ ر گیتا نگر روڈ اندور ایم پی۔ میرے فرزند شاہنواز علی جس کا نکاح ہم نے انگریزی تاریخ ۲۴ ر جون ۲۰۱۸ء کو مقام پتھر مونڈلا اندور ایم پی، محمد الیاس ولد محمد حسین کی صاحبزادی نینا نسرین کے ساتھ کروادیا تھا۔ عرض ہے کہ لڑکی کے والد ووالدہ اور بھائی سہیل نے اپنی اسی لڑکی کی شادی گولو ولد محمد رفیق نام کے ہماری برادری کے لڑکے کے ساتھ پہلے کروائی تھی۔ گولو کی شراب خوری، نشہ خوری کی بری عادت کے چلتے ان کے بیچ لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اسی بیچ لڑکی کے والد والدہ اور بھائی سہیل نے پہلے خاوند سے طلاق لیے بنا کسی آگرہ اتر پردیش کے رہنے والے لڑکے کے ساتھ نینا نسرین کا نکاح کروادیا۔ ہمیں معلوم نہیں اس رشتہ میں ان کے بیچ کیا ہوا۔

معاملہ کورٹ چلا گیا کورٹ میں کیسے چلتے ہوئے کی حالت میں ہی کورٹ کا فیصلہ آنے کا انتظار کئے بغیر ہی اسی لڑکی نینا نسرین کا نکاح میرے فرزند شاہنواز علی کے ساتھ تاریخ ۲۴/جون ۲۰۱۸ء کو اول لڑکے گولو کا طلاق نامہ ۲۴/مئی ۲۰۱۸ء نوٹری پر کیا گیا۔ بتا کر کہا گیا کہ گولو نے کافی وقت پہلے زبانی طلاق دے دیا تھا لیکن اسٹامپ پر لکھائی پڑھائی ہم نے ۲۴/مئی ۲۰۱۸ء کو کروائی ہے۔ اسی نوٹری کو سامنے رکھ کر میرے فرزند شاہنواز علی کے ساتھ تیسرا نکاح اسی لڑکی نینا نسرین کے ساتھ لڑکی کے والد اور بھائی سہیل نے کروا دیا۔ دونوں ہی معاملہ میں طلاق لیے بنا وقت سے پہلے ہی سلسلہ وار نکاح کو انجام دیا گیا۔ نکاح ثانی ہم سے چھپایا گیا تھا۔ میرے فرزند اور ہم کو بعد میں معلوم ہوا۔ محترم جناب مفتی صاحب!

میرا سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں میرے فرزند شاہنواز علی کا نکاح اسلامی شریعت کی روشنی میں درست ہے یا نہیں؟

برائے مہربانی جواب عنایت کریں۔

الجواب

غیر کی بیوی سے نکاح قطعاً ناجائز و حرام ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ

اور حرام ہیں شوہر دار عورتیں۔" [ترجمۂ قرآن، کنز الایمان، پارہ ۵ سورہ نساء آیت ۲۴]

اس آیت کی تفسیر میں تفسیر نسفی میں ہے:

''أی ذوات الأزواج.... والمعنی وحرم علیکم نکاح المنکوحات أی اللاتی لهن أزواج''

یعنی شوہر والی عورتیں تم پر حرام ہیں۔ [تفسیر مدارک التنزیل، پارہ ۵ سورہ نساء آیت ۲۴]

تفسیر خازن میں ہے:

''ذوات الأزواج من النساء فلا یحل لأحد نکاحهن قبل مفارقة أزواجهن''

یعنی شوہر والی عورتیں کہ ان سے شوہر کے الگ کرنے سے قبل کسی کا نکاح حلال نہیں ہے"

[تفسیر خازن، پارہ ۵ سورہ نساء آیت ۲۴]

تفسیر ابن ابی حاتم میں ہے: ''هن ذوات الأزواج، حرم الله نکاحهن مع أزواجهن''

یعنی محصنات شوہر والی عورتیں ہیں۔ اللہ نے ان کے شوہروں کے ہوتے ہوئے ان عورتوں کے ساتھ نکاح حرام فرمایا ہے۔"

[تفسیر بن ابی حاتم، پارہ ۵ سورہ نساء آیت ۲۴]

فتاوی عالمگیری میں ہے: ''لا یجوز للرجل أن یتزوج زوجة غیرہ وکذلك المعتدة، کذا فی السراج الوهاج.

یعنی آدمی کے لیے کسی غیر کی بیوی سے نکاح جائز نہیں یوں ہی معتدہ سے ایسا ہی سراج وہاج میں ہے۔"

[فتاوی ہندیہ، ۱/۲۸۰، الباب الثالث فی بیان المحرمات، القسم السادس المحرمات التی یتعلق بها حق الغیر]

لہٰذا صورت مسئولہ میں جب کہ شاہنواز علی کا نکاح غیر کی منکوحہ یعنی نسرین سے لاعلمی میں ہوا ہے۔ جیسا کہ استفتا میں ذکر ہے

توشرعاًیہ نکاح فاسد ہے۔شاہنواز علی پرلازم ہے کہ فورانسرین کو چھوڑدے۔اگرنسرین سے صحبت بھی کرلی ہے تونسرین پرعدت لازم ہوگی۔ اوروہ بدستوراپنے پہلے شوہر کے نکاح میں رہے گی البتہ پہلے شوہر پراس سے صحبت کی اجازت نہ ہوگی۔اوراگراس سے صحبت نہیں ہوئی ہے تواس پرعدت لازم نہیں ہے۔اوراگرنسرین سے نکاح وصحبت جان کرکی ہے توشاہنواز علی نے زناجیسے گناہ کبیرہ کاارتکاب کیاہے۔جس پرحدلازم ہے شاہنواز علی توبہ کرے۔اورنسرین بغیرعدت اپنے شوہر کے ساتھ رہے۔اس پرعدت واجب نہیں ہے۔البتہ گناہ کبیرہ کاارتکاب کیاہے اس لیے توبہ لازم وفرض ہے۔

فتاوی شامی میں ہے:

''أما نكاح منكوحة الغير و معتدته فالدخول فيه لا يوجب العدة إن علم أنها للغير لأنه لم يقل أحد بجوازه فلم ينعقد أصلا. قال..... ولهذا يجب الحد مع العلم بالحرمة لأنه زنى ''

یعنی غیر کی منکوحہ اور معتدہ سے یہ جانتے ہوئے کہ غیر کی بیوی ہے وطی کرنے سے عدت واجب نہیں۔کیوں کہ کسی نے اسے جائز نہیں کہاتووہ نکاح بالکل منعقد ہی نہیں ہوا۔اوراسی لیے حدواجب ہے کیوں کہ اس نے جان بوجھ کرزناکاارتکاب کیاہے۔"[ردالمحتار، ۱۳۲/۳، مطلب فی النکاح الفاسد]

جوہرہ نیرہ میں ہے:

''وإن تزوج منكوحة الغير و وطئها إن كان لا يعلم أنها منكوحة غيره تجب العدة وتحرم على الأول إلى أن تنقضي العدة وإن علم أنها منكوحة لا تجب العدة و لا تحرم على الأول؛ لأنه حينئذ يكون زنا محضا''

اوراگرغیر کی بیوی سے نکاح کیااوراس سے صحبت کی یہ جانتے ہوئے کہ یہ غیر کی منکوحہ ہے توعدت واجب نہیں ہے۔اورپہلے شوہر پرعدت کی تکمیل تک وہ عورت حرام ہے۔البتہ جانتاہے کہ وہ غیر کی بیوی ہے توعدت واجب نہیں اوروہ شوہر اول پرحرام بھی نہیں۔اس لیے کہ یہ خالص زناہے۔"[جوہرہ نیرہ، ۷۸/۲، کتاب العدد]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''ولو تزوج بمنكوحة الغير وهو لا يعلم أنها منكوحة الغير فوطئها؛ تجب العدة، وإن كان يعلم أنها منكوحة الغير لا تجب حتى لا يحرم على الزوج وطؤها، كذا في فتاوى قاضي خان۔

یعنی اگرغیر کی منکوحہ سے لاعلمی میں نکاح کیاتوعدت واجب ہے۔اوراگرعمداًنکاح کیاتوعدت واجب نہیں ۔حتی کہ شوہر کے اس سے وطی حرام نہیں ہوگی۔ایساہی فتاوی قاضی خاں میں ہے۔"

[فتاوی ہندیہ، ۲۸۰/۱، الباب الثالث فی بیان المحرمات، القسم السادس المحرمات التی یتعلق بہا حق الغیر]

الحاصل: صورت مسئولہ میں شاہنواز علی پرلازم ہے فوراً نسرین کو چھوڑدے۔اس سے کہہ دے کہ میں نے تجھے چھوڑا۔اورچوں کہ یہ نکاح لاعلمی میں ہوااس لیے شاہنواز علی پرشرعاًکوئی مواخذہ نہیں۔پھر بھی احتیاطاًخداکی بارگاہ میں توبہ واستغفارکرے۔اورنسرین پرفرض ہے کہ وہ اگرشاہنواز علی کے ساتھ صحبت کرچکی ہے اورشاہنواز علی کوچوں کہ اس کے غیر کی بیوی ہونے کاعلم نہیں تھاتوعدت گزارکراپنے پہلے شوہر کے ساتھ رہے۔اورچوں کہ اس نے گناہ کبیرہ کاارتکاب کیاہے اس لیے خداکی بارگاہ میں توبہ کرے اورآئندہ ایسی حرکات سے بازرہے۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۹۶

دیوبندیوں سے شادی بیاہ حرام ہے
ان کے یہاں دعوت کھانا بھی جائز نہیں

مسئولہ: ناصر علی محلہ وجے نگر کاشی پور۔ ۲۱/ محرم الحرام ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں

(۱) زید بکر عمر نے دیوبندی کو لڑکی دی یا دیوبندی کی لڑکی لی اور پہلے سے معلوم بھی ہے کہ جہاں رشتہ کر رہے ہیں وہ وہابی ہے تو زید بکر عمر کا شریعت کی نظر میں کیا حکم ہے؟

(۲) دیوبندی کے یہاں دعوت کھانا کیسا ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

(۱) دیوبندی جماعت اپنے عقائد کفریہ باطلہ، مثلاً اللہ جھوٹ بول سکتا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی آسکتا ہے، امتی عمل میں نبی سے بڑھ سکتا ہے، نماز میں نبی کا خیال گدھے بیل کے خیال اور بیوی سے مجامعت کے خیال سے بدتر ہے، جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مالک ومختار نہیں، نبی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، نبی کی یوم پیدائش منانا کنہیا کے جنم کے مثل ہے، لا الہ الا اللہ اشرف علی رسول اللہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، انبیاء واولیاء ہر مخلوق چھوٹی بڑی اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی زیادہ ذلیل ہے، نبی کا علم شیطان سے کم اور جانوروں، پاگلوں، بچوں کے برابر ہے، صحابہ کو کافر کہنے والا کافر نہیں ہے، حضرت علی کا اسلام معتبر نہیں ہے، حضرت حسین جلیل القدر صحابی نہیں ہیں، (معاذاللہ رب العلمین) وغیرہا عقائد کے سبب مرتد، دین اسلام سے خارج ہے۔ توجو شخص ان عقائد سے متفق ہو یا ان عقائد خبیثہ سے واقف ہونے کے باوجود بھی قائلین ومصدقین اور مؤیدین کو مسلمان سمجھتا ہو۔ اور انہیں مرتد نہ مانتا ہو تو وہ بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ اس کے ساتھ کسی سنی لڑکے یا لڑکی کا نکاح کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ بدمذہبوں سے نکاح نہ کرنے کا حکم فرماتے ہوئے غیب داں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

فلاتنا کحوھم ولا تؤاکلوھم ولا تشاربوھم ولا تجالسوھم ولا تصلوا علیھم ولا تصلوا معھم۔

یعنی بدمذہبوں کے ساتھ نہ نکاح کرو نہ کھاؤ نہ پیو نہ بیٹھو نہ ان کی نماز جنازہ پڑھو نہ ان کے ساتھ نماز پڑھو"

[کنز العمال ۱۱/۵۴۰:۵۲۹]

فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاوی ہندیہ جسے پانچ سو اکابر علمانے ترتیب دیا ہے اس میں بھی یہی حکم مصرح ہے:

لایجوز للمرتد ان یتزوج مرتدۃ ولا مسلمۃ ولا کافرۃ اصلیۃ وکذالك لایجوز نکاح المرتدۃ مع احد کذا فی المبسوط۔

یعنی مرتد کے لئے مرتدہ اور مسلمہ اور اصلی کافرہ کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے اور ایسے ہی مرتدہ کا نکاح کسی سے جائز نہیں ایسا ہی مبسوط میں ہے۔ [باب المحرمات بالشرک ۱/۲۸۲] حضور اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں:

"وہابی ہو یا رافضی جو بدمذہب عقائد کفریہ رکھتا ہے.... تو ایسوں سے نکاح باجماع مسلمین والیقین باطل محض وزنائے صرف

ہے"[فتاوی رضویہ جدید ۱۱/۳۷۷]مزید فرماتے ہیں:

"مرتد مرد خواہ عورت کا نکاح تمام عالم میں کسی عورت و مرد سے مسلم یا کافر مرتد یا اصلی کسی سے نہیں ہو سکتا"[مرجع سابق]

لہٰذ دیوبندی جانتے ہوئے کسی نے اپنے لڑکے یالڑکی کی شادی کسی دیوبندی سے کی تووہ سخت مجرم و گنہگار ہے۔ مستحق عذاب نار ہے۔اس پر توبہ لازم ہے اوراپنے لڑکے یالڑکی کواس غیر شرعی نکاح سے الگ کرنالازمی ہے۔

(۲) دیوبندی کے یہاں کھانا کھانے کی بھی شرعاًاجازت نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بدمذہبوں کے ساتھ کھانا کھانے سے متعلق فرماتے ہیں:

"ولاتؤاکلوھم ولا تشاربوھم" یعنی بدمذہبوں کے ساتھ نہ کھاؤنہ پیو۔[کنزالعمال ۱۱/۵۲۹۔۵۴۰]

الحاصل: بکر کا لڑکا اگر واقعی دیوبندی ہے توزید کی لڑکی کا نکاح اس کے ساتھ کسی بھی صورت میں منعقد نہیں ہو گا۔خواہ نکاح کوئی بھی پڑھائے،اوراگر نکاح پڑھانے والا مسلمان ہے اور لاعلمی میں نکاح پڑھاتاہے اور بعد میں توبہ ورجوع نہیں کرتایاواقفیت کے باوجود بھی نکاح پڑھاتاہے اور بکر کے لڑکے کو مسلمان سمجھ کر نکاح پڑھاتاہے توازروئے شرع مذکورہ بالا حکم اس پر منطبق ہو گا۔لیکن نکاح پھر بھی نہیں ہو گا۔اوردیوبندی کے یہاں کھانا بھی جائز نہیں ان سے میل جول محبت سب ناجائزوحرام ہے۔ھٰذاماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ عزوجل ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

فتوی ۹۷ — دیوبندی کے ساتھ نکاح جائز نہیں

مسئولہ: محمد عمر گاؤں کیشونگر تحصیل بازپور بارڈ نمبر ۶ ضلع اودھم سنگھ نگر۔۱۳؍ شعبان المعظم ۱۴۳۹ھ

کیافرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زیداورزید کی لڑکی دونوں سنی صحیح العقیدہ ہیں۔زیدنے اپنی لڑکی کی شادی جس لڑکے سے کی بعد میں پتہ چلاوہ دیوبندی جماعت سے تعلق رکھتاہے۔دیوبندی اجتماع میں بہت خوشی سے جاتاہے۔اوران کی رشتہ داریاں بھی دیوبندیوں سے ہیں۔تواب معلوم یہ کرناہے کہ کیایہ نکاح درست ہوااور کیالڑکی کولڑکے کے یہاں بھیجناجائز ہو گا؟شریعت کاجو بھی حکم ہو بیان فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب

دیوبندی جماعت اپنے عقائد کفریہ خبیثہ باطلہ ، جیسے اللہ جھوٹ بول سکتاہے،محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی آسکتاہے،امتی عمل میں نبی سے بڑھ سکتاہے،نماز میں نبی کاخیال گدھے بیل کے خیال اور بیوی سے مجامعت کے خیال سے بدترہے،جس کانام محمد یاعلی ہے وہ کسی چیز کامالک ومختار نہیں،نبی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا،نبی کی یوم پیدائش منانا کنہیاکے جنم کے مثل ہے،لاالہ الااللہ اشرف علی رسول اللہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ،انبیاء واولیاء ہر مخلوق چھوٹی بڑی اللہ کی شان کے آگے چمارسے بھی زیادہ ذلیل ہے،نبی کاعلم شیطان سے کم اور جانوروں ، پاگلوں ،بچوں کے برابرہے،صحابہ کوکافر کہنے والاکافرنہیں ہے،(معاذاللہ رب العلمین)وغیرہابہت سے عقائد باطلہ کے سبب خارج ازاسلام کافرومرتدہے۔

لہٰذازید کابیٹااگران عقائد کفریہ سے متفق ہے یاپھر ان عقائد کفریہ سے واقف ہونے کے باوجود بھی دیوبندی جماعت کوحق

جانتا اور سمجھتا ہے۔ اور قائلین ومصدقین اور مؤیدین کو مسلمان سمجھتا ہے۔ اور ان کو حق بجانب تسلیم کرتا ہے، تو وہ بھی انہیں میں شامل ہے۔ اور اس سے نکاح ہرگز جائز نہیں تھا۔ حدیث شریف میں ہے:

''فلا تجالسوھم ولا تشاربوھم ولا تؤاکلوھم ولا تناکحوھم۔'' یعنی بدمذہبوں کے ساتھ نہ بیٹھو نہ ان کے ساتھ پیو نہ کھاؤ نہ ان کے ساتھ نکاح کرو۔ دوسری حدیث شریف میں ہے:

فلا تناکحوھم ولا تؤاکلوھم ولا تشاربوھم ولا تجالسوھم ولا تصلوا علیھم ولا تصلوا معھم۔

بدمذہبوں کے ساتھ نہ کھاؤ نہ پیو نہ بیٹھو نہ ان کی نماز جنازہ پڑھو نہ ان کے ساتھ نماز پڑھو۔ [کنز العمال ۱۱/۵۴۰:۵۲۹]

اور جب کہ بعد میں پتہ چلا کہ لڑکا دیوبندی ہے اور وہ علمائے دیوبند کے ان عقائد کفریہ کے معلوم ہونے کے باوجود بھی ان کو مسلمان سمجھتا ہے تو وہ بھی مرتد وبددین ہے اس سے زید کی لڑکی کا نکاح ہوا ہی نہیں۔

فقہ حنفی کی مشہور ومعتبر کتاب فتاوی عالمگیری میں ہے:

لایجوز للمرتد ان یتزوج مرتدۃ ولا مسلمۃ ولا کافرۃ اصلیۃ وکذالک لایجوز نکاح المرتدۃ مع احد کذا فی المبسوط۔

یعنی مرتد کے لئے مرتدہ اور مسلمہ اور اصلی کافرہ کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے اور ایسے ہی مرتدہ کا نکاح کسی سے جائز نہیں ایسا ہی مبسوط میں ہے۔ [باب المحرمات بالشرک ۱/۲۸۲] اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''وہابی ہو یا رافضی جو بدمذہب عقائد کفریہ رکھتا ہے... تو ایسوں سے نکاح باجماع مسلمین والیقین باطل محض وزنائے صرف ہے''

مزید فرماتے ہیں:

''کہ مرتد مرد خواہ عورت کا نکاح تمام عالم میں کسی عورت ومرد سے مسلم یا کافر مرتد یا اصلی کسی سے نہیں ہو سکتا''

[فتاوی رضویہ جدید ۱۱/۳۷۷]

الحاصل: نکاح کے وقت اگر زید کا داماد دیوبندی عقائد رکھتا تھا اور دیوبندی عقائد جانتے ہوئے بھی دیوبندی جماعت کو حق مانتا تھا تو یہ نکاح باطل ٹھہرا یعنی ہوا ہی نہیں۔ ایسی صورت میں طلاق وعدت کے بغیر کہیں اور نکاح کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر بعد میں عقائد بتائے گئے پہلے نہیں معلوم تھے اور اس کے باوجود بھی وہ لڑکا اس جماعت کو حق پر مانتا ہے تو اگر خلوت ہو گئی ہے تو عدت کی ضرورت ہے۔ اور اگر خلوت نہ ہوئی ہو تو عدت کی ضرورت نہیں۔ جہاں چاہے نکاح کیا جاسکتا ہے۔

حضور صدر الشریعہ فرماتے ہیں:

''اگر وقت نکاح اس شخص کے یہ عقائد تھے تو نکاح ہوا ہی نہیں۔ کہ مسلمان عورت کا نکاح کافر سے نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس وقت اس کے ایسے عقائد نہ تھے بعد میں یہ عقائد پیدا ہوئے تو نکاح جاتا رہا۔ کہ ارتداد زوج نکاح کو فسخ کر دیتا ہے....

تنویر الابصار میں ہے ''ویبطل النکاح'' لڑکی کو اختیار ہے جہاں چاہے دوسرا نکاح کرے۔ پھر اگر خلوت نہ ہوئی ہو تو عدت نہیں، اور اگر خلوت ہو چکی ہو اور وقت نکاح زید کے وہی عقائد تھے جو سوال میں مذکور ہیں تو یہ نکاح باطل ہے۔ اور نکاح باطل میں عدت نہیں۔ در مختار میں ہے: فلا عدۃ فی باطل، اور بعد نکاح وخلوت یہ عقائد پیدا ہوئے تو عدت تین حیض ہے۔''

[فتاوی امجدیہ، جلد ۲ ص ۱۳۱] واللہ تعالیٰ اعلم

فتوی ۹۸ بدمذہبوں سے نکاح کسی بھی صورت جائز نہیں

مسئولہ: محمد عزیز الرحمن ٹھاکر دوارہ۔ ۲۴/ ذوالحجہ ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں

کہ ہمارے شہر ٹھاکر دوارہ میں ایک عجیب مسئلہ در پیش ہے وہ یہ کہ بعض باراتیں دیوبندی علاقے سے آتی ہیں اور بعض باراتیں دیوبندی خیالات کے گھرانے سے آتی ہیں۔ مگر دولہا اور اہل خانہ و بعض لوگ اس کو سنی کہتے ہیں رسومات اہل سنت ادا کرنے کی وجہ سے۔ بعض لوگ اس کو دیوبندی کہتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ ادھر بھی نماز ادا کرتا ہے اور ادھر بھی۔ اب ایسی صورت میں نکاح پڑھانے میں تین طرح کے لوگ ہیں۔

(۱) بعض ائمہ تو مطلقاً نکاح پڑھا دیتے ہیں۔

(۲) اور بعض ائمہ نے ایک تحریر تیار کررکھی ہے جس میں دیوبندی وہابی کے عقائد کفریہ ہیں اور مسلک اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر قائم ودائم رہنے کا عہد ہے اس پر گواہوں کی موجودگی میں پڑھوا کر اور سمجھا کر دستخط لیتے ہیں۔

(۳) اور بعض ائمہ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے راستہ کھول دیا ہے ہم تو اب کیسا ہی نکاح پڑھا دیں گے اگرچہ پکا دیوبندی ہو۔ وہ ایک تحریر لے کر جاتے ہیں اور جیسے نکاح کی رسید پر دولہا دستخط کرتا ہے اسی دھوکے سے دستخط کراتے ہیں اور نکاح پڑھا دیتے ہیں۔

آیا ان تینوں میں کون سی صورت درست ہے؟ یا سب صحیح ہیں یا سب غلط؟ برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں مہربانی ہوگی۔

الجواب

اہل سنت وجماعت کے نزدیک وہابیہ ودیابنہ دین اسلام سے خارج ہیں۔ ان کا نکاح دراصل نکاح ہی نہیں ہے محض زنا ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: لایجوز للمرتد ان یتزوج مرتدۃ ولا مسلمۃ ولا کافرۃ اصلیۃ۔

مرتد کے لئے مرتدہ اور مسلمہ اور اصلی کافرہ کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے۔ [باب المحرمات بالشرک ۱/ ۲۸۳]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"وہابی ہو یا رافضی جو بدمذہب عقائد کفریہ رکھتا ہے.... تو ایسوں سے نکاح باجماع مسلمین والیقین باطل محض وزنائے صرف ہے۔" [فتاوی رضویہ جدید ۱۱/ ۳۷۷]

صورت مسئولہ میں وہ ائمہ جو مطلقاً سنی دیوبندی سب کا نکاح پڑھا دیتے ہیں اور وہ ائمہ جو کہتے ہیں ہم تو اب کیسا ہی نکاح پڑھا دیں گے اگرچہ پکا دیوبندی ہو اور اس تحریر پر وہ دھوکے سے دستخط لے لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنا کام پورا کر دیا انہیں اس کا بھی احساس نہیں ہوتا کہ انہوں نے بدمذہب دیوبندی کا نکاح پڑھا کر جرم عظیم کا ارتکاب کیا ہے۔ ایسے امام یقیناً مجرم وگنہگار ہیں اور کسی طرح بھی لائق امامت نہیں ہیں۔ اگر واقعی وہ ان لوگوں کا نکاح بھی پڑھا دیتے ہیں جو دیوبندی عقائد رکھتے ہیں یا دیوبندی عقائد والوں کو مسلمان سمجھتے ہیں تو اگر مسلمان سمجھ کر پڑھاتے ہیں تو وہ ائمہ بھی انہیں میں سے ہیں

اوراگروہ دیوبندی جماعت کے عقائد فاسدہ کفریہ سے باخبر افراد کوبددین ومرتد سمجھ کرہی نکاح پڑھاتے ہیں تب بھی وہ گنہگار ہیں پہلی صورت میں ان پر توبہ، تجدید نکاح، تجدید ایمان لازم وضروری ہے۔اوردوسری صورت میں ان پر توبہ کے ساتھ ساتھ نکاح سے براءت کااظہار بھی ضروری ہے۔فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختاراوراس کے حاشیہ ردالمحتار میں ہے:

’’مایکون کفرااتفاقایبطل العمل والنکاح واولادہ اولادزنا،ومافیہ خلاف یؤمربالاستغفاروالتوبۃ(ای تجدیدالاسلام)وتجدیدالنکاح‘‘

متفق علیہ کفرسے عمل اور نکاح باطل ہوجاتاہے اوراس کی حالت میں جواولادہوگی وہ اولادزناہوگی اور جس کے کفر ہونے میں اختلاف ہواس میں توبہ، تجدید اسلام اور تجدید نکاح کاحکم دیاجائے گا۔[باب المرتد،۳۹۱/۶]

البتہ وہ ائمہ جوصورت حال کی مکمل تحقیق کرکے شریعت کامکمل پاس ولحاظ رکھتے ہوئے نکاح پڑھاتے ہیں وہ خداکی بارگاہ سے اجر کے مستحق ہیں۔اوردور حاضر میں نکاح پڑھانے والوں کوخاص کرایسی ہی روش اختیار کرناچاہئے۔تاکہ بدمذہبیت وگمراہیت پرروک لگ سکے۔ھٰذاماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ

سنی بریلوی اور دیوبندی لڑکے لڑکی کانکاح کوئی بھی پڑھائے ہوگاہی نہیں

فتوی ۹۹ مسئولہ: جمیل احمد ولد حافظ عبدالرحیم، محلہ علی خاں کاشی پور۔۳؍شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ

باسمہٖ تعالیٰ: کیافرماتے ہیں علماءدین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں

کہ بکر مسلک دیوبند سے تعلق رکھتاہے اورزید مسلک رضاخاں فاضل بریلوی سے تعلق رکھتاہے۔کیازید کی لڑکی کانکاح مسلک دیوبند سے تعلق رکھنے والا قاضی پڑھاسکتاہے کہ نہیں؟

اوراگرزید کی لڑکی کانکاح بکرکے لڑکے سے مسلک رضاخاں فاضل بریلوی سے تعلق رکھنے والا قاضی پڑھادے توکیانکاح درست ہوگا؟اور قاضی صاحب توکسی زدمیں نہیں آئیں گے قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب تحریر فرمادیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں حکم شرعی یہ ہے کہ اگر بکر کالڑکادیوبندی جماعت کے عقائد کفریہ باطلہ، مثلاً اللہ جھوٹ بول سکتاہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی آسکتاہے، امتی عمل میں نبی سے بڑھ سکتاہے، نماز میں نبی کاخیال گدھے بیل کے خیال اور بیوی سے مجامعت کے خیال سے بدتر ہے، جس کانام محمد یاعلی ہے وہ کسی چیز کامالک ومختار نہیں، نبی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، نبی کی یوم پیدائش منانا کنہیاکے جنم کے مثل ہے، لاالہ الااللہ اشرف علی رسول اللہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، انبیاءواولیاءہر مخلوق چھوٹی بڑی اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی زیادہ ذلیل ہے، نبی کاعلم شیطان سے کم اور جانوروں، پاگلوں، بچوں کے برابرہے، صحابہ کوکافرکہنے والاکافرنہیں ہے، حضرت علی کااسلام معتبرنہیں ہے، حضرت حسین جلیل القدر صحابی نہیں ہیں، (معاذاللہ رب العلمین) وغیرہاعقائد سے متفق ہے یاان عقائد خبیثہ سے واقف ہونے کے باوجود بھی قائلین ومصدقین اور مؤیدین کومسلمان سمجھتاہے۔یااب تک ان عقائد کفریہ سے ناواقف تھالیکن اب اس فتوی کے ذریعہ

دیوبندی عقائد کفریہ سے آگاہ ہونے کے بعد بھی ان کو حق بجانب تسلیم کرتا ہے اور انہیں مرتد نہیں مانتا تو بکر اور اس کا لڑکا دونوں مذکورہ بالا حکم میں داخل ہیں ۔لہٰذا یہ نکاح خواہ سنی قاضی پڑھائے یا دیوبندی قاضی کسی بھی صورت میں منعقد نہیں ہو سکتا۔کیوں کہ دیوبندی جماعت کا ہر وہ فرد جو مذکورہ بالا عقائد کفریہ رکھتا ہے اور ان عقائد سے آگاہ ہونے کے باوجود بھی قائلین ،مصدقین ومؤیدین کو مسلمان سمجھتا ہے اہل سنت وجماعت عصر حاضر میں جسے مسلک اعلیٰ حضرت سے جانا پہچانا جاتا ہے کے تمام علما کے نزدیک مرتد، دائرہ اسلام سے خارج ہے۔اور مرتد کے ساتھ نکاح کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔جیسا کہ بدمذہبوں سے نکاح نہ کرنے کا حکم فرماتے ہوئے غیب داں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

فلاتناکحوهم ولاتؤاکلوهم ولا تشاربوهم ولا تجالسوهم ولا تصلوا علیهم ولا تصلوا معهم۔

بدمذہبوں کے ساتھ نہ نکاح کرو نہ کھاؤ نہ پیو نہ بیٹھو نہ ان کی نماز جنازہ پڑھو نہ ان کے ساتھ نماز پڑھو۔

[کنز العمال ۱۱/۵۴۰:۵۲۹]

فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاوی ہندیہ جسے پانچ سو اکابر علما نے ترتیب دیا ہے اس میں بھی یہی حکم مصرح ہے:

لایجوز للمرتد ان یتزوج مرتدة ولا مسلمة ولا کافرة اصلیة وکذالك لایجوز نکاح المرتدة مع احد کذا فی المبسوط۔

مرتد کے لئے مرتدہ اور مسلمہ اور اصلی کافرہ کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے اور ایسے ہی مرتدہ کا نکاح کسی سے جائز نہیں ایسا ہی مبسوط میں ہے۔[باب المحرمات بالشرک ۱/۲۸۲]

حضور اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں:

"وہابی ہو یا رافضی جو بدمذہب عقائد کفریہ رکھتا ہے...تو ایسوں سے نکاح باجماع مسلمین والیقین باطل محض وزنائے صرف ہے"

مزید فرماتے ہیں کہ "مرتد مرد خواہ عورت کا نکاح تمام عالم میں کسی عورت ومرد سے مسلم یا کافر مرتد یا اصلی کسی سے نہیں ہو سکتا"[فتاوی رضویہ جدید ۱۱/۳۷۷]

لہٰذ نکاح پڑھانے والے کو اگر بکر کے لڑکے کی بدمذہبیت کا علم نہیں تھا اور نکاح پڑھا دیا تو معلوم ہو جانے کے بعد نکح پر شرعاً رجوع، توبہ اور استغفار لازم ہو گا۔اور اگر اس کی بدمذہبیت کا علم تھا اور اسے بدمذہب جان کر ہی نکاح پڑھایا حرام کیا تب بھی توبہ واستغفار لازم وضروری ہے۔اور اگر نکح نے اسے مسلمان سمجھ کر نکاح پڑھایا تو نکح بھی " من شك فی عذابه وکفره فقد کفر " کے سبب مذکورہ حکم میں داخل مانا جائے گا۔اور اس پر توبہ، تجدید ایمان، تجدید نکاح اور تجدید بیعت لازم وضروری ہو گی۔اعلیٰ حضرت محدث بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں:

"جس طرح ضروریات دین کا انکار کفر ہے یونہی ان کے منکر کو کافر نہ جاننا بھی کفر ہے۔وجیز امام کردری میں و در مختار وشفائے امام قاضی عیاض وغیرہا میں ہے " اجمع العلماء من شك فی عذابه وکفره فقد کفر " علماء کا اجماع ہے کہ جو کافر کے کفر وعذاب میں شک کرے وہ کافر ہے"[فتاوی رضویہ جدید ۱۱/۳۷۸]

فقہ حنفی کی مشہور کتاب در مختار اور اس کے حاشیہ ردالمحتار میں ہے:مایکون کفرا اتفاقا یبطل العمل والنکاح واولاده اولادزنا، ومافیه خلاف یؤمر بالاستغفار والتوبة (ای تجدید الاسلام) وتجدید النکاح۔

متفق علیہ کفر سے عمل اور نکاح باطل ہو جاتا ہے اور اس کی حالت میں جو اولاد ہو گی وہ اولاد زنا ہو گی اور جس کے کفر ہونے میں اختلاف ہو اس میں توبہ، تجدید اسلام اور تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا۔[باب المرتد، ۳۹۱/۶]

الحاصل: بکر کا لڑکا اگر واقعی دیوبندی ہے تو زید کی لڑکی کا نکاح اس کے ساتھ کسی بھی صورت میں منعقد نہیں ہو گا۔ خواہ نکاح کوئی بھی پڑھائے، اور اگر نکاح پڑھانے والا مسلمان ہے اور لاعلمی میں نکاح پڑھاتا ہے اور بعد میں توبہ ورجوع نہیں کرتا یا واقفیت کے باوجود بھی نکاح پڑھاتا ہے اور بکر کے لڑکے کو مسلمان سمجھ کر نکاح پڑھاتا ہے تو ازروئے شرع مذکورہ بالا حکم اس پر منطبق ہو گا۔ لیکن نکاح پھر بھی نہیں ہو گا۔

ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ عزوجل ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

فتوی ۱۰۰

غیر مقلدین کے ساتھ نکاح جائز نہیں
نکاح میں شریک ہونا بھی ناجائز ہے

مسئولہ: محمد انیس رضا نوری محلہ وجے نگر نئی بستی کاشی پور۔ ۲۴/ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ

غیر مقلدین (وہابی) کے ساتھ کسی سنی لڑکی یا لڑکے کا نکاح کرنا ازروئے شریعت کیسا ہے؟

اور ان کے نکاح میں شریک ہونے والوں کے لئے شریعت کا کیا حکم ہے؟ تفصیلی جواب مرحمت فرمائیں

الجواب

غیر مقلدین زمانہ جو خود کو اہل حدیث کہتے ہیں اور وہابی سے بھی جانے جاتے ہیں وہ اپنے عقائد فاسدہ کے سبب گمراہ وبددین اور متعدد وجوہات سے کافر ومرتد ہیں۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”فرقہ غیر مقلدین کہ تقلید ائمہ دین کے دشمن اور بیچارہ عوام اہل اسلام کے رہزن ہیں، مذاہب اربعہ کو چوراہا بتائیں ائمہ وہدی کو احبار ورہبان ٹھہرائیں، سچے مسلمانوں کو کافر مشرک بنائیں، قرآن وحدیث کی آپ سمجھ رکھنا، ارشاداتِ ائمہ کو جانچنا پرکھنا ہر عامی جاہل کا کام کہیں، بے راہ چل کر، بیگانہ مچل کر، حرامِ خدا کو حلال کر دیں حلال خدا کو حرام کہیں، ان کا بدعتی بدمذہب گمراہ بے ادب ضال مضل غوی مبطل ہونا نہایت جلی واظہر“[فتاوی رضویہ جدید جلد ۱۴ ص ۲۸۲]

اور فرماتے ہیں ”بلاشبہہ طائفہ نائفہ غیر مقلدین گمراہ بددین اور بحکم فقہ کفار ومرتدین، جن پر بوجوہ کثیرہ لزوم کفر بین مبین“

[فتاوی رضویہ جدید جلد ۱۴]

مزید فرماتے ہیں ”اور وہابی لوگ وغیر مقلدین زمانہ پر حکم کفر ہے“[فتاوی رضویہ جدید جلد ۸ ص ۷۵]

لہٰذا ان سے کسی سنی لڑکے یا لڑکی کا نکاح کسی حال میں جائز نہیں ایسے بدمذہب مرتدین سے نکاح کرنا اور ان کے ساتھ تعلقات رکھنا شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان عالیشان ہے

”فلا تجالسوھم ولا تشاربوھم ولا تؤاکلوھم ولا تناکحوھم۔“

بدمذہبوں کے ساتھ نہ بیٹھو نہ ان کے ساتھ پیو نہ کھاؤ نہ ان کے ساتھ نکاح کرو۔

دوسری حدیث شریف میں ہے

فلاتناکحوھم ولاتؤاکلوھم ولا تشاربوھم ولا تجالسوھم ولا تصلواعلیھم ولا تصلوامعھم۔

بد مذہبوں کے ساتھ نہ کھاؤ نہ پیو نہ بیٹھو نہ ان کی نماز جنازہ پڑھو نہ ان کے ساتھ نماز پڑھو۔[کنز العمال ۱۱/۵۴۰:۵۲۹]

فقہ حنفی کی مشہور و معتبر کتاب فتاوی عالمگیری میں ہے:

لایجوز للمرتد ان یتزوج مرتدۃ ولا مسلمۃ ولا کافرۃ اصلیۃ وکذالك لایجوز نکاح المرتدۃ مع احد کذا فی المبسوط۔

یعنی مرتد کے لئے مرتدہ اور مسلمہ اوراصلی کافرہ کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے اور ایسے ہی مرتدہ کا نکاح کسی سے جائز نہیں ایسا ہی مبسوط میں ہے۔[باب المحرمات بالشرک ۱/۲۸۲]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"وہابی ہو یا رافضی جو بدمذہب عقائد کفریہ رکھتا ہے...تو ایسوں سے نکاح باجماع مسلمین والیقین باطل محض وزنائے صرف ہے۔"[فتاوی رضویہ جدید ۱۱/۳۷۷]

الحاصل: غیر مقلدین وہابیہ سے کسی بھی مسلمان کا نکاح نہیں ہو سکتا ہے۔بلکہ ان سے کسی مسلمان لڑکے یا لڑکی کا نکاح ان کے عقائد کفریہ جانتے ہوئے انہیں مسلمان سمجھ کر کرنے والا شخص بھی کفر کی زد میں آجائے گا،اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔اور جو لوگ ان کے عقائد کفریہ سے آگاہ ہیں یا علماء اہل سنت کی جانب سے ان پر حکم کفر کی انہیں اطلاع ہے اوراس کے باوجود بھی وہ انہیں مسلمان سمجھ کر ان کے نکاح میں شریک ہوتے ہیں تو وہ بھی کافر ہو جائیں گے،کیوں کہ کسی کافر کو کافر نہ جاننا بلکہ اسے مسلمان سمجھنا بھی کفر ہوتا ہے۔اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"جس طرح ضروریات دین کا انکار کفر ہے یونہی ان کے منکر کو کافر نہ جاننا بھی کفر ہے وجیز امام کردری میں و درمختار وشفائے امام قاضی عیاض وغیرہا میں ہے "اجمع العلماء من شك فی عذابه وکفرہ فقد کفر"

علماء کا اجماع ہے کہ جو کافر کے کفر وعذاب میں شک کرے وہ کافر ہے""[فتاوی رضویہ جدید ۱۱/۳۷۸]

ایسے شخص پر توبہ و تجدید ایمان و تجدید نکاح لازم وضروری ہے۔درمختار اوراس کے حاشیہ ردالمحتار میں ہے:

مایکون کفرا اتفاقا یبطل العمل والنکاح واولادہ اولاد زنا،ومافیہ خلاف یؤمر بالاستغفار والتوبۃ(ای تجدید الاسلام)وتجدید النکاح۔

متفق علیہ کفر سے عمل اور نکاح باطل ہو جاتا ہے۔اوراس کی حالت میں جو اولاد ہو گی وہ اولاد زنا ہو گی۔

اور جس کے کفر ہونے میں اختلاف ہو اس میں توبہ،تجدید اسلام اور تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا۔[باب المرتد،۶/۳۹۱]

البتہ وہ سنی کہلانے والا شخص عقائد کفریہ رکھنے والے غیر مقلدین کو کافر سمجھتا ہے پھر بھی نکاح کر رہا ہے یا شریک ہونے والے بھی کافر ہی سمجھتے ہیں تو کفر تو نہیں البتہ سخت ناجائز و حرام ہے۔نکاح کرنے اور شریک ہونے والوں پر توبہ واستغفار لازم ہے۔ اور آئندہ ایسے نکاح میں شرکت سے باز رہنا واجب وضروری ہے۔

ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

احکام تجارت

کمپنی کے شئیرز وغیرہ میں شرکت اور منافع سے متعلق اہم مسائل

فتوی ۱۰۱ مسئولہ: محمد اشفاق احمد نظامی ودیگر اراکین کمپنی کرلا ممبئ ۹/ شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان ذوی الاحترام درج ذیل مسئلہ میں

(۱) کمپنی کے ڈائریکٹر اور کارکنان شئر دار ہوتے ہوئے کمپنی سے تنخواہ حاصل کرسکتے ہیں یا نہیں؟

نیز کمپنی کے سبھی شرکاء اتفاق سے کسی ایک شریک کو اجرت پر وکیل مقرر کردیں توکیا یہ ازروئے شرع درست ہوگا؟ اگر نہیں تو اس کے جواز کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں

الجواب

ازروئے شرع ہروہ کام جس کا تعلق اصل تجارت جیسے کسی چیز کا بیچنا خریدنا ادھر ادھر منتقل کرنا وغیرہ سے ہو تو ایسے کام میں شرکاء کو اجرت لینے کی اجازت نہیں ہے، اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس کام کے لئے کمپنی کا قیام عمل میں آیا ہے خاص اس کام کے کرنے پر کوئی شریک اجرت کا حقدار نہیں ہے اور ہر وہ کام جس کا تعلق اصل تجارت سے نہ ہو جیسے نظام کمپنی، مشاورتی میٹنگ، کمپنی کا پرچار، کمپنی کا معائنہ وغیرہ امور ان میں اگر کوئی اجرت لیتا ہے تو جائز ہے۔ بدائع الصنائع میں ہے:

''ومنها شركة العامل فيما يعمل فيه؛ لأن العامل أجير رب الأرض، واستئجار الإنسان للعمل في شيء هو فيه شريك المستأجر لا يجوز حتى إن النخل لو كان بين رجلين فدفعه أحدهما إلى صاحبه معاملة مدة معلومة على أن الخارج بينهما أثلاث ثلثاه للشريك العامل وثلثه للشريك الساكت فالمعاملة فاسدة والخارج بينهما على قدر الملك ولا أجر للعامل على شريكه لما مر أن في المعاملة معنى الإجارة، ولا يجوز الاستئجار لعمل فيه الأجير شريك المستأجر وإذا عمل لا يستحق الأجر على شريكه''

(معاملہ کو فاسد کرنے والی شرطوں میں سے ایک یہ ہے کہ عامل وہ کام کرے جس میں وہ شریک ہو۔ اس کے مفسد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عامل رب الارض کا اجیر ہے۔ اورآدمی کو ایسے کام کے لئے اجرت پر رکھنا جس میں اجیر مستاجر کا شریک ہو جائز نہیں یہاں تک کہ اگر کھجور کا باغ دو آدمیوں کا ہو پھر ان میں سے ایک وہ باغ اپنے ساتھی کو مقررہ مدت کے لئے مساقات پر دے اس شرط پر کہ پیداوار دونوں کی دونوں کے درمیان تہائی میں تقسیم ہوگی دو تہائی شریک عامل کے لئے اور ایک تہائی شریک ساکت کے لئے تو مساقات فاسد ہوگی اور پیداوار دونوں کے درمیان ان کی ملکیت کے تناسب سے تقسیم ہوگی اور عامل کے لئے اس کے ذمہ کچھ اجرت نہ ہوگی کیوں کہ یہ بات گزر چکی ہے کہ مساقات میں اجارہ کا معنی پایا جاتا ہے اور ایسے عمل میں استیجار (اجرت پر رکھنا) جائز نہیں ہے جس میں اجیر مستاجر کا شریک ہو اور اگر وہ عمل کرلے تو عامل کو اپنے شریک پر کسی اجرت کا استحقاق نہیں ہوتا)

[بدائع الصنائع، کتاب المعاملة، فصل فی الشرائط المفسدة للمعاملة، ۲۷۰/۵]

حضور اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان فتاوی رضویہ میں فرماتے ہیں:

قال محمد وكل شیء استأجر احدهما من صاحبه ممايكون عملا فانه لايجوز وان عمله فلا اجرله وكل شیء ليس يكون عملا استأجره احدهما من صاحبه فهو جائزوقال شمس الائمة البيهقی فی الكفاية والاصل ان فی كل موضع لا يستحق الاجرالا بايقاع عمل فی العين المشترك لايجوز لانه لا يمكن كما فی نقل الطعام المشترك بنفسه او احبته اوغلامه وكل ما يستحق بدون ايقاع عمل فی المشترك يجوز فانه تجب الاجرة بوضع العين فی الدار والسفينة والرحی لا بايقاع عمل''

یعنی امام محمد نے فرمایا کہ شریکین میں سے اگر ایک مشترکہ چیز کے کسی عمل میں اجیر بنا تو یہ جائز نہیں اگر اس نے ایسا کیا تو کوئی اجرت نہ پائے گا، اور ایسی مشترکہ چیز جو عمل نہ بنے اس کو اگر شریک اجرت پر لیتا ہے تو جائز ہے۔ اور شمس الائمہ بیہقی نے کفایہ میں فرمایا کہ قاعدہ یہ ہے کہ ایسا مقام جہاں صرف عمل کرنے پر ہی اجرت کا مستحق بنے تو وہاں کسی شریک کا اجیر بننا جائز نہیں کیوں کہ مشترکہ چیز میں یہ ممکن نہیں جیسا کہ مشترکہ طعام کو خود شریک یا اس کا قریبی یا اس کا غلام منتقل کرنے کا اجیر بنے تو نا جائز ہے، اور ایسا مقام جہاں مشترک چیز میں بغیر عمل اجرت کا مستحق بنے وہاں جائز ہے کیوں کہ عین چیز کو گھر میں اور کشتی اور چکی کو مکان میں (کرایہ پر) رکھ چھوڑنے پر اجرت واجب ہوتی ہے، عمل پر واجب نہیں ہوتی۔

نیز وکالت پر اجرت سے متعلق حضور اعلیٰ حضرت درج ذیل حکم فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''بقیہ شرکاء کی طرف سے عمرو کو تفویض دکان واجازت اعمال تجارت ہوئی یہ معنے وکالت ہیں اور اس میں یہ شرط قرار پانا کہ جو مال بکے عمرو اکنی روپیہ دستور لے اگرچہ شرط فاسد ہے کہ شریک کو مال مشترک میں تصرف کرنے کے لئے اجیر کرنا اصلاً جائز نہیں.... قال فی الدر المختار لو استأجره لحمل طعام مشترك بينهما فلا اجرله لايعمل شيئا لشريكه الاويقع بعضه لنفسه فلايستحق الاجر'' یعنی در مختار میں فرمایا کہ اگر ایک شریک مشترکہ سامان کو اٹھانے کے لئے اجیر بنا تو اس کو اجرت نہ ملے گی کیوں کہ جو کچھ اس نے اٹھایا اس میں شریک کے ساتھ اس کا اپنا حصہ بھی تھا لہٰذا اس اشتراک کی بنا پر وہ اجرت کا مستحق نہ ہوا۔ [فتاوی رضویہ قدیم، کتاب الشرکۃ، ۳۲۸/۶، ۳۲۷]

لہٰذا صورت مستفسرہ میں کمپنی کے کارکنان وشئیر ہولڈرس کو مقرر کردہ منافع سے زائد بشکل تنخواہ لینے کی مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں سے جو صورت ہوگی اسی کے مطابق حکم منطبق ہوگا۔ اور یہی حکم شریک وکیل کا بھی ہوگا۔

اور رہی بات صورت جواز کی تو اس میں اجرت کی تو کوئی صورت نہیں البتہ عامل کے لئے منافع کی بس یہ ایک صورت فی الوقت احقر کی نظر میں ہے وہ یہ کہ مستفتی نے اپنے دوسرے استفتاء میں اس کاروبار کو شرکت عنان کے تحت بتایا ہے، اگر واقعی کمپنی کے معاملات شرکت عنان کے تحت ہوں تو شرکاء میں سے کام کرنے والوں کو اجرت تو نہیں مل سکتی البتہ سبھی شرکاء کے اتفاق سے نفع میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ شرکت عنان میں نفع میں کمی وزیادتی جائز ہے۔

فتاوی عالمگیری میں شرکت عنان کی بحث میں ہے''ان شرطا الربح للعامل اكثرمن راس ماله جازعلى الشرط''

یعنی اگر کام کرنے والے شریک کے لئے اس کے راس المال سے زائد نفع کی شرط لگائی تو شرط کے مطابق جائز ہے۔

[فتاوی عالمگیری۔ کتاب الشرکۃ، الفصل الثانی فی شرط الربح، ۳۲۰/۲]

محیط برہانی میں ہے:

”یجوز أن یشترط لأحدھما فضل فی الربح“،یعنی شریکین میں سے کسی ایک کے لئے نفع میں اضافہ کی شرط لگاناجائزہے۔[محیط برہانی،فصل فی العنان،۳۲/۶]

حضور صدرالشریعہ فرماتے ہیں:

”اگر دونوں نے اس طرح شرکت کی کہ مال دونوں کا ہو گا مگر کام فقط ایک ہی کرے گا اور نفع دونوں لیں گے اور نفع کی تقسیم مال کے حساب سے ہو گی یا برابر لیں گے یا کام کرنے والے کو زیادہ ملے گا تو جائز ہے اور اگر کام نہ کرنے والے کو زیادہ ملے گا تو شرکت ناجائز۔ یوہیں اگر یہ ٹھہرا کہ کل نفع ایک شخص لے گا تو شرکت نہ ہوئی اور اگر کام دونوں کریں گے مگر ایک زیادہ کام کرے گا دوسرا کم اور جو زیادہ کام کرے گا نفع میں اُس کا حصہ زیادہ قرار پایا یا برابر قرار پایا یہ بھی جائز ہے۔“

[بہارشریعت،جلد۲ حصہ دہم،صفحہ ۲۹]

بالجملہ: کمپنی کے شرکاء شرکت عنان کی صورت میں نفع میں کمی بیشی تو کرسکتے ہیں لیکن ازروئے شرع عمل تجارت پر اجرت کے مستحق نہیں ہوسکتے۔

ھٰذا ماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ وحبیبہ صلی اللہ علیہ وسلم

افیون کی کاشت،خرید وفروخت وغیرہ سے متعلق شرعی احکام

فتوی ۱۰۲ مسئولہ: بلال احمد نظامی، باداکھیڑی، ضلع، مندسور، ایم پی۔۶ / ربیع الغوث ۱۴۳۸ھ

مفتیان کرام کی بارگاہ میں افیون کے تعلق سے استفتاعرض ہے-اس سے قبل اسکے ہر پہلو کو آپ کے سامنے رکھتاہوں تاکہ اس کی کاشت اور خرید وفروخت کے ہر پہلو پر آپ کی نظر رہے اور اسی کے مطابق آپ حکم شرع واضح فرمادیں

افیون کی تعریف اور حکومت کی پالیسی اوراس کے غیر قانونی انسداد کے لئے سزاؤں اور جرمانے کے تعلق سے مختصر سی جانکاری حاضر ہے۔ افیون کی تعریف پوستِ خشخاش سے نکلنے والا وہ لیسدار عرق جو عقل وشعور کو متاثر اور اعضاء کو بے حس کرتا ہے اور استعمال کنندہ کو نیند لاتا ہے ہمارے ملک میں اس کی کاشت عام طور پر ممنوع ہے- صرف مدھیہ پردیش، راجستھان، اور یوپی کے چند اضلاع میں مشروط اجازت ہے- گورنمنٹ کاشتکار کو افیون کی کاشت کے لئے اس شرط پر لائسنس دیتی ہے کہ کاشتکار کو ایک آری زمین میں کم از کم 700 گرام افیون 1500 سے 2200 تک روپیہ کے عوض فروخت کرے گا۔ نیز یہ بھی شرط ہے کہ کم پیداوار کی صورت میں کسان کو لائسنس بر قرار رکھنے کے لئے مقررہ مقدار کو بہر صورت پورا کرنا ہو گا۔ افیون کی بلیک مارکیٹ میں قیمت تقریبافی کلو 40000 ہزار روپیہ ہوتی ہے جو غیر قانونا نشے کے لئے بازار میں غیر قانونی طور پر خفیہ طریقے سے خرید وفروخت ہوتی ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کمزور کسان اس کمی کو پورا کرنے کے لئے سودی قرض لینے پر مجبور ہوجاتا ہے کبھی گھر کا کل اثاثہ بیچ ڈال دیتاہے اور زیادہ پیداوار کی صورت میں کل افیون گورنمنٹ کے مقررہ بھاؤ میں دینالازم ہوتا ہے بچا کر رکھنے کی صورت میں

یا غیر قانونی طور پر فروخت کرنے پر جو نشہ میں استعمال کی جائے گی اگر گورنمنٹ کو بھنک لگی تو محکمہ انسداد منشیات کے قانون کے مطابق جرم ثابت ہونے پر چھ ماہ سے لے کر بیس سال تک سزا ہو سکتی ہے۔ مزید 10000 ہزار سے لیکر 200000 لاکھ تک جرمانہ بھی ہو سکتا ہے۔ حکومت کی انتباہی ہدایت یہ بھی ہے کہ موسم کی معمولی ناموافقت اور ہلکی قدرتی آفت کے سبب مقدار معلومہ میں کمی غیر معتبر ہے ہاں سخت ناموافقت اور فاش قدرتی آفات سے پوستِ خشخاش کامل نہ ہوئے ہو تو بالکلیہ فصل تباہ کرایا جائے گا اور افیون کی کی بیع تحفظِ لائسنس کے ساتھ اس سال فسخ ہو گی اور اس کی کاشت پر جو اخراجات ہوئے اسکا کوئی معاوضہ نہیں -اور اس کی پوست کی بھی بلیک میں خرید و فروخت ہوتی ہے گورنمنٹ کو معلوم ہونے پر مجرم اور سزا کا مستحق ہوتا ہے اور اس پوست کو بھی نشہ خوری میں استعمال کیا جاتا ہے: دریافت طلب امور یہ ہیں کہ

(۱) کاشتکار کا رضامندی سے مذکورہ شرائط کے ساتھ گورنمنٹ سے افیون کی کاشت کے لئے لائسنس لینا اور کاشت کرنا کیسا ہے؟

(۲) پیداوار میں کمی کی صورت میں برائے تحفظِ لائسنس بھاری نقصان برداشت کر غیر قانونی طور سے افیون خرید کر محکمہ کو دینا کیسا ہے؟

(۳) زیادہ پیداوار کی صورت میں محکمہ کو نہ دے کر بلیک مارکیٹ میں مہنگے بھاؤ میں فروخت کرنا کیسا ہے جو دست بدست ہو کر یقیناً لوگوں کے نشہ میں استعمال ہو گی؟

(۴) اس نیت سے افیون کی کاشت کرنا کہ بیچنے کی صورت میں خفیہ طور پر زیادہ قیمت میں فروخت کریں گے کیسا ہے جبکہ غیر قانونی فروختگی پر گرفتاری کی صورت میں عمر و عزت کے برباد اور مال ضائع ہونے کے قوی امکانات ہیں جس کا مشاہدہ بھی ہے کئی گھر اس سے تباہ ہو گئے ہیں؟

(۵) اس کی پوست کی بیع کرنا کیسا ہے؟ بینوا و توجروا

الجواب

افیون کی کاشت فی نفسہ جائز ہے۔ البتہ اس کی بیع کے معاملہ میں شرعایہ حکم ہے کہ اسے نشہ خور افراد کے ہاتھ نہیں بیچ سکتے۔ اور اس کے علاوہ کسی سے بھی اس کی بیع جائز و مشروع ہے۔ جن کے ہاتھ بیچی ہے وہ اگر اس کا ناجائز استعمال کریں گے تو اس کے وہ ذمہ دار ہوں گے۔ حضور اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ فتاوی رضویہ شریف میں فرماتے ہیں:

”افیون نشہ کی حد تک کھانا حرام ہے۔ اور اسے بیرونی علاج مثلاً ضماد و طلاء میں استعمال کرنا یا خوردنی معجونوں میں اتنا قلیل حصہ داخل کرنا کہ روز کی قدر شربت نشے کی حد تک نہ پہنچے تو جائز ہے۔ اور جب وہ معصیت کے لئے متعین نہیں تو اس کے بیچنے میں حرج نہیں مگر اس کے ہاتھ جس کی نسبت معلوم ہو کہ نشہ کی غرض سے کھانے یا پینے کو لیتا ہے،

لان المعصیۃ تقوم بعینہا فکان کبیع السلاح من اھل الفتنۃ

(اس لئے کہ گناہ عین شے کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ جیسے اہل فتنہ کو ہتھیار بیچنا)

اور جب اس کی تجارت مطلقاً حرام نہ ہوئی بلکہ جائز صورتوں پر بھی مشتمل ہوئی تو زیادہ مقدار تاجروں کے ہاتھ بیچنا اور ہلکا ہو گیا کہ یہاں تعین معصیت اصلاً نہیں اور ان کا نشہ داروں کے ہاتھ بیچنا ان کا فعل ہے، وتخلل فعل فاعل مختار یقطع النسبة کما فی الهداية وغيرها۔ (کسی فاعل، مختار کا درمیان میں گھسنا نسبت کو منقطع کر دیتا ہے جیسا کہ ہدایہ وغیرہ میں ہے) یہ صورتیں اس کے جواز کی نکلتی ہیں، اور اہل تقویٰ کو اس سے احتراز زیادہ مناسب"

[فتاوی رضویہ قدیم، جلد نہم نصف آخر ص ۱۸۹]

مزید فرماتے ہیں۔

"افیون کی تجارت دوا کے لئے جائز اور افیونی کے ہاتھ بیچنا ناجائز ہے، لان المعصية تقوم بعينه وكل ما كان كذلك كره بيعه (اس لئے کہ گناہ ذات شیء کے ساتھ قائم ہے اور جس میں ایسا ہو تو اس کا بیچنا مکروہ ہے)" [مرجع سابق، ص ۳۰۳]

درمختار کے حوالے سے فرماتے ہیں: "مفاده صحة بيع الحشيشة والافيون

جس کا مفاد یہ ہے کہ حشیش اور افیون کی بیع صحیح ہے" [ایضا، جلد ۵، ص ۲۶۳]

مزید فرماتے ہیں:

"صحت چیزے دیگر ست وجواز بمعنی حل دیگر اینہا اگرچہ تاحد سکر حرام است فاما ہمچو خمر وخنزیر از تقوم برنیفتادہ است وچوں بیع برمال متقوم مقدور التسلیم وارد شود صحیح بود گو حرام باشد پس صحت در ینہا مطلق ست وگر برائے تداوی از بیرون بدن می خواہد می خواہد بمعنی حل نیز باشد وگر برائے معصیت میخواہد روا نیست، قال تعالیٰ ولا تعاونوا على الاثم والعدوان

(صحت اور چیز ہے اور جواز بمعنی حل دوسری چیز، مذکورہ اشیاء یعنی افیون اور بھنگ نشہ کی حد تک اگرچہ حرام ہیں مگر شراب اور خنزیر کی طرح متقوم ہونے سے خارج نہیں ہوتیں، اور جب بیع مال متقوم مقدور التسلیم پر وارد ہو تو صحیح ہوتی ہے اگرچہ حرام ہو لہٰذا صحت تو ان میں مطلق ہے اور اگر بیرون بدن ان میں سے علاج معالجہ مطلوب ہو تو جواز بمعنی حل بھی ہو گا اور اگر معصیت کے لئے ان کی بیع مطلوب ہو تو جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا گناہ اور ظلم پر تعاون مت کرو)"

[ایضاً، جلد ۷ ص ۴۱]

اور چونکہ عموماً اس کا ناجائز استعمال کرنے والے ہی خرید و فروخت کرتے ہیں تو بچنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ رہا معاملہ گورنمنٹ کا کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی نہیں بیچ سکتا تو یہ معاملہ قانون کا ہے اس سے بیچنے خریدنے والے پر کوئی الزام نہیں۔

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"بھنگ اور افیون بقدر نشہ کھانا پینا حرام ہے۔ اور خارجی استعمال نیز کسی دوا میں قدر قلیل جزو ہو کہ روز کے قدر شربت میں قابل تفتیر نہ ہو، اندرونی بھی جائز، تو وہ معصیت کیلئے متعین نہیں، تو ان کی بیع حرام نہیں، مگر اس کے ہاتھ کہ معصیت کے لئے اسے خریدے، لیکن اکثر وہی ہیں تو ان کی تجارت میں احتیاط سخت دشوار اور اسلم احتراز، اور ٹھیکہ یہاں غالباً بایں معنیٰ ہے کہ گورنمنٹ سے ان کو اجازت دی جاتی ہے، دوسرا انہیں بیچ سکتا، یہ ایک قانونی بات ہے جس کا ان پر الزام نہیں"

[ایضاً، جلد ۸ ص، ۱۸۵، ۱۸۴]

صورت مسئولہ میں یہ جو ذکر کیا گیا ہے کہ گورنمنٹ نے ایک حد بیچنے کی مقرر کر دی ہے اب اگر پیداوار کم ہو تو نقصان کا سامنا ہے اور نقصان سے بچے تو قانونا مجرم ٹھہرے۔ اس سلسلے میں اولا تو یہ بات جاننا ضروری ہے کہ ولایت عرفیہ کی بنیاد پر یہاں کی حکومت کو احکام نافذ کرنے کا جواز موجود ہے۔ اور عوام کو اس کی پابندی بھی لازمی ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"شریعت مطہرہ اسلامیہ علی صاحبہا و آلہ افضل الصلوٰۃ والتحیۃ نے ولایت عرفیہ کو جس سے آدمی والی ملک اور حاکم کو بادشاہ وقت ہو جاتا ہے اور عایا کو اس کی پابندی لازم ہوتی ہے اس کے حال پر چھوڑا ہے، اسے مسلم نامسلم کسی سے خاص نہ فرمایا"

[ایضاً جلد ۷/۴۹۵]

البتہ غیر شرعی احکام پر عمل کرنا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ شرعی قانون کے مطابق حاکم کو نرخ مقرر کرنے کی اجازت نہیں ہے، اور اگر بائع حاکم کے ڈر سے کم بھاؤ میں بیچتا ہے تو خریدنے والے کے لئے ازروئے شرع وہ جائز نہیں ہوگا۔ البتہ تجار بھاؤ حد فاحش تک کریں تو حاکم کو مشورہ کے بعد بھاؤ مقرر کرنے کی اجازت ہوگی۔ لیکن اس حد تک نہیں کہ بائع کا نقصان ہو۔ علاوہ ازیں اگر کوئی حاکم کے بھاؤ کے خلاف کسی اور سے زیادہ رقم میں بیع کرے تو شرعا نفاذ کو مانع نہیں ہے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

''فإن سعر فباع الخباز بأكثر مما سعر جاز بيعه۔ اگر نان بائی نے مقررہ نرخ سے زیادہ پر بیع کی تو جائز ہے''

[فتاوی عالمگیری، جلد ۳ ص ۲۱۴، کتاب البیوع، فصل فی الاحتکار]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"اسی قبیل سے ہے سلطان کا ایام گرانی میں، یا فوج کے لئے اشیاء کا بھاؤ کاٹ دینا کہ اگر بائع برضائے مشتری زیادہ کو پہنچے شرعاً جائز و نافذ رہے گا آخرت میں مستحق عذاب نہ ہوگا اگرچہ دنیا میں سلطان اسے سزا دے۔ اور اگر اس سلطانی مقرر کردہ بھاؤ پر محض بخوف سلطان بیچے تو وہ شے مشتری کیلئے عند اللہ حلال نہ ہوگی۔ در مختار میں ہے:

لايسعر حاكم لقوله صلى الله عليه وسلم لاتسعروا فان الله هو المسعر القابض الباسط الرازق الا اذا تعدى الارباب عن القيمة تعديا فاحشا فيسعر بمشورة اهل الرأي، وفي الاختيار ثم اذا سعر و خاف البائع ضرب الامام لو نقص لايحل للمشتري اه اي اذا باع للخوف۔

حاکم بھاؤ مقرر نہ کرے کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے بھاؤ مقرر نہ کرو کیوں کہ اللہ پاک ہی بھاؤ بنانے والا ہے وہی تنگی، وہی وسعت وہی رزق دینے والا ہے۔ مگر جب تجار قیمت میں فحش گرانی کریں تو پھر حاکم اہل الرائے سے مشورہ کے بعد بھاؤ مقرر کرے تو جائز ہے، اور اختیار میں ہے۔ پھر جب حاکم بھاؤ مقرر کر دے اور بائع کو حاکم کی سزا کا خوف ہو اور اس نے مال کم بھاؤ پر دیا تو مشتری کو اس بھاؤ خریدنا جائز نہیں، یعنی جب بائع محض خوف کی وجہ سے بیچے تو مشتری کو جائز نہیں"

[فتاوی رضویہ قدیم، جلد ۷ ص ۵۰۰]

اب ایسی صورت میں جب کہ شرعا اسے کاشت و بیع کی اجازت ہے مگر گورنمنٹ کے قانون سے مجبور ہے اگر خلاف ورزی

کرتا ہے تومالی نقصان کے ساتھ اذیت اور ہتک عزت کا خطرہ ہے۔ توایسی صورت میں اسے ایسے غیر قانونی کاروبار سے بچنے کا حکم ہو گا۔

اعلی حضرت فرماتے ہیں:

''ان من الصور المباحة مایکون جرمافی القانون ففی اقتحامه تعریض النفس للاذی والاذلال وھولایجوز فیجب التحرز عن مثله''

جائز صورتوں میں بعض وہ ہوتی ہیں جو قانوناً جرم ہیں۔ توان میں ملوث ہونا اپنے آپ کو اذیت وذلت کیلئے پیش کرنا ہے اوروہ جائز نہیں لہٰذا، اس طرح کی صورتوں سے بچنا ضروری ہے۔'' [ایضاً، جلد ۶ ص ۱۱۵]

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

''ہم کہتے ہیں جن مواضع میں مثل بازار وشارع عام وغیرہا گاؤکشی کی قانوناً ممانعت ہے وہاں جو مسلمان گائے ذبح کرے گا البتہ اثارت فتنہ وفساد اس کی طرف منسوب ہو سکتی ہے اور قانونا مجرم قرار پائے گا، اور اس امر کو ہماری شریعت مطہرہ بھی روا نہیں رکھتی کہ ایسی وجہ سے مسلمانوں پر مواخذہ یا انھیں سزا ہونا بیشک توہین اسلام ہے جن کا مرتکب یہ شخص ہوا، نظیر اس کی سب وشتم الہہ باطلہ مشرکین ہے کہ شرع نے اس سے ممانعت فرمائی، اگرچہ اکثر جگہ فی نفسہ حرج متحقق نہ تھا۔''

[ایضاً، جلد ۸ ص ۴۴۸]

الحاصل:۔ صورت مسئولہ میں افیون کی کاشت فی نفسہ جائز ہے۔ اوراس کی بیع گورنمنٹ سے خواہ کسی سے بھی غیر مشروع صورت کے علاوہ جائز ہے۔ اور گورنمنٹ کی شرط جو بائع کے لئے نقصان کا باعث ہو اس پر عمل درآمد شرعا لازم نہیں ہے۔ اس کو غیر قانونی بیع کی اجازت ہے۔ البتہ غیر قانونی ہونے کے سبب وہ قانون کا مجرم قرار پائے گا اوراس طرح اس کے جانی ومالی نقصان کے ساتھ ہتک عزت کا بھی خطرہ ہے جس کی حفاظت شرعا فرض ہے۔ اس لئے ایسی صورت میں ازروئے شرع ایسی تجارت کرنے کا حکم نہیں ہو گا۔ ھٰذا ماعندی والعلم عندالله تعالیٰ

احکام وقف، مسجد، مدرسہ، مقبرہ

فتوی ۱۰۳ مسجد کی کمیٹی کیسے لوگوں کی ہونا چاہئے

مسئولہ: سمیر شیخ، مالونی گیٹ نمبر 2، ملاڈویسٹ ممبئی 400095۔ ۲۹؍ربیع الغوث ۱۴۳۵ھ

باسمہ تعالیٰ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں

کہ مہاراشٹرا، ممبئی میں مسجدوں کی کمیٹی دو طرح کی ہوتی ہے (1) سنی مسلمانوں کو ممبر شپ (تا کہ کوئی بدمذہب داخل نہ ہوسکے) کے ذریعہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ الیکشن کے ذریعہ صحیح نمائندوں کو چن کر مسجد کی خدمت کیلئے آگے لائیں تا کہ مسلمانوں کی پسند سے کمیٹی دین کا کام صحیح طریقہ سے انجام دے (2) سنی مسلمانوں کی غفلت اور عدم توجہی کی بنیاد پر کچھ لوگ سلیکشن کے ذریعہ اپنی مرضی سے کمیٹی بناتے ہیں اور اپنے پسندیدہ افراد کو لاتے ہیں، مختلف معاملات میں قرآن وسنت کے مقابلہ میں اپنے مفاد کیلئے عملا بائیلاج کو اہمیت دیتے ہیں، کہتے ہیں ہمارے سلیکشن ہے الیکشن نہیں۔ عام مسلمانوں کی حیثیت خرِ باربر کی طرح ہوتی ہے کہ صرف عطیات دیں اور باہر نکلیں۔

حضور مفتی صاحب قبلہ کی بارگاہ میں گذارش ہے شرعًا مسلمانوں کی نمائندہ کمیٹی ان دونوں میں سے کون ہے؟

حکم شرعی دونوں کے تعلق سے قرآن وحدیث کی روشنی دلائل کے ساتھ واضح فرمائیں؟ مسجد کے اسٹاف وغیرہ کی تقرری و برخاست وغیرہ کا حق شرعی کسے حاصل ہے؟ فقط والسلام

الجواب

ازروئے شرع اول الذکر کمیٹی مسجد کے انتظام وانصرام کی اہل ہے۔ قرآن مجید میں ہے

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

اور تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے کہ بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھی بات کا حکم دیں اور بُری سے منع کریں۔ اور یہی لوگ مُراد کو پہنچے۔ [القرآن الکریم مع ترجمہ کنزالایمان: پارہ ۴، سورہ آل عمران، آیت ۱۰۴]

ردالمحتار میں اسعاف کے حوالے سے ہے:

''ولا یولی الا امین'' متولی ومنتظم صرف اسی کو بنایا جائے گا جو امین ہو۔ [ردالمحتار: ۵۷۸/۶]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''جبکہ مسجد کی بے انتظامی اور نمازیوں کو تکلیف رہی تو اس انتظام کا بدلنا اور ہوشیار دیانت دار پرہیزگار مسلمانوں کی نگرانی میں دینا فرض تھا'' [فتاوی رضویہ قدیم۔ج ۶ ص ۳۹۱]

لہٰذا اول الذکر کمیٹی ہی مسجد کی ذمہ داریوں کی اہل ہے۔ ثانی الذکر کمیٹی کسی بھی لحاظ سے مسجد کی تولیت و تنظیم کی مستحق نہیں ہے۔ مسجد اللہ کا گھر ہے۔ اس میں اپنے مفاد کی خاطر شریعت کے مقابلے اپنی مرضی کو ترجیح دینے والے اشخاص کا انتخاب سراسر غلط اور شریعت کے تقدس کو پامال کرنے کے مترادف ہے۔ جس کی اجازت ہرگز ہرگز نہیں مل سکتی۔

اور جو لوگ اہل محلہ و مسجد نے نظام مسجد کے لئے منتخب کئے ہیں مسجد کے اسٹاف وغیرہ کی تقرری اور خلاف شرع حرکت کرنے پر ان کو معزول کرنا نیز دیگر امور مسجد میں بس انہیں کو اختیار ہو گا۔ ان کے علاوہ کسی کو بھی بلاوجہ شرعی دخل اندازی کی اجازت نہیں ہو گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۱۰۴ — مسجد کے عہدیدران پابند شرع مقرر کئے جائیں

مسئولہ: صداقت حسین، مالونی، ملاڈ ویسٹ ممبئی 400095۔ ۲۹؍ ربیع الغوث ۱۴۳۵ھ

باسمہ تعالیٰ

کیا فرماتے علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں

کہ اہلسنت و جماعت کی ایک مسجد میں انتظام و انصرام کی کمی کو لیکر اہلیان محلہ نے ایک مشاورتی میٹنگ کا انعقاد کیا تاکہ موجودہ ٹرسٹ کو ہٹا کر اچھے لوگوں کی ایک کمیٹی بنائی جاسکے جس سے انتظام اچھا ہو جائے اور مصلیان کو بھی تکلیفوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جب مصلیان نے یہ بات موجودہ ٹرسٹ کو کہا تو وہ آپے سے باہر ہو گئے اور چلا چلا کر کہنے لگے کہ ہماری مسجد کا دستور ایسا بنا ہوا ہے کہ ہمیں کوئی ہٹا نہیں سکتا ہم لائف ٹرسٹی ہیں ہمارے بعد ہماری اولاد اس مسجد کی ٹرسٹ رہے گی تمہیں جو کرنا ہے کرلو ہمیں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

اس طرح کا دستور پاس کرانا اور اپنی منمانی کرنا اور مسجد کا نظام صحیح نہ رکھنا آئے دن مسجد کے اسٹاف اور نمازیوں کو پریشان کرنا کہاں تک درست ہے؟

حضور مفتی صاحب قبلہ سے گذارش ہے کہ ایسے ٹرسٹیان کے بارے میں حکم شرعی بیان فرمائیں اور قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں؟

الجواب

ٹرسٹی مذکور سے متعلق سوال میں درج باتیں اگر سچائی پر مبنی ہیں تو ٹرسٹی مذکور قرآن مجید کی آیت کریمہ

مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ

بھلائی سے بڑا روکنے والا حد سے بڑھنے والا گنہگار [ترجمہ قرآن کنز الایمان، پارہ ۲۹: سورہ قلم آیت ۱۲] کا مصداق ہے۔ ایسے شخص کو فورا معزول کیا جائے۔ اور مسجد کا انتظام کسی متدین ذی شعور امین اور پابند شرع شخص کو سونپا جائے۔

اعلیٰ حضرت فتاوی رضویہ میں فرماتے ہیں "

" جبکہ مسجد کی بے انتظامی اور نمازیوں کو تکلیف رہی تو اس انتظام کا بدلنا اور ہوشیار دیانت دار پرہیز گار مسلمانوں کی نگرانی میں دینا فرض تھا" [فتاوی رضویہ قدیم۔ج ۶ ص ۳۹۱]

اور فرماتے ہیں "متولی اور منتظم پر اتباع شرع و شرائط واقف ضروری ہے ان کے خلاف کسی فعل کا ان کو اختیار نہیں، اور اگر کریں تو مسلمانوں کو ان کی مزاحمت چاہیے" [مرجع سابق ص ۵۲۵]

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں ’’ضروری خدمتوں میں تقصیر بربنائے عجز ہوگی یابربنائے بے پروائی دونوں صورتوں میں لائق عزل ہے‘‘[مرجع سابق،ص۵۰۷]

مزید فرماتے ہیں ’’اگر یہ امر واقعی ہے کہ زید فتنہ گر، شریر، مفرق جماعت ہے تو وہ ہر گز تولیت مسجد کے قابل نہیں ،اس کا معزول کرنا واجب ہے۔:درمختار میں ہے:ینزع وجوبالوالواقف غیر مامون۔ناقابل اطمینان متولی کو ولایت وقف سے نکال دینا واجب ہے اگرچہ واقف ہی ہو‘‘[فتاوی رضویہ قدیم۔ج ۶ ص ۵۱۳]

مزید فرماتے ہیں ’’متولی رہے گا جب تک کہ اس کی خیانت یا عجز یا فسق ظاہر نہ ہو ورنہ اس سے ولایت لے لی جائے گی اگرچہ متولی خود واقف ہی ہو،درمختار میں ہے:

وینزع وجوبا لوکان المتولی غیرمامون او عاجزاً وظھربه فسق وان شرط عدم نزعه او ان لاینزعه قاض ولاسلطان لمخالفته حکم الشرعی فیبطل کالوصی۔

اور متولی غیر معتمد علیہ ہو، یانالائق ہو، یااس کا فسق ظاہر ہوچکا ہو تو اس کو معزول کرنا ضروری ہے اگرچہ معزول نہ کرنے کی شرط کی ہو، یا یہ کہ قاضی اور سلطان بھی نہ معزول کرے گا، تو شرع کے مخالف ہونے کی وجہ سے یہ شرط باطل ہے‘‘

[فتاوی رضویہ قدیم۔ج ۶ ص ۳۳۸]

اور رہاٹرسٹی کا یہ کہنا’’ہماری مسجد کا دستور ایسابنا ہوا ہے کہ ہمیں کوئی ہٹا نہیں سکتا ہم لائف ٹرسٹی ہیں ہمارے بعد ہماری اولاد اس مسجد کی ٹرسٹ رہے گی تمھیں جو کرنا ہے کرلو ہمیں کوئی کچھ نہیں کرسکتا‘‘ بالکل غلط ہے۔تولیت میراث نہیں اس میں خود کی مرضی نہیں چلتی بلکہ شریعت کے قوانین نافذ ہوتے ہیں اوراس سلسلے میں شریعت کا قانون فتاوی رضویہ کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیں۔

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

’’وقف کی تولیت کوئی ترکہ نہیں ،اس میں شرائط واقف پھر عملدرآمد سابق پھر صوابدید مسلمانان پر نظر ہوگی ان کے اعتبار سے جسے ترجیح ہوگی وہی متولی ہوگا بیٹا ہو یا بھائی یا غیر۔

ردالمحتار میں ہے ’من جھلھم قولھم خبزالاب لابنه‘ ان کا یہ قول کہ باپ کی روٹی بیٹے کی ہے ان کی جہالت کی بناپر ہے‘‘

[فتاوی رضویہ قدیم۔ج ۶ ص ۵۱۴]

الحاصل:۔ ٹرسٹی مذکورامور مذمومہ کے سبب لائق تولیت نہیں ہے۔لہٰذا اہل محلہ ومسجد کو اختیار ہے کہ وہ باتفاق رائے جس کو چاہیں متولی بنائیں۔ردالمحتار میں تاتارخانیہ کے حوالے سے ہے:

’’أن أهل المسجد لو اتفقوا علی نصب رجل متولیا لمصالح المسجد فعند المتقدمین یصح‘‘

یعنی اہل مسجد مصالح مسجد کے پیش نظر اگر کسی شخص کو متولی بنانے پر متفق ہوں تو متقدمین کے نزدیک صحیح ہے۔

[ردالمحتار ۶/۶۳۴ کتاب الوقف]

ھٰذا ماعندی والعلم عندالله تعالیٰ

مذہبی کاموں میں بدمذہبوں سے چندہ لینا شرعاً منع ہے

فتوی ۱۰۵ مسئولہ: احسان خان نعیمی مغربی بنگال۔ یکم شعبان المعظم ر ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین

ہمارے یہاں دیوبندیوں کی بہت قلیل آبادی ہے وہاں پر اہلسنت و جماعت کا ایک ادارہ زیر تعمیر ہے جس میں اس کی چھت کی ڈھلائی 19 مارچ کو قرار پائی ہے ان شاء اللہ۔ پورے علاقہ کے سنی مسلمانوں کو مدعو کیا گیا ہے اور اس ادارے کا مقصد وہاں پھیلنے والی وہابیت اور بد دینیت کو روکنا ہے اگر ڈھلائی میں دیوبندیوں کو شریک نہیں کریں گے تو وہ اور دور ہوں گے اور ان کی اصلاح وہدایت کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اور اگر ان کو شریک کریں گے تو ان کی اصلاح کا کام اور ادارے میں ان کے بچوں کو بھی تعلیم و تربیت کے لئے آسانی سے بلایا جا سکتا ہے۔ بلانے کا مقصد ان کی تعظیم و تکریم نہیں ہے۔ عرض تحریر یہ ہے کہ کیا ایسے موقعوں پر ان کی شرکت کروانا ازروئے شرع جائز ہو گا یا نہیں؟ اور اگر وہ شریک ہوں اور تعمیر میں کچھ رقم دینا چاہیں تو ان کی رقم لینا کیسا ہے حوالے کے ساتھ جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب

دیوبندی اپنے عقائد فاسدہ کفریہ کے سبب شرعاً کافر، مرتد، بددین و بدمذہب ہیں ۔اپنے دینی معاملات میں ان کو شریک کرنا، ان کا چندہ لینا، ازروئے شرع منع ہے۔ دینی معاملات میں ان کو شریک کرنے سے خواہ تعظیم مقصد نہ ہو مگر پھر بھی ان کی شرکت خود ان کے لیے باعث تعظیم ہو گی۔ ان کا قرب کسی بھی حال میں مفید نہیں ہو سکتا۔ حکمت و مصلحت کا مفہوم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون جانے گا۔ انہوں نے خود بدمذہبوں کی تعظیم و تکریم ان سے میل جول ان کے ساتھ نشست وبرخاست، نکاح وغیرہ امور سے منع فرمایا، اور یہی نہیں بلکہ ان سے دور رہنے اور ان کو خود سے دور رکھنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ وہ تمہیں کہیں گمراہ نہ کر دیں کہیں فتنہ میں نہ ڈال دیں۔ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں وہ ایسی بیماری میں مبتلا ہیں جو بیماری لاعلاج ہے۔ اور اس کا علاج بہت ہی مشکل ہے۔ (الاماشاء اللہ) اس لیے ان سے دور رہا جائے۔

حدیث شریف میں ہے: ''ایاکم وایاھم لایضلونکم ولایفتنونکم''

یعنی گمراہوں سے دُور بھاگو اُنہیں اپنے سے دُور رکھو کہیں وہ تمہیں بہکا نہ دیں اور تمہیں فتنے میں نہ ڈال دیں۔

[صحیح مسلم، ۱۰/۱]

دوسری حدیث میں ہے:

فلاتناکحوھم ولاتؤاکلوھم ولا تشاربوھم ولا تجالسوھم ولا تصلوا علیھم ولا تصلوا معھم۔

بدمذہبوں کے ساتھ نہ کھاؤ نہ پیو نہ بیٹھو نہ ان کی نماز جنازہ پڑھو نہ ان کے ساتھ نماز پڑھو۔ [کنز العمال ۱۱/۵۴۰:۵۲۹]

الغرض ان کے ساتھ تعلقات رکھنا انہیں عزت دینا ہے، اور وہ تعظیم کے بالکل لائق نہیں ہیں۔ بلکہ علما فرماتے ہیں کہ ان کی تحقیر و تذلیل لازم ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

حکم المبتدع البغض والعداوۃ والاعراض عنه والاهانة والطعن واللعن۔
یعنی بدمذہب کے لیے حکم شرعی یہ ہے کہ اس سے بغض وعداوت رکھیں، روگردانی کریں، اس کی تذلیل وتحقیر کریں۔ اس سے طعن کے ساتھ پیش آئیں۔[فتاوی رضویہ جدید ۳۹۷/۱۱]

ملا علی قاری لکھتے ہیں:

والأظهر أن مراده أن لا تبلغه مني السلام، أو رده فإنه ببدعته لا یستحق جواب السلام، ولو کان من أهل الإسلام. قال ابن حجر: لا تقرئه مني السلام لأنا أمرنا بمهاجرة أهل البدع''

یعنی اوراظہر یہ کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اس کو میر اسلام مت پہنچانا یا اس کو جواب مت پہنچانا کیوں کہ وہ اپنی بدعت کی وجہ سے سلام کے جواب کا مستحق نہیں ہے۔ اگر چہ وہ اہل اسلام سے ہو۔ ابن حجر نے فرمایا اسے میر اسلام مت کہنا یہ اس لئے کہ ہمیں بدعتیوں سے ترک تعلق کا حکم دیا گیا ہے۔

[مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، ۱۹۰/۱،باب الایمان بالقدر]

اور رہا ان سے چندہ لینا تو دینی کاموں میں کافروں سے چندہ لینا بھی شرعاً منع ہے۔
ردالمحتار میں ہے: ''لاینبغي أن یستعان بالکافر في أمور الدین'' (یعنی دینی کاموں میں کافر سے مدد لینا مناسب نہیں)

[ردالمحتار، کتاب الاضحیہ، ۳۶۸/۶]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''کسی دینی کام کے لئے کفار سے چندہ لینا اول توخود ہی ممنوع اور سخت معیوب ہے''[فتاوی رضویہ جدید، ۵۶۶/۱۴]
فقیہ ملت مفتی جلال الدین امجدی علیہ الرحمہ رقمطراز ہیں:
''دیوبندی، وہابی اور شیعہ غیر ہم و مرتدین گمراہ، گمراہ گر ہیں۔ لہٰذا ان سے چندہ لینا جائز نہیں ہے۔ ان سے چندہ لینا بہت بڑے فتنہ کا باعث ہے۔ اس لیے کہ جو لوگ ان سے روپیہ لیں گے وہ ان سے میل جول رکھیں گے، سلام کلام کریں گے، ان کی تعظیم کریں گے، اپنی تمام تقریبات میں انہیں شریک کریں گے۔ اور یہ خود ان کے یہاں شرکت کریں گے۔ اور یہ سب حرام ہے۔''[فتاوی فقیہ ملت: ۱۷۰/۲]

الحاصل: دیوبندی مرتدوبددین ہیں ۔ انہیں اپنے دینی کاموں میں شریک کرنا،اوران سے چندہ لینا بے شمار مفاسد کا دروازہ کھولنا ہے۔ جس کی اجازت شریعت ہرگز نہیں دے سکتی۔ اہل سنت کے ساتھ مل کر تبلیغی سرگرمیوں کے ذریعہ ان کو اپنے مسلک سے جوڑنے کی کوشش کریں ۔ اس طرح ان کے ساتھ تعلقات استوار کرکے مذہب ومسلک کے نقصان کے ذمہ دار نہ بنیں۔ اور اپنے دینی کاموں میں چندہ لے کر انہیں اپنے دینی ومسلکی امور میں دخیل نہ بنائیں۔
جب وہ چندہ دیں گے تو انہیں دخل اندازی کا بھی حق ہوگا اور یہ بلاشبہہ فتنہ کا باعث ہوگا۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

مسجد میں غیر مسلم کے پیسے لگانے سے بچنا چاہئے
مصافحہ کے بعد ہاتھوں کو سینہ پر لگانا جائز ہے
نامحرم بے پردہ عورتوں کو تعلیم دینے والے امام کی امامت کا حکم

فتوی ۱۰۶ مسئولہ: عبد الغفور پا کبڑا مراد آباد۔ ۲/ ربیع النور ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ان مسائل میں

(۱) ایک ہندو نے مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ مسجد کی تعمیر کے واسطے دئے اور وہ لے بھی لئے گئے تو اب معلوم یہ کرنا ہے کہ مذکورہ رقم مسجد کی تعمیر پر خرچ کرنے کا عند الشرع کیا حکم ہو گا؟

(۲) مصافحہ کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں کو سینہ پر لگانا شریعت کے کس حکم میں داخل ہے؟

(۳) بعض ائمہ مساجد اپنے مقتدیوں یا غیر مقتدیوں کے گھروں پر جاکر نامحرم بالغ لڑکیوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے ہیں کیا وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں؟

اور ایسے امام کی امامت کا ازروئے شرع کیا حکم ہے اور اگر ناجائز ہو تو کیوں اس کی وجہ ظاہر کر دی جائے کیا قباحت ہے؟

الجواب

(۱) جائز ہے جب کہ اس غیر مسلم کا اس مسجد میں کوئی دخل نہ ہو۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

اگر اس نے مسجد بنوانے کی صرف نیت سے مسلمان کو روپیہ دیا یا روپیہ دیتے وقت صراحتاً کہہ بھی دیا کہ اس سے مسجد بنوا دو مسلمان نے ایسا ہی کیا تو وہ مسجد ضرور مسجد ہو گئی اور اس میں نماز پڑھنی درست ہے۔

[فتاوی رضویہ قدیم، ۳۹۲/۶]

لیکن مسلمانوں کو ان نیک کاموں میں کافروں مشرکوں کی مدد نہیں لینی چاہئے۔

حضور اعلیٰ حضرت حدیث شریف کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"نا مسلم کا عطیہ کہ اس کے اپنے مال سے ہو خصوصاً اپنے اسلامی کام میں نہ لینا چاہئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

انی نھیت عن زبد المشرکین (مجھے مشرکوں کے عطیہ سے منع کر دیا گیا ہے)

اور فرماتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم: انی لا اقبل ھدیۃ مشرك (میں مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا)۔۔۔۔ اور فرماتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم: انا لا نقبل شیء من المشرکین (ہم مشرکوں کی کوئی شی قبول نہیں کرتے)۔۔۔ اور فرماتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم:

انا لا نستعین بمشرك (ہم مشرکوں سے مدد نہیں مانگتے)" [فتاوی رضویہ قدیم، ۴۶۰/۶]

(۲) مصافحہ کے بعد سینے پر ہاتھ لگانا ازروئے شرع جائز ہے۔ اس کے سنت، مستحب یا مستحسن ہونے کا حکم کتب احادیث وغیرہ میں نظر نہیں آیا لیکن اس کے ناجائز ہونے پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۳) اگر حدود شرع میں رہتے ہوئے تعلیم دیتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حدود شرع سے مراد یہ کہ عورت پردہ میں ہو اور دونوں خلوت میں نہ ہوں بلکہ عورت کے محارم میں سے کوئی ساتھ ہو فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، تو ضرورتاً علم سیکھنے اور سکھانے میں کوئی حرج نہیں ہے شرعاً۔ یہ اجازت اس وقت ہے کہ وہاں کوئی عورت قرآن بخوبی مخارج کی رعایت کے ساتھ پڑھنا نہ جانتی ہو اگر کوئی عورت وہاں ہے جو پڑھانے کی صلاحیت رکھتی ہے اور پڑھا سکتی ہے تو اسی سے پڑھنے کا حکم ہو گا۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر امام صاحب یا کوئی اور حافظ قاری صاحب بھی پڑھا سکتے ہیں بشرطیکہ حدود شرع ملحوظ رہے۔

مفتی عبد المنان اعظمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

ضرورتاً وہ اجنبی مرد کی آواز سن بھی سکتی ہے اور اس کو اپنی آواز سنا بھی سکتی ہے۔ اور قرآن کی تعلیم ایک دینی ضرورت ہے قرآن پڑھانے والی عورت نہ ہو تو مرد سے تعلیم حاصل کر سکتی ہے .... تعلیم کے لیے بے پردگی کیا ضروری ہے۔ عورت برقعہ کے اندر رہو اور اس کا جسم چھپا ہو اور ایسا انتظام ہو کہ استاذ سے کسی فتنہ کا ڈر نہ ہو تو قرآن سیکھنے میں یا دینی مسائل جاننے میں کوئی حرج نہیں" [فتاوی بحر العلوم، ۳۸۶/۱۔ کتاب الصلاۃ]

اور اگر امام صاحب، غیر محرم بے پردہ عورت کو خلوت میں پڑھائیں تو جائز نہیں ہے۔ اور ایسی صورت میں ان کی امامت بھی جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ عورت کے ساتھ خلوت میں رہنا اور عورت کا غیر محرم کے سامنے بے پردہ رہنا از روئے شرع حرام اور بہت سے فتنوں کا موجب ہے۔ ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

سودی رقم مسجد میں نہ لگائی جائے
سود خور کے یہاں دعوت نہ کھائیں
مسجد کی دکانوں اور کتابوں سے متعلق مسائل

فتوی ۱۰۷ مسئولہ: (مولانا) محمد ظہیر اشرف نعمانی خادم الطلبہ مدرسہ انصار العلوم بہیڑی بریلی شریف۔ ۲۵/ ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام مسئلہ ذیل کے بارے میں

(۱) کیا سودی پیسہ مسجد میں لگا سکتے ہیں؟

(۲) کیا سودی کے یہاں دعوت میں جا سکتے ہیں؟

(۳) کیا مسجد کی دکان نائی کو کرائے پر دے سکتے ہیں؟

(۴) نیچے دکانیں اور اوپر مسجد بنا سکتے ہیں؟

(۵) کیا مسجد کی کتب مدرسہ میں لے جا سکتے ہیں؟

مذکورہ بالا سوالات کے جوابات حوالجات سے مزین کر کے جلد از جلد بھجوادیں۔

عین نوازش ہو گی اشد ضرورت کے پیش نظر۔ بینوا توجروا۔

الجواب

(۱) سودی روپیہ مسجد میں لگانے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

درالحکام شرح غررالاحکام کے حاشیہ شرنبلالی میں اور فتاوی شامی میں ہے:

''إذا أنفق فی ذلك مالا خبیثا أو مالا مسببه الخبیث والطیب فیکرہ؛ لأن الله تعالیٰ لا یقبل إلا الطیب فیکرہ تلویث بیته بما لا یقبله''

یعنی مسجد میں خبیث مال اور مخلوط مال خرچ کیا تو مکروہ ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ طیب مال کے سوا قبول نہیں فرماتا۔ لہٰذا اس کے گھر میں غیر مقبول مال لگانا مکروہ ہے۔

[درالحکام، باب مکروہات الصلاۃ، ۱/۱۱۱، ردالمحتار، ۲/۴۳۱، باب مایفسد الصلاۃ ومایکرہ]

(۲) حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''سود خوار کے یہاں نہ کھانا بہتر ہے خصوصاً عالم ومقتداء کو اور فتوی وہی ہے کہ جب تک کسی خاص مال کی حرمت معلوم نہ ہو منع نہیں''[فتاوی رضویہ قدیم، جلد ۹ نصف اول صفحہ ۲۳۲]

مزید فرماتے ہیں:

''جو چیز بعینہٖ سود میں آئی ہو مثلاً گیہوں یا چاول، اس کا کھانا بلاشبہہ حرام ہے۔ اور اگر سود کے روپے سے خریدی گئی یوں کہ وہ روپیہ دکھا کر کہا گیا کہ اس کے بدلے دے دے اور پھر وہی روپیہ قیمت میں دے دیا تو یہ چیز بھی ناجائز ہو گئی، اور اگر ایسا نہیں تو حرمت نہیں، مگر سود خوار کے یہاں کھانے سے احتراز مناسب ہے۔ اور شبہہ کے مال سے زیادہ احتراز چاہئے مگر حرمت نہیں جب تک معلوم نہ ہو۔ بہ ناخذ مالم نعرف شیئا حراما بعینه هندیة عن الذخیرة عن محمد رحمه الله تعالیٰ'

(ہندیہ میں ذخیرہ کے حوالے سے امام محمد علیہ الرحمہ سے مروی ہے کہ ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں جب تک کسی معین چیز کے حرام ہونے کو نہ پہچانیں)''[فتاوی رضویہ قدیم، جلد ۹ نصف ثانی، صفحہ ۱۳۹]

(۳) مسجد کی دکان نائی کو کرائے پر دینا جائز ہے، اگرچہ نائی بال کاٹنے کے علاوہ داڑھی بھی مونڈتا ہے، لیکن یہ اس کا فعل ہے۔ اراکین مسجد تو دکان مطلقاً کرائے پر دیتے ہیں خاص داڑھی مونڈنے یا کسی اور حرام کام کے لئے نہیں اگر ایسا ہو تو وہ سب گنگار ہوں گے۔ علاوہ ازیں اس کی آمدنی سے کرایہ وصول کرنا بھی جائز ہے جب تک کہ کرایہ میں ملنے والی رقم کے بارے میں حرمت کا علم نہ ہو، حضور اعلیٰ حضرت ہدایہ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''من اٰجر بیتا لیتخذ فیه بیت نار او کنیسة اوبیاع فیه الخمر بالسواد فلا باس به لان الاجارة ترد علی منفعة البیت ولا معصیة فیه انما المعصیة بفعل المستاجر، اقول وهذا هو محمل مافی الغمز عن القنیة وفی جامع الرموز عن المنیة وفی المنح عن شمس الائمة الحلوانی، وفی ردالمحتار عن غرر الافکار عن المحیط عن الامام ان الاجر طیب وان کان السبب حراما کما حققناہ فی ماعلی ردالمحتار علقناہ فاحفظه فانه مزلة ومعضلة،

(جس نے مکان کرایہ پر دیا کہ اس میں آتش کدہ یا گرجا بنایا جائے یا وہاں شراب فروخت کی جائے تو کوئی حرج نہیں کیوں کہ اجارہ کا انعقاد مکان کی منفعت پر ہوا ہے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے گناہ تو کرایہ دار کے فعل سے ہوا۔ میں کہتا ہوں جو غمز میں قنیہ سے اور جامع الرموز میں منیہ سے اور منح میں شمس الائمہ حلوانی سے اور ردالمحتار میں غرر الافکار اس میں محیط سے اس میں حضرت امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ اجرت طیب ہوگی اگرچہ سبب حرام ہو، کا یہی محمل ہے جیسا کہ اس کی تحقیق ہم نے ردالمحتار پر اپنے حاشیہ میں کی ہے اس کو محفوظ کرلو، یہ پھسلنے کا اور مشکل مقام ہے"

[فتاوی رضویہ قدیم، ۱۷۶/۸]

البتہ دور حاضر میں نائی کی دکان پر عام طور پر داڑھی منڈانے والا کام ہی زیادہ ہوتا ہے اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ مسجد کی دکان داڑھی مونڈنے والے نائیوں کو نہ دی جائے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں "مگر اس صورت میں یعنی بحالت غلبہ حرام تقوی احتراز ہے۔

فان للاکثر حکم الکل بل منہم من نص عند ذٰلك علی عدم الجواز فالاسلم الاحتراز۔

(کیوں کہ اکثر پر کل کا حکم ہوتا ہے بلکہ بعض نے نص فرمائی ہے کہ ایسی صورت میں ناجائز ہے تو پرہیز میں سلامتی ہے)"

[مرجع سابق ص ۱۴۲]

(۴) تمامیت مسجد سے قبل اگر مسجد کے نیچے دکانیں بنائی جائیں تو جائز ہے تمامیت مسجد کے بعد نہیں۔ مجمع الانہر میں ہے:

''ولا یضر جعلہ أی جعل الواقف تحتہ أی تحت المسجد سردابا ھو بیت یتخذ تحت الأرض للتبرید وغیرہ لمصالحہ أی المسجد''، یعنی اگر واقف مسجد کے نیچے تہ خانہ جو ٹھنڈک وغیرہ مصالح مسجد کے لئے بنایا جاتا ہے، بنائے تو مضر نہیں ہے۔

[مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر، ۵۹۴/۲، کتاب الوقف]

در مختار میں ہے: ''وإذا جعل تحتہ سردابا لمصالحہ أی المسجد جاز''

یعنی اور جب مسجد کے نیچے مصالح مسجد کی غرض سے تہ خانہ بنائے تو جائز ہے۔ [الدر المختار، ۵۴۷/۶، کتاب الوقف]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"مسجد کردینے سے پہلے دکانیں وقف مسجد کیلئے بناتے اور اس کے بعد ان کی چھت کو مسجد کرتے تو جائز تھا"

[فتاوی رضویہ قدیم، ۴۷۷/۶]

(۵) جائز نہیں، فتاوی عالمگیری میں ہے:

''لا یجوز إعارتہا لمسجد آخر''، یعنی مسجد کا سامان دوسری مسجد کے لئے عاریتاً دینا جائز نہیں ہے۔

[فتاوی عالمگیری، ۳۲۲/۵، کتاب الکراہیۃ، الباب الخامس فی آداب المسجد]

اسی میں ہے: ''متولی المسجد لیس لہ أن یحمل سراج المسجد إلی بیت''

یعنی مسجد کے متولی کے لئے مسجد کا چراغ گھر لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔

[مرجع سابق، الباب الحادی عشر فی المسجد وما یتعلق بہ، ۴۶۲/۵]

وقف کردہ مسجد کو اپنی ملکیت بتانے والا مجرم ہے
مزار شریف کے نام سے چندا لے کر خود استعمال کرنا حرام ہے

فتوی ۱۰۸ مسئولہ: جعفر حسین موضع بابر کھیڑ ایوایس نگر۔۱۸؍ ربیع الغوث ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

(۱) زید نے مسجد کے لئے زمین وقف کی لہٰذا اس جگہ مسجد تعمیر ہوگئی اب زید کہتا ہے کہ یہ مسجد میری اور میرے باپ کی جاگیر ہے یہاں ایسا ہوگا جیسا میں چاہوں گا لہذا صورت مسئولہ میں زید کے بارے میں کیا حکم ہے اور ایسی مسجد میں نماز پڑھنے کے بارے میں کیا حکم ہے حالانکہ مسجد کی تعمیر عوامی چندے سے ہوئی ہے لہٰذا جواب سے نوازیں۔

(۲) صاحب مزار کے نام لوگوں سے راستہ میں چارپائی ڈال کر چندہ مانگنا کیسا ہے؟ یا جو عورتیں مزار کی گولق میں پیسہ ڈالنا چاہیں زید ان سے چھین کر اپنی جیب میں رکھے، زید کا صاحب مزار سے کوئی خاندانی رشتہ نہیں ہے، اور نہ ہی بستی نے زید کو سجادہ نشین چنا بلکہ زید خود اپنی مرضی سے مزار کا مالک بن رہا ہے، اور جو گولق وغیرہ میں پیسہ آتا ہے اس کو اپنے استعمال میں کرتا ہے۔ کیا یہ اس کے لئے جائز ہے؟ ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جواب سے نوازیں۔

الجواب

زید نے جب مسجد وقف کر دی تو اب وہ مسجد ہوگئی اس میں زید کی ملکیت کا دعوی باطل ہے۔ مسجد جب تک وقف نہ ہو مسجد نہیں کہلاتی اور مسجد ہونے کے بعد کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ قرآن پاک میں ہے:

''وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ'' اور یہ کہ مسجدیں اللہ ہی کی ہیں۔[ترجمہ کنز الایمان، سورہ جن آیت ۱۸ پارہ ۲۹]

محیط برہانی میں ہے: ''ملك الواقف قد زال بنفس الوقف'' یعنی وقف ہوتے ہی واقف کی ملکیت ختم ہوگئی۔

[محیط برہانی: ۱۲۸/۶، کتاب الوقف، الفصل الرابع: فیما یتعلق بالشروط فی الوقف،]

در مختار میں ہے: ''یزول ملکه عن المسجد'' یعنی واقف کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے مسجد ہونے سے۔[الدر المختار، کتاب الوقف]

ہدایہ میں ہے: ''اذا صح خرج من ملك الواقف'' یعنی جب وقف صحیح ہے تو وہ شی واقف کی ملکیت سے نکل گئی۔

[ہدایہ: کتاب الوقف، ج ۲ ص ۶۱۸]

بنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

''إذا صح الوقف یزول ملك الواقف'' جب وقف صحیح ہو تو واقف کی ملک زائل ہو جاتی ہے۔[۴۲۴/۷، کتاب الوقف]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''مسجد ہونے کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی شش جہت میں جمیع حقوق عباد سے منزہ ہو۔ اگر کسی حصہ میں بھی ملک عبد باقی ہے تو مسجد نہ ہوگی۔''[فتاوی رضویہ قدیم، ۴۵۳/۶]

صدر الشریعہ فرماتے ہیں:

''زید کا یہ کہنا کہ میں مالک مسجد ہوں بالکل غلط ہے۔ مساجد خالص ملک الٰہی ہیں کسی دوسرے کی ملک نہیں۔ ارشاد ہوا ان المسجد للہ۔ جس نے مسجد بنائی وہ بھی اس کا مالک نہیں ہوتا۔ نہ کہ دوسرا۔ بلکہ بنانے والا جب تک اسے اپنی ملک سے خارج نہ کردے مسجد نہیں ہوسکتی''[فتاوی امجدیہ، ۱۴۳/۳]

علاوہ ازیں زید نے مسجد کے لئے زمین دی اور لوگوں نے اس میں تعمیر کی تو زید زمین مسجد اور عوام تعمیر کے واقف کی حیثیت رکھتے ہیں تو جو حقوق زید کو زمین وقف کرنے کے سبب ملے ہیں وہی حقوق تعمیر میں حصہ لینے والوں کے لئے بھی ہیں۔

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

اصل مسجد زمین ہے تو زمین کا واقف اصل مسجد کا واقف ہے اور جس نے اس میں عمارت بنا کر وقف کی وہ بنا کا واقف ہے اور بنا اگرچہ وصف ہے اس کے لئے حکم جز ہے تو وہ بھی وقف مسجد میں شریک ہے۔[فتاوی رضویہ قدیم، ۵۲۶/۶]

مزید فرماتے ہیں:

''جب ان سب نے مل کر وہ مسجد بنائی سب اس کے واقف ہوئے جو حقوق کہ واقف کے ہیں سب کے لئے ہیں''

[مرجع سابق]

الحاصل: زید کا مسجد کو اپنی جاگیر بتانا سراسر غلط اور خلاف شریعت ہے زید کو چاہئے کہ اپنے اعمال ضائع نہ کرے اور شریعت کے مطابق مسجد کی خدمت کرے۔

(۲) چندہ کی رقم چندہ دہندگان کی ہے اس رقم کو ان کے مقصد کے علاوہ میں صرف کرنا یا خود رکھ لینا یا ان سے چھیننا ناجائز و حرام ہے۔ قرآن پاک میں مسلمانوں کا مال ناحق کھانے سے رب نے منع فرمایا۔ رب فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ

(اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ)[ترجمہ کنزالایمان، پارہ ۵ سورہ نساء آیت ۲۹]

اور رہا معاملہ سجادگی کا تو زید اس کا حقدار نہیں ہے۔ اس لئے کہ طریقت میں سجادہ نشینی کا طریقہ یہ ہے کہ گدی نشین اپنی حیات میں جس کو چاہیں اپنا قائم مقام بنادیں، ان کے بعد وہی سجادہ نشین کہلائے گا۔ زید کو صاحب مزار سے سجادگی حاصل نہیں تو وہ سجادہ کیسے بن سکتا ہے؟ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''سجادہ نشینی خلافت خاصہ ہے جس میں اجرائے سلسلۂ سجادہ و تولیت اوقاف درگاہ اور جملہ نظم و نسق و رتق و فتق و جمع و فرق و نصب و عزل عملہ میں صاحب سجادہ کی نیابت مطلقہ سب داخل اور کوئی خاص بے عام متحقق نہیں ہوتا اور شرعاً معروف کالمشروط ہے۔ معروف یہی ہے کہ سجادہ نشین وہی ہوسکتا ہے جو اس سلسلہ میں ماذون و مجاز ہو کہ اس کا بڑا مقصد اس سلسلہ کا احیا ہے نہ کہ مجرد تولیت۔ ولہٰذا جو سلسلہ صاحب درگاہ میں خلافت صحیحہ نہ رکھتا ہو کہیں سجادہ نشین نہیں کیا جاتا۔''

[فتاوی رضویہ قدیم۔ ۵۲۰/۶]

زید کا خود سجادہ بن جانا اور غیر شرعی حرکتیں کرنا لوگوں کا ناحق مال کھانا، جو رقم مزار پر صرف کرنے کے لئے دی گئی ہے وہ خود پر خرچ کرنا گناہ ہے۔ او زید اس گناہ کے سبب فاسق ہے۔ اور فاسق سجادگی کا کسی بھی حال میں اہل نہیں

ہوسکتا ہے۔زید کو چاہئے کہ غیر شرعی حرکات سے باز آئے اور شریعت کے احکام کی پیروی کرے۔اوراگر زید اپنی ان حرکات قبیحہ سے باز نہ آئے تو اہل بستی کو چاہئے کہ اس کا بائیکاٹ کریں اس سے بالکل قطع تعلق کرلیں۔تاکہ ان سے کسی طرح کا کوئی مواخذہ نہ ہو۔

ھٰذا ماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم

مسجد میں محراب کے اوپر کمرا بنانے اورامام صاحب کے رہنے کا حکم

فتوی ۱۰۹ مسئولہ:اراکین کمیٹی غوثیہ مسجد نئی کردم پوری دہلی۔۲۵/شوال المکرم ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں

ہمارے محلہ کی مسجد میں جس جگہ محراب بنی ہوئی ہے اس کے اوپر امام صاحب وغیرہ کے رہنے کے لئے ایک حجرہ بناہوا ہے،وہاں امام صاحب مع اہل وعیال رہتے ہیں ۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مسجد کے اوپر حجرے میں امام صاحب کا رہنا ٹھیک نہیں ہے،شریعت کی روشنی میں تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔اور عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں مسجد کے اوپر بنے ہوئے حجرے میں امام صاحب وغیرہ کی رہائش کے جوازوعدم جواز سے متعلق جاننے سے قبل یہ جان لیں کہ محراب عموماً مسجد ہی میں ہوتی ہے،ہمیشہ سے لوگوں کی عادت بنی ہوئی ہے کہ محراب مسجد کے اندر ہی بناتے ہیں جیسا کہ فتاوی شامی میں بھی لکھا ہوا ہے:''کان المحراب من المسجد کماھوالعادۃ المستمرۃ''

یعنی محراب مسجد میں ہو جیسا کہ دائمی معمول ہے۔[ردالمحتار،کتاب الصلاۃ،باب مایفسد الصلاۃ،۴۱۴/۲]

اسی لئے علامہ شامی نے دوسرے مقام پر محراب سے متعلق فرمایا:

''المحراب...کان من بقاع المسجد''،یعنی محراب مسجد کا ہی ایک حصہ ہے،[مرجع سابق]

مزید فتاوی عالمگیری میں محراب کے ساتھ اس سے متصل جگہ کو بھی مسجد کے حکم میں ماناہے،لکھاہے:

''داخل المحراب لہ حکم المسجد''،یعنی محراب کا اندرونی حصہ مسجد کے حکم میں ہے۔

[فتاوی ہندیہ،کتاب الکراہیۃ،الباب الخامس فی آداب المسجد،۳۲۱/۵]

اورجب محرابِ مسجد اوراس سے متصل جگہ مسجد ہی کے حکم میں ہے،تو پھر اس کا بالائی حصہ پر بھی مسجد کا ہی حکم ہوگا،اس لئے کہ مسجد کا بالائی حصہ مسجد کے حکم ہی میں ہوتا ہے۔جیسا کہ البحرالرائق شرح کنزالدقائق میں ہے:

''سطح المسجدلہ حکم المسجد''،یعنی مسجد کی چھت کے لئے مسجد کا حکم ہے۔

[کتاب الصلاۃ،باب مایفسد الصلاۃ ومایکرہ فیھا،۲/۲۰]

محیط برہانی میں ہے:''فعلم ان لسطح المسجدحکم المسجد''،یعنیجان لیاگیا کہ کہ مسجد کی چھت کے لئے مسجد کا حکم ہے۔

[۳۱۷/۵،کتاب الاستحسان والکراہیۃ،الفصل الخامس فی المسجد]

تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق میں ہے:

''سطح المسجد مسجد الی عنان السماء''، یعنی مسجد کی چھت آسمان کی بلندی تک مسجد ہی ہے۔

[باب مایفسد الصلاۃ، ۱/۱٦۸]

اسی لئے فقہانے مسجد کے اوپر گھر بنانا تو الگ اس میں بلاوجہ شرعی چڑھنے اور نیچے جگہ ہوتے ہوئے نماز پڑھنے سے بھی سخت منع فرمایاہے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

''الصعود علی سطح کل مسجد مکروہ ولھٰذا اذا اشتد الحر یکرہ ان یصلوا بالجماعۃ فوقہ''

یعنی ہر مسجد کی چھت پر چڑھنا مکروہ ہے۔ اور اسی لئے جب کہ شدت کی گرمی ہو مکروہ ہے کہ لوگ جماعت کے مسجد کے اوپر نماز پڑھیں۔ [کتاب الکراہیۃ، باب الخامس فی آداب المسجد، ۳۲۲/۵]

اب صورت مسئولہ کا حکم ملاحظہ فرمائیں۔

مسجد میں محراب کے اوپر چھت پر امام صاحب کی رہائش کے لئے حجرہ بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ مسجد کی تعمیر کے وقت مصالح مسجد کی غرض سے اس حجرے کو بنایا گیا یا تمامیت مسجد کے بعد اگر تمامیت مسجد کے بعد بنایا تو ازروئے شرع ہرگز اس کی اجازت نہیں ہوگی، درمختار میں ہے:

''لوتمت المسجدیۃ ثم اراد البناء منع''، یعنی اگر مسجد پوری ہوگئی پھر گھر بنانا چاہے گا تو روکا جائے گا۔

[کتاب الوقف، ۵۴۸/٦]

اور اگر پھر بھی بنالے تو اسے ڈھادینا ضروری ہوگا جیسا کہ بحر الرائق میں ہے:

''فمن بنی بیتا علی جدار المسجد وجب ھدمہ''، یعنی جس شخص نے مسجد کی دیوار پر گھر بنایا تو اس کا ڈھانا واجب ہے۔

[بحر الرائق، ۴۲۱/۵، کتاب الوقف، فصل فی احکام المسجد،]

مفتی حبیب اللہ صاحب نعیمی اس تعلق سے فرماتے ہیں:

''مسجد کی چھت پر امام صاحب کے رہنے کے لئے حجرہ بنانا جائز نہیں ہے اور نہ اس حجرہ میں رہنا سہنا کھانا پینا جائز ہوگا۔ اس حجرہ کو جو چھت پر بنایا گیاہے منہدم کر دیا جائے'' [حبیب الفتاوی، ۲۵۸/۳]

اور اگر تمامیت مسجد کے قبل مصالح مسجد کے پیش نظر مسجد کے اوپر گھر بنایا تو ازروئے شرع وہ گھر ٹھیک اور اس میں رہنا جائز ہوگا۔ بحر الرائق میں ہے:

''لوبنی بیتا علی سطح المسجد لسکنی الإمام فإنہ لایضر فی کونہ مسجدا لأنہ من المصالح''

اگر مسجد کی چھت پر امام کے رہنے کے لئے گھر بنایا تو مسجد ہونے میں کوئی نقصان نہیں اس لئے کہ یہ بھی مسجد کے مصالح سے ہے۔[مرجع سابق]

درمختار میں ہے: ''لوبنی فوقہ بیتا للامام لایضر لانہ من المصالح''، اگر مسجد کی چھت پر امام کے کے لئے گھر بنایا تو کوئی نقصان نہیں اس لئے کہ یہ بھی مسجد کے مصالح سے ہے۔[کتاب الوقف، ۵۴۸/٦]

حضور اعلیٰ حضرت در مختار، اور بحر الرائق کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"در مختار مطبع قسطنطنیہ جلد ۳ ص ۵۷۳ میں ہے: لو بنی فوقه بیتا للامام لایضر لانه من المصالح اما لوتمت المسجدیة ثم ارادہ البناء منع ولو قال عنیت ذٰلك لم یصدق تاتارخانیة فاذا کان هذا فی الواقف فکیف بغیرہ فیجب هدمه ولو علی جدار المسجد۔

یعنی اگر مسجد کی چھت پر امام کے لئے گھر بنایا تو نقصان نہیں کہ یہ بھی مصالح مسجد سے ہے مگر مسجد پوری ہونے کے بعد اگر امام کیلئے بھی گھر بنانا چاہے گا نہ بنانے دیں گے اور اگر کہے گا میری پہلے سے یہی نیت تھی جب بھی نہ مانیں گے یہ تاتارخانیہ میں ہے۔ تو جب یہ حکم خود بانی مسجد پر ہے تو دوسرے کا کیا ذکر، تو اس کا ڈھادینا واجب ہے اگرچہ مسجد کی فقط دیوار ہی پر کچھ بنایا ہو۔ بحر الرائق مطبع مصر جلد ۵ ص ۲۷۱ میں ہے:

اذا کان هذا فی الواقف فکیف بغیرہ فمن بنی بیتا علی جدار المسجد وجب هدمه۔ یعنی جب خود بانی مسجد کو ممانعت ہے تو غیر بانی کیا چیز ہے تو جو شخص مسجد کی دیوار پر کوئی عمارت بنائے اس کا ڈھادینا واجب ہے۔" [فتاوی رضویہ قدیم، ۴۱۴/۶]

الحاصل: مسجد کے اوپر امام صاحب کے رہنے کے لئے جو کمرہ ہے وہ اگر تعمیر مسجد کے وقت مسجد کی تمامیت سے پہلے ہی بنایا گیا ہے تو اس میں امام صاحب اوران کے اہل وعیال کی رہائش بالکل جائز و درست ہے۔ اور اگر مسجد کی تعمیر پوری ہونے کے بعد بنایا گیا تو ہرگز اس میں رہائش وغیرہ کی اجازت نہیں ہوگی۔ ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

منبر و محراب کے اوپر حجرے میں امام صاحب کی رہائش جائز ہے

فتوی ۱۱۰ مسئولہ: اراکین کمیٹی غوثیہ مسجد نئی کردم پوری دہلی۔ ۲۷ر شوال المکرم ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں

ہمارے محلہ کی مسجد میں منبر و محراب بنی ہوئی ہے اس کے اوپر کمرہ بناہوا ہے اوراس کی تعمیر مسجد کی تعمیر مکمل ہونے سے پہلے کی گئی ہے۔ اس میں امام صاحب اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہتے ہیں کیا ان کا رہنا عند الشرع جائز ہے؟

قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں مسجد کے اوپر بنے ہوئے حجرے میں امام صاحب اوران کے اہل وعیال کی رہائش جائز ہے۔

کیوں کہ اگر تمامیت مسجد کے قبل مصالح مسجد کے پیش نظر مسجد کے اوپر گھر بنایا تو ازروئے شرع وہ گھر ٹھیک اوراس میں رہنا جائز ہوگا، بحر الرائق میں ہے:

''لو بنی بیتا علی سطح المسجد لسکنی الإمام فإنه لا یضر فی کونه مسجدا لأنه من المصالح''

یعنی اگر مسجد کی چھت پر امام کے رہنے کے لئے گھر بنایا تو مسجد ہونے میں کوئی نقصان نہیں اس لئے کہ یہ بھی مسجد کے مصالح سے ہے۔ [مرجع سابق]

در مختار میں ہے: ''لوبنی فوقه بیتاللامام لایضرلانه من المصالح''
یعنی اگر مسجد کی چھت پر امام کے کے لئے گھر بنایا تو کوئی نقصان نہیں اس لئے کہ یہ بھی مسجد کے مصالح سے ہے۔
[کتاب الوقف، ۵۴۸/۶]

حضور اعلیٰ حضرت در مختار، اور بحر الرائق کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''در مختار مطبع قسطنطنیہ جلد۳ ص ۵۷۳ میں ہے:لو بنی فوقه بیتا للامام لایضر لانه من المصالح امالوتمت المسجدیة ثم ارادہ البناء منع ولو قال عنیت ذٰلك لم یصدق تاتارخانیة فاذاکان هذا فی الواقف فکیف بغیرہ فیجب هدمه ولوعلی جدار المسجد۔
یعنی اگر مسجد کی چھت پر امام کے لئے گھر بنایا تو نقصان نہیں کہ یہ بھی مصالح مسجد سے ہے مگر مسجد پوری ہونے کے بعد اگر امام کیلئے بھی گھر بنانا چاہے گا نہ بنانے دیں گے اور اگر کہے گا میری پہلے سے یہی نیت تھی جب بھی نہ مانیں گے یہ تاتارخانیہ میں ہے۔''[فتاوی رضویہ قدیم، ۴۱۴/۶]

الحاصل: مسجد کے اوپر امام صاحب کے رہنے کے لئے جو کمرہ تعمیر مسجد کے وقت مسجد کی تمامیت سے پہلے بنایا گیا ہے اس میں امام صاحب اوران کے اہل وعیال کی رہائش بالکل جائز ودرست ہے۔ھٰذا ماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ

فتوی ۱۱۱ وقفی قبرستان کی اینٹیں کہیں اور نہیں استعمال کر سکتے

مسئولہ: غلام شہنشاہ عالم ساکن بابر کھیڑا جس پور۔ ۲۲؍ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ

کیافرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں
ساکن کونڈا میں ایک قبرستان ہے۔کافی عرصہ پہلے اس کی چہار دیواری کی گئی تھی۔اب پرانی چہار دیواری دوبارہ سے بنائی گئی ہے اس میں پرانی کچھ اینٹیں بچ گئی ہیں توکیاان بچی ہوئی اینٹوں کو مسجد میں استعمال کر سکتے ہیں ؟شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

اگر قبرستان وقفی ہے تو اس کی اینٹیں مسجد وغیرہ کو دینے کی اجازت نہیں ہے۔
البتہ تعمیر کے بعد اس کی اینٹیں وغیرہ اگر اس کے استعمال میں نہ آئیں اوران کے ضائع ہو جانے کا خوف ہو توان کو حاکم یا متولی یاعامۂ مسلمین بیچ کر قبرستان کے دیگر مصارف کے لئے محفوظ رکھیں۔لیکن اسے کسی مسجد میں یا کسی مدرسہ یا دوسرے قبرستان میں دینے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔در مختار میں ہے:

صرف الحاکم اوالمتولی نقضه اوثمنه ان تعذر اعادۃ عینه الی عمارته ان احتاج والاحفظه لیحتاج، الااذاخاف ضیاعه فیبیعه ویمسك ثمنه لیحتاج۔

یعنی اگر وقف کا اعادہ بعینہ اس کی عمارت کی طرف دشوار ہو توحاکم یا متولی، وقفی منقوض (لکڑی، اینٹ، پتھر وغیرہ) یااس کی

قیمت کو صرف کرے۔ اگر حاجت ہو مرمت کی، ورنہ قضائے حاجت کے لئے محفوظ رکھے، مگر جب اس کے ضائع ہونے کا ڈر ہو تو اس کو فروخت کر کے ثمن وقف حاجت کیلئے رکھ چھوڑے۔" [الدر المختار، ۳۷۷/۴، کتاب الوقف]

حضور اعلیٰ حضرت ایک وقف کا مال دوسرے وقف کے لئے استعمال کرنے کا حکم شرعی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"دونوں صورتیں حرام ہیں مسجد جب تک آباد ہے اس کا مال نہ کسی مدرسے میں صرف ہو سکتا ہے نہ دوسری مسجد میں، یہاں تک کہ اگر ایک مسجد میں سو چٹائیاں یا لوٹے حاجت سے زیادہ ہوں اور دوسری مسجد میں ایک بھی نہ ہو تو جائز نہیں کہ یہاں کی ایک چٹائی یا لوٹا دوسری مسجد میں دے دیں۔ در مختار میں ہے:

اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف عليه جائز للحاكم، ان يصرف عن فاضل الوقف الاخر اليه لانهما حينئذ كشيء واحد وان اختلف احدهما بان بنى رجلان مسجدين او رجل مسجدا ومدرسة ووقف عليهما اوقافا لايجوز له ذلك۔

دو وقفوں کا واقف بھی ایک ہو اور ایک ہی چیز پر وقف ہوں، ان میں ایک کی آمدنی کم ہو جائے تو حاکم کو جائز ہے کہ دوسرے وقف کی بحث سے اس پر خرچ کرے اس لئے کہ اس حالت میں وہ دونوں گویا ایک ہی چیز ہیں، اور اگر واقف دو ہوں یا جدا جدا چیزوں پر وقف ہوں جیسے دو شخصوں نے دو مسجدیں بنائیں یا ایک شخص نے ایک مسجد اور ایک مدرسہ بنایا اور ان پر جائدادیں وقف کیں تو اب حاکم کو بھی جائز نہیں کہ ایک کا مال دوسرے میں صرف کرے۔ رد المحتار میں ہے:

المسجد لايجوز نقل ماله الى مسجد اخر۔ جائز نہیں کہ ایک مسجد کا مال دوسری مسجد کو لے جائیں۔"

[فتاوی رضویہ جدید، ۲۸۱/۱۶]

الحاصل: قبرستان کی اینٹیں قبرستان ہی کے لئے محفوظ رکھی جائیں۔ اور اگر ایسا ہو کہ اب ان کا کوئی کام ہی نہیں ہے اور ان کے ضائع ہو جانے کا خوف ہو تو مسلمانوں کے مشورہ سے ان کو بیچ کر قبرستان ہی میں اس کی رقم خرچ کی جائے۔ یا آئندہ کے لئے محفوظ رکھی جائے کہ کبھی ضرورت ہو تو یہ رقم قبرستان کے کام آجائے، کسی مسجد وغیرہ کو دینے کی اجازت نہیں ہے شرعاً۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۱۱۲

وقفی قبرستان میں دکان وغیرہ بنانے اور مدرسہ میں بازار لگوانے کا شرعی حکم

مسئولہ: محمد نسیم انصاری ٹھاکر دوارہ۔ ۲۰؍ شعبان المعظم ۱۴۳۷ھ

کیا حکم ہے شریعت کا ان مسائل کے بارے میں

(۱) ایک قبرستان ٹھاکر دوارہ میں ہائی وے روڈ پر واقع ہے اس کے فرنٹ پر کچھ بھومافیہ لوگوں نے دکانیں شروع کر دی ہیں اہل بستی نے جج صاحب سے اسٹے آڈر لے لیا ہے بستی والے چاہتے ہیں کہ قبرستان کی صرف چہار دیواری ہو اور گیٹ لگے اب یہ مافیہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ محمد نسیم انصاری نے دین کے کام میں اڑنگا لگا دیا ہے مہربانی فرما کر بتلائیں کہ ان لوگوں کا یہ عمل صحیح ہے یا غلط؟ اور ان دکانوں سے جو آمدنی ہوگی اس کو کہاں کہاں لگا سکتے ہیں؟

کسی مدرسہ میں کسی مسجد میں یا کسی غریب لڑکی کی شادی میں یا قبرستان کے علاوہ کہیں اور لگا سکتے ہیں ؟ قرآن اور حدیث کی روشنی میں جواب کا طالب ہوں۔

(۲) یہاں پر ایک مدرسہ ہے انوارالعلوم یہ لوگ اس میں ہفتہ کے روز بازار لگواتے ہیں پھڑ والوں سے تہہ بازاری کے طور پر پیسہ وصول کرتے ہیں بازار میں ہندو مسلم عورتیں بے پردہ خریداری کرتی ہیں اور گرہ کٹ عورتیں اور مرد غنڈہ گردی کرتے ہیں مدرسہ میں اس طرح بازار لگوانا کہ شریعت کی دھجیاں اڑتی ہوں بے پردگی اور بے حیائی کا نظارہ ہو قرآن وحدیث کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں ؟ صحیح جواب سے نوازیں۔

الجواب

(۱) قبرستان اگر وقف شدہ ہے تو اس میں وقف کے اصل مقصد کے خلاف کسی طرح کا تصرف ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے اور شرعاً اس میں دکان وغیرہ بنانے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ وقف شدہ قبرستان خواہ اس میں قبریں ہوں یا نہ ہوں اس کو اس کی اصل حالت پر رکھنا واجب ہے شرعاً۔ وقفی قبرستان میں دکان وغیرہ بنانے کے ناجائز ہونے پر فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاوی عالمگیری میں ہے:

''ولا یجوز تغییر الوقف عن ھیئته فلا یجعل الدار بستانا ولا الخان حماما ولا الرباط دکانا''

یعنی وقف کو اس کی ہیئت سے بدلنا جائز نہیں ہے لہٰذا مکان کو باغ اور سرائے کو حمام اور اصطبل کو دکان نہیں بنایا جائے گا۔''

[فتاوی عالمگیری، کتاب الوقف، جلد ۲ ص ۴۹۰]

بلکہ وقف کو اس کی اصل حالت پر رکھنا واجب ہے نہ اس میں کمی کر سکتے ہیں نہ زیادتی۔ فتاوی شامی میں ہے:

''الواجب ابقاء الوقف علی ما کان علیه دون زیادۃ'' یعنی وقف کا باقی رکھنا بغیر کمی وزیادتی کے واجب ہے۔

[ردالمحتار، کتاب الوقف، ج ۶ ص ۵۸۸]

محیط برہانی میں ہے:

''سئل الإمام شمس الأئمة محمود الأوزجندی عن المقبرۃ إذا اندرست ولم یبق فیھا أثر الموتی لا العظم ولا غیرہ ھل یجوز زرعھا واستغلالھا قال: لا، ولھا حکم المقبرۃ''

یعنی نیست ونابود مقبرہ جس میں ہڈی وغیرہ میت کا کوئی اثر باقی نہ رہا ہو اس میں کھیتی اور غلہ حاصل کرنے کے جواز وعدم جواز سے متعلق امام شمس الائمہ محمود اوزجندی سے سوال کیا گیا فرمایا کہ جائز نہیں اوہ وہ مقبرہ کے حکم میں ہے۔

[محیط برہانی، کتاب الوقف، جلد ۶ ص ۲۲۰]

حضور اعلیٰ حضرت رضی المولیٰ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کا عام قبرستان وقف ہوتا ہے اور اس میں سوائے دفن کے اور تصرف کی اجازت نہیں اسے تجارت گاہ بنانا یا اس پر کھیت کرنا سب حرام ہے'' [فتاوی رضویہ قدیم، جلد ۶ ص ۴۹۳]

الحاصل:۔ قبرستان میں اس طرح کا ناجائز تصرف کرنے والے لوگ مجرم ہیں۔ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس جگہ کا جائز اور وقف کے مقصد کے مطابق استعمال کریں اور وقف کے مقصد کے خلاف نہ اس میں کوئی کام کریں اور نہ کرنے دیں۔ جن لوگوں نے وہاں دکانیں بنائی ہیں وہ بلاشبہہ مجرم اور عذاب شدید کے مستحق ہیں انہیں چاہئے کہ وہ فوراً قبرستان کی جگہ کو خالی کریں اور اللہ کے عذاب سے خوف کریں اپنے اس فعل سے باز آئیں اور توبہ کریں۔

(۲) مدرسہ دینی تعلیم کا مرکز ہوتا ہے اسے بنانے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہاں دینی تعلیم دی جائے مدرسہ کو دوسرے کاموں میں لانا ہرگز جائز نہیں ہے۔ یہ بازار اگر مدرسہ کے اندر لگتا ہے تب تو اس کے خلاف شرع ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے۔ اور اگر مدرسہ سے ہٹ کر اس کی تعلیمی سرگرمیوں میں استعمال نہ ہونے والی جگہ میں لگتا ہے تو مدرسہ کی آمدنی کی نیت سے اس میں بازار لگوانا درست ہے۔ البتہ اس میں خلاف شرع جو امور ہوتے ہیں مدرسہ کے ذمہ داروں پر لازم ہے کہ وہ ان کو روکیں اور حد شرع میں رہتے ہوئے اس زمین کا استعمال کریں۔ ورنہ شرعاً مجرم مانے جائیں گے۔ علاوہ ازیں یہ جواز کی صورت بھی تب ہے جب کہ وہ زمین خاص وقف کی نہ ہو۔ اگر وہ زمین وقف کی ہے تو پھر اس کا حکم یہی ہے کہ اس کو سوائے مدرسہ کے کسی اور کام میں نہیں لا سکتے۔ حضور اعلیٰ حضرت رضی المولیٰ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

”شرع مطہر میں بلا شرط واقف کہ اسی وقف کی مصلحت کیلئے ہو وقف کی ہیأت بدلنا بھی ناجائز ہے۔ اگرچہ اصل مقصود باقی رہے۔ تو بالکل مقصد وقف باطل کر کے ایک دوسرے کام کے لیے دینا کیونکر حلال ہو سکتا ہے۔ سراج وہاج و فتاوی عالمگیری وغیرہما میں ہے: لایجوز تغییر الوقف عن ہیأته فلایجعل الدار بستانا ولاالخان حماما ولاالرباط دکانا الا اذاجعل الواقف الی الناظر مایری فیه مصلحة الوقف

(وقف کی ہیئت میں تبدیلی کرنا جائز نہیں، لہٰذا مکان کو باغ، سرائے کو حمام اور اصطبل کو دکان نہیں بنایا جائے گا مگر اس وقت یہ تبدیلی ناجائز نہ ہوگی جب واقف نے خود متولی کو اختیار دیا ہو کہ مصلحت کیلئے جو تبدیلی بہتر سمجھیں کرلیں)“

[فتاوی رضویہ قدیم، جلد ۶ ص ۴۲۱]

فتوی ۱۱۳ — وقف شدہ قبرستان میں ذاتی تصرف جائز نہیں

مسئولہ: (مولانا) محمد سلیم نعیمی دڑھیال (مفتی) جلیس احمد القادری، دڑھیال ضلع رامپور۔ ۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں

ایک ادارہ کی عمارت اراضی قبرستان میں قائم ہے اور یہ ادارہ تقریباً ۱۴ سال سے چل رہا ہے۔ اب محلہ کے کچھ اہل خیر و صلاح اس ادارہ کو بہ صورت جواز تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ اس کے چاروں طرف مسلم آبادی ہے اور افراد محلہ اس کے قرب و جوار کی جگہ کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔ اگر اس جگہ کو یوں ہی خالی چھوڑ دیا جائے تو اس کے استعمال کا اندیشہ بلکہ قبضہ کا بھی اندیشہ موجود ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ ادارہ کو جائز طریقہ پر بنانے کی صورت کیا ہوگی اور جو لوگ قبرستان کی جگہ کو استعمال کرتے ہیں ان کے تعلق سے شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے جواب عنایت فرمائیں عین کرم ہوگا۔

الجواب

اراضی قبرستان اگر وقف شدہ ہے تو اس میں مدرسہ، مسجد بنانا یا وقف کے اصل مقصد کے خلاف اس میں کسی طرح کا تصرف ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے۔ اور شرعاً اس میں مدرسہ وغیرہ بنانے کی کوئی جائز صورت نہیں ہے۔

وقف شدہ قبرستان خواہ اس میں قبریں ہو یا نہ ہو اس کو اس کی اصل حالت پر رکھنا واجب ہے۔

وقفی قبرستان میں مدرسہ وغیرہ بنانا خواہ قبریں ہوں یا نیست و نابود ہو گئیں ہوں یا وہاں اب تک قبریں بنی ہی نہ ہوں ان تینوں صورتوں کا حکم شرعی بیان کرتے ہوئے حضور صدر الشریعہ کتب فقہ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"وقفی قبرستان میں ان چیزوں کا بنانا جائز نہیں فتاوی عالمگیری میں ہے:

ولا یجوز تغییر الوقف عن هیئته فلا یجعل الدار بستانا ولا الخان حماما ولا الرباط دکانا،

فتح القدیر ورد المحتار وشرح الاشباہ للعلامۃ البیری میں ہے، الواجب ابقاء الوقف علی ما کان علیه دون زیادة"

آگے لکھتے ہیں:

"بلکہ اگرچہ قبریں نیست و نابود ہو گئی ہوں جب ایسے قبرستان میں مدرسہ وغیرہ بنانا ناجائز کہ اب بھی وہ مقبرہ ہے فتاوی عالمگیری میں ہے: سئل الإمام شمس الأئمة محمود الأوزجندی عن المقبرة إذا اندرست ولم یبق فیها أثر الموتی لا العظم ولا غیره هل یجوز زرعها واستغلالها، قال: لا، ولها حکم المقبرة، کذا فی المحیط"

اور لاعلمی میں مدرسہ بنا دینے کی صورت میں حکم شرعی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کو منہدم کر دیا جائے کہ یہ تصرفات ناجائز ہیں اور وقف کا اپنے حال پر باقی رکھنا واجب ہے۔"

نیز قبرستان کی خالی جگہ کے استعمال کے تعلق سے فرماتے ہیں:

"قبرستان وقفی خالی زمین پر بھی نہ کوئی اپنا مکان بنا سکتا ہے نہ اسے اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔"

[فتاوی امجدیہ۔ج ۳ص ۱۷، ۱۶]

وقفی قبرستان کی اراضی میں مدرسہ وغیرہ کی تعمیر کا جواز اس صورت میں ممکن تھا جب کہ وہ اراضی ایسی ہو جہاں پر قبریں بنا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں وقف شدہ اراضی چونکہ واقف کی ملکیت میں لوٹ آتی ہے اور پھر واقف یا اس کے ورثہ کو وہ نہ ہوں تو عام مسلمانوں کو اس میں جائز تصرف کی اجازت مل جاتی ہے۔

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

البتہ جو زمین اس میں قبور سے جدا تھی وہ ازانجا کہ اب وہاں دفن ممکن نہ رہا ملک اصل واقف کی طرف عود کر گئی اس کے ورثہ کو اختیار ہے ان کی اجازت سے اس قدر کو متعلق مسجد کر سکتے ہیں اور واقف نہ معلوم ہو یا ورثہ کا پتہ نہیں تو مسلمانوں کا یہ فعل باستثناء مواضع قبور ممنوع نہیں۔" [فتاوی رضویہ قدیم، ۳۴۰/۶]

اعلیٰ حضرت قبرستان قدیم میں خلاف وقف تعمیر کے سلسلے میں جواز و عدم جواز کی دو صورتیں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"رہامسلمانوں کا قبرستان قدیم کہ وہ ضرور دفن موتے کے لئے موقوف ہوتا ہے اس میں دوصورتیں ہیں اگر وہ قبرستان ہنوز قابل کار ہو کہ اس میں دفن اموات کو جگہ بھی اور کسی اوروجہ کے باعث اس سے استغنا بھی نہ ہو گیا ہو نہ داخل حدود شہر ہونے کے سبب اس میں دفن کی ممانعت انگریزی طور پر ہو گئی جب تو اسے پاٹ کر دفن سے روک دینا سرے سے ناجائز وحرام ہے کہ یہ ابطال غرض وقف ہے۔ اور وہ اصلا روا نہیں۔

عالمگیریہ میں ہے: لایجوز تغییرالوقف فتح القدیر میں ہے الواجب ابقاء الوقف علی ماکان علیہ، اوراگر وہ قابل کار نہ رہایا اس سے استغنا ہو گیا یا وہاں دفن کی ممانعت ہو گئی جس کے سبب اب وہ اس کام میں صرف نہیں ہو سکتا یا مسجد قدیم لب مقبرہ واقع ہے یہ بیرون حدود مقبرہ ستون قائم کرکے اوپر کافی بلندی پر پاٹ کر چھت کو صحن مسجد سابق سے ملا کر مسجد کر دینا چاہتا ہے اس طرح کہ زمین مقبرہ نہ رکے نہ اس میں دفن موتی کرنے اوراس کی غرض سے لوگوں کے آنے جانے کی راہ رکے نہ اس چھت کے ستون قبور مسلمین پر واقع ہوں بلکہ حدود مقبرہ سے باہر ہوں تو اس میں حرج نہیں جب کہ وہ زمین جس میں ستون قائم کئے گئے متعلق مسجد ہو اور کارروائی اہل محلہ کی یا ان کے اذن سے ہو یا وہ زمین اس بانی سقف یا کسی دوسرے مسلمان کی ملک ہو اور مالک اسے ہر کام کے لئے وقف کر دے یا وہ زمین افتادہ بیت المال ہو اوراس میں اس کارروائی سے مسلمانوں کے راستے وغیرہ کو ضرر نہ ہو کہ ان حالتوں میں اس نے کوئی بیجا تصرف نہ کیا نہ وقف کو روکا نہ اس کی زمین کو کسی دوسرے کام میں صرف کیا صرف بالائی ہوا میں کہ نہ موقوف تھی نہ مملوک ایک تصرف غیر مضر نفع مسلمین کے لئے کیا"

[فتاوی رضویہ قدیم، ۴۰۰/۶، ۳۹۹]

استفتا میں ذکر کردہ تفصیل دیکھنے کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اعلی حضرت کی بیان کردہ صورت جواز یہاں کام نہیں آئے گی۔ کیوں کہ اعلیٰ حضرت کی بیان کردہ صورت جواز میں جن باتوں کا ذکر ہے وہ یہاں مفقود ہیں۔

الحاصل: استفتاء میں ذکر کردہ تفصیل کی صورت میں جواز کی کوئی صورت ازروئے شرع نظر نہیں آتی۔

اولاً اس لئے کہ قبرستان قدیم اوروقف شدہ ہے اور شرعاً وقف شدہ قبرستان میں خلاف مقاصد وقف کسی طرح کی کوئی تعمیر جائز نہیں۔

ثانیاً قبرستان میں قبریں ہونے کی صورت میں اس پر کسی طرح کی کوئی تعمیر جائز نہیں ہے اور قبریں نہیں ہیں مطلب پہلے تھیں اب نہیں ہیں یہ صورت بھی مانع جواز ہے۔

ثالثاً وہاں قبریں بنی ہی نہیں تو اس کی دووجہ ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ وہاں قبریں بننا ممکن ہی نہ تھی تو ایسی صورت میں جواز تعمیر کی صورت ہم اوپر بیان کر آئے۔ دوسری یہ کہ مدرسہ بن جانے کے سبب لوگ قبریں نہ بنا سکے۔ تو یہ صورت بھی مدرسہ کی تعمیر کے عدم جواز کی طرف دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا صورت سوال کے مطابق قبرستان میں مدرسہ کی تعمیر کی کوئی جائز صورت نہیں ہے صرف اس اندیشہ پر کہ لوگ اس جگہ کو استعمال کریں گے یا قابض ہو جائیں گے مدرسہ وغیرہ کے تعمیر کی اجازت نہیں مل سکتی ہے۔ یہ تو سبھی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس جگہ کا جائز اوروقف کے مقصد کے مطابق استعمال کریں

اور غیر جائز قبضہ نہ کریں نہ کرنے دیں۔ جن لوگوں نے اس پر ناجائز قبضہ کیا ہے یا اس جگہ کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں وہ بلا شبہہ مجرم اور عذاب شدید کے مستحق ہیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ فوراً قبرستان کی جگہ کو خالی کریں اور اللہ کے عذاب سے خوف کریں۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالی

فتوی ۱۱۴ جھوٹا شخص مدرسہ کا مہتمم، مسجد کا امام، نہیں ہو سکتا

مسئولہ: (مولانا) محمد سلام الدین برکاتی (شہر قاضی تحصیل سانویر ضلع اندور، ایم پی)۔ ۲۸ ربیع النور ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام حسب ذیل مسئلہ کے بارے میں

ایک ایسا شخص جس کے پاس عالم کی کوئی تصدیق شدہ سند نہیں ہے، ہر طرح وہ شخص جھوٹ بولتا ہے، اور وہ حافظ و قاری بھی نہیں ہے۔ ایک مدرسہ سے عالم کی نقلی سند بھی لے آیا ہے نقلی سند دکھا کر لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہے اور علاقہ والوں کو یہ یقین دلا رہا ہے کہ میں حافظ و قاری عالم بھی ہوں۔

کیا ایسا جھوٹا شخص مدرسہ کا مہتمم ہو سکتا ہے؟

کیا ایسے جھوٹے شخص کی امامت درست ہے؟

کیا ایسا جھوٹے شخص مدرسہ کا چندہ کر سکتا ہے؟

کیا ایسا جھوٹا شخص نکاح پڑھا سکتا ہے؟

جو اپنے فائدہ کے لئے قوم کو لڑانا چاہتا ہے

لہٰذا گزارش ہے کہ شرعی رو سے مفصل جواب عنایت فرمائیں تا کہ عوام کو مطلع کیا جا سکے۔

الجواب

بر تقدیر صدق مستفتی ایسا شخص از روئے شرع مجرم و گنہگار ہے۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”زید جاہل کا اپنے آپ کو مولوی صاحب کہنا دونا گناہ ہے کہ اس کے ساتھ جھوٹ اور جھوٹی تعریف کا پسند کرنا بھی شامل ہوا۔

قال اللہ عزوجل:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوْا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

(القرآن الکریم۔ سورہ آل عمران آیت ۱۸۸)

(اللہ عزوجل نے فرمایا) ہرگز نہ جانیو تو انہیں جو اتراتے ہیں اپنے کام پر اور دوست رکھتے ہیں اسے کہ تعریف کئے جائیں اس بات سے جو انہوں نے نہ کی تو ہرگز نہ جانیو انہیں عذاب سے پناہ کی جگہ میں اور اُن کے لئے دکھ کی مار ہے۔

معالم شریف میں عکرمہ تابعی شاگرد عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں منقول۔

یفرحون باضلالھم الناس وبنسبۃ الناس ایاھم الی العلم ولیسوا باھل العلم۔

خوش ہوتے ہیں لوگوں کو بہکانے اور اس پر کہ لوگ انہیں مولوی کہیں حالانکہ مولوی نہیں۔"

[فتاوی رضویہ قدیم جلد نہم نصف اول۔ص ۹۶]

لہٰذا ایسے شخص کو امام بنانا اس سے نکاح پڑھوانا اور دیگر امور دینی و دنیوی میں اسے عزت دینا ہر گز ہر گز جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ فاسق و گنہگار ہے اور فاسق کی تعظیم جائز نہیں ہے بلکہ شرعاً اس کی توہین کا حکم ہے۔

صاحب تبیین الحقائق شرح کنزالد قائق فاسق کی توہین کو واجب قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''الفاسق.... وجب علیهم اهانته شرعاً۔

یعنی لوگوں پر از روئے شرع فاسق کی توہین ضروری ہے۔"[۱۵۷/۲، باب الاحق بالامامة]

بہر صورت ایسا شخص دینی کسی بھی معاملہ میں لائق اعتبار نہیں ہے بلکہ جب تک اپنے فسق سے توبہ نہ کرلے تب تک لوگوں کو اس سے ترک تعلقات کر لینے کا حکم ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ''

(اور جو کہیں تجھے شیطان بھلادے تو یاد آنے پر ظالموں کے پاس نہ بیٹھ۔)[کنز الایمان پارہ ۲۸، سورہ انعام آیت ۶۸]

آخر میں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کسی کے عالم ہونے کے لئے سند لازمی نہیں ہے بلکہ تعلیم کا حصول ضروری ہے۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"سند حاصل کرنا تو کچھ ضرور نہیں، ہاں باقاعدہ تعلیم پانا ضرور ہے، مدرسہ میں ہو یا کسی عالم کے مکان پر۔ اور جس نے بے قاعدہ تعلیم پائی وہ جاہل محض سے بدتر، نیم ملا خطرۂ ایمان ہو گا۔"[فتاوی رضویہ قدیم جلد نہم نصف دوم۔ص ۳۰۸]

الحاصل: زید اگر واقعی جھوٹ بول رہا ہے وہ حافظ و قاری اور عالم نہیں ہے اور لوگوں میں اپنا حافظ و قاری عالم ہونا ظاہر کر رہا ہے تو سخت مجرم و گنہگار ہے۔ اس پر فرض ہے توبہ کرے۔ اور آئندہ اس طرح کی حرکات شنیعہ سے باز آئے۔

فتوی ۱۱۵ سنی ادارہ میں دیوبندی شخص کو صدر بنانا ہر گز جائز نہیں

مسئولہ: محمد آصف خان محلہ علی خاں کاشی پور۔ ۲۸ر صفر المظفر ۱۴۳۶ھ

جناب مفتی ذوالفقار صاحب!

آپ سے یہ سوال کرنا ہے کہ کسی سنی بریلوی مسلک کے مدرسہ کو صرف اپنے سیاسی مفاد کے لئے کسی دیوبندی کو صدر بنا کر اس کے ہاتھ میں سونپ دینا کیا ہے؟ ایسے لوگوں کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

دیوبندی جماعت اپنے عقائد کفریہ باطلہ، مثلاً اللہ جھوٹ بول سکتا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی آسکتا ہے، امتی عمل میں نبی سے بڑھ سکتا ہے، نماز میں نبی کا خیال گدھے بیل کے خیال اور بیوی سے مجامعت کے خیال سے بدتر ہے، جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مالک و مختار نہیں، نبی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یوم پیدائش منانا کنہیا کے

جنم کے مثل ہے، لاالہ الا اللہ اشرف علی رسول اللہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، انبیاء واولیاء ہر مخلوق چھوٹی بڑی اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی زیادہ ذلیل ہے، نبی کا علم شیطان سے کم اور جانوروں، پاگلوں، بچوں کے برابر ہے، صحابہ کو کافر کہنے والا کافر نہیں ہے، حضرت علی کا اسلام معتبر نہیں ہے، وغیرہا(معاذاللہ رب العلمین) کے سبب دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ لہٰذا جو شخص ایسا عقیدہ رکھے یا ایسا عقیدہ رکھنے والوں کو حقیقت معلوم ہونے کے بعد بھی مسلمان جانے تو وہ شخص بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ لہٰذا ایسے کسی شخص کو اگر مدرسہ کا صدر بنایا گیا اور مدرسہ اسے سونپا گیا تو ازروئے شرع ایک عظیم جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے جن لوگوں نے صدر بنایا اور جو اس پر راضی ہوئے ایسے سبھی لوگ مجرم وگنہگار ہیں۔ اور اس آیت کریمہ کے مصداق بھی ہیں: وَلَا تَرْكَنُوْا إِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ

اے مسلمانو! بدمذہبوں کی طرف نہ جھکو نہیں تو تم کو جہنم کی آگ چھوئے گی) [پارہ ۱۲، سورہ ھود آیت ۱۱۳]

لہٰذا ان لوگوں پر توبہ کے ساتھ ساتھ اپنی غلطی کا ازالہ لازم وضروری ہے یعنی ان لوگوں پر لازم ہے کہ وہ فوراً دیوبندی شخص کو صدارت سے ہٹائیں اور کسی سنی صحیح العقیدہ کو صدر بنائیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں تو وہ سخت گنہگار اور عذاب الٰہی کے مستحق ہوں گے۔ حدیث شریف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

إن الناس إذا رأوا المنكر لا يغيرونه، أوشك أن يعمهم الله بعقابه

لوگ جب کوئی برا کام دیکھیں اور اس سے نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اپنا عذاب بھیج دے۔

[سنن ابن ماجہ، باب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر ص ۲۸۹]

فتوی ۱۱۶ شراب کا کاروبار کرنے والا مدرسہ کا صدر نہیں بن سکتا

مسئولہ: مجیب احمد ایڈوکیٹ محلہ خالصہ کاشی پور۔ ۲۴/ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں

کہ جو شخص شراب کا کاروبار کرے کسی مقصد کے تحت شراب لوگوں کو فری بانٹے مسجد کا پیسہ مار لے اور دینے کو منع کرے کیا ایسے شخص کو کسی دینی اسکول ومدرسہ کا صدر بنایا جا سکتا ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

جو شخص شراب کا کاروبار کرتا ہو یا لوگوں کو تقسیم کرتا ہو یا خود پیتا ہو اور مسجد کی رقم غصب کئے بیٹھا ہو ایسے شخص کو کسی بھی دینی یا رفاہی ادارہ کا صدر بنانا یا اسے کوئی عہدہ ومنصب سونپنا ہر گز ہر گز جائز نہیں ہے۔ شراب حرام ہے اس کا کاروبار پینا پلانا گناہ کبیرہ ہے اور شیطانی کاموں میں سے ہے۔ رب تعالیٰ قرآن مقدس میں فرماتا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ

تم سے شراب اور جوئے کا حکم پوچھتے ہیں تم فرما دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔

[ترجمہ کنزالایمان، پارہ ۲ سورہ بقرۃ آیت ۲۱۹]

دوسرے مقام پر ارشاد خداوندی اس طرح ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

اے ایمان والو شراب اور جوا اور بت اور پانسے ناپاک ہی ہیں شیطانی کام تو ان سے بچتے رہنا کہ تم فلاح پاؤ۔

[ترجمہ کنز الایمان، پارہ ۷ سورہ مائدۃ آیت ۹۰]

اور مسجد اللہ کا گھر ہے۔ قرآن مقدس میں ہے رب فرماتا ہے:

''وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ'' اور یہ کہ مسجدیں اللہ ہی کی ہیں۔ [ترجمہ کنز الایمان، پارہ ۲۹ سورہ جن آیت ۱۸]

لہٰذا مسجد کی رقم مارلینا جرم عظیم اور غضب الٰہی کا سبب ہے۔ مسجد کی رقم مارلینا تو بڑی بات مسجد کی چیز دوسری مسجد کو فقط استعمال کے لئے بھی دینے کی اجازت نہیں ہے، شریعت نے ناجائز فرمایا۔ تو بھلا مسجد کی رقم ہی ہضم کرلینا کتنا بڑا جرم ہوگا۔ ایسا شخص یقینا مستحق نار ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ مسجد کا روپیہ واپس دے اور اپنے گناہ سے توبہ کرے خود نہ دے تو لوگ اس سے وصول کریں اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"وہ شخص جس نے روپیہ مارلیا اس سے حتی الامکان مسجد کا روپیہ وصول کریں وہ غاصب ہے مرتکب غصب و مستحق غضب ہے" [فتاوی رضویہ قدیم، ۵۰۸/۶]

اور اگر پھر بھی نہ دے تو لوگ اس سے قطع تعلق کریں، اس کا ساتھ بالکل نہ دیں ورنہ وہ بھی عذاب الٰہی کے مستحق ہوں گے۔

حدیث شریف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''إن الناس إذا رأوا المنكر لا يغيرونه، أوشك أن يعمهم الله بعقابه''

یعنی لوگ جب کوئی برا کام دیکھیں اور اس سے نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اپنا عذاب بھیج دے۔

[سنن ابن ماجہ، باب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر ص ۲۸۹]

الحاصل: استفتاء میں ذکر کردہ شخص اپنے ان جرموں کے سبب کسی بھی صورت میں اسلامی رفاحی ادارہ کے کسی بھی عہدہ کا حقدار نہیں ہے۔ ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

فتوی ۱۱۷

مدرسہ وغیرہ وقف کی زمین پر قبضہ کرنا ناحق اس میں مداخلت کرنا شرعاً گناہ ہے

مسئولہ: محمد جمیل برکاتی، لکھ پیڑا باغ بارہ بنکی۔ ۵ر رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع مسئلہ ہٰذا میں

زید، بکر اوران کے ساتھیوں نے مل کر مسجد ومدرسہ کے لیے چندہ کرکے دو پلاٹ خریدے اوراسی درمیان کمیٹی کے رجسٹریشن کے مقصد سے عہدیداران کے انتخاب کے لیے ایک میٹنگ ہوئی جس میں اتفاق رائے سے بکر کو صدر اور عمر کو منیجر منتخب کیا۔ مگر کاغذات تیار کرانے میں بکر نے بدنیتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے نام کے ساتھ

منیجر اور عمر کے نام کے ساتھ صدر ٹائپ کروادیا۔ جب یہ بات کھل گئی تو زید اوراس کے چند انصاف پسند ممبران نے مخالفت کی جس کی بناپر بکر نے رجسٹریشن کو ہی التوا میں ڈال دیا۔ اور طرح طرح کے حیلے بہانے کرنے لگا۔ جب مدرسہ، مسجد کے پلاٹ کی رجسٹری ہوناطے پائی تو کمیٹی کے ایک اور رکن عزیز نے بکر کی بدنیتی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا کہ پلاٹ کی رجسٹری کسی شخص کے نام نہیں ہو گی بلکہ پہلے کمیٹی کا رجسٹریشن کرا کے کمیٹی کے نام سے ہی رجسٹری ہو گی۔ اس بات پر بکر تیار نہ ہوا اور بہانہ کیا کہ ابھی پیسے کی کمی ہے رجسٹریشن بعد میں ہو گا۔

جس پر عمر نے کہا کہ رجسٹریشن کا خرچ میں تنہا الگ سے دوں گا تب بھی بکر حیلے بہانے کرتا رہا اور رجسٹریشن نہیں ہو سکا۔ پلاٹ کی رجسٹری میں تاخیر سے نقصان کی وجہ سے زید اور عمر نے عزیز کو بلا کر سمجھایا کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ابھی رجسٹری ہو جائے بعد میں رجسٹریشن ہو جائے گا۔ عزیز اس شرط پر راضی ہوا کہ دونوں رجسٹری میں دو، دو نام شامل کئے جائیں۔ زید و عمر نے مشورہ پسند کیا اور بکر سے بات کی بکر تیار تو ہو گیا مگر ہوشیاری یہ کی کہ ایک پلاٹ میں زید کے ساتھ اپنا نام ، دوسرے میں عزیز کے ساتھ اپنا نام بھی شامل کیا جس سے بکر کی مزید بدنیتی ظاہر ہو گئی۔ پھر بھی زید، عمر اور دوسرے ارکان نے دفع فتنہ کے لیے عزیز کو سمجھا کر خاموش کر دیا۔ رجسٹری کے بعد اراکین نے مل کر محنت کی اور چندہ کر کے مسجد کی تعمیر شروع ہو گئی۔ وسائل مہیا ہو جانے کے بعد بکر نے زید اور دوسرے اراکین سے بدکلامی شروع کر دی تا کہ لوگ دور ہو جائیں اور بکر کا تسلط ہو جائے۔ مسجد کے بعد میں مدرسہ تیار ہوا اب بکر امام اور دوسرے اراکین کے ساتھ نازیبا کلمات کا استعمال کرنے لگا۔ اس بیچ بکر نے خفیہ رجسٹریشن کرالیا۔ جب رجسٹریشن کی خبر اراکین کو لگی تو رجسٹرار آفس فیض آباد سے کاغذات نکلوائے گئے۔ حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب یہ پتہ چلا کہ بکر نے علاوہ دو ارکان کے کسی رکن کا نام نہ رکھا دو کے بھی جعلی دستخط بنائے بغیر اطلاع کے ایک وہابی شخص شامل تھا دوسرے کئی افراد کے فرضی دستخط تھے۔ مزید معلومات کے بعد پتہ چلا کہ ضلع اقلیتی فلاح و بہبود آفس سے فرضی طور پر طلبا کی غلط تعداد دکھا کر وظیفہ حاصل کیا گیا۔ کینرا بینک میں اپنے اور اپنی سالی کے نام سے اکاؤنٹ کھولا اسی اکاؤنٹ سے رقم خرد برد کی۔ اتنی غلطیوں کے بعد بھی زید اور دوسرے اراکین نے تقریباً ایک سال تک سمجھانے کی کوشش کی تا کہ غلطیوں کی اصلاح کرلے مگر بکر اپنی ہٹھ دھرمی پر اڑا رہا۔ مجبور ہو کر زید نے بکر پر اپنے ساتھوں کے مشورہ سے مقدمہ کر دیا۔

جب بکر کو جیل جانے اور نوکری جانے کا یقین ہو گیا تب بکر نے سب سے منت وسماجت شروع کر دی اور اپنے عہدے سے استعفی کے لیے تیار ہو گیا۔ آخر کار زید اور اس کے ساتھیوں نے یہ کہا کہ کیس واپس لینا تو ممکن نہیں، ہاں ہم پیروی نہیں کریں گے ۔ بکر نے تمام کاغذات و استعفی نامہ دے دیا۔ کچھ عرصہ تک تو بکر خاموش رہا۔ یہاں تک مسجد ہٰذا میں بکر نے نماز پڑھنا بھی چھوڑ دیا۔ تقریباً چار سال کے بعد بکر نے پھر مسجد آنا شروع کر دیا اور بدتمیزی سے پیش آنے لگا۔ اسی بیچ بکر نے وقف بورڈ میں پھر ایک فرضی کمیٹی قائم کرنے کی درخواست دے دی۔ جب زید اور اس کے ساتھیوں کو علم ہوا تو انہوں نے وقف بورڈ میں حقائق پیش کر کے اپنی کمیٹی رجسٹریشن کے لیے اپلائی کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ پرانے مقدمے کی پیروی بھی شروع کر دی۔ جس پر جج نے بکر کے خلاف تفتیش کرنے کا آرڈر بھی کر دیا۔ اب بکر اپنی خدمات وسیادت کی دہائی دے

کر لوگوں میں اپنے کو مظلوم ثابت کرنے میں لگا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جھوٹے سوالات قائم کر مفتیان کرام سے جوابات حاصل کر کے عوام اہل سنت کو اپنی پارسائی کا سرٹیفکٹ دینے میں لگا ہے۔ ساتھ ہی زید اور اس کے ساتھیوں کو گالیاں دیتا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ

(۱) بکر کا جعلی اور فرضی دستخط سے سوسائٹی رجسٹرڈ کرانا اور اس سوسائٹی کے ذریعہ غلط طریقہ سے مدرسے کی مانیتا لینا اور ایسے بچے جو دوسرے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ان کے والدین کے نام سے فرضی حلف نامہ بنوا کر وظیفہ حاصل کرنا اور خود کو منیجر اور اپنی سالی کو بچوں کے اس مدرسہ کا پرنسپل دکھا کر بینک میں کھاتہ کھلوانا اور کھاتے میں وظیفہ کے پیسہ منگوانا شرعاً کیسا ہے؟

(۲) مذکورہ بالا امر کی جانکاری ہونے پر بکر کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا کیسا ہے؟

(۳) بکر کا حلف نامہ کے ذریعہ استعفی دے کر ادارے سے الگ ہو جانا اور قریب چار سال بعد فرضی کمیٹی بنا کر زمین کی رجسٹری میں شامل فریقین کو بتائے بغیر اور یہ جانتے ہوئے کہ میں ادارے سے استعفی دے چکا ہوں اور دوسری کمیٹی برابر کام کر رہی ہے پھر بھی حقیقت کو چھپاتے ہوئے قف بورڈ میں درخواست دے کر ادارہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنا کیسا ہے؟

(۴) بکر کا سنی صحیح العقیدہ مسلمانوں (جو کہ بکر کے مذکورہ بالا امر کے خلاف ہیں) کو شیطان، یہودی، جہنمی، کتے، حرام زادے وغیرہ کہنا جس کے شرعی گواہ جناب مسعود اختر، جمیل احمد، وغیرہ ہیں، شرعاً کیسا ہے؟

(۵) بکر کا کسی کو وہابی، دیوبندی جانتے ہوئے بھی اپنے بچاؤ کے لیے سنی صحیح العقیدہ بتانا اور غلط بیانی کر کے حقیقت کو چھپاتے ہوئے فتوی حاصل کرنا کیسا؟

(۶) بکر کی اتنی واضح غلطیوں کو جانتے ہوئے بھی جو لوگ بکر کی حمایت کرتے ہیں اور دینی جلسوں کی اس سے صدارت و قیادت کراتے ہیں ان کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب

بکر سے متعلق استفتاء میں ذکر کردہ باتیں اگر مبنی بر حقیقت ہیں تو از روئے شرع بکر سخت فاسق مجرم و گنہگار ہے۔

بکر کا مسلمانوں کی وقف کردہ زمین پر اپنے قبضہ کی تدبیریں کرنا یقینا بڑا جرم ہے۔

حدیث شریف میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"أیما رجل ظلم شبرا من الأرض، کلفه الله أن یحفره حتی یبلغ سبع أرضین، ثم یطوقه یوم القیامة حتی یفصل بین الناس"

یعنی جو شخص ایک بالشت زمین ناحق لے لے اللہ تعالیٰ اسے تکلیف دے کہ اس زمین کو کھودے ساتویں طبقے کے آخر تک پھر قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالے یہاں تک کہ تمام مخلوق کا حساب کتاب ختم ہو کر فیصلہ فرما دیا جائے۔

[صحیح ابن حبان، کتاب الغصب، ۱۱/۵۶۸]

اور فرمایا:

''من اخذ من الارض شیئاً بغیر حقه خسف به یوم القیامة الی سبع ارضین۔
یعنی جس شخص نے کسی کی تھوڑی سی زمین بھی ناحق لے لی قیامت کے دن زمین کے ساتویں طبقے تک دھنسایا جائے گا۔

[بخاری، کتاب المظالم، باب إثم من ظلم شیئا من الأرض]

مزید فرمایا: ''من ظلم قید شبر من الارض طوقه من سبع أرضین''
یعنی جس نے ظلماً کسی کی زمین ہتھیائی تو اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔

[بخاری شریف، باب ائم من ظلم شیئا من الارض، کتاب، کتاب المظالم والغصب]

یہ عذاب صرف حق عبد چھیننے پر ہے مسجد و مدرسہ کی زمین تو حق اللہ بھی ہے اور حق العبد بھی ہے۔ تو اس پر مکر و فریب اور جعل سازی سے ناجائز قبضہ کرنے پر کتنا سخت عذاب ہوگا۔ مسجد و مدرسہ کی زمین جب چندہ سے خریدی گئی تو وہ مسجد اور مدرسہ ہو کر وقف ہو گئی اس پر کسی طرح کا غیر شرعی اور خلاف وقف تصرف جائز نہیں ہو گا۔ مسجد اور مدرسہ نماز و تعلیم کے لیے ہی وقف ہوتے ہیں ان میں اپنی من مانی کرنا اور غیر اسلامی امور کا ارتکاب کرنا شرعاً ناجائز و حرام ہے۔

بکر کا اہل بستی کی مرضی کے بغیر خود اپنے مفاد کے اعتبار سے عہدہ مقرر کر لینا، اور اس میں فرضی ناموں کو شامل کرنا، اور دھوکہ سے مدرسہ سے وظیفہ حاصل کرنا، جھوٹ بولنا، خیانت کرنا، جھوٹی قسم کھانا دیوبندی کو اپنے ساتھ کمیٹی میں شامل کرنا اور خلاف شرع دیگر امور کا ارتکاب کرنا از شرع ناجائز و حرام ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ زید کو مسجد و مدرسہ کے تمام عہدوں اور ذمہ داریوں سے معزول کریں۔ اور مسجد و مدرسہ کا انتظام و اہتمام دین دار متقی پرہیز گار نمازی شریعت کا پاس و لحاظ رکھنے والوں کے ہاتھوں میں دیں۔ ردالمحتار میں اسعاف کے حوالے سے ہے:

''ولا یولی الا امین'' یعنی متولی و منتظم صرف اسی کو بنایا جائے گا جو امین ہو۔ [ردالمحتار: ۵۷۸/۶]

اعلیٰ حضرت فتاوی رضویہ میں فرماتے ہیں:

''جبکہ مسجد کی بے انتظامی اور نمازیوں کو تکلیف رہی تو اس انتظام کا بدلنا اور ہوشیار دیانت دار پرہیز گار مسلمانوں کی نگرانی میں دینا فرض تھا'' [فتاوی رضویہ قدیم۔ج ۶ ص ۳۹۱]

اور فرماتے ہیں ''متولی اور منتظم پر اتباع شرع و شرائط واقف ضروری ہے ان کے خلاف کسی فعل کا ان کو اختیار نہیں، اور اگر کریں تو مسلمانوں کو ان کی مزاحمت چاہئے'' [مرجع سابق ص ۵۲۵]

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں ''ضروری خدمتوں میں تقصیر بر بنائے عجز ہو گی یا بر بنائے بے پروائی دونوں صورتوں میں لائق عزل ہے'' [مرجع سابق، ص ۵۰۷] مزید فرماتے ہیں:

''اگر یہ امر واقعی ہے کہ زید فتنہ گر، شریر، مفرق جماعت ہے تو وہ ہرگز تولیت مسجد کے قابل نہیں، اس کا معزول کرنا واجب ہے۔: در مختار میں ہے:

ینزع وجوبا لوالواقف غیر مامون۔ نا قابل اطمینان متولی کو ولایت وقف سے نکال دینا واجب ہے اگر چہ واقف ہی ہو''

[فتاوی رضویہ قدیم۔ج ۶ ص ۵۱۳]

مزید فرماتے ہیں:

"متولی رہے گا جب تک کہ اس کی خیانت یا عجز یا فسق ظاہر نہ ہو ورنہ اس سے ولایت لے لی جائے گی اگر چہ متولی خود واقف ہی ہو۔ در مختار میں ہے:

وینزع وجوبا لوکان المتولی غیر مامون او عاجزاً وظھربہ فسق وان شرط عدم نزعہ او ان لاینزعہ قاض ولا سلطان لمخالفتہ حکم الشرعی فیبطل کالوصی۔

اور متولی غیر معتمد علیہ ہو، یا نالائق ہو، یا اس کا فسق ظاہر ہو چکا ہو تو اس کو معزول کرنا ضروری ہے اگر چہ معزول نہ کرنے کی شرط کی ہو، یا یہ کہ قاضی اور سلطان بھی نہ معزول کرے گا، تو شرع کے مخالف ہونے کی وجہ سے یہ شرط باطل ہے"

[فتاوی رضویہ قدیم۔ج ۶ ص ۳۳۸]

علاوہ ازیں بکر کا ازخود دھو کہ دے کر کسی عہدہ پر قابض ہو جانا شرعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتا اہل بستی جسے جو عہدہ تفویض کرنا چاہیں شرعاً انہیں اختیار حاصل ہے۔ ردالمحتار میں تاتار خانیہ کے حوالے سے ہے:

"أن أھل المسجد لو اتفقوا علی نصب رجل متولیا لمصالح المسجد فعند المتقدمین یصح"

یعنی اہل مسجد مصالح مسجد کے پیش نظر اگر کسی شخص کو متولی بنانے پر متفق ہوں تو متقدمین کے نزدیک صحیح ہے۔

[ردالمحتار ۶/۶۳۴ کتاب الوقف]

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"وقف کی تولیت کوئی ترکہ نہیں، اس میں شرائط واقف پھر عملدرآمد سابق پھر صوابدید مسلمانان پر نظر ہو گی ان کے اعتبار سے جسے ترجیح ہو گی وہی متولی ہو گا بیٹا ہو یا بھائی یا غیر۔ ردالمحتار میں ہے:

"من جھلھم قولھم خبز الاب لابنہ' ان کا یہ قول کہ باپ کی روٹی بیٹے کی ہے ان کی جہالت کی بنا پر ہے"

[فتاوی رضویہ قدیم۔ج ۶ ص ۵۱۴]

اور رہا بکر کا زید وغیرہ کو گالی دینا تو یہ بھی سخت جرم ہے اور بکر سخت مجرم و گنہگار۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "سباب المسلم فسق"، کسی مسلمان کو گالی دینا فسق ہے۔

[صحیح البخاری کتاب الآداب باب ماینھی عن السباب]

اور فرمایا: سباب المسلم کالمشرف علی الھلکۃ

یعنی مسلمان کو گالی دینے والا اس شخص کی طرح جو عنقریب ہلاکت میں پڑا چاہتا ہے۔ [کنز العمال، ۳/۵۹۸]

الغرض بکر نے گالی کے ذریعہ جو زید اور دیگر مسلمانوں کو تکلیف پہنچائی ہے اس پر لازم ہے کہ توبہ کرے اور زید وغیرہ سے معافی طلب کرے ورنہ سخت عذاب کا مستحق ہو گا۔ کیوں کہ کسی مسلمان کو گالی دینا اسے تکلیف پہنچانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور پروردگار عالم کو ایذا پہنچانے کے مترادف ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من اذی مسلما فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللہ عزوجل"

یعنی جس نے کسی مسلمان کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے بلاشبہ اللہ تعالی کو اذیت دی۔
[المعجم الصغیر للطبرانی، ۱/۲۸۴]

الحاصل: بکر خلاف شرع حرکات کے سبب سخت فاسق و گنہگار ہے۔ بکر پر لازم ہے کہ ان خلاف شرع حرکات سے باز آئے اور خلوص کے ساتھ توبہ کرے۔ اور مسجد و مدرسہ کا انتظام واہتمام بستی کے اہل سنت وجماعت حضرات کے اختیار میں رہنے دے اس میں کسی طرح کی مداخلت نہ کرے۔ ورنہ عذاب الٰہی کا انتظار کرے۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ

بے شک تیرے رب کی گرفت بہت سخت ہے۔ [ترجمہ کنزالایمان، سورہ بروج، پارہ ۳۰، آیت ۱۲]

اگر بکر اپنی حرکتوں سے باز آجائے تو ٹھیک ورنہ جملہ مسلمانان بستی پر لازم ہے کہ اس کا بائیکاٹ کریں اور اس سے کسی طرح کا کوئی تعلق روانہ رکھیں جب تک کہ توبہ نہ کرلے۔

قرآن پاک میں ہے ''وَاِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ''

(اور جو کہیں تجھے شیطان بھلادے تو یاد آنے پر ظالموں کے پاس نہ بیٹھ۔) [کنزالایمان پارہ ۲۸، سورہ انعام آیت ۶۸]

اور جو لوگ بکر کی خلاف شرع حرکات سے آگاہ ہونے کے باوجود بھی اس کا ساتھ دیں وہ بھی بکر کے جرم میں برابر کے شریک ہیں ایسے لوگوں کے لیے رب کا حکم ہے:

''ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان'' گناہ اور زیادتی پر باہم مدد نہ دو۔ [پارہ ۶ سورہ مائدہ آیت ۲]

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''من أعان ظالما بباطل لیدحض به حقا، فقد برء من ذمة الله وذمة رسوله۔ صلی الله علیه وسلم''

یعنی جس نے ظالم کی باطل کے معاملہ میں مدد کی تاکہ باطل کے ذریعہ حق کو غلط ثابت کرے تو وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ سے بری ہے۔ [مجمع الزوائد، ۴/۲۰۵]

فتاوی عالمگیری کتاب الشہادات میں ہے: الاعانة علی المعاصی والفجور والحث علیها من جملة الکبائر۔

گناہوں اور برائیوں پر مدد کرنا اور اکسانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ [جلد ۳/ ۴۵۱]

لہٰذا بکر کا ساتھ دینے والوں پر بھی لازم ہے کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہو کر عذاب الٰہی کے مستحق نہ بنیں۔ خود بھی حکم شرع پر عمل کریں اور بکر کو بھی شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے کام کرنے کی ترغیب دیں۔ ورنہ اس سے دور ہو جائیں۔

علاوہ ازیں اگر بکر اپنی حرکات سے باز نہ آئے اور مسجد و مدرسہ پر ظالمانہ تسلط وقبضہ کرنے کی کوشش کرے تو اہل بستی کو قانوی کاروائی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ایسی صورت میں ان پر مسجد و مدرسہ کی حفاظت لازمی ہونے کے سبب قانونی کاروائی بھی لازمی ہو گی۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب و رسوله اعلم صلی اللہ علیه وسلم

احکام قربانی

بلا دانت، بغیر سینگ، بغیر زبان کے جانور کی قربانی کا حکم گنجے جانور کی قربانی کا حکم، قربانی کے جانور کون سے ہیں؟

فتوی ۱۱۸ مسئولہ: ایوب راہی، ذاکر نگر دہلی: ۶/ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسائل میں

(۱) وہ جانور جس کے دانت ہی نہ ہوں یا ہو کر جھڑ گئے ہوں اس کی قربانی ہو جائے گی یا نہیں؟

(۲) وہ جانور جس کے پیدائشی سینگ نہ ہوں یا ہوں مگر ٹوٹ گئے ہوں تو اس کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

(۳) جس جانور کی زبان نہ ہو اس کی قربانی ہو جائے کیا؟

(۴) وہ جانور جو بالکل گنجا ہو گیا ہو اس کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

(۵) کن جانوروں کی قربانی کی جائے؟

الجواب

(۱) وہ جانور جس کے بالکل دانت نہ ہوں یا جھڑ گئے ہوں تو وہ اگر چر کر چارہ کھالیتا ہے تو مفتی بہ قول کے مطابق اس کی قربانی جائز ہے۔ ورنہ جائز نہیں۔

جوہرہ نیرہ میں ہے: ''يجوز الهتماء إذا كانت تعتلف وهي ذاهبة الأسنان''

یعنی ہتماء جس کے دانت جھڑ گئے ہوں وہ اگر چر لیتا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔ [الجوہرۃ النیرۃ: باب الھدی، ج ا ص ۱۸۱]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

وأما الهتماء وهي التي لا أسنان لها، فإن كانت ترعى وتعتلف جازت وإلا فلا، كذا في البدائع. وهو الصحيح، كذا في محيط السرخسي''

یعنی ہتماء جس کے دانت نہ ہوں وہ اگر چر لیتا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے ورنہ نہیں ایسا ہی بدائع میں ہے اور یہی صحیح ہے ایسا ہی محیط سرخسی میں ہے۔ [فتاوی ہندیہ: ج ۵ ص ۲۹۸، کتاب الاضحیہ]

بدائع الصنائع میں ہے:

''وأما الهتماء وهي التي لا أسنان لها فإن كانت ترعى وتعتلف جازت وإلا فلا، وذكر في المنتقى عن أبي حنيفة رحمه الله أنه إن كان لا يمنعها عن الاعتلاف تجزيه وإن كان يمنعها عن الاعتلاف إلا أن يصب في جوفها صبا لم تجزه،

یعنی بغیر دانت کا جانور اگر چر لیتا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے ورنہ نہیں۔ منتقی میں ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ذکر کیا کہ دانتوں کا نہ ہونا اگر چرنے سے نہ روکے تو جائز ہے ورنہ ناجائز اگر چہ اس کے پیٹ میں پہنچ جائے۔

[بدائع الصنائع: کتاب الاضحیہ، ج ۵ ص ۷۵]

(۲) بغیر سینگ کے جانور کی قربانی جائز ہے اور وہ جس کا سینگ ٹوٹ گیا ہو تو اگر گودے تک ٹوٹ گیا ہو تو نا جائز ہے۔ ورنہ جائز ہے۔ فتاویٰ شامی میں ہے:

یضحی بالجماء هی التی لا قرن له خلقة و کذا العظماء التی ذهب بعض قرنها بالکسر او غیرفان بلغ الکسر الی المخ لم یجز قهستانی، وفی البدائع ان بلغ الکسر المشاش لا یجزئ والمشاش رؤس العظام مثل الرکبتین والمرفقین

یعنی جماء کی قربانی جائز ہے اور جماء وہ ہے جس کے سینگ پیدائشی طور پر نہ ہو اور یوں ہی عظماء یعنی جس کے سینگ کا کچھ حصہ ٹوٹا گیا ہو البتہ اگر سینگ گودہ سمیت ٹوٹا ہو تو ناجائز ہے۔ قہستانی اور بدائع میں ہے کہ اگر سینگ کا ٹوٹنا مشاش تک ہو جائے تو ناجائز ہے۔ اور مشاش یہ ہڈی کا سرا ہے جیسے گھٹنے اور کہنیاں ہیں۔ [ردالمحتار علی الدر المختار: کتاب الاضحیۃ، ج۶ ص۳۲۳]

(۳) بیل گائے بھینس وغیرہ کی زبان کٹی ہو یا بالکل ہی نہ ہو تو قربانی جائز نہیں ہے۔ اور بکری بھیڑ وغیرہ کی زبان نہ ہو تو قربانی جائز ہے۔ اور اگر کٹی ہوئی تو اگر چارہ کھالیتی ہو تو جائز ہے ورنہ نہیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وفی الیتیمة کتبت إلی أبی الحسن علی المرغینانی، ولو کانت الشاة مقطوعة اللسان هل تجوز التضحیة بها، . فقال: نعم إن کان لا یخل بالاعتلاف، وإن کان یخل به لا تجوز التضحیة بها، کذا فی التتارخانیة. وقطع اللسان فی الثور یمنع، وفی الشاة اختلاف، کذا فی القنیة. والتی لا لسان لها فی الغنم تجوز، وفی البقر لا، کذا فی الخلاصة.

یعنی یتیمیہ میں ہے کہ میں نے ابو الحسن علی مرغینانی کو لکھا کہ زبان کٹی ہوئی بکری کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ تو کہا کہ اگر چرنے میں خلل واقع نہ ہوتا ہو تو جائز ہے اور اگر چر نہ پاتی ہو تو اس کی قربانی جائز نہیں۔ ایسا ہی تتار خانیہ میں ہے۔ اور زبان کٹے ہوئے بیل کی قربانی منع ہے۔ اور بکری میں اختلاف ہے۔ ایسا ہی قنیہ میں ہے۔ اور غنم (یعنی بھیڑ بکری) کی زبان نہ ہو تو قربانی جائز ہے۔ اور بقر (یعنی گائے بھینس وغیرہ) میں کسی کی زبان نہ ہو تو قربانی جائز نہیں۔ ایسا ہی خلاصہ میں ہے۔''

[فتاویٰ ہندیہ: کتاب الاضحیہ: ج۵ ص۲۹۸]

(۴) جس جانور کے بال جھڑ گئے ہوں اس کی قربانی جائز ہے۔ بشرطیکہ ہڈی میں گودہ موجود ہو۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

''تناثر شعر الأضحیة فی غیر وقته یجوز إذا کان لها نقی أی مخ''

یعنی قربانی کے جانور کے بال قربانی کے وقت کے سوا میں گر گئے ہوں تو قربانی جائز ہے جب کہ اس کی ہڈیوں میں گودہ ہو۔

[فتاویٰ ہندیہ: ج۵ ص۲۹۹]

(۵) قربانی کے جانوروں کے بارے میں بہار شریعت میں فتاویٰ عالمگیری وغیرہ کے حوالے سے لکھا ہے:

قربانی کے جانور تین قسم کے ہیں۔ ۱ اونٹ، ۲ گائے، ۳ بکری ہر قسم میں اوس کی جتنی نوعیں ہیں سب داخل ہیں نر اور مادہ خصی اور غیر خصی سب کا ایک حکم ہے یعنی سب کی قربانی ہو سکتی ہے۔ بھینس گائے میں شمار ہے اس کی بھی قربانی ہو سکتی ہے۔ بھیڑ اور دنبہ بکری میں داخل ہیں ان کی بھی قربانی ہو سکتی ہے'' [بہار شریعت: جلد۳ حصہ ۱۵ ص۳۳۹]

فتوی ۱۱۹ کافروں کو قربانی کا گوشت دینا منع ہے

مسئولہ :(مولانا) حسن نوری گونڈوی خطیب وامام نورانی مسجد اجین ایم پی۔۸/ ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان ذوی الاحترام درج ذیل مسئلہ میں

زید کہتا ہے کہ قربانی کا گوشت کافر کو دیا جاسکتا ہے۔ خواہ وہ ذمی ہو مستامن ہو یا حربی ہو۔ زید کا جواب حسب ذیل ہے:

قربانی کا گوشت خواہ کچا ہو یا پکا ہوا ہو، کسی مالدار یا فقیر غیر مسلم کو دینا جائز ہے۔ بلکہ اگر غیر مسلم پڑوسی ہو اور قربانی کا گوشت کھانے میں رغبت رکھتا ہو تو پڑوسی کی بنا پر دینے سے حق جوار کا بھی ثواب ملے گا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا [سورہ نساء آیت ۳۶]

ویھب منھا مایشاء للغنی والفقیر والمسلم والذمی (فتاوی ہندیہ)

یجوز ان یطعم من الاضحیۃ کافرا (اعلاء السنن) اویھدیہ لغنی اوفقیر مسلم او کافر (اعلاء السنن)

نیز فتاوی دارالعلوم دیوبند پندرہویں جلد کے صفحہ ۵۷۱، پر لکھا ہے۔

"قربانی کا گوشت ہنود وغیرہ کو بطریق تصدق دے سکتے ہیں" اس کے حاشیہ میں لکھا ہے۔

"کیوں کہ یہ صدقات واجبہ میں سے نہیں ہے بلکہ نفل صدقہ ہے اور نفل صدقہ غیر مسلم کو دینا درست ہے"

لیکن حضور اعلیٰ حضرت نے فتاوی رضویہ شریف میں کافر کو قربانی کا گوشت دینے کے سلسلے میں فرمایا ہے

"یہاں کے کافروں کو گوشت دینا جائز نہیں" (فتاوی رضویہ قدیم، جلد ۳ ص ۴۶۷)

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کا قول اور فتاوی دارالعلوم دیوبند کے مطابق کسی بھی کافر کو قربانی کا گوشت دے سکتے ہیں لیکن حضور اعلیٰ حضرت ناجائز قرار دے رہے ہیں۔ بلکہ فتاوی فیض الرسول، فتاوی مرکز تربیت افتاء وغیرہ اہل سنت کے فتاوی میں عدم جواز کا ہی قول ہے۔ اور دلائل بھی دونوں طرف موجود ہیں۔ ایسی صورت میں قربانی کے گوشت کو کافر خاص کر ہمارے یہاں کے ہنود کو دینے کے سلسلے میں کیا حکم ہے؟

دلائل کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

ازروئے شرع قربانی کا گوشت ذمی کافر کے علاوہ کسی اور کافر کو دینے کی اجازت نہیں ہے۔ نہ حربی کافر کو نہ مستامن کو۔

اس سے پہلے کہ ہم اپنے دلائل پیش کریں مناسب ہے کہ زید کے دلائل کا جائزہ لے لیں۔

زید نے کافر کو قربانی کا گوشت دینے کے جواز میں قرآن مقدس کی جس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے۔ پہلے ہم اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں اس کے بعد اس پر کلام کرتے ہیں۔

(ترجمہ) "اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کا شریک کسی کو نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ سے بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں

اور محتاجوں اور پاس کے ہمسائے اور دور کے ہمسائے اور کروٹ کے ساتھی اور راہ گیر اور اپنی باندی غلام سے بے شک اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی اترانے والا بڑائی مارنے والا''[ترجمہ قرآن کنز الایمان، پارہ ۵، سورہ نساء آیت ۳۶]

اس آیت کریمہ میں رشتہ داروں، پڑوسیوں وغیرہ سے حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔

لیکن ہم بتادیں کہ اس آیت کریمہ میں پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم تو ہے مگر اس میں کافر حربی شامل نہیں ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کرام نے یہودی و نصاری کا ذکر کیا ہے۔ اور اس ضمن میں چند روایتیں بھی پیش کیں جن سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اس حکم میں کفار سے یہود و نصاری اور بعض اقوال کے مطابق ذمی کافر مراد ہیں۔

لیکن حربی کافروں کا ذکر ترک کیا گیا ہے۔ اور چند تفاسیر میں حربی کافر کو اس حکم سے خارج مانا گیا ہے۔ جس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قرآن پاک میں اللہ پاک نے کافر حربی کے ساتھ حسن سلوک سے منع فرمایا ہے۔ ذمی وغیرہ کفار کے ساتھ حسن سلوک کی اجازت عطا کی ہے۔ اللہ پاک کا یہ حکم ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ پاک فرماتا ہے:

''لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔

اللہ تمہیں ان سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین میں نہ لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا کہ ان کے ساتھ احسان کرو اور ان سے انصاف کا برتاؤ برتو۔ بے شک انصاف والے اللہ کو محبوب ہیں اللہ تمہیں انہیں سے منع کرتا ہے جو تم سے دین میں لڑے یا تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا یا تمہارے نکالنے پر مدد کی کہ ان سے دوستی کرو اور جو ان سے دوستی کرے تو وہی ستمگار ہے۔

[ترجمہ قرآن کنز الایمان پارہ ۲۸ سورہ ممتحنہ آیت ۹،۸'']

ملاحظہ کریں مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں بالکل صاف صریح حکم موجود ہے۔ پہلی آیت میں ذمی کافر مراد ہیں جن سے صلہ رحمی اور احسان کی اجازت دی گئی ہے۔ اور دوسری آیت سے حربی کافر مراد ہیں جس کے ساتھ احسان اور صلہ رحمی سے منع کیا گیا ہے۔ ملا جیون علیہ الرحمہ کی تفسیرات احمدیہ میں اس آیت کی تفسیر حسب ذیل ہے۔ ملاحظہ ہو:

''هاتان الآيتان الاولى في جواز الاحسان الى الذمي والثانية في عدمه الى الحربي''

ان دونوں آیتوں میں پہلی آیت ذمی سے احسان کے جواز کے سلسلے میں ہے اور دوسری آیت حربی سے احسان کے عدم جواز کے بارے میں ہے۔ آگے فرماتے ہیں:

''والحاصل ان الاية الاولى ان كانت في الذمي والثانية في الحربي كما هو الظاهر وعليه الاكثرون كان دالا على جواز الاحسان الى الذمي دون الحربي، ولهذا اتمسك صاحب الهداية في باب الوصية ان الوصية للذمي جائزة دون الحربي لانه نوع احسان و لهذا المعنى قال في باب الزكوٰة ان الصدقة النافلة يجوز اعطاءها للذمي دون الحربي''

حاصل یہ ہے کہ پہلی آیت (جس میں نیک سلوک کی رخصت ہے) اگر ذمی کے حق میں مانی جائے اور دوسری آیت (جس میں

احسان وغیرہ کی ممانعت ہے) حربی کے حق میں مانی جائے۔ جیسا کہ یہی ظاہر ہے اور یہی اکثر ائمہ کا مذہب ہے تو یہ آیتیں دلیل ہوں گی کہ ذمی کے ساتھ نیک سلوک جائز ہے۔ حربی کے لئے نہیں، اور اسی لئے صاحب ہدایہ نے وصیت کے باب میں انھیں آیتوں سے استدلال کرتے ہوئے ذمی کے لئے وصیت کو جائز قرار دیا حربی کے لئے نہیں۔ کیوں کہ وصیت ایک طرح کا احسان ہے اور اس معنی کر باب الزکوٰۃ میں فرمایا کہ نفلی صدقہ ذمی کو دینا جائز ہے حربی کو نہیں۔"

[تفسیرات احمدیہ، ص ۴۷۱، ۴۷۰: پارہ ۲۸ سورہ ممتحنہ آیت ۹،۸"]

تفسیرات احمدیہ کی روشنی میں چند باتیں واضح ہوئیں ایک تو یہ کہ ذمی کے ساتھ احسان کی اجازت ہے مگر حربی کے لئے نہیں۔ دوسری بات یہ کہ نفلی صدقہ ذمی کو دینا جائز ہے حربی کو دینا جائز نہیں ہے۔

لہٰذا زید کا آیات کریمہ پیش کر کے اس سے حربی وغیرہ سبھی کفار کے لئے جواز کا حکم بیان کرنا بالکل نادرست ہے۔ کیوں کہ دوسری آیات سے حربی کفار کے ساتھ بھلائی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء وفقہاء نے بھی اپنی کتابوں میں صراحتاً مطلقاً حربی کافر کے ساتھ بھلائی کو ناجائز قرار دیا ہے۔ فتاوی شامی میں ہے:

''أجمعوا أنه إذا ظهر أنه حربي ولو مستأمنا لا يجوز وكذا في المعراج معللا بأن صلته لا تكون برا شرعا ولذا لم يجز التطوع إليه فلم يقع قربة''

یعنی اس بات پر اجماع ہے کہ جب ظاہر ہو جائے کہ یہ حربی ہے اگر چہ مستامن ہو تو اسے صدقہ دینا جائز نہیں ہے اور ایسا ہی معراج الدرایہ میں ہے اس کی تعلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کے ساتھ صلہ رحمی شرعاً نیکی نہیں ہے اور اسی لئے اس کو نفل صدقہ بھی جائز نہیں ہے کہ اس سے قربت واقع نہیں ہوگی۔ [ردالمحتار، ۳۰۲/۳، باب مصرف الزکاۃ]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''لاباس بان يصل الرجل المسلم المشرك قريبا كان اوبعيدا محاربا كان اوذميا واراد بالحارب المستامن واما اذا كان غير المستامن فلاينبغي للمسلم ان يصله بشيء كذا في المحيط۔

یعنی کوئی حرج نہیں کہ مسلمان مشرک سے کوئی مالی سلوک کرے خواہ رشتہ دار ہو یا اجنبی، حربی ہو یا ذمی۔ اگر حربی سے مراد مستامن ہے۔ اگر غیر مستامن ہو تو مسلمان کو جائز نہیں کہ اس کے ساتھ کوئی نیک سلوک کرے، ایسا ہی محیط میں ہے۔

"[فتاوی عالمگیری، کتاب الکراہیة، ۳۴۷/۵]

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"تو وہ اصلاً محلِ احسان نہیں۔ ابتدائے اسلام میں غیر محارب و محارب کفار میں فرق فرمایا تھا اُن سے نیک سلوک اور برابری کا برتاؤ جائز تھا۔ اور اِن سے منع، اور اسی کو ان سے دوستی رکھنے سے تعبیر فرمایا تھا اور نہ دوستی تو کسی کافر سے کبھی حلال نہ تھی"

اور فرماتے ہیں:

"تو اب کسی کافر حربی سے برّ وصلہ جائز نہ رہا اگر چہ اس نے بالفعل محاربہ نہ کیا ہو" [فتاوی رضویہ جدید، ۳۳۳/۱۰۔۳۳۴]

مزید فرماتے ہیں:

''امام برہان الدین صاحب ذخیرہ نے محیط پھر علامہ جوی زادہ پھر علامہ شرنبلالی نے غنیہ میں فرمایا:

لایجوز للمسلم برالحربی''

حربی کے ساتھ نیک سلوک مسلمان کو جائز نہیں ہے۔[مرجع سابق، ج ۱۴ ص ۴۵۹۔۴۶۰]

الغرض زید کی پیش کردہ آیت کریمہ میں غیر حربی کافر کے ساتھ ہی بھلائی تسلیم کی جائے گی۔ حربی کے ساتھ احسان نہ کرنے پر سورہ ممتحنہ کی آیت پیش کر دی گئی ہے۔

علاوہ ازیں زید کی پیش کردہ آیت کو مطلق مانا جائے تو سورہ ممتحنہ کی آیتوں کے بارے میں کیا حکم ہو گا؟

نیز درج ذیل حدیث پاک کے بارے میں کیا کہا جائے گا جس میں پڑوسیوں کے حقوق کی تعلیم دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں کو قربانی کا گوشت کھلانے سے منع فرمایا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

''قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الجيران ثلاثة: فمنهم من له ثلاثة حقوق، ومنهم من له حقان، ومنهم من له حق، فأما الذي له ثلاثة حقوق فالجار المسلم القريب له حق الجار ,وحق الإسلام، وحق القرابة، وأما الذي له حقان فالجار المسلم له حق الجوار، وحق الإسلام، وأما الذي له حق واحد فالجار الكافر له حق الجوار "قلنا: يا رسول الله صلى الله عليه وسلم نطعمهم من نسكنا، قال: "لا تطعموا المشركين شيئا من النسك''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پڑوسی تین طرح کے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ جن کے تین حقوق ہیں اور ان میں وہ جن کے لئے دو حق ہیں اور ان کچھ وہ جن کا ایک حق ہے۔ مسلمان اہل قرابت میں سے ہے تو اس کے تین حقوق ہیں پڑوسی کا حق، اسلامی حق اور حق قرابت۔ اور غیر قریبی ہے تو دو حق ہیں پڑوسی ہونے کا حق اور اسلامی حق۔ اور پڑوسی کافر کا ایک حق ہے پڑوسی ہونے کا حق۔ ہم نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم اپنی قربانی میں سے انہیں کچھ کھلا سکتے ہیں فرمایا مشرکین کو قربانی میں سے کچھ مت کھلاؤ۔

[شعب الایمان للبیہقی، ۱۰۵/۱۲۔ کنز العمال، ۱۸۶/۹]

اس حدیث کی روشنی میں زید کی پیش کردہ آیت اور اس حدیث کے حکم میں واضح تضاد موجود ہے۔ جس میں تطبیق کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ یہاں مشرکین میں غیر ذمی کفار و مشرکین مراد لئے جائیں۔ اور دوسری، قربانی کے گوشت کو واجبی نہ مانا جائے۔ لیکن پھر بھی اس میں کفار میں غیر حربی کفار ہی شامل ہوں گے۔

تفسیر قرطبی میں بھی یہی تطبیق بیان کی گئی ہے۔ ملاحظہ کریں:

امام قرطبی لکھتے ہیں:

''قال العلماء: الأحاديث في إكرام الجار جاءت مطلقة غير مقيدة حتى الكافر كما بينا. وفي الخبر قالوا: يا رسول الله أنطعمهم من لحوم النسك؟ قال: (لا تطعموا المشركين من نسك المسلمين) ونهيه صلى الله عليه وسلم. عن إطعام المشركين من نسك المسلمين يحتمل النسك الواجب في الذمة الذي لا يجوز للناسك أن يأكل منه ولا أن يطعمه

الأغنياء، فأما غير الواجب الذي يجزيه إطعام الأغنياء فجائز أن يطعمه أهل الذمة''
یعنی علمانے فرمایا کہ پڑوسی کی تعظیم میں مطلق غیر مقید احادیث وارد ہوئی ہیں یہاں تک کہ کافر بھی اس میں شامل ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ اور حدیث میں صحابہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم کفار کو قربانی کا گوشت کھلائیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مشرکین کو مسلمانوں کی قربانی کا گوشت نہ کھلاؤ۔ مشرکین کو مسلمانوں کی قربانی کھلانے سے روکنے میں احتمال ہے کہ اس سے وہ قربانی مراد ہے جو ذمہ میں واجب ہو کہ جس کا قربانی کرنے والے کے لئے کھانا اور مالداروں کو کھلانا جائز نہیں ہے۔ لیکن غیر واجب جسے مالداروں کو کھلانا جائز ہے پس جائز ہے کہ وہ ذمیوں کو بھی کھلائی جائے۔''[تفسیر قرطبی سورہ نساء آیت ۳۶]

لب لباب یہ ہے کہ مسلمان اور غیر حربی کفار پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا۔ البتہ حربی کفار کے ساتھ صلہ رحمی نہ کی جائے گی انہیں قربانی کا گوشت نہیں دیا جائے گا۔

رہا زید کا جملہ کفار کو قربانی کے گوشت کو کھلانے اور انہیں گوشت دینے پر فتاوی عالمگیری اور اعلاء السنن کی درج ذیل عبارات

ويهب منها مايشاء للغني والفقير والمسلم والذمي (فتاوی ہندیہ)

يجوز ان يطعم من الاضحية كافرا (اعلاء السنن) اويهديه لغني اوفقير مسلم او كافر (اعلاء السنن)

سے استدلال کرنا تو یہ بھی درست نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ اعلاء السنن میں کافر کا ذکر مطلق ہے۔ لیکن فتاوی عالمگیری میں ذمی کی قید ہے اور صدقات وغیرہ معاملات میں صرف ذمی کی قید احترازی ہے جس سے حربی ومستامن خارج ہے۔ عام طور پر کتب فقہ وفتاوی میں بہت سے مسائل میں ذمی کی قید لگائی گئی ہے تو اس میں ذمی کے علاوہ کفار حربی وغیرہ کو خارج مانا جاتا ہے۔

بحر الرائق میں ہے: ''قيد بالذمي؛ لأن جميع الصدقات فرضا كانت أو واجبة أو تطوعا لا تجوز للحربي اتفاقا''
یعنی حکم مقید کا ذمی کے ساتھ اس لئے کہ تمام صدقات فرض ہوں یا واجب یا نفل حربی کے لئے بالاتفاق جائز نہیں ہیں۔

[بحر الرائق شرح کنز الدقائق: ج ۲ ص ۲۶۱، باب المصرف]

اور دوسری بات وہ جس کی تفصیل ہم پیچھے کر آئے کہ قرآن وحدیث میں بھلائی کا حکم مطلقاً دیا گیا مگر دوسرے مقام پر اس کی وضاحت کر کے حربی کفار کے ساتھ احسان سے منع کیا گیا۔ یوں ہی حدیث پاک میں مطلقاً بھلائی کا حکم ہوا مگر مشرکین کو قربانی کا گوشت دینے سے منع کیا گیا۔ لیکن اس حکم میں مفسرین ومحدثین اور فقہاء نے حربی کی قید لگا کر ذمی کو اس حکم سے خارج کر دیا۔ لہٰذا کتب فقہ کی معتمد کتابوں میں قربانی کا گوشت کافر کو دینے کی صراحت بس ذمی کے ساتھ ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ اس میں حربی شامل نہیں ہے۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے کہ حربی کے ساتھ بھلائی کی شرعاً ممانعت ہے۔ لیکن ذمی اس سے خارج ہے، اسی لئے یہاں بھی وہی حکم ہوگا۔ حربی کو گوشت دینا بطور صدقہ ہو یا بطور ہدیہ ہو احسان میں شامل ہے اور اس کے ساتھ احسان منع ہے۔ اگر زید اعلاء السنن کی عبارت کے پیش نظر یہ کہے کہ یہاں کفار کا ذکر مطلقاً ہے تو اس کے جواب میں حدیث شریف ہی کافی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً مشرکین کو گوشت کھلانے سے منع فرمایا۔

علاوہ ازیں علامہ بدرالدین عینی حنفی شارح بخاری، اپنی کتاب عمدۃ القاری شرح بخاری میں مطلقاً مشرکین کو ہدیہ دینے، ان کے ساتھ احسان کرنے کی ممانعت کا ذکر کرتے ہوئے نیز اس کی علت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقول الله تعالى﴿لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين﴾ والمراد من ذكر الآية بيان من تجوز له الهدية من المشركين، ومن لا تجوز، وليس حكم الهدية إليهم على الإطلاق... ولا يجوز الإهداء للمشركين إلا للأبوين خاصة، لأن الهدية فيها تأنيس للمهدى إليه، وألطاف له، وتثبيت لمودته، وقد نهى الله تعالى عن التودد للمشركين بقوله:﴿لا تجد قوما يؤمنون بالله واليوم الآخر يوادون من حاد الله ورسوله﴾ الآية، وقوله تعالى:﴿يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا عدوي وعدوكم أولياء تلقون إليهم بالمودة﴾ ''

یعنی اوراللہ تعالیٰ کا فرمان ''اللہ تمہیں ان سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین میں نہ لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا کہ ان کے ساتھ احسان کرو اور ان سے انصاف کا برتاؤ برتو۔بے شک انصاف والے اللہ کو محبوب ہیں۔

اس آیت کو ذکر کرنے سے ان مشرکین کا بیان مراد ہے جنہیں ہدیہ جائز ہے۔اور وہ جنہیں نہیں۔اور انہیں ہدیہ دینے کا حکم مطلقاً نہیں ہے۔اور سوائے والدین کے مشرکین کو ہدیہ دینا جائز نہیں ہے۔کیوں کہ انہیں دینے میں ان سے انسیت، ان پر مہربانی اور ان کے ساتھ محبت ثابت ہو رہی ہے حالانکہ اللہ پاک نے مشرکین سے محبت کرنے سے منع فرمایا ہے۔اپنے اس فرمان کے ذریعہ: تم نہ پاؤ گے ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ان سے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت کی۔اور اس فرمان سے:

''اے ایمان والو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم انہیں خبریں پہنچاتے ہو دوستی سے''

[عمدۃ القاری شرح بخاری، کتاب الھبۃ، باب الھدیۃ للمشرکین، ۱۷۳/۱۳]

بالجملہ: زید کا مطلقاً کفار کے لئے قربانی کا گوشت دینے اور کھلانے کا حکم بیان کرنا بالکل نادرست اور مفہوم قرآن واحادیث اور اقوال فقہا و علما کے خلاف ہے۔

اب رہا مسئلہ فتاوی دیوبند میں ہنود جن کے حربی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، ان کے لئے قربانی کا گوشت دینے کے جواز میں یہ کہنا کہ ان کو صدقہ نافلہ دینا جائز ہے۔یہ بھی سراسر تفسیرات مفسرین، تشریحات محدثین اور تصریحات فقہا کے خلاف ہے گزشتہ اوراق میں تفصیل گزر چکی ہے۔البتہ حربی کافر کو صدقہ نافلہ دینے سے متعلق چند عبارات فقہا یہاں بھی نقل کئے دیتے ہیں تاکہ مزید اطمینان آپ کو حاصل ہو جائے۔اور آپ پر مسئلہ بالکل واضح ہو جائے، ہم یہ تفصیل حضور اعلیٰ حضرت کے حوالے سے نقل کریں گے تاکہ آپ نے جو بیان کیا ہے کہ حضور اعلیٰ حضرت ہنود کو گوشت دینے سے منع فرماتے ہیں وہ فرمان مدلل ہو جائے۔حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: ''یہاں اگر مسلمان مسکین نہ ملے تو کافر کو اصلا نہ دے کہ یہ کفار ذمی نہیں، تو ان کو دینا قربانی ہو خواہ صدقہ، اصلا کچھ ثواب نہیں رکھتا، درمختار میں ہے:

اما الحربی ولو مستامنا فجمیع الصدقات لایجوز له اتفاقا، بحر عن الخانیة وغیرھا۔

حربی اگر مستامن بھی ہو تو اس کو کوئی بھی صدقہ دینا بالاتفاق ناجائز ہے۔بحر نے خانیہ وغیرہا سے نقل کیا۔

بحر الرائق میں معراج الدرایہ شرح ہدایہ سے ہے:

صلتہ لاتکون براشرعا، ولذا لم یجزالتطوع الیہ فلم یقع قربۃ۔

اس سے صلہ شرعانیکی نہیں اسی لئے اس کو نفلی صدقہ بھی جائز نہیں لہذا عبادت نہ بنے گا۔"

[فتاوی رضویہ جدید، ۲۵۳/۲۰]

"تو اس کو ران وغیرہ کچھ نہ دیں کہ کافروں کا صدقات وغیرہ میں کچھ حق نہیں ، نہ اس کو دینے کی اجازت، غایہ سروجی وبحر الرائق ودر مختار وغیرہا میں ہے:

اما الحربی ولومستأمنا فجمیع الصدقات لایجوز لہ اتفاقا۔ لیکن کافر حربی اگر چہ مستامن ہو اس کو تمام صدقات دینا بالاتفاق ناجائز ہے۔ درایہ میں ہے: صلتہ لاتکون براشرعا۔ ولذا لم یجزالتطوع الیہ۔

اس کے ساتھ صلہ رحمی شرعی طور پر نیکی نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس پر احسان کرنا جائز نہیں۔"

[فتاوی رضویہ جدید، ۵۸۹/۲۰]

مزید فرماتے ہیں:

"تصدقو اعلی اھل الا دیان کلھا میں امر بتصدق ہے اور تصدق قربت جہاں قربت نہ ہو صدقِ تصدق محال ہے اور بہ تصریح ائمہ اہل حرب کو کچھ دینا اصلاً قربت نہیں تو وہاں صدق تصدق ناممکن۔ اور قطعاً حاصلِ حدیث یہ کہ جن کو دینا قربت ہے وُہ کسی دین کے ہوں ان پر تصدق کرو یہ ضرور صحیح ہے۔ اور صرف اہلِ ذمّہ کو شامل نصرانی ہوں خواہ یہودی خواہ مجوسی خواہ وثنی، کسی دین کے ہوں، اگر وُہ قول لیں کہ غنی کو دینا صدقہ نہیں ہوسکتا تو مسلمان غنی بھی اس عموم اہل الادیان کلھا میں نہیں آسکا کہ وہ محلِ صدقہ ہی نہیں اور کلام تصدق میں ہے، یہی جواب اس حدیث سے ہے کہ ہر جاندار سے بھلائی صدقہ ہے، ورنہ صحیح مسلم شریف کی صحیح حدیث میں فرمایا کہ جو وزغ کو ایک ضرب مارے سَو نیکیاں پائے"

[فتاوی رضویہ جدید، ۳۳۲/۱۰]

اور نہایہ، بحر الرائق وغیرہ کتب فقہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"نہایہ امام سغناقی وغایۃ البیان امام اتقانی وبحر الرائق وغنیہ علامہ شرنبلالی میں:

واللفظ للبحر صح دفع غیرالزکوٰۃ الی الذمی لقولہ تعالٰی لاینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین الاٰیۃ وقید بالذمی لان جمیع الصدقات فرضا کانت اوواجبۃ اوتطوعا لاتجوز للحربی اتفاقا کما فی غایۃ البیان لقولہ تعالٰی ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واطلقہ فشمل المستامن وقد صرح بہ فی النھایۃ۔

زکوۃ کے سوا اور صدقات ذمی کو دے سکتے ہیں، اللہ عزوجل فرماتا ہے: تمھیں اللہ ان سے منع نہیں فرماتا جو دین میں تم سے نہ لڑیں، ذمی کی قید اس لئے لگائی کہ حربی کیلئے جملہ صدقات حرام ہیں، فرض ہوں یا واجب یا نفل۔ جیسا کہ غایۃ البیان میں ہے۔ اس لئے کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے: اللہ تمھیں ان سے منع فرماتا ہے جو دین میں تم سے لڑیں، حربی کو مطلق رکھا تو مستامن کو بھی شامل ہوا جو سلطان اسلام سے پناہ لے کر دارالاسلام میں آیا اسے بھی کسی قسم کا صدقہ دینا جائز نہیں۔

اور نہایہ میں اس کی صاف تصریح ہے۔"

[فتاوی رضویہ جدید، ۴۴۳/۱۴]

عنایہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"عنایہ امام اکمل میں ہے: التصدق علیھم مرحمة لھم و مواساة وھی منافیة لمقتضی الاٰیة۔
انھیں خیرات دینا ان پر ایک طرح کی مہربانی اور ان کی غمخواری ہے اور یہ حکم قرآن مجید کے خلاف ہے۔"

[فتاوی رضویہ جدید، ۴۶۰/۱۴، ۴۵۹]

الحاصل: ہنود کو قربانی کا گوشت دینا، ہدیہ کرنا، صدقہ کرنا کھلانا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ حربی کافر ہیں اور حربی کے ساتھ احسان وصلہ رحمی، ان کو ہدیہ وصدقہ ازروئے شرع ناجائز ہے۔ کماسبق۔

ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

حظر واباحت

دنیا میں دیدار الٰہی ہوگا یا نہیں
آخرت میں کیا مومن کافر منافق سب کو دیدار الٰہی ہوگا

فتوی ۱۲۰ مسئولہ: (مولانا) مقبول رضا نعیمی متعلم جامعہ نعیمیہ مرادآباد۔ ۱۰ ر جمادی الاخریٰ ۱۳۴۰ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسائل میں

کیا انسان اللہ پاک کا دیدار کر سکتا ہے؟ اگر ہاں تو دنیا میں یا آخرت میں؟

اور دیدار الٰہی مومن کافر سب کو ہوگا یا صرف مومنین بندوں کو؟ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ مومن کافر سب کو دیدار ہوگا۔ تو اس بارے میں کیا تحقیق ہے؟ اور اگر ہوگا تو کہاں ہوگا جنت میں یا موقف میں؟ اس تعلق سے تفصیلی جواب مع دلائل بیان فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

(۱) انسان کے لیے اللہ پاک کا دیدار محال نہیں ہے۔ اللہ کے فضل سے مومنوں کو رب کا دیدار حاصل ہوگا۔ مگر دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں۔ جمہور اہل سنت وجماعت کے نزدیک دنیا میں دیدار باری تعالیٰ ممکن تو ہے البتہ واقع نہیں ہے۔ اس تعلق سے مفسرین محدثین اور محققین علما وفقہا نے بہت ہی معرکۃ الآرا بحثیں فرمائی ہیں۔ ہم یہاں ان سب بحثوں سے قطع نظر دوچند عبارات ونصوص پیش کرتے ہیں۔ پہلے ہم دنیا میں دیدار الٰہی کے عدم وقوع کے حوالے سے عبارات پیش کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں رب ارشاد فرماتا ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصٰر (آنکھیں اسے احاطہ نہیں کرتیں) [سورہ انعام آیت ۱۰۳]

اس آیت کریمہ کے تحت مفسرین کرام نے جو تفسیریں کی ہیں ان میں سے چند پیش ہیں۔

علامہ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

لَا تُدْرِكُهُ فِي الدُّنْيَا، وَإِنْ كَانَتْ تَرَاهُ فِي الْآخِرَةِ'' یعنی اللہ تعالیٰ کو دنیا میں نہیں دیکھ سکتے البتہ آخرت میں اس کا دیدار ہوگا۔

[تفسیر ابن کثیر: سورہ انعام آیت ۱۰۳]

تفسیر قرطبی میں اس آیت کے تحت ہے:

''وقال ابن عباس: ''لا تدركه الأبصار'' في الدنيا، ويراه المؤمنون في الآخرة''

یعنی حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ رب کو دنیا میں آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں البتہ آخرت میں مومن دیکھیں گے۔ [تفسیر قرطبی: سورہ انعام آیت ۱۰۳] تفسیر روح البیان میں ہے:

''فمعنى قوله لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ اى لا تراه فى الدنيا فهو مخصوص برؤية المؤمنين له فى الآخرة''

یعنی دنیا میں آنکھوں سے رب کی رویت نہیں ہوگی وہ آخرت میں مومنوں کے لیے خاص ہے۔

[تفسیر روح البیان: سورہ انعام آیت ۱۰۳]

تفسیر مظہری میں ہے۔

''اجمع اھل السنۃ علی نفی الرویۃ فی الدنیا وإثباتھا فی الاخرۃ للمؤمنین فی الجنۃ''

یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عدم رویت پر اہل سنت کا اجماع ہے البتہ مومنوں کے لیے آخرت میں جنت میں رویت ثابت ہے۔

[تفسیر مظہری: ۳/۲۴۷]

تفسیر در منثور میں ہے:

''أخرج أَبُو الشَّيْخ وَالْبَيْهَقِيّ فِي كتاب الرُّؤْيَة عَن الْحسن فِي قَوْله ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَار﴾ قَالَ: فِي الدُّنْيَا''

ابو الشیخ اور بیہقی نے روایت کیا حسن سے اللہ کے فرمان (لَاتُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ) کے بارے میں فرمایا: دنیا میں۔ یعنی دنیا میں آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ [تفسیر در منثور: سورہ انعام آیت ۱۰۳]

تفسیر خزائن العرفان میں آیت کریمہ

''وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ''

کی تفسیر میں صدر الافاضل فرماتے ہیں:

''ان آنکھوں سے سوال کر کے بلکہ دیدار الٰہی بغیر سوال کے محض اس کی عطا و فضل سے حاصل ہوگا، وہ بھی اس فانی آنکھ سے نہیں بلکہ باقی آنکھ سے یعنی کوئی بشر مجھے دنیا میں دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ میرا دیکھنا ممکن نہیں اس سے ثابت ہوا کہ دیدار الٰہی ممکن ہے اگرچہ دنیا میں نہ ہو کیوں کہ صحیح حدیثوں میں ہے کہ روز قیامت مؤمنین اپنے ربّ عزّوجلّ کے دیدار سے فیضیاب کئے جائیں گے علاوہ بریں یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام عارف باللہ ہیں، اگر دیدار الٰہی ممکن نہ ہوتا تو آپ ہر گز سوال نہ فرماتے۔''

[تفسیر خزائن العرفان: سورہ اعراف آیت ۱۴۳]

یہاں تک قرآن پاک اور تفاسیر کی روشنی میں ثابت ہوا کہ دیدار الٰہی ممکن ہے البتہ اس کے عدم وقوع پر علما کا اتفاق ہے۔ اس تعلق سے مسلم شریف کی ایک حدیث پاک بھی ملاحظہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تعلموا أنه لن يرى أحد منكم ربه عزوجل حتى يموت، یعنی موت سے پہلے کوئی بھی تم میں سے رب کو نہیں دیکھ سکے گا۔

[صحیح مسلم: باب ذکر ابن صیاد، ج۴ ص ۲۲۴۰، رقم الحدیث: ۱۶۹]

اب چند محدثین کرام کی عبارتیں پیش ہیں وہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

علامہ عینی عمدۃ القاری شرح بخاری میں فرماتے ہیں:

''أن رؤية الله تعالى في الدنيا بالأبصار غير واقعة فإن قلت فالنبي صلى الله عليه وسلم قد رآه قلت قال بعضهم وأما النبي صلى الله عليه وسلم فذاك لدليل آخر قلت رؤية النبي صلى الله عليه وسلم ربه عزوجل لم يكن في دار الدنيا بل كانت في الملكوت العليا والدنيا لا تطلق عليها والدليل الصريح على عدم وقوع رؤية الله تعالى بالأبصار في الدنيا ما رواه

مسلم من حديث أبي أمامة قال عليه السلام ’’ واعلموا أنكم لن تروا ربكم حتى تموتوا ‘‘ وأما الرؤية في الآخرة فمذهب أهل الحق أنها واقعة بالأبصار ‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا میں آنکھوں سے واقع نہیں ہے۔ اگر تم کہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رب کو دیکھا ہے تو میں کہوں گا کہ تو میں کہوں گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کا دیدار دنیا میں نہیں کیا بلکہ عالم ملکوت میں کیا اور اس پر دنیا کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اور دنیا میں رب کے دیدار کے واقع نہ ہونے کی صریح دلیل ابوامامہ کی حدیث ہے جسے امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جان لو کہ تم موت سے قبل ہرگز اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے۔ اور آخرت میں دیدار الٰہی میں اہل سنت کا مذہب ہے کہ وہ آنکھوں سے واقع ہوگا۔‘‘

[باب سؤال جبريل لنبي صلى الله عليه وسلم عن الإيمان والإسلام والإحسان وعلم الساعة، ۲۹۱/۱]

علامہ ابن حجر فتح الباری لابن حجر میں لکھتے ہیں:

’’ وأما في الدنيا فقال مالك إنما لم ير سبحانه في الدنيا لأنه باق والباقي لا يرى بالفاني فإذا كان في الآخرة ورزقوا أبصارا باقية رأوا الباقي بالباقي قال عياض وليس في هذا الكلام استحالة الرؤية إلا من حيث القدرة فإذا قدر الله من شاء من عباده عليها لم يمتنع قلت ووقع في صحيح مسلم ما يؤيد هذه التفرقة في حديث مرفوع فيه واعلموا أنكم لن تروا ربكم حتى تموتوا وأخرجه بن خزيمة أيضا من حديث أبي أمامة ومن حديث عبادة بن الصامت فإن جازت الرؤية في الدنيا عقلا فقد امتنعت سمعا ‘‘

یعنی دنیا میں دیدار الٰہی نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اللہ باقی ہے اور باقی کو فانی نہیں دیکھ سکتا۔ اور آخرت میں اللہ تعالیٰ آنکھوں کو بقا بخشے گا تو باقی کا دیدار بقا والی آنکھوں کو عطا ہوگا۔ قاضی عیاض نے کہا کہ اس کلام میں رویت محال نہیں ہے بلکہ قدرت پر منحصر ہے۔ اللہ جسے چاہے گا قدرت دے گا دیدار پر، تو اس کے لیے دیدار محال نہیں ہے۔ میں کہوں گا کہ اس تفریق کی تائید میں صحیح مسلم میں روایت ہے کہ جان لو تم لوگ موت سے پہلے اپنے رب کا دیدار نہیں کر سکتے۔ اس کو ابن خزیمہ نے بھی روایت کیا ہے۔ اور عبادہ بن صامت والی حدیث سے رویت باری کا جواز ظاہر ہوتا ہے عقلاً البتہ شرعاً محال ہے۔

[فتح الباری شرح صحیح الخاری:۲۰۸/۸]

مزید فرماتے ہیں:

’’ أن الله تعالى لا يراه في الدنيا أحد من الأحياء وإنما يقع ذلك للمؤمنين بعد الموت ‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا میں زندوں میں سے کسی کے لیے واقع نہیں ہے۔ ہاں مومنوں کے لیے بعد موت واقع ہے۔

[باب من احب لقاء اللہ]

تیسیر شرح جامع صغیر میں ہے:

’’ (انكم) أيها المؤمنون (لن تروا ربكم عزوجل) بأعينكم يقظة (حتى تموتوا) فإذا متم رأيتموه في الآخرة رؤية منزهة عن الكيفية أما في الدنيا يقظة فلغير الأنبياء ممنوعة ولبعض الأنبياء ممكنة في بعض الأحوال ‘‘

یعنی اے مومنو! تم رب تعالیٰ کا دیدار اپنی آنکھوں سے عالم بیداری میں نہیں کرسکتے یہاں تک کہ تمہیں موت آئے۔ توجب تم مر جاؤ گے تو بلا کیف رب کو دیکھو گے۔ البتہ دنیا میں بیداری میں غیر انبیا کے لیے اس کا وقوع ممنوع ہے۔ اور بعض انبیا کے لیے بعض حالتوں میں ممکن ہے۔ [۳۵۷/۱، حرف الھمزہ]

ملا علی قاری مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح میں رقمطراز ہیں:

''الحق من أن رؤية الله في الدنيا لا تقع لحديث مسلم واعلموا أنكم لن تروا ربكم حتى تموتوا قال الإمام مالك: لأن البصر في الدنيا خلق للفناء فلم يقدر على رؤية الباقي بخلافه في الآخرة فإنه لما خلق للبقاء الأبدي قوي وقدر على نظر الباقي سبحانه، فرؤيته۔ صلى الله عليه وسلم۔ ليلة الإسراء بعين رأسه على القول به إما على أنه مستثنى،''

حق یہ کہ دنیا میں اللہ پاک کا دیدار واقع نہیں ہے۔ حدیث مسلم کی دلیل سے کہ ''جان لو کہ تم اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے جب کہ تمہیں موت نہ آجائے۔ امام مالک نے فرمایا: کہ دنیاوی آنکھ فنا کے لیے بنی ہے تو وہ باقی کی رویت پر قادر نہیں ہے۔ بر خلاف آخرت میں کہ وہاں بقائے ابدی ملے گی اعضا کو اور وہ باقی کو دیکھنے پر قادر ہو گی۔ پس معراج کی رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رب کو دیکھنا مستثنیٰ ہے۔

[مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح: کتاب الایمان، ج ۱ ص ۶۲]

فیض القدیر میں لاترون ربکم والی حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ مناوی لکھتے ہیں:

''(إنكم) أيها المؤمنون (لن تروا ربكم) بأعينكم يقظة (عزوجل حتى تموتوا) فإذا متم رأيتموه في الآخرة رؤية منزهة عن الكيفية أما في الدنيا يقظة فلغير الأنبياء عليهم الصلاة والسلام ممنوعة ولبعض الأنبياء عليهم الصلاة والسلام ممكنة في بعض الأحوال''

یعنی اے مومنو! تم ہرگز اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے جاگتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے جب تمہیں موت آئے تو آخرت میں اسے بلا کیفیت دیکھو گے۔ اور دنیا میں غیر انبیا کے لیے رویت ممنوع ہے۔ اور بعض انبیا کے لیے بعض حالات میں اس کا وقوع ممکن ہے۔'' [۲۵۷/۲، حرف الھمزۃ]

حدیث جبریل کے درج ذیل جملہ

قال ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك

کے تحت شیخ عبد الحق محدث دہلوی، لمعات التنقیح شرح مشکاۃ المصابیح میں رقمطراز ہیں۔

''ان في الحديث دلالة على ان رؤيته تعالىٰ في الدنيا ممكنة عقلا لأن لم لنفي الممكن ك زيد لم يقم ،بخلاف الحجر لا يطير، وامكان الروية في الدنيا هو الحق وان لم يكن''

یعنی حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ دنیا میں رویت باری تعالیٰ عقلاً ممکن ہے۔ اس لیے کہ لم ممکن کی نفی کے لیے آتا ہے۔ جیسے زید لم یقم بر خلاف الحجر لا یطیر کے۔ اور دنیا میں رویت کا امکان حق ہے اگرچہ واقع نہیں ہے۔

[لمعات التنقیح شرح مشکاۃ المصابیح، کتاب الایمان، جلد اول صفحہ ۸۵]

الحاصل: دنیا میں دیدار الٰہی کے امکان کے ساتھ عدم وقوع پر علما کا اتفاق ہے۔
اب رہا معاملہ کہ آخرت میں ہوگا تو کس کس کو ہوگا کیا مومن اور کافر سبھی دیدار الٰہی سے مستفیض ہوں گے۔
تو اس تعلق سے علما میں شدید اختلاف ہے بعض مومن کافر سب کے لیے دیدار الٰہی کے قائل ہیں اور بعض صرف مومنوں کے لیے رویت خاص قرار دیتے ہیں۔ جو علما سب کے لیے رویت عام مانتے ہیں ان میں سے چند کے حوالے پیش ہیں۔
علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں:

'' رؤية الله تعالى يوم القيامة فى الموقف حاصلة لكل أحد، الرجال والنساء بلا نزاع، وذهب قوم من أهل السنة إلى أنها تحصل فيه للمنافقين أيضا. وذهب آخرون منهم إلى أنها تحصل للكافرين أيضا، ثم يحجبون بعد ذلك ليكون عليهم حسرة، وله شاهد رويناه عن الحسن البصرى.وأما الرؤية فى الجنة فأجمع أهل السنة أنها حاصلة للأنبياء والرسل والصديقين من كل أمة، ورجال المؤمنين من البشر من هذه الأمة''

''یعنی قیامت کے دن موقف میں مرد وعورت سب کو بلا اختلاف رویت باری حاصل ہے۔ اہل سنت وجماعت کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ رویت باری تعالیٰ منافقین کو بھی حاصل ہوگی اور دوسرا گروہ اس طرف گیا ہے کہ کافروں کو بھی رویت حاصل ہوگی۔ پھر وہ محجوب ہو جائیں گے تاکہ ان کے لیے حسرت ہو جائے۔ اور ان کے اس پر دلیل ہے جو ہم نے حسن بصری سے روایت کیا۔ اور رہا جنت میں دیدار تو اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ وہ انبیاء اور رسل اور ہر امت کے صدیقین اور اس امت کے مومن مرد کے لیے حاصل ہے۔[الحاوی للفتاوی: ج ۲ ص ۲۴۰]

شیخ عبد الحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

''مختار آنست کہ رویت حق سبحانہ تعالیٰ در دنیا نیز ممکن است ولیکن واقع نیست باتفاق..... وگفتہ اند کہ ایں تخصیص رویت بمومناں در بہشت است کہ بعد از درآمدن آں بایں دولت مشرف شوند امادر موقف حشر ہمہ بہ بینند چہ مومن وچہ کافر وکافراں بعد از دیدن محجوب شوند ودر حسرت ابد بمانند''

یعنی مذہب مختار یہ ہے کہ رویت حق تعالیٰ دنیا میں بھی ممکن ہے البتہ بالاتفاق واقع نہیں ہوئی..... اور کہا گیا ہے کہ رویت کی تخصیص خاص مومنوں کے لیے ہے جنت میں۔ البتہ میدان حشر میں سب دیکھیں گے خواہ مومن ہو یا کافر۔ اور کافر رویت کے بعد محجوب ہو جائیں گے اور ہمیشہ حسرت میں رہیں گے۔''[اشعۃ اللمعات، ۲۲۹/۴، باب رویۃ اللہ تعالیٰ]

امام سیوطی اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی قدس سرھما کی عبارات سے ظاہر ہے کہ آخرت میں دیدار سب کے لیے عام ہے۔ حالانکہ امام سیوطی کی اس بات سے ملا علی قاری متفق نہیں ہیں۔ اور انہوں نے اس پر کلام کیا ہے۔ وہ بھی دلائل کے ساتھ۔ ان کی عبارت یہ ہے:

'' ذكر السيوطى - رحمه الله - فى بعض تعاليقه أن رؤية الله تعالى يوم القيامة فى الموقف حاصلة لكل أحد من الرجال والنساء، حتى قيل للمنافقين والكافرين أيضا، ثم يحجبون بعد ذلك ; ليكون عليهم حسرة، وأقول: وفيه بحث ; لقوله تعالى: {كلا إنهم عن ربهم يومئذ لمحجوبون} [المطففين:١٥] ; ولقوله - صلى الله تعالى عليه وسلم - على ما سيأتى:

(حتی إذا لم یبق إلا من کان یعبد الله أتاهم رب العالمین)؛ ولأن لذة النظر ولو مرة تنسی کل محنة وشدة، بل یرتفع به کل حسرة؛ إذ من المعلوم أن النظر لا یوجد دائما لأهل الجنة أیضا ''

یعنی سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بعض تعلیقات میں ذکر کیا کہ رویت باری تعالیٰ قیامت میں موقف میں تمام مرد وعورت بلکہ منافقین وکافرین کے لیے بھی ہے بعد دیدار وہ محجوب ہو جائیں گے تاکہ ان کے لیے حسرت ہو۔ میں کہتا ہوں اس میں بحث ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان {کلا إنهم عن ربهم یومئذ لمحجوبون} کے سبب۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان عالیشان (حتی کہ جب اللہ کی عبادت کرنے والوں کے سوا کوئی باقی نہ رہے گا تو رب ان کو اپنا دیدار عطا کرے گا۔) کی وجہ سے۔ اور اس لیے کہ دیدار کی لذت اگرچہ ایک ہی مرتبہ ہو ہر محنت اور سختی کو بھلادے گی۔ بلکہ اس کی وجہ سے ہر حسرت مٹ جائے گی۔ جب کہ یہ معلوم ہے کہ دیدار اہل جنت کو بھی ہمیشہ نہیں ہو گا۔

[مرقاۃ المفاتیح: باب الحوض والشفاعۃ، ج ۸ ص رقم الحدیث، ۵۵۷۸۔]

علاوہ ازیں قرآن پاک کی درج ذیل آیت کریمہ سے بھی یہی مفہوم حاصل ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ ؕ وَلَا یَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾

بھلائی والوں کے لیے بھلائی ہے اور اس سے بھی زائد اور ان کے منہ پر نہ چڑھے گی سیاہی اور نہ خواری وہی جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ [ترجمہ قرآن کنز الایمان: پارہ ۱۱، سورہ یونس، آیت ۲۶]

اس آیت کریمہ میں زیادت سے مراد مومنوں کے لیے رویت باری تعالیٰ ہے۔ جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں صدر الافاضل لکھتے ہیں:

بھلائی والوں سے اللہ کے فرمانبردار بندے مومنین مراد ہیں اور یہ جو فرمایا کہ ان کے لئے بھلائی ہے اس بھلائی سے جنّت مراد ہے اور زیادت اس پر دیدارِ الٰہی ہے۔ مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ جنّتیوں کے جنّت میں داخل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تم چاہتے ہو کہ تم پر اور زیادہ عنایت کروں، وہ عرض کریں گے یاربّ کیا تونے ہمارے چہرے سفید نہیں کئے، کیا تونے ہمیں جنّت میں داخل نہیں فرمایا، کیا تونے ہمیں دوزخ سے نجات نہیں دی، حضور نے فرمایا پھر پردہ اٹھا دیا جائے گا تو دیدارِ الٰہی انہیں ہر نعمت سے زیادہ پیارا ہو گا۔ صحاح کی بہت حدیثیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ زیادت سے آیت میں دیدارِ الٰہی مراد ہے۔

[پارہ ۱۱ آیت ۲۶۔ سورہ یونس]

دوسری آیت میں کفار سے عدم رویت کی نفی ثابت ہوتی ہے وہ بھی تلاوت فرمائیں:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾

ہاں ہاں بے شک وہ اس دن اپنے رب کے دیدار سے محروم ہیں۔ [پارہ ۳۰، سورہ مطففین، آیت ۱۵]

صدر الافاضل اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مسئلہ: اس آیت سے ثابت ہوا کہ مومنین کو آخرت میں دیدارِ الٰہی کی نعمت میسّر آئے گی کیوں کہ محرومی دیدار سے کفّار کی وعید میں ذکر کی گئی اور جو چیز کفّار کے لئے وعید و تہدید ہو وہ مسلمان کے حق میں ثابت ہو نہیں سکتی تو لازم آیا کہ مومنین کے حق میں یہ محرومی ثابت نہ ہو، حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جب اس نے اپنے دشمنوں کو اپنے دیدار سے محروم کیا تو دوستوں کو اپنی تجلّی سے نوازے گا اور اپنے دیدار سے سرفراز فرمائے گا۔

[تفسیر خزائن العرفان: پارہ ۳۰، سورہ مطففین آیت ۱۵]

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت کے ملفوظات میں ہے:

''اہلسنّت کا ایمان ہے کہ قیامت و جنت میں مسلمانوں کو دیدارِ الٰہی بے کیف و بے جہت و بے محاذات ہوگا۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ، اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ،

کچھ منہ تر و تازہ ہوں گے اپنے رب کو دیکھتے ہوئے۔

کفار کے حق میں فرماتا ہے:

كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ

بے شک وہ اس دن اپنے ربّ (عَزَّوَجَلَّ) سے حجاب میں رہیں گے۔

یہ کافروں پر عذاب بیان فرمایا گیا ہے تو ضرور مسلمان اس سے محفوظ ہیں۔ [ملفوظات اعلیٰ حضرت: حصہ اول ص ۱۱۱]

ان عبارات و نصوص سے ظاہر ہے کہ دیدار الٰہی صرف مومنین کے لیے ہوگا۔ (اس پر مزید حوالے ابتدائی بحث میں دنیا میں دیدار الٰہی کے عدم و قوع کے سلسلے میں عبارات میں دیکھے جاسکتے ہیں) اب وہ جنت میں ہوگا یا موقف میں بھی ہوگا یہ مختلف فیہ ہے۔ بعض علما نے موقف میں مومنوں کے لیے دیدار الٰہی تسلیم کیا ہے اور بعض نے جنت میں دیدار الٰہی ثابت مانا ہے۔ اہل جنت کے لیے جنت میں دیدار مسلمہ ہے۔ البتہ موقف کے معاملہ میں کوئی صریح حکم قرآن و حدیث سے نہیں ملتا۔ بلکہ احادیث اور اقوال علما و فقہا سے یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ دیدار جنت میں اہل جنت کے لیے خاص ہے۔

مسلم شریف کی حدیث صحیح ملاحظہ ہو:

'' عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: '' إذا دخل أهل الجنة الجنة، قال: يقول الله تبارك وتعالى: تريدون شيئا أزيدكم، فيقولون: ألم تبيض وجوهنا، ألم تدخلنا الجنة، وتنجنا من النار، قال: فيكشف الحجاب، فما أعطوا شيئا أحب إليهم من النظر إلى ربهم عزوجل ''

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ پاک فرمائے گا: کیا تم مجھ سے مزید کچھ چاہتے ہو تو وہ عرض کریں گے کیا تو نے ہمارے چہرے روشن نہ کئے کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا، کیا تو نے ہمیں جہنم سے آزاد نہیں فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی دوران پردہ اٹھا دیا جائے گا۔ تو ان کو کوئی چیز ایسی نہیں دی گئی ہوگی جو ان کو رب کے دیدار سے زیادہ محبوب ہو۔

[مسلم شریف، باب إثبات رؤية المؤمنين في الآخرة ربهم سبحانه وتعالى]

ترمذی شریف میں ہے:

''عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی قولہ: ﴿للذین أحسنوا الحسنی وزیادۃ﴾ (یونس:۱۵) قال: ، إذا دخل أهل الجنة الجنة نادى مناد: إن لكم عند الله موعدا، قالوا: ألم يبيض وجوهنا وينجنا من النار ويدخلنا الجنة، قالوا: بلى، فيكشف الحجاب، قال: فواللہ ما أعطاهم شيئا أحب إليهم من النظر إليه''

یعنی فرمان رب تعالیٰ (بھلائی والوں کے لیے بھلائی ہے اور اس سے بھی زائد) کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو منادی ندا دے گا۔ کہ تمہارے لیے اللہ کا وعدہ ہے۔ جنتی کہیں گے کہ کیا ہمارے چہرے روشن نہ کئے گئے اور کیا ہمیں جہنم سے آزاد کر کے جنت میں داخل نہ کیا گیا۔ کہیں گے وہ کیوں نہیں۔ تو پردہ اٹھایا جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی قسم اللہ نے ان کو ایسی کوئی چیز عطا نہیں کی جو انہیں دیدار الٰہی سے زیادہ محبوب ہو۔ [ترمذی شریف، باب ما جاء فی رؤیۃ الرب تبارک وتعالی]

سنن ابن ماجہ میں ہے:

''عن صهيب، قال: تلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم هذه الآية: ﴿للذين أحسنوا الحسنى وزيادة﴾ (یونس:۲۶)، وقال: '' إذا دخل أهل الجنة الجنة، وأهل النار النار، نادى مناد: يا أهل الجنة إن لكم عند الله موعدا يريد أن ينجزكموه، فيقولون: وما هو، ألم يثقل الله موازيننا، ويبيض وجوهنا، ويدخلنا الجنة، وينجنا من النار، قال: فيكشف الحجاب، فينظرون إليه، فواللہ ما أعطاهم الله شيئا أحب إليهم من النظر- يعني إليه - ولا أقر لأعينهم''

یعنی حضرت صہیب سے مروی انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سے اس آیت: ﴿للذين أحسنوا الحسنى وزيادة﴾ کو تلاوت کیا۔ اور فرمایا: جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو منادی ندا دے گا کہ اے اہل جنت اللہ کے یہاں تمہارے لیے ایک وعدہ ہے اللہ چاہتا ہے کہ وہ پورا فرمادے۔ جنتی کہیں گے وہ کیا ہے؟

کیا اللہ پاک نے ہمارے نامہ اعمال کو وزنی نہیں کیا، ہمارے چہرے روشن نہیں کئے، ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا۔ ہمیں جہنم سے آزادی نہیں دی؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچانک پردہ ہٹا دیا جائے گا تو وہ اللہ کا دیدار کریں گے۔ خدا کی قسم ان کو کوئی ایسی چیز جو انہیں دیدار الٰہی سے زیادہ محبوب ہو اور ان کی آنکھوں کا قرار ہو نہیں دی گئی۔

[سنن ابن ماجہ، باب فیما أنکرت الجھمیۃ]

ان احادیث کریمہ سے صاف ظاہر ہے کہ اہل جنت کو جنت میں دیدار الٰہی ہو گا۔ اگر اہل جنت موقف میں دیدار الٰہی کر چکے ہوں گے تو پھر ان سے دیدار کی بابت دریافت کرنا اور ان سے وعدہ پورا کرنے کی بات کہنا بھی خود میں ایک سوال ہے۔

علاوہ ازیں دیدار کو سب کے لیے موقف میں تسلیم کرنے پر اہل جنت کے لیے کیا خاص رہ جائے گا۔ اس لیے ظاہر احادیث کے مطابق اہل جنت ہی کے لیے دیدار الٰہی ثابت مانا جانا زیادہ مناسب ہے۔ نیز اہل جنت کے لیے رویت باری تعالیٰ اہل سنت کے نزدیک مجمع علیہ ہے۔ البتہ موقف میں دیدار پر اختلاف ہے۔ ہم یہاں اہل جنت کے لیے دیدار الٰہی کے حوالے سے چند محدثین وفقہا کے اقوال پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ملا علی قاری شرح مشکاۃ میں امام نووی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وقال النووی ۔ رحمه الله : اعلم أن مذهب أهل السنة قاطبة أن رؤية الله تعالی ممكنة غير مستحيلة عقلا ، وأجمعوا أيضا علی وقوعها فی الآخرة أی نقلا وأن المؤمنين يرون الله تعالی دون الكافرين ، وزعمت طوائف من أهل البدع المعتزلة والخوارج وبعض المرجئة أن الله تعالی لا يراه أحد من خلقه ، وأن رؤيته مستحيلة عقلا ، وهذا الذی قالوه خطأ صريح وجهل قبيح ، وقد تظاهرت أدلة الكتاب والسنة وإجماع الصحابة ، فمن بعدهم من سلف الأمة علی إثبات رؤية الله تعالی فی الآخرة للمؤمنين ، ورواها نحو عشرين صحابيا ۔ رضی الله تعالی عنهم ۔ عن رسول الله ۔ صلی الله تعالی عليه وسلم ۔ وآيات القرآن فيها مشهورة ، واعتراضات المبتدعة عليها لها أجوبة مسطورة فی كتب المتكلمين من أهل السنة. وأما رؤية الله تعالی فی الدنيا ، ولكن الجمهور من السلف والخلف من المتكلمين وغيرهم من أنها تقع فی الدنيا.

یعنی نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ جان لو! اہل سنت وجماعت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رویت عقلاً ممکن ہے محال نہیں ہے۔ اور آخرت میں اس کے وقوع پر نقلاً اجماع ہے۔ اور یہ کہ مومن اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے کافر نہیں۔ اہل بدعت معتزلہ اور خوارج اور بعض مرجئہ نے جو گمان کیا ہے کہ مخلوق میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کر سکتا کہ اس کی رویت عقلاً محال ہے۔ یہ قول صریح غلطی اور بری جہالت ہے۔ کیوں کہ کتاب، سنت اجماع صحابہ اور اسلاف امت سے آخرت میں مومنین کے لیے دیدار باری تعالیٰ ثابت ہے۔ اور اس کو بیس کے قریب صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور قرآنی آیات اس بابت مشہور ہیں۔ اور بدعتیوں کے اعتراضات کے جوابات متکلمین اہل سنت کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں۔''

[مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح: باب رویۃ اللہ تعالیٰ، ج ۹، رقم الحدیث ۵۶۵۵]

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فقہ اکبر میں فرماتے ہیں:

'' والله تعالی يری فی الآخرة ويراه المؤمنون وهم فی الجنة بأعين رؤوسهم بلا تشبيه ولا كيفية ولا يكون بينه وبين خلقه مسافة''

یعنی اللہ تعالیٰ مومنین جنت میں اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ بلا تشبیہ وبلا کیفیت۔ رب کے اور مومنوں کے درمیان دوری نہیں ہو گی۔ [رؤیۃ اللہ فی الآخرۃ، ۵۳/۱]

اس کی شرح میں ملا علی قاری لکھتے ہیں:

''لقوله عليه الصلاة والسلام علی ما رواه مسلم ، اذا دخل اهل الجنة الجنة الخ''

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے بموجب جس کو مسلم نے روایت کیا ہے کہ ''جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ ملا علی قاری امام اعظم کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''وقال الامام الاعظم رحمه الله فی کتابه ''الوصية'' ولقاء الله تعالیٰ لاهل الجنة بلا کيف ولا تشبيه ولا جهة حق انتهی''

یعنی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب وصیت میں فرمایا: کہ جنتیوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے شرف ملاقات بلا کیفیت وبلا تشبیہ وجہت حق ہے۔[منح الروض الازھر فی شرح الفقہ الاکبر ۲۴۶،۲۴۵]

بالجملہ: اہل جنت کو جنت میں دیدار ہوگا اس پر اہل سنت میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ البتہ موقف میں بھی ہوگا یا نہیں ہوگا؟ اور مومنوں کو ہوگا یا کفار ومنافقین کو بھی ہوگا یہ بات مختلف فیہ ہے۔ بعض علما کے نزدیک سب کے لیے موقف میں دیدار الٰہی ثابت ہے۔ بعض نے کہا کہ موقف میں صرف مومنوں کو ہوگا۔ البتہ اکثر علما کی رائے یہ ہے کہ دیدار الٰہی جنت میں اہل جنت کو ہوگا اس کے سوا کسی کو نہ ہوگا۔ اور اس پر اجماع بھی ہے۔ باقی کسی بات پر اجماع ثابت نہیں ہے۔

اسی لیے فقہائے احناف نے اہل جنت کے لیے دیدار الٰہی کے منکر کی تکفیر کی ہے۔ لیکن کہیں کسی سے موقف میں سب کے لیے دیدار الٰہی ماننے پر اجماع نقل نہیں ہے۔ اور نہ اس کے انکار پر کہیں تکفیر نقل ہے۔ اہل جنت کے لیے دیدار الٰہی نہ ماننے والے پر حکم کفر کے سلسلے میں چند عبارات کتب فقہیہ پیش ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

’’یکفر بإنکار رؤیۃ اللہ تعالی عزوجل بعد دخول الجنۃ‘‘

یعنی جنت میں داخل ہونے کے بعد رویت باری تعالیٰ کے انکار پر تکفیر کی جائے گی۔[باب احکام المرتدین: ج ۲ ص ۲۷۴]

بحر الرائق میں ہے:

’’رؤیۃ اللہ تعالی فی الآخرۃ حق یراہ أھل الجنۃ فی الآخرۃ بلا کیفیۃ ولا تشبیہ ولا محازاۃ‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ کا دیدار آخرت میں حق ہے اہل جنت آخرت میں کیفیت وتشبیہ محاذات کے بغیر دیدار کریں گے۔

[بحر الرائق شرح کنز الدقائق: کتاب الکراہیۃ ج ۸ ص ۳۳۱]

مجمع الانہر میں ہے: ’’یکفر بإنکارہ رؤیۃ اللہ عزوجل بعد دخولہ الجنۃ‘‘ یعنی جنت میں داخل ہونے کے بعد رویت باری تعالیٰ کے منکر کی تکفیر کی جائے گی۔

[مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر: کتاب السیر والجہاد: ج ۲ ص ۵۰۹]

پوری بحث کا لب لباب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک دنیا میں دیدار الٰہی ممکن مگر غیر واقع ہے۔ اور اکثر علما کے نزدیک موقف میں دیدار الٰہی اولاً ثابت نہیں وہ بس اہل جنت کو جنت میں حاصل ہوگا۔ اور ثابت ماننے کی صورت میں وہ مومنین کے لیے خاص ہے۔ اس میں کفار ومنافقین شامل نہیں۔ یہ بحث مزید تفصیل طلب ہے لیکن یہ مقام اس کا متحمل نہیں ہے۔ اسی لیے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

قرآن پاک میں چھبیس انبیائے کرام کے اسمائے مبارکہ صراحتاً ذکر ہیں

فتوی ۱۲۱ — مسئولہ: انیس قادری مرادآباد۔ ۲۳؍رجب ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں مفتی صاحب اس بارے میں کہ قرآن پاک میں کتنے انبیائے کرام کے نام صراحتاً ذکر ہیں؟
نیز ان کے نام بھی ذکر فرمائیں۔ اور عند اللہ ماجور وعند الناس مشکور ہوں۔

الجواب

قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ چھبیس انبیائے کرام کے اسمائے مبارکہ ذکر ہیں۔ اور بطور ابہام اٹھائیس انبیائے کرام کے۔ تفسیر روح البیان میں سورہ غافر کی آیت:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ کے تحت ہے:

''والمذكورون في القرآن باسم العلم ستة وعشرون نبيا وهم محمد وآدم وإدريس ونوح وهود وصالح وابراهيم ولوط وإسماعيل وإسحاق ويعقوب ويوسف وأيوب وذو الكفل وشعيب وموسى وهارون وداود وسليمان وعزير ويونس وزكريا ويحيى وعيسى والياس واليسع صلوات الله عليهم أجمعين''

یعنی قرآن پاک میں چھبیس انبیائے کرام کے نام مذکور ہیں۔ اور وہ ہیں:
محمد، آدم، ادریس، نوح، ھود، صالح، ابراہیم، لوط، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، یوسف، ایوب، ذوالکفل، شعیب، موسیٰ، ہارون، داوٗد، سلیمان، عزیر، یونس، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، الیسع۔ ان تمام پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔''

[تفسیر روح البیان: سورہ غافر آیت ۷۸]

فتاوی رضویہ میں ہے:
''قرآن عظیم میں حضرات انبیائے کرام علیہم افضل الصلوٰۃ والسلام کا ذکر پاک بہت وجوہ مختلفہ سے وارد:
(۱) فرداً فرداً خواہ بتصریح اسماء یہ صرف چھبیس کے لئے ہے: آدم، ادریس، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، اسحٰق، اسمٰعیل، لوط، یعقوب، یوسف، ایوب، شعیب، موسٰی، ہارون، الیاس، الیسع، ذوالکفل، داوٗد، سلیمان، عزیر، یونس، زکریا، یحیٰی، عیسیٰ، محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیہم وبارک وسلم۔
یا بر سبیل ابہام مثل قال لهم نبيهم (ان کو ان کے نبی (شمویل) نے کہا۔ واذقال لفَتٰهُ (یوشع) فوجد اعبد امن عبادنا خضر علیہم الصلوٰۃ والسلام اور جس وقت انہوں نے نوجوان (یوشع) سے کہا:
''تو پایا حضرت موسٰی اور یوشع نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ حضرت خضر علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

[فتاوی رضویہ جدید، ۱۴/۳۴۲]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عورت کے کوڑا پھینکنے والی روایت بے اصل ہے
گستاخ رسول کو معاف کرنے کا حق کسی امتی کو حاصل نہیں

فتوی ۱۲۲

مسئولہ:(مفتی) فقیر ضیاء احمد، خطیب جامع مسجد
ندیم ٹاؤن ملتان روڈ لاہور۔ ۱۳/ جمادی الاولی ۱۴۴۰ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں واعظین وخطباکے بیانات میں اکثر یہ بات بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک عورت کوڑا کرکٹ پھینکا کرتی تھی، ایک دن اس نے کوڑا نہ پھینکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گھر تشریف لے گئے اس کے گھر کو صاف کیا، پانی بھرا وغیرہ وغیرہ۔

تو وہ عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق اور کردار کو دیکھ کر مسلمان ہو گئی۔ اس واقعہ کی تحقیق مطلوب ہے۔ یہ واقعہ حدیث شریف کی کسی کتاب میں ہے یا صرف سنی سنائی بات ہے؟

(۲) یہ بھی فرمادیں کہ کسی امتی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کسی گستاخ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو معاف کر دے؟

الجواب

صورت مسئولہ میں بیان کردہ حدیث تلاش بسیار کے باوجود کسی بھی حدیث اور سیرت کی معتبر ومشہور کتاب میں نظر نہیں آئی۔ البتہ ایک روایت معتبر کتب حدیث وسیر میں پائی جاتی ہے جس کا مفہوم ذکر کردہ روایت کے بالکل برعکس ہے ملاحظہ ہو:

''کنت بین شر جارین بین أبی لھب وعقبة بن أبی معیط، إن کان لیأتیان بالفروث فیطرحانھا علی بابی حتی إنھم لیأتون ببعض مایطرحون من الأذی فیطرحونه علی بابی''

بعض کتابوں میں یہ روایت کچھ الفاظ کے اضافے کے ساتھ یوں ہے:

''قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: کنت بین شر جارین بین أبی لھب وعقبة بن أبی معیط إن کانا لیأتیان بالفروث فیطرحانھا علی بابی حتی إنھم لیأتون ببعض مایطرحون من الأذی فیطرحونه علی بابی فیخرج به رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فیقول: یا بنی عبد مناف أی جوار ھذا ﷺ ثم یلقیه بالطریق''

[کنز العمال:۹/ ۵۲۔ الجامع الصغیر للسیوطی: جلد ا۔ رقم ۹۷۶۰۔ جامع الاحادیث للسیوطی: ج۱۵ ص ۴۰۹۔ السیرۃ الحلبیہ: ج۱ ص ۴۴۷۔ الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ج۱ ص ۱۵۷۔ التاریخ الطبری: ج۲ ص ۳۴۳۔ الکامل فی التاریخ: ج ۱ ص ۶۸۵۔ البدایة والنھایة لابن الکثیر: ج۳ ص ۱۲۲۔ سیرۃ ابن ہشام: ج ۱ ص ۴۴۶]

دونوں روایتوں کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ابو لہب اور عقبہ بن ابی معیط دو بدترین پڑوسیوں کے بیچ میں رہتا ہوں جو گوبر کے اوجھ اور بعض اوقات تکلیف دینے والی چیزیں (پاخانہ، خون وغیرہ) میرے دروازے پر پھینکتے ہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلتے اوران دونوں سے کہتے کہ اے عبد مناف کی اولاد! یہ کون سا پڑوس ہے مطلب کیا یہی پڑوسی کا حق ہوتا ہے؟ پھر اس گندگی کو راستہ سے ہٹا دیتے۔

اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

اولاً: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابولہب اور عقبہ بن ابی معیط جو آپ کے بالکل پڑوس میں رہتے تھے۔ بس ایک دیوار کا فرق تھا۔ ان دونوں کو کوڑا گندگی وغیرہ ڈالنے کے سبب بدترین پڑوسی بتایا۔

دوسری بات یہ کہ دونوں کو یہ کہہ کر تنبیہ کی کہ کیا یہی پڑوس کا حق ہے۔

استفتا میں درج روایت اور اس روایت میں کھلا تضاد ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھی پڑوسی عورت کے کوڑا ڈالنے پر نا بدترین پڑوسی قرار دیا اور نا اسے کوئی تنبیہ کی بلکہ اس کے گھر جا کر اس کا کام کیا۔ اور ابولہب اور عقبہ کو بدترین پڑوسی بتایا اور انہیں تنبیہ بھی کی۔ بلکہ بخاری شریف کی روایت میں عقبہ بن ابی معیط وغیرہ کے لیے دعائے ہلاکت کا بھی ذکر ملتا ہے۔

قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي في ظل الكعبة، فقال: "ابو جهل وناس من قريش ونحرت جزور بناحية مكة، فارسلوا فجاءوا من سلاها وطرحوه عليه فجاءت فاطمة فالقته عنه، فقال: اللهم عليك بقريش، اللهم عليك بقريش، اللهم عليك بقريش لابي جهل بن هشام وعتبة بن ربيعة وشيبة بن ربيعة والوليد بن عتبة وابي بن خلف وعقبة بن ابي معيط"، قال عبد الله: فلقد رايتهم في قليب بدر قتلى''

[صحيح بخاري: جلد ۴ ص ۴۴۔ رقم ۲۹۳۴۔ باب الدعاء على المشركين بالهزيمة والزلزلة]

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے ابو جہل اور قریش کے بعض لوگوں کے اکسانے پر کسی (عقبہ بن ابی معیط) نے اونٹ کی اوجھڑی لا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ڈال دی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آکر اسے ہٹایا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل، عتبہ، شیبہ، ولید، ابی بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط کے لیے ہلاکت کی دعا فرمائی۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں نے انہیں جنگ بدر میں قتل ہوتے دیکھا۔

اور بخاری شریف کی دوسری روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے:

''قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: وأتبع أصحاب القليب لعنة''

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان گڑھے والوں پر اللہ کی لعنت ہو۔

[صحيح بخاري: جلد ۱ ص ۱۱۰۔ رقم ۵۲۰۔ باب المرأة تطرح عن المصلي، شيئا من الأذى]

الحاصل: عقبہ بن ابی معیط بھی پڑوسی تھا لیکن اس کے کوڑا کچڑا وغیرہ ڈالنے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے بھی اور اس کے ساتھیوں کے لیے بھی دعائے ہلاکت فرماتے ہیں۔ اور ابولہب اور عقبہ کو پڑوسی کے حقوق کی یاد دہانی کراتے ہیں۔ نیز انہیں گندگی گھر کے دروازے پر ڈالنے کی وجہ سے بدترین پڑوسی قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس عورت کو کوڑا ڈالنے پر کچھ نہیں فرماتے بلکہ اس کی خیریت کے لیے اس کے گھر جاتے ہیں اور اس کے گھر کے کام کرتے ہیں جیسا کہ بعض واعظین نے مشہور کر رکھا ہے۔ یہ بالکل خلاف معقول بات ہے۔ بخاری شریف اور کتب حدیث وسیر کی ذکر کردہ روایات کے مقابلے میں عورت کے کوڑا ڈالنے والی روایت بالکل غیر معقول، غیر معتبر ومستند اور نا قابل قبول ہے۔

(۲) گستاخ رسول کی سزائے شرعی صرف موت ہے۔ اس کو معاف کر دینے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔

ہاں البتہ وہ اگر سچی توبہ کرے تو اس کی توبہ مقبول مانی جائے گی۔ البتہ اس میں اختلاف کہ سلطان اسلام اسے بعد توبہ بھی سزا دے یا نہیں؟ راجح قول یہی ہے کہ اسے بعد توبہ قتل نہ کیا جائے گا۔

حضور اعلیٰ حضرت وجیز کردری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"الا اذا سب الرسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم او واحدا من الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام فلا توبۃ لہ واذا شتمہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سکران لایعفی"

یعنی جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا کسی نبی کی شان میں گستاخی کرے دنیا میں بعد توبہ بھی اسے قتل کی سزا دی جائے گی یہاں تک کہ اگر نشہ کی بیہوشی میں کلمہ گستاخی بکا جب بھی معافی نہ دیں گے۔ [فتاوی رضویہ جدید: ج ۱۴ ص ۳۰۰، ۲۹۹]

اور پھر اس تعلق سے مزید کتب معتبرہ کی عبارات پیش کرنے کے بعد خلاصۂ بحث کے طور پر فرماتے ہیں:

بالجملہ: اشخاص مذکورین کے کفر وارتداد میں اصلاً شک نہیں، دربارہ اسلام ورفع دیگر احکام ان کی توبہ اگر سچے دل سے ہو ضرور مقبول ہے، ہاں اس میں اختلاف ہے کہ سلطان اسلام انہیں بعد توبہ واسلام صرف تعزیر دے یا اب بھی سزائے موت دے۔ وہ جو بزازیہ اور اس کے بعد کی بہت کتب معتمدہ میں ہے کہ اس کی توبہ مقبول نہیں اس کے یہی معنی ہیں اور اس کی بحث یہاں بیکار ہے، کہاں سلطان اسلام اور کہاں سزائے موت کے احکام، صدہا خبیث، اخبث، ملعون، انجس ہیں کہ کلمہ گو بلکہ اعلیٰ درجہ کے مسلمان مفتی واعظ مدرس شیخ بن کر اللہ ورسول کے جناب میں منہ بھر کر ملعونات بکتے، لکھتے، چھاپتے ہیں اور ان سے کوئی تو کہنے والا نہیں اور اگر انہیں تو کہئے تو نہ صرف ان کے بلکہ بڑے بڑے مہذب بننے والے مسلمانوں کے نزدیک یہ بے تہذیبی وتشدد ہو" [مرجع سابق: ص ۳۰۴] مزید فرماتے ہیں:

"ہمارے اَئِمّہ مذہب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک ساب (یعنی گستاخِ رسول) مُرتَد ہے اور اس کے سب احکام مثل مرتد، مرتد اگر توبہ کرے تقبل ولایقتل (یعنی توبہ قبول کی جائے گی قتل نہ کیا جائے گا)" [مرجع سابق: ۱۵/ ۱۵۶]

الحاصل: گستاخ رسول کی سزا موت ہے۔ البتہ سچے دل سے توبہ کرے اور علمائے حقہ کے نزدیک وہ توبہ شرعی ہو تو توبہ قبول کی جائے گی اور قتل نہ کیا جائے گا۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم

فتوی ۱۲۳ — انبیائے کرام کی جائے وفات ہی ان کا مدفن ہوتی ہے

مسئولہ: (مولانا) محمد فخر عالم فیضی بسکھاروی۔ ۲۲ر رمضان ۱۳۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومحققین اسلام اس مسئلہ میں

(۱) عن عائشة، قالت: لما قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم اختلفوا في دفنه، فقال أبو بكر: سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم شيئا ما نسيته، قال: ما قبض الله نبيا إلا في الموضع الذي يحب أن يدفن فيه، ادفنوه في موضع فراشه" [مشکوۃ: ۵۴۷]

(۲)''حدثنی یحیی، عن مالك أنه بلغه أن رسول الله صلی الله علیه وسلم توفی یوم الإثنین، ودفن یوم الثلاثاء، وصلی الناس علیه أفذاذا لا یؤمهم أحد. فقال ناس: یدفن عند المنبر، وقال آخرون: یدفن بالبقیع، فجاء أبو بكر الصدیق، فقال: سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: ما دفن نبی قط إلا فی مكانه الذی توفی فیه، فحفر له فیه، فلما كان عند غسله، أرادوا نزع قمیصه. فسمعوا صوتا یقول: لا تنزعوا القمیص، فلم ینزع القمیص، وغسل وهو علیه صلی الله علیه وسلم''

[موطاامام مالک، باب ماجاء فی دفن المیت، ج ۲ ص: ۲۱۴]

ان دونوں حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی کو وہیں دفن کیا گیا جہاں اس کی وفات ہوئی اور اللہ تعالیٰ ہر نبی کو وہیں وفات دیتا ہے جہاں وہ دفن ہونا پسند کرتا ہے۔ بلکہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور کے اسی ارشاد مبارک سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو موضع وفات یعنی حجرہ عائشہ ہی میں دفن کرنے پر استدلال بھی کیا ہے۔ اور بالآخر اس پر تمام صحابہ کا اتفاق بھی ہوا۔ لیکن اس کے برخلاف دوسری طرف کچھ انبیائے کرام کے محل وفات وتدفین میں کافی فرق معلوم ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ یوسف کی آیت کریمہ ''تَوَفَّنِی مُسلِمًا وَأَلْحِقْنِی بِالصَّالِحِینَ (یوسف:۱۰۱)

کے تحت تفسیروں میں حضرت یعقوب اور یوسف علیہما السلام کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی وفات مصر میں ہوئی جب کہ وہ بیت المقدس میں اپنے والد حضرت اسحٰق علیہ السلام کے پہلو میں دفن ہونا پسند کرتے تھے اسی لئے انہوں نے وفات کے وقت اس کی وصیت کی تھی کہ اور وصیت کے مطابق عمل بھی ہوا۔

اور حضرت یوسف علیہ السلام کی جب مصر میں وفات ہوئی تو ہر محلے والے اپنے محلے میں آپ کی تدفین کے خواہاں ہوئے حتی کہ جھگڑے کی نوبت بھی آگئی مگر آخر میں اتفاق رائے سے آپ کے تابوت کو دریائے نیل میں رکھا گیا اور چار سو سال کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحکم الٰہی آپ کو بیت المقدس میں دفن کیا۔ یہ دونوں واقعے متعدد تفاسیر خازن جلالین جمل خزائن العرفان وغیرہ میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

اس تعارض کو دور کرنے کی کیا صورت ہے؟ معتمد و صحیح حوالوں کے ساتھ رقم فرمائیں۔

الجواب

اولاً ہم دونوں حدیثوں کا مفہوم بیان کردیں بعد میں اس کی تطبیق کی صورت بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

استفتا میں ذکر کردہ پہلی حدیث پاک ''ما قبض الله تعالی نبیا إلا فی الموضع الذی یحب أن یدفن فیه''(یعنی جہاں نبی کو دفن ہونا پسند ہو اس کے علاوہ کسی اور جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض نہیں فرمائی)

[ترمذی شریف، ابواب الجنائز، باب ما جاء فی دفن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حیث قبض]

محدثین نے اس حدیث پاک میں نبی کے مدفن کی پسندیدگی کو نبی علیہ السلام سے منسوب کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ پاک سے بھی منسوب کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نبی کا مدفن وہیں ہوتا ہے جہاں رب پسند کرتا ہے یا نبی علیہ السلام پسند کرتے ہیں۔

ملا علی قاری اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں

''(ما قبض الله نبيا إلا في الموضع الذي يحب) أي: النبي أو يريد الله (أن يدفن)، أي: ذلك النبي (فيه). أي: في ذلك المكان''

یعنی اللہ تعالیٰ نبی کی روح وہیں قبض فرماتا ہے جہاں نبی پسند کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ جس مقام پر اس نبی کی تدفین چاہتا ہے۔

[مرقاۃ المفاتیح: ج ۱۱ ص ۱۱۰، کتاب الفضائل]

اسی حدیث کے تحت اشعۃ اللمعات میں شیخ فرماتے ہیں:

''قبض نکردہ است خدا روح ہیچ پیغمبر را مگر در جائی کہ دوست میدارد آں پیغمبر یا حق تعالیٰ کہ دفن کردہ شود آں پیغمبر درآنجا''

یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی روح قبض نہیں فرمائی مگر اسی جگہ جہاں نبی پسند کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کو نبی کی اسی جگہ تدفین پسند ہو۔ [اشعۃ اللمعات: باب وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد ۴ صفحہ ۶۳۴]

خلاصہ حدیث یہ نکلا کہ نبی علیہ السلام کا مدفن اللہ پاک کو یا نبی علیہ السلام کو جہاں پسند ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نبی علیہ السلام کی روح وہیں قبض فرماتا ہے۔ استفتا میں ذکر دوسری روایت:

''ما دفن نبي قط إلا في مكانه الذي توفي فيه''

کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی نبی علیہ السلام کبھی جائے وفات کے علاوہ دفن نہیں ہوئے۔ یعنی جس جگہ وفات ہوئی وہیں دفن کئے گئے۔ ابن ماجہ کے الفاظ اس طرح ہیں حضرت ابو بکر نے فرمایا:

''إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ما قبض نبي إلا دفن حيث يقبض''

[سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ذکر وفاتہ ودفنہ صلی اللہ علیہ وسلم]

اس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کو اسی جگہ دفن کیا جاتا ہے جہاں ان کا وصال ہوتا ہے۔

بالجملہ: دونوں روایتوں سے دو الگ الگ مفہوم حاصل ہوئے

ایک یہ کہ جہاں اللہ کو یا نبی کو نبی کا مدفن پسند ہوتا ہے وہیں نبی کا وصال ہوتا ہے دوسرا یہ کہ جس جگہ نبی علیہ السلام کا انتقال ہوتا ہے وہیں مدفن ہوتا ہے۔ پہلی روایت میں نبی کا وصال اللہ یا نبی کے پسندیدہ مدفن (نبی) پر موقوف ہے۔ اور دوسری روایت میں مطلقاً جائے وفات کو نبی علیہ السلام کا مدفن قرار دیا گیا ہے۔

اسے یوں سمجھ لیں کہ نبی جہاں تدفین پسند کرتے ہیں وہیں وصال ہوتا ہے اور جہاں وصال ہوتا ہے وہیں تدفین عمل میں آتی ہے۔ اب حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات و مدفن پر گفتگو کرتے ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا وصال مصر میں ہوا اور فلسطین میں تدفین ہوئی۔ تو اب روایت کے تناظر میں دیکھیں تو یوں خلاصہ سامنے آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جہاں دفن ہونا پسند کیا وہاں وصال نہیں ہوا اور جہاں وصال ہوا وہاں مدفن نہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام والے واقعہ میں یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ یہ واقعہ احادیث کے حکم سے مستثنیٰ ہے۔

اور یوسف علیہ السلام کے معاملہ کا جواب یہ ہے کہ آپ کا وصال جہاں ہوا وہیں آپ کی تدفین عمل میں آئی اور آپ نے بیت المقدس میں جو تدفین کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا وہ بھائیوں کے مصر سے جانے پر مشروط تھا۔ جس میں بعد میں عمل درآمد ہوا۔

جو حدیث کے منافی نہیں ہے۔ہم یہاں علمائے کرام کے بیان کردہ چند جوابات پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

ملا علی قاری جمع الوسائل میں لکھتے ہیں:

''وأما يوسف عليه السلام فقبر في المحل الذي قبض فيه، وإنما نقل إلى آبائه بعد بفلسطين فلا ينافيه الحديث أو أن محبة يوسف عليه السلام لدفنه بمصر كانت معياة بنقل من ينقله إلى آبائه، وأما موسى عليه السلام فالظاهر أنه فعله بوحي من الله تعالى''

یعنی یوسف علیہ السلام کا مزار وہیں ہے جہاں ان کی روح قبض کی گئی۔البتہ کچھ دنوں بعد ان کے آباء کے پاس فلسطین انہیں منتقل کر دیا گیا تو یہ حدیث کے منافی نہیں ہے۔یا یہ کہ یوسف علیہ السلام کی چاہت مصر میں دفن ہونے کے ساتھ اپنے آبا کی طرف منتقل ہونے کی بھی تھی۔اور رہا موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ تو ظاہر یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے سبب ہوا۔

[جمع الوسائل في شرح الشمائل، باب ما جاء في وفاة رسول الله، ۲/۲۰۸]

امام نووی رقم طراز ہیں:

''(ما مات نبي إلا دفن حيث يقبض) ولهذا سأل موسى ربه عند قبض روحه أن يدنيه من الأرض المقدسة لأنه لا يمكن نقله إليها بعد موته بخلاف غير الأنبياء فإنهم ينقلون من بيوتهم التي ماتوا فيها إلى مدافنهم ومقابرهم فالأفضل في حق من عدا الأنبياء الدفن في المقبرة قال ابن العربي: وهذا الحديث يرد قول الاسرائيلية أن يوسف نقل إلا أن يكون ذلك مستثنى إن صح''

یعنی نبی کی تدفین وہیں ہوتی ہے جہاں روح قبض کی جاتی ہے۔اسی لیے حضرت موسیٰ نے اپنے رب سے اپنی روح کے قبض ہوتے وقت بیت المقدس میں تدفین کے لیے عرض کیا تھا۔کیوں کہ ان کے وصال کے بعد اس طرف ان کا منتقل ہونا ممکن نہیں تھا بر خلاف غیر انبیا کے کہ وہ جہاں مرتے ہیں وہاں سے انہیں ان کے مقابر کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔اور انبیاء کے علاوہ کے لیے مقبرہ میں ہی دفن ہونا افضل ہے۔ابن عربی نے کہا اور اس حدیث سے اسرائیلی قول کا رد بھی ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام منتقل ہوئے۔اور اگر یہ بات صحیح ہو تو اس کو مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔

[فيض القدير شرح جامع صغير: ۵/۳۶۵، حرف الميم]

مزید لکھتے ہیں:

''(ما قبض الله نبيا إلا في الموضع الذي يحب) الله والنبي صلى الله عليه وسلم (أن يدفن فيه) بصيغة المجهول إكراما له حيث لم يفعل به إلا ما يحبه ولا ينافيه نقل موسى ليوسف من مصر إلى آبائه بفلسطين لاحتمال أن محبة يوسف لدفنه بمصر مؤقتة بفقد من ينقله ويميل إليه''

یعنی اللہ تعالیٰ نبی کی روح وہیں قبض فرماتا ہے جہاں وہ نبی کے لیے اور خود نبی اپنے لیے دفن کیا جانا پسند کرتے ہیں۔اور یہ ان کی تعظیم کے سبب ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ نہیں کیا گیا مگر وہی جو انہوں نے پسند فرمایا۔اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر سے ان کے آبا کے پاس فلسطین منتقل کرنے کے منافی نہیں ہے۔اس احتمال کے سبب کہ

حضرت یوسف علیہ السلام کی مصر میں تدفین کی چاہت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان کی طرف آنے کے ساتھ مؤقت تھی۔

[مرجع سابق: ج ۵ ص ۴۵۹، حرف المیم]

شرح زرقانی میں ہے:

(فجاء أبوبكر الصديق فقال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ما دفن نبي قط إلا في مكانه الذي توفي فيه. فحفر له فيه) أخرجه ابن سعد من طريق داود بن الحصين عن عكرمة عن ابن عباس، ومن طريق هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة وأخرج الترمذي عن أبي بكر مرفوعا '' ما قبض الله تعالى نبيا إلا في الموضع الذي يحب أن يدفن فيه وأخرجه ابن ماجه عنه بلفظ: '' ما مات نبي إلا دفن حيث قبض '' ولذا سأل موسى ربه عند موته أن يدنيه من الأرض المقدسة ; لأنه لا يمكن نقله إليها بعد موته بخلاف غير الأنبياء فينقلون من بيوتهم التي ماتوا فيها إلى المدائن فالأفضل في حق من عداهم الدفن في المقبرة، فهذا من خصائص الأنبياء كما ذكره غير واحد. قال ابن العربي، وهذا الحديث يرد قول الإسرائيلية أن يوسف نقله موسى من مصر إلى آبائه بفلسطين، إلا أن يكون ذلك مستثنى إن صح، أي ويكون محبة يوسف لدفنه بمصر موقتة بقصد من ينقله.

یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: نبی کی تدفین اسی جگہ ہوتی ہے جہاں وہ وفات پاتا ہے۔ اسی جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار شریف وہیں ہے جہاں آپ کی وفات ہوئی۔ ابن سعد نے بطریق داؤد بن حصین، عکرمہ وابن عباس سے اور ہشام بن عروہ کی سند سے ان کے والد عروہ اور حضرت عائشہ سے اس حدیث کی تخریج کی۔ اور امام ترمذی نے حضرت ابو بکر سے مرفوعاً روایت کیا کہ اللہ تعالیٰ نبی کی روح اسی جگہ قبض فرماتا ہے جہاں وہ تدفین چاہتا ہے۔ ابن ماجہ نے ان الفاظ سے روایت کیا کہ نبی کی تدفین وہیں ہوئی جہاں روح قبض کی گئی۔

اوراسی وجہ سے حضرت موسی علیہ السلام نے اپنے رب سے وصال کے وقت عرض کیا تھا کہ انہیں بیت القدس میں پہنچادیا جائے، کیوں کہ وصال کے بعد بیت المقدس کی طرف ان کا منتقل ہونا ممکن نہیں تھا برخلاف غیر انبیا کے کہ انہیں ان کے گھروں سے جہاں ان کی موت ہوتی ہے شہروں کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔ اوران کے حق میں افضل بھی یہی ہے کہ وہ مقبرہ میں دفن ہوں۔ جائے وفات میں تدفین انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والتسلیمات کا خاصہ ہے۔ جیسا کہ اس کو بہت سے علمانے ذکر کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا: کہ اس حدیث سے اسرائیلی قول کی تردید ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر سے فلسطین ان کے آبا کے پاس منتقل کیا گیا۔ اوراگر یہ بات صحیح ہو تو اسے مستثنیٰ مانا جائے گا۔ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کی مصر میں تدفین کی چاہت فلسطین منتقل ہونے کے واقعہ تک مؤقت ہوگی۔

[شرح زرقانی علی الموطا۔ ۸۹/۲، کتاب الجنائز باب ماجاء فی دفن المیت]

سیرت حلبیہ میں ہے:

''وعن أبي بكر رضي الله عنه سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لا يقبض النبي إلا في أحب الأمكنة إليه قال بعضهم ولا شك أن أحبها: أي الأمكنة إليه أحبها إلى ربه تعالى فإن حبه صلى الله عليه وسلم تابع لحب ربه جل وعلا''

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ نبی کی روح وہیں قبض کی جاتی ہے جہاں وہ پسند کرتا ہے۔ بعض نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اسی جگہ کو پسند کرتے ہیں جسے رب پسند فرماتا ہے کیوں کہ ان کی پسند رب کی پسند کے تابع ہے۔[۵۱۵/۳]

مفتی احمد یار خاں نعیمی علیہ الرحمہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"یعنی جس جگہ اللہ تعالیٰ کو یا ان رسول کو دفن ہونا پسند تھا وہاں ہی ان کو وفات دی گئی لہٰذا رب کو یہی پسند ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کے حجرہ میں دفن ہوں تاکہ آپ سے جگہ کو عزت ملے کسی جگہ سے آپ کو عزت نہ ملے خیال رہے کہ حضرت موسیٰ نے دعا کی کہ مجھے فلسطین پہنچا کر وفات دی جائے چنانچہ وہاں ہی آپ کی وفات اور آپ کا وطن واقع ہوے۔ یوسف علیہ السلام اولاً مصر ہی میں دفن ہوئے اپنی جاے وفات میں پھر چار سو برس کے بعد آپ کا تابوت فلسطین لایا گیا یعقوب علیہ السلام زندگی شریف میں فلسطین پہنچے پھر وہاں وفات پا کر دفن ہوئے لہٰذا ان واقعات سے اس حدیث پر اعتراض نہیں ہو سکتا کہ یہ حضرات اپنی وفات کی جگہ دفن نہ ہوے۔ یا یہ کہو کہ نبی جس جگہ وفات پائیں اس جگہ ان کا دفن ہونا بہتر ہے اگر اور جگہ دفن کر دیئے جائیں تو بہتر نہ ہو گا غرض کہ یہاں ذکر بہتری کا ہے نا کہ واقع کا۔"

[مراۃ المناجیح شرح مشکوۃ المصابیح، جلد۸ صفحہ ۲۹۳]

خلاصہ بحث: ایک حدیث کے مطابق نبی جہاں وصال پاتے ہیں وہیں ان کا مدفن ہوتا ہے۔ لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام جنہوں نے وصیت کی تھی کہ انہیں ان کے آبا کے پاس فلسطین سپرد خاک کیا جائے۔ تو ان کا وصال تو مصر میں ہوا مگر تدفین فلسطین میں ہوئی۔

اور دوسری حدیث یہ کہ جہاں اللہ تعالیٰ نبی کا یا خود نبی اپنا مدفن چاہتے ہیں وہیں ان کی روح قبض کی جاتی ہے۔ اس کے بر خلاف ان کی روح مصر میں قبض کی گئی اور مدفن فلسطین میں ہے۔ گزشتہ اوراق میں درج علمائے کرام کے جوابات اس تعلق سے گزرے جس میں بہتر جواب یہی ہے عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر شاذ و نادر اس کے خلاف بھی ہو جاتا ہے۔ اس لیے حضرت یعقوب علیہ السلام والا معاملہ اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔

اور رہا حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ تو ان کا وصال وہاں ہوا جہاں اللہ نے ان کا مدفن پسند فرمایا۔ اور جہاں وصال ہوا وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ البتہ ان کی چاہت اور پسند بیت المقدس میں تدفین کی تھی تو وہ مشروط تھی کہ اگر اہل خاندان جائیں تو انہیں بیت المقدس لے جائیں جو بعد میں وحی کے مطابق حضرت موسیٰ کے ذریعہ عمل میں آئی۔

تو یہ دونوں صورتیں دونوں حدیثوں کے منافی نہیں ہیں۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

مزارات کی زیب وزینت کا حکم، مدینہ شریف جانے کا حکم
خود کو وہابی کہنا وہابیوں کی حمایت کرنا اور وہابیوں کو سنیوں سے اچھا کہنا گمراہی ہے
اہل سنت جنت کے حقدار ہیں

فتوی ۱۲۴ مسئولہ: غلام احمد رضا چھتیس گڑھ۔ ۱۰ر جمادی الاخری، ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں کہ جو شخص اس قسم کی باتیں کریں تو اس پر شریعت کا کیا حکم ہے....؟

(1) مزارات پر ٹائلز لگانا پتھر لگانا یہ شیشہ کا کام یہ گرینائٹ کا کام اور وہاں عمارت وقبہ وغیرہ بنانا سب حرام سب حرام

(2) مدینہ شریف جانا جیسا کہ عام طور پر لوگ جاتے ہیں زیارت روضہ رسول کے لئے یہ کوئی فرض وواجب نہیں ہے اور حج کے ارکان سے بھی نہیں ہے۔

(3) وہاب اللہ کا نام ہے ہم ہیں وہابی

(4) سنیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ:

تم سے اچھے تو وہابی ہیں ان کے پاس بظاہر عمل تو ہے تمہارے پاس نہ عمل ہے نہ ایمان تم میں اکثر ایسے ہیں کہ جن کے پاس نہ عمل ہے نہ ایمان

(5) وہابی وہ ہے جو سب کو سلام کرے اور جو کسی کو سلام نہ کرے بلکہ جب اس کو سلام کیا جائے تو سلام کا جواب بھی نہ دے وہ ہے سنی

(6) بے نماز کے مزار بے کار۔ بے نماز کے سب کچھ بے کار

(7) حضور اعلیٰ حضرت کے اس شعر پر عوام اہل سنت بہت خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ:

تجھ سے اور جنت سے کیا مطلب وہابی دور ہو
ہم رسول اللہ کے جنت رسول اللہ کی

تو اس پر طنزا یہ کہا کہ:

یہ شعر سن کر بہت اچھلتے ہو، ارے کیا سنی جنت کا ٹھیکیدار ہے؟

الجواب

(۱) شخص مذکور کا مزارات سے متعلق یہ کہنا کہ ان پر پتھر وغیرہ لگانا وہاں عمارت بنانا حرام ہے۔ سخت جہالت اور شریعت پر بے جا جسارت کا نتیجہ ہے۔ ہمارے یہاں اولیائے کرام وعلمائے کرام کے مزارات عموماً یوں ہوتے ہیں کہ قبر کے اطراف میں پتھر وغیرہ لگائے جاتے ہیں ۔ اور کچھ دوری پر چہار دیواری کر دی جاتی ہے تاکہ مزار کا ادب ملحوظ رہے۔ اور اکثر وہاں عمارت وغیرہ بنادی جاتی ہے، تاکہ زائرین وہاں آرام سے بیٹھ کر قرآن وغیرہ کی تلاوت کر سکیں ۔ اور انہیں وہاں بارش

اور دھوپ وغیرہ میں پریشانی نہ ہو۔ اوران سارے امور میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں پائی جاتی ہے۔ حرام درکنار کراہت بھی نہیں ہے۔ فتاوی قاضی خاں میں ہے:

ویکرہ الآجرفی اللحد اذا کان یلی المیت ' اما فیما وراء ذالك لا باس بہ

یعنی لحد میں میت کے اردگرد پکی ہوئی اینٹ لگانا مکروہ ہے البتہ اس سے ہٹ کر (یعنی قبر کے اوپر) کوئی حرج نہیں ہے۔"

[خانیہ علی ہامش الھندیۃ' باب فی غسل المیت ومایتعلق بہ ۱/۱۹۴]

مزارات کے اردگرد زائرین کے لئے عمارت وغیرہ کے جواز کا حکم بیان کرتے ہوئے، حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"ائمہ دین نے مزاراتِ حضرات علماء ومشائخ قدست اسرارہم کے گرد زمین جائز التصرف میں اس غرض سے کہ زائرین ومستفیدین راحت پائیں عمارت بنانا جائز رکھا، اور تصریحات فرمائیں کہ علت منع نیت فاسدہ یا عدم فائدہ ہے تو جہاں نیت محمود اور نفع موجود منع مفقود۔ لاجرم ائمہ کرام نے گردِ قبورِ علماء ومشائخ قدست اسرارہم اباحتِ بنا کی تصریح فرمائی۔

علامہ طاہر فتنی بعد عبارت مذکورہ فرماتے ہیں:

وقد اباح السلف ان یبنی علی قبر المشایخ والعلماء المشاھیر لیزورھم الناس ویستریحوا بالجلوس فیہ ،

سلف نے مشہور علماء ومشائخ کی قبروں پر عمارت بنانے کی اجازت دی ہے تاکہ لوگ ان کی زیارت کو آئیں اوراس میں بیٹھ کر آرام پائیں ۔بعینہ اسی طرح علامہ علی قاری مکی نے بعد عبارت مسطورہ ذکر فرمایا کہ، وقد اباح السلف البناء سلف نے علماء ومشائخ کی قبور پر عمارت بنانے کو جائز قرار دیا ہے۔"

مزارات پر قبہ وعمارت کے جواز پر کلام کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر پر عمارت وقبہ وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے جذب القلوب اور کشف الغطاکے حوالے سے رقمطراز ہیں:

"بعد ازاں کہ امیر المومنین عمر در مسجد زیادت کردہ حجرہ راازخشت خام بناکردو تازمان حدوث عمارت ولید ایں حجرہ ظاہر بود عمر بن عبد العزیز بحکم ولید بن عبد الملک آں راہدم کردو بحجارہ منقوشہ بر آورد۔ برظاہر آں حظیرہ دیگر بناکرد وہیچکدام ازیں دودرے نگذاشت از عروہ روایت می کنند کہ وے بہ عمر بن عبد العزیز گفت، اگر حجرہ شریفہ رابر حالِ خود گزارند وعمارتے گرد آں بر آرند احسن باشد۔

جب امیر المومنین حضرت عمر نے مسجد میں اضافہ کیا تو حجرہ کی عمارت کچی اینٹوں کی بنادی، ولید کے زمانہ کی تعمیر جدید تک یہ حجرہ ظاہر تھا، عمر بن عبد العزیز نے ولید بن عبد الملک کے حکم سے اسے منہدم کرکے منقش پتھروں سے بنایا اوراس کے بیرونی حصہ پر ایک اور حظیرہ بنایا اور ان دو دروازوں میں سے کوئی نہ چھوڑا۔ حضرت عروہ سے روایت ہے کہ انھوں نے عمر بن عبد العزیز سے کہا اگر حجرہ شریف کو اپنے حال پر رکھتے اوراس کے گرد ایک عمارت بنادیتے تو بہتر ہوتا الخ.......

کشف الغطاء میں ہے: در مطالب المومنین گفتہ کہ مباح کردہ اند سلف بناء رابر قبر مشائخ علمائے مشہور تامردم زیارت کنند واستراحت نمایند بجلوس درآں ولیکن اگر برائے زینت کنند حرام است ودر مدینہ مطہرہ بنائے قبہا بر قبور اصحاب درزمان پیش کردہ اند ظاہر آنست کہ آں بتجویز آں وقت باشد وبر مرقدِ منور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نیز قبہ عالی ست۔

مطالب المومنین میں لکھا ہے کہ سلف نے مشہور علماء و مشائخ کی قبروں پر عمارت بنانا مباح رکھا ہے تاکہ لوگ زیارت کریں اور اس میں بیٹھ کر آرام لیں، لیکن اگر زینت کے لیے بنائیں تو حرام ہے مدینہ منورہ میں صحابہ کی قبروں پر اگلے زمانے میں قبے تعمیر کئے گئے ہیں، ظاہر یہ ہے کہ اس وقت جائز قرار دینے سے ہی یہ ہوا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقدِ انور پر بھی ایک بلند قبہ ہے۔"

نورالایمان، شیخ محقق علی الاطلاق محدث دہلوی کی مدارج اور مطالب الایمان، مفاتیح شرح مصابیح اور مشہور فقیہ اسمٰعیل زاہدی کے حوالے سے مزارات پر قبہ جات کا جواز نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نورالایمان میں ہے: قد نقل الشیخ الدهلوی فی مدارج عن مطالب المومنین ان السلف اباحوا ان یبنی علی قبر المشایخ والعلماء المشهورین قبة لیحصل الاستراحة الزائرین و یجلسون فی ظلها وهکذا فی المفاتیح شرح المصابیح وقد جوزه اسمٰعیل الزاهدی الذی من مشاهیر الفقهاء،

شیخ محقق دہلوی نے مدارج النبوۃ میں مطالب المومنین سے نقل کیا ہے، کہ سلف نے مشہور مشائخ وعلماء کی قبروں پر قبے تعمیر کرنا جائز و مباح رکھا ہے۔ تاکہ زائرین کو آرام ملے اور اس کے سائے میں بیٹھ سکیں، اسی طرح مفاتیح شرح مصابیح میں بھی ہے۔ اور مشاہیر فقہاء میں سے اسمٰعیل زاہدی نے بھی اسے جائز قرار دیا ہے۔" [فتاوی رضویہ جدید، ۹/ ۴۱۳ تا ۴۱۸]

الحاصل: مزارات مشائخ و علماو فقہا پر پتھر لگانا جس طرح رائج ہے اور عمارت وقبہ وغیرہ بنانا بلا کراہت جائز ہے۔ شخص مذکور کا مزارات پر پتھر لگانے اور اس پر قبہ وعمارت کی تعمیر کو حرام قرار دینا غلط و نادرست بلکہ شریعت میں مداخلت ہے۔ جو ایک بڑا جرم ہے۔ ایسے شخص پر جائز ومباح کام کو حرام کہنے کے سبب توبہ لازم ہے۔

(۲) مدینہ طیبہ جانا بغرض زیارت رسول علما کے نزدیک افضل مستحبات، قریب الواجب بلکہ واجب ہے۔ بشرطیکہ صاحب استطاعت ہو۔ شخص مذکور کا یہ کہنا کہ حج کے ارکان میں سے نہیں اپنی جگہ درست۔ البتہ فقہا وصوفیا کے نزدیک حج کی قبولیت کے لئے سند کے درجہ میں ہے۔ لیکن اس کا یہ کہنا کہ واجب وفرض نہیں۔ فرض نہیں ہے البتہ اکثر علما کے نزدیک واجب یا قریب الواجب ہے اور عدم استطاعت یا کسی مجبوری کے سوا اس کو ترک کرنے والا مجرم و گنگار ہے۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں ہے:

"ومن أحسن المندوبات بل یقرب من درجة الواجبات زیارة قبر نبینا وسیدنا محمد۔ صلی الله علیه وسلم

ہمارے نبی اور ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار کی زیارت احسن مندوبات بلکہ درجہ واجبات کے قریب ہے۔"

[مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر، جلد ۱ ص ۳۱۲]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

"قال مشایخنا رحمهم الله تعالی: إنها أفضل المندوبات وفی مناسك الفارسی وشرح المختار أنها قریبة من الوجوب لمن له سعة"

ہمارے مشائخ اللہ ان پر رحم فرمائے) نے فرمایا کہ زیارت روضہ رسول افضل مستحبات ہے اور مناسک فارسی اور شرح مختار میں

ہے کہ زیارت روضہ رسول صاحب وسعت کے لئے قریب الواجب ہے۔

[فتاوی عالمگیری، جلد ا ص ۲۶۵، خاتمۃ فی زیارۃ قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم]

حضوراعلیٰ حضرت زیارت روضہ رسول کے واجب یاقریب الواجب ہونے پر علماوفقہا کی تصریحات نقل کرتے ہوئے، نیز بلاوجہ معقول ترک زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

علامہ سمہودی شافعی وفاء الوفاء میں فرماتے ہیں:

''حنفیہ زیارت شریف کو قریب بہ واجب کہتے ہیں، اور اسی طرح مالکیہ وحنبلیہ نے تصریح کی۔''

ہماری کتب مذہب میں مناسک فارسی وطرابلسی وکرمانی واختیار شرح مختار وفتاویٰ ظہیریہ وفتح القدیر وخزانۃ المفتین ومنسک متوسط ومسلک متقسط ومنح الغفار ومراقی الفلاح وحاشیہ طحطاویہ علی المراقی ومجمع الانہر وسنن الہدیٰ وعالمگیری وغیرہ میں اس کے قریب واجب ہونے کی تصریح کی بلکہ خود صاحب مذہب سیدنا امام اعظم سے اس پر نص منقول، جذب القلوب میں ہے:

زیارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزد ابی حنیفہ از افضل مندوبات واوکد مستحبات است قریب بہ درجہ واجبات۔

زیارت مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل مندوبات واعلیٰ مستحبات سے ہے درجہ واجبات کے قریب۔ اور بعض ائمہ مالکیہ وشافعیہ تو صاف صاف واجب کہتے ہیں اور یہی مذہب ظاہر یہ سے منقول۔ امام ابن الحاج مکی مالکی مدخل اور امام سبکی شافعی تہذیب الطالب امام عبد الحق بن محمد سے نقل فرماتے ہیں:

''امام ابو عمران فاسی مالکی نے فرمایا قبر شریف حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت واجب ہے۔''

امام قاضی عیاض مالکی شفا شریف میں امام ابو عمرو سے ناقل:

''قبر اقدس حضور والا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سفر کر کے جانا واجب ہے۔''

اسی طرف امام قسطلانی شارح صحیح بخاری شافعی وامام ابن حجر مکی شافعی وعلامہ علی قاری حنفی وغیرہم علماء کا میلان ہے بلکہ بعض کلمات امام سبکی بھی اسی طرف ناظر، شفا شریف میں فرمایا:

''زیارت قبر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم ہے اور نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم واجب۔''

اسی طرح مواہب لدنیہ شریف میں ہے، اور شک نہیں کہ ظاہر دلیل اسی کو مقتضی۔ ابن عدی وغیرہ کی حدیث میں ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: من حج البیت ولم یزرنی فقد جفانی

جس نے حج کیا اور میری زیارت کو حاضر نہ ہوا بیشک اس نے مجھ پر جفا کی۔

علامہ علی قاری شرح لباب میں اس کی سند کو حسن اور وہی شرح شفاء ودرہ مضیہ اور امام ابن حجر جوہر منظم میں محتج بہ فرماتے ہیں، انہی دونوں کتابوں میں فرمایا: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جفا حرام ہے تو زیارت نہ کرنا متضمن جفا ہے حرام ہوا۔''

مدارج النبوۃ میں ہے:

''صاحب مواہب گفتہ ایں ظاہر است در حرمتِ ترکِ زیارت زیرا کہ دریں جفاواذائے اوست وجفاء واذائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حرام ست باجماع پس واجب باشد ازالہ جفاوآں بزیارت خواہد پس زیارت واجب باشد۔''

(صاحب مواہب نے فرمایا کہ زیارت نہ کرنے کی حرمت پر یہ ظاہر ہے کیوں کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جفا ہے اور آپ کو ایذا ہے جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جفا اور ایذاء بالاجماع حرام ہے، تواس جفا کے ازالہ کے لیے زیارت واجب ہے۔) ..... حتی کہ بعض ائمہ شافعیہ زیارت شریفہ کو مثل حج فرض بتاتے ہیں ، علامہ عبدالغنی بن احمد بن شاہ عبدالقدوس چشتی گنگوہی قدس سرہ شاگرد امام علامہ ابن حجر مکی رحمہم اللہ تعالیٰ سنن الہدیٰ میں فرماتے ہیں:

"میں نے اپنے استاذ ابن حجر (ایّد اللہ الاسلام ببقائہ) کو فرماتے سنا کہ زیارت شریفہ ہمارے بعض اصحاب شافعیہ کے نزدیک مثل حج واجب ہے اور ان کے نزدیک واجب فرض میں کچھ فرق نہیں"

بالجملہ: قول وجوب من حیث الدلیل اظہر اور نظر ایمانی میں اَحب وازہر ہے اور قریب وجوب کہ علمائے مذاہب اربعہ بلکہ خود امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا منصوص اس کے قریب اور حکماً مقارب،....، تارک کے اثم پر یک زبان، بہر حال جزم کیا جاتا ہے کہ باجود قدرت تارک زیارت قطعاً محروم وملوم وبدبخت ومشوم وآثم وگنہگار وظالم وجفاکار ہے"

[فتاوی رضویہ جدید، جلد ۱۰، ص ۷۱۸تا۷۲۴]

الحاصل: زیارت روضہ رسول اکثر علما کے نزدیک واجب یا قریب الواجب ہے۔ اوراس کا تارک محروم وبدبخت مجرم وگنہگار ظالم وجفاکار ہے۔ علاوہ ازیں شخص مذکور نے اگر اس کے واجب ہونے کا ذکر اس نیت سے کیا ہو کہ وہ اس کا سرے سے ہی منکر ہو اور زیارت روضہ رسول کو افضل واعظم حسنات نہ مانتا ہو تو بلاشبہہ وہ شخص گمراہ وبددین ہے۔

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"مسلمان غور کرے جب تارکِ زیارت کا یہ حال، اس کے مانع یا منکر فضیلت کا کیا حال ہوگا! آفتاب سے زیادہ روشن کہ ایسا شخص گمراہ، بددین، خارق اجماع مسلمین، مستحق وعید شدید،۔

امام ابن حجر افضل القریٰ میں فرماتے ہیں:

"جو اس کی خوبی میں نزاع کرے گا اس کا نزاع کرنا دنیا وآخرت میں اس کی تباہی وروسیاہی کا باعث ہوگا۔...... یہاں تک کہ بعض علماء صراحۃً زیارت شریفہ کے قربت ہونے کو ضروریاتِ دین سے اور اس کے منکر کو کافر بتاتے ہیں، درہ مضیہ مولانا علی قاری میں ہے:

"بعض فضلاء نے مبالغہ کیا کہ فرماتے ہیں زیارت شریفہ کا قربت ہونا دین سے ضرورۃ معلوم ہے اور اس کے منکر پر کفر کا حکم .....زیارت سراپا طہارت حضور پرنور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم بالقطع والیقین باجماع مسلم ین افضل قربات واعظم حسنات سے ہے جس کی فضیلت وخوبی کا انکار نہ کرے گا مگر گمراہ بددین یا کوئی سخت جاہل، سفیہ غافل، سخرہ شیاطین والعیاذ باللہ رب العالمین۔" [مرجع سابق،]

(۳) وہاب اللہ تعالیٰ کا نام ضرور ہے، لیکن عام طور پر دور حاضر میں ابن عبد الوہاب نجدی کے پیروکاروں کو محمد بن عبد الوہاب کی نسبت سے وہابی بولا جاتا ہے۔ نا کہ اللہ پاک کے نام پاک "وہاب" کی نسبت سے۔ اور ابن عبد الوہاب مرتد بددین ظالم فاسق شخص تھا۔ وہ اپنے اور اپنے متبعین کے سوا سب کو مشرک گردانتا تھا۔

نجدی ابن عبد الوہاب کے تعلق سے حضور اعلیٰ حضرت فتاوی شامی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''کما وقع فی زماننا فی اتباع عبد الوهاب الذین خرجوا من نجد و تغلبوا علے الحرمین وکانوا ینتحلون مذهب الحنابلة لکنهم اعتقدوا انهم هم المسلمون وأن من خالف اعتقادهم مشرکون، واستباحوا بذلك قتل اهل السنة وقتل علمائهم حتی کسر الله تعالٰے شوکتهم وخرب بلادهم وظفر بهم عساکر المسلمین عام ثلاث وثلاثین ومائتین وألف۔

یعنی خارجی ایسے ہوتے ہیں جیسا ہمارے زمانے میں پیروان محمد بن عبد الوہاب نجدی سے واقع ہوا جنہوں نے نجد سے خروج کر کے حرمین محترمین پر تغلب کیا اور وہ اپنے آپ کو کہتے تو حنبلی تھے مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ مسلمان بس وہی ہیں اور جو ان کے مذہب پر نہیں وہ سب مشرک ہیں اس وجہ سے انہوں نے اہلسنّت کا قتل اور ان کے علماء کا شہید کرنا مباح ٹھہرالیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شوکت توڑدی اور ان کے شہر ویران کیے اور لشکر مسلمین کو ان پر فتح بخشی ۱۲۳۳ھ میں۔

[النیر الشہابی علی تدلیس الوہابی، ص۷، ۲]

دیوبندی مولوی محمود حسن نے لکھا:

''محمد بن عبد الوہاب نجدی..... خیالات باطلہ اور عقائد فاسدہ رکھتا تھا.... الحاصل وہ ایک ظالم و باغی خونخوار فاسق شخص تھا الخ''

[الشہاب الثاقب ص ۵۴]

اور مولوی رشید احمد گنگوہی اپنے فتاوی میں لکھتے ہیں:

''محمد بن عبد الوہاب کے مقتدیوں کو وہابی کہتے ہیں۔'' [فتاوی رشیدیہ ۲۴۲، ۲۴۱]

الغرض: وہابی عرف عام میں نجدی عبد الوہاب کے معتقدین کے لئے بولا جاتا ہے۔ اگر شخص مذکور اس جماعت سے وابستہ ہے اور ان کے عقائد و نظریات سے متفق ہے اور ان کے عقائد و نظریات اور ان کے کفریات سے واقف ہونے کے باوجود بھی انہیں مسلمان سمجھتا ہے اور اسی مناسبت سے خود کو وہابی کہتا ہے تو وہ انہیں میں سے ہے۔ اور اس پر وہی حکم نافذ ہو گا۔ یعنی مرتد و کافر گمراہ و بددین۔ اور اگر اس جماعت سے وابستہ نہیں اور ان کے عقائد و نظریات سے متفق نہیں بس یوں ہی ہٹ دھرمی میں خود کو وہابی کہتا ہے تو سخت مجرم و گنہگار ہے۔ اس پر توبہ لازم ہے۔

(۴) شخص مذکور کا یہ جملہ سخت قبیح و شنیع بلکہ کفر پر مشتمل ہے۔ وہابیوں کو جن پر حکم کفر ہے سنیوں سے اچھا بتانا اور سنی جو واقعی سچے مسلمان ہیں ان کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کے پاس نہ عمل ہے نہ ایمان۔ گویا کفر کو اسلام سے بہتر اور کافر کو مومن سے اچھا بتانا ہے۔ اور یہ بلاشبہہ کفر ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کے ایمان کو اس کافر اکفر کے ایمان سے کم کہنا صریح کفر ہے، یہ کفر کو ایمان پر تفضیل دینا ہے، کافر میں ایمان کہاں اور وہ بھی مسلمانوں کے ایمان سے افضل'' [فتاوی رضویہ قدیم، ج ۶ ص ۱۹۱]

صدر الشریعہ فرماتے ہیں''

''شخص مذکور برائے آنکہ کفر را پسند کرد و کفر را بر اسلام ترجیح داد کافر باشد'' (شخص مذکور اس وجہ سے کہ اس نے کفر کو پسند کیا اور کفر کو اسلام پر ترجیح دی کافر ہو گیا) [فتاوی امجدیہ، ج ۴ ص ۴۳۳]

(۵) زید کا یہ کہنا" وہابی وہ ہے جو سب کو سلام کرے اور جو کسی کو سلام نہ کرے بلکہ جب اس کو سلام کیا جائے تو سلام کا جواب بھی نہ دے وہ ہے سنی"

یہ سنی پر طنز ہے کیوں کہ سنی شخص کسی وہابی دیوبندی کو نہ سلام کرتا ہے اور نہ سلام کا جواب دیتا ہے۔اور وہابی بد مذہب سب کو سلام کرتے پھرتے ہیں تاکہ ان سے تعلقات بنا کر انہیں بھی اپنے فرقہ میں شامل کریں ۔ شخص مذکور جاہل مطلق ہے اور شریعت کے معاملہ میں بہت ہی بے باک اور سخت جری ہے۔اسے معلوم ہونا چاہئے کہ سنی کا یہ عمل خالص شرعی اور مذہبی ہے۔کیوں کہ شریعت میں بد مذہبوں کو سلام کرنے سے منع ہے اوران کے سلام کا جواب دینے کا بھی حکم نہیں ہے۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ان مرضوا فلا تعودوهم وان ماتوا فلا تشهدوهم وان لقيتم فلا تسلم واعليهم۔

یعنی اگر (بد مذہب بد دین) بیمار پڑیں تو ان کو پوچھنے نہ جاؤ اور اگر وہ مر جائیں تو ان کے جنازہ پر حاضر نہ ہو اور اگر انکا سامنا ہو تو سلام نہ کرو۔" (سنن ابن ماجہ المقدمہ في اواخر باب القدر)

نیز حضرت عبد اللہ ابن عمر سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ومن سلم على صاحب بدعة، أو لقيه بالبشر أو استقبله بما يسره، فقد استخف بما أنزل الله على محمد صلى الله عليه وسلم"

(جو کسی بد مذہب کو سلام کرے یا اس سے بکشادہ پیشانی ملے یا ایسی بات کے ساتھ اس سے پیش آئے جس میں اس کا دل خوش ہو تو اس نے اس چیز کی تحقیر کی جو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری۔" [تاریخ بغداد، ج ۱۱ ص ۳۴۵]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے منقول ہے:

على بن عبد الصمد قال سألت احمد بن حنبل عن جار لنا رافضى يسلم على أرد عليه قال لا"

"علی بن عبد الصمد فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا کہ میرے پڑوس میں رافضی ہے جو مجھ کو سلام کرتا ہے تو کیا میں اس کو جواب دوں؟ آپ نے فرمایا، نہیں" (السنۃ لخلال، ج:۳، ص:۴۹۳،)

مزید اسی میں ہے:

الحسن بن على الحسن انه سأل عبد الله عن صاحب بدعة يسلم عليه قا اذا كان جهميا أوقدريا أورافضيا داعية فلا يصلى عليه ولا يسلم عليه"

حسن بن علی حسن نے ابو عبد اللہ سے صاحب بدعت کے بارے میں سوال کیا۔ کہ وہ اس کو سلام کرتا ہے تو انہوں نے فرمایا "جب جہمی یا قدریہ یا رافضی بلائے تو اس پر نہ نماز جنازہ پڑھو اور نہ اس پر سلام کرو" (السنۃ لخلال، ج:۳، ص:۴۹۴،)

(۶) شخص مذکور کا یہ کہنا کہ "بے نماز کے مزار بے کار۔ بے نماز کے سب کچھ بے کار "نری جہالت ہے۔ شخص مذکور واقعی جاہل مطلق ہے۔ کسی کا نماز نہ پڑھنا جرم ہے البتہ مزارات کا تقدس اپنی جگہ ہے ۔اس طرح کی باتیں عموماً بد مذہب وہابی دیوبندی ہی کرتے ہیں ۔اگر واقعی وہ انہیں فرقوں میں سے کسی فرقہ سے وابستہ ہے اور اس طرح کی باتیں کرتا ہے تو اس میں

حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ہاں اگر وہ خود کو سنی کہتا ہو اور اس طرح کی باتیں کرتا ہو تو یقیناً افسوس کا مقام ہے۔ اسے چاہئے کہ علما کی صحبت اختیار کرے اسے معلوم ہو جائے گا کہ بے نمازی ہونا جرم ہے اور بزرگوں سے محبت کرتے ہوئے ان کے مزارات پر حاضری دینا باعث برکت ہے۔ بلکہ بقول علماو صلحامزارات پر حاضری زائر کے گناہوں سے دوری اور نیکیوں کی طرف رغبت کا سبب بھی ہے۔

(۷) شخص مذکور کا، حضور اعلیٰ حضرت کا درج ذیل شعر

* تجھ سے اور جنت سے کیا مطلب وہابی دور ہو۔ ہم رسول اللہ کے جنت رسول اللہ کی *

پر طنز کرتے ہوئے یہ قول "یہ شعر سن کر بہت اچھلتے ہو، ارے کیا سنی جنت کا ٹھیکیدار ہے؟

وہابیہ کے صاف دفاع اور سنیوں سے بغض وعداوت پر گواہی دے رہا ہے۔اس شعر میں سنی کے جنت کا ٹھیکدار ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اس شعر میں یہ بتایا جارہا ہے کہ جنت رسول اللہ کی ہے اور ہم رسول اللہ کے ہیں اور وہابی چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخ ہیں تو انہیں جنت سے دور ہی رہنا چاہئے۔ کہ جب انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم محبت ہی نہیں ہے تو پھر جنت سے انہیں کیا مطلب؟ صاحب جنت سے عداوت و نفرت اور جنت جو رسول اللہ کی ملکیت ہے۔اس کی طلب چہ معنی دارد؟

الغرض: شخص مذکور کی جملہ مذکورہ باتیں جہالت وسفاہت، پر مبنی، وہابیت زدہ اور چند باتیں گمراہی وبے دینی اور کفر پر مشتمل ہیں۔اس پر لازم ہے کہ توبہ کرے، تجدید ایمان اور تجدید نکاح کرے اور اگر مرید ہو تو تجدید بیعت کرے۔ درمختار مع فتاوی شامی باب المرتد میں ہے:

مایکون کفرااتفاقایبطل العمل والنکاح واولادہ اولادزنا،ومافیہ خلاف یؤمربالاستغفاروالتوبۃ'' (أی تجدید الاسلام وتجدید النکاح

متفق علیہ کفر سے عمل اور نکاح باطل ہو جاتا ہے اور اس حالت میں جو اولاد ہو گی وہ اولادِ زنا ہو گی اور جس کے کفر ہونے میں اختلاف ہو اس میں توبہ تجدید اسلام و تجدید نکاح کا حکم دیا جائے گا۔" [درالمختارمع ردالمحتار،ج ۶ ص ۳۹۱]

مسلمانوں پر لازم ہے کہ بموجب فرمان الٰہی

واما ینسینك الشیطان فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظالمین۔

اور جو کہیں تجھے شیطان بھلادے تو یاد آئے پر ظالموں کے پاس نہ بیٹھ۔"

[ترجمہ کنزالایمان، پارہ،۲۸: سورۃ الانعام آیت ۶۸]

اور فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم: ایاکم وایاھم لایضلونکم ولایفتنونکم

گمراہوں سے دُور بھاگو اُنہیں اپنے سے دُور رکھو کہیں وہ تمہیں بہکانہ دیں اور تمہیں فتنے میں نہ ڈال دیں۔

[مسلم شریف، ج ۱ ص ۱۰]

ایسے شخص سے دور رہیں۔ اور جب تک توبہ نہ کرلے ترک تعلق رکھیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب،

فتوی ۱۲۵ — سنی جنت میں جائیں گے

مسئولہ: (مولانا) محمد تحسین رضا رضوی ثقافی۔ ۲۲ / ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع مسئلہ ذیل میں

کہ زید جو عالم ومفتی ہے اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ نہ سنی جنت میں جائے گا نہ دیوبندی جنت میں جائے گا جو نبی کے طریقہ پر چلے گا وہی جنت میں جائے گا زید کا ایسا کہنا کیسا ہے؟ اور اس پر شریعت کا کیا حکم ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

زید کا قول کہ جنت میں دیوبندی نہیں جائے گا بالکل حق و درست ہے۔ لیکن زید کا یہ کہنا کہ سنی نہیں جائے گا۔ سراسر غلط اور مبنی بر ضلالت ہے۔ سنی سے مومن مراد ہوتے ہیں: حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

عرف قرآن وحدیث وصحابہ میں مومن اسی کو کہتے ہیں جو سنی صحیح العقیدہ ہو" [فتاوی رضویہ ۲۴/۶۸۷]

لہٰذا جو سنی صحیح العقیدہ ہو وہ مومن ہے بلکہ یوں کہیں کہ مومن وہ ہے جو سنی ہے اور سنی اہل سنت سے تعبیر ہے اور اہل سنت جماعت سے۔ اور جماعت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی فرمایا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "تفترق امتی علی ثلث وسبعین ملة کلھم فی النار الاملة واحدة

میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی ان میں بجز ایک کے سب ناری ہیں۔" [سنن ترمذی ابواب الایمان، ۲/۹۳]

دوسری حدیث میں ہے: "ما انا علیہ واصحابی (جنتی فرقہ وہ ہے) جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہو"

[سنن ترمذی، ابواب الایمان، ۲/۹۳]

ایک اور حدیث ہے:

"وواحد فی الجنة وھی الجماعة" اور ایک گروہ جنتی ہے اور وہ جماعت ہے [سنن ابوداؤد، کتاب السنة، ۲/۶۳۱]

ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

"السواد الاعظم یعبر بہ عن الجماعة الکثیرة والمراد ما علیہ اکثر المسلمین

سواد اعظم جماعت کثیرہ سے عبارت ہے اس سے مراد وہ ہے جس پر اکثر اہل اسلام ہیں"

[مرقاة المفاتیح شرح مشکوة المصابیح، کتاب الایمان باب الاعتصام بالکتاب والسنة، ۱/۳۸۳

شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اشعۃ اللمعات شرح مشکوۃ میں فرماتے ہیں:

سواد اعظم در دین اسلام مذہب اہل سنت وجماعت ہست عرف ذالک من انصف بالانصاف وتجنب عن التعصب والاعتساف"

یعنی دین اسلام میں سواد اعظم اہل سنت وجماعت ہیں منصف اور تعصب سے اجتناب کرنے والا اسے جانتا ہے۔"

[اشعة اللمعات، کتاب الایمان باب الاعتصام بالکتاب والسنة، ۱/۶۷]

الغرض سنی جماعت ہی جنتی جماعت ہے۔

لہٰذا زید کا یہ کہنا کہ سنی جنت میں نہیں جائے گا۔ اس سے جماعت کے جنتی ہونے کا انکار ہے۔ اور جماعت سے مراد مومنین ہی ہیں یہ بالکل ظاہر ہے تو مطلب ہوا کہ مومنین جنت میں نہیں جائیں گے۔

حالانکہ قرآن وحدیث اوراجماع امت سے صاف ظاہر ہے کہ مومنین ضرور جنت میں جائیں گے۔ جس کی تفصیل ہم آگے پیش کریں گے۔

اور زید کا اگلا جملہ کہ جو نبی کی اطاعت کرے گا وہ جنت میں جائے گا، یہ بھی محل کلام ہے۔ اس جملہ سے زید کی مراد کیا ہے اگر اطاعت سے مراد محبت رسول ہے تو یہ سنی کے لئے تحصیل حاصل کے درجہ میں ہے کیوں کہ سنی بغیر محبت رسول کے سنی ہو تا ہی نہیں ہے۔ اور اگر اطاعت سے مراد عمل اور طریقہ رسول ہے جیسا کہ ظاہر ہے تو اس سے دیوبندی خارج ہو گا کیوں کہ وہ عمل کرے نہ کرے جنت میں نہیں جائے گا جب تک کہ مومن نہ بن جائے۔ اب رہا سنی کہ وہ اطاعت کرے گا تو جنت میں جائے گا ورنہ نہیں تو یہ بھی خلاف اصول ہے۔ اسلامی مسلم اصول ہے کہ ہر مومن خواہ وہ نیک ہو یا گنہگار جنت میں جائے گا۔ جنت میں جانے کے لئے ایمان شرط ہے۔ عمل شرط نہیں ہے۔ شہادت کے طور پر صحاح ستہ کی بہت سی احادیث کریمہ پیش کی جاسکتی ہیں مگر ہم یہاں بس ایک حدیث پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

عن ابی ذر قال اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثوب ابیض وھونائم ثم اتیتہ وقد استیقظ فقال مامن عبد قال لا الہ الا اللہ ثم مات علی ذالک الا دخل الجنۃ قلت وان زنی وان سرق قال وان زنی اوان سرق قلت وان زنی وان سرق قال وان زنی وان سرق قلت وان زنی وان سرق قال وان زنی وان سرق علی رغم انف ابی ذر

یعنی حضرت ابوذر سے مروی، فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سفید کپڑا تھا اور آپ آرام فرمارہے تھے میں دوبارہ حاضر ہوا تو اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہو چکے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی شخص اس کلمہ لا الہ الا اللہ (مکمل کلمہ مراد ہے) کا اقرار کرے اور پھر وہ اسی حالت (ایمان) پر انتقال کر جائے تو وہ جنت میں داخل ہو گا میں نے عرض کیا کہ چاہے وہ زنا کرے اور چوری کرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چاہے وہ زنا کرے اور چوری کرے۔ میں نے دوبارہ دریافت کیا کہ چاہے وہ زنا کرے اور چوری کرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ چاہے وہ زنا اور چوری کرے۔ میں نے سہ بارہ عرض کیا کہ چاہے وہ زنا اور چوری کرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چاہے وہ زنا اور چوری کرے۔ ابو ذر کی ناک کے خاک آلود ہونے کے باوجود۔"

[صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب الثیاب البیض]

اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری فرماتے ہیں:

"ففیہ بشارۃ الی ان عاقبتہ دخول الجنۃ وان کان لہ ذنوب جمۃ لکن امرہ الی اللہ ان شاء عفا عنہ وادخلہ الجنۃ ان شاء عذبہ بقدر ذنبہ ثم ادخلہ الجنۃ۔

اس میں اس بات کی بشارت ہے کہ مومن کا انجام یہ ہے کہ وہ جنت میں داخل ہوگا۔ خواہ اس پر گناہوں کا کتنا ہی بوجھ ہو لیکن اس کا معاملہ اللہ کے قبضہ میں ہے کہ اگر وہ چاہے تو معاف کر دے اور جنت میں داخل کر دے اور گر چاہے تو گناہوں کے بقدر سزادے کر جنت میں داخل فرمائے۔"[مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح]

امام بدرالدین عینی حنفی مومن کے جنتی ہونے سے متعلق رقمطراز ہیں:

''المؤمن يدخل الجنة لا محالة''،مومن جنت میں داخل ہوگا لازمی"[۲۲/۱۴]

مزید لکھتے ہیں:''فكل من يدخل الجنة آمن بالله وصدق رسله''

ہروہ شخص جو اللہ پر ایمان لایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کی وہ جنت میں داخل ہوگا"

[عمدۃ القاری، ۱۵۹/۱۵]

گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ہوتا اور وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے بلکہ اس کا انجام جنت ہی ہے اس کا خلاصہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

''أن الكبيرة لا تسلب اسم الإيمان وأنها لا تحبط الطاعة وأن صاحبها لا يخلد في النار وأن عاقبته دخول الجنة''

کبیرہ اصل ایمان کو سلب نہیں کرتاہ۔ے اور یہ کہ وہ طاعت کو ضائع نہیں کرتا ہے۔ اور یہ کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ جہنم میں نہیں رے گا اس کا انجام کار جنت میں داخل ہونا ہے۔"

[عمدۃ القاری شرح البخاری، ۸/۲۲باب لبس الحریر]

اور لکھتے ہیں:''المرتكب لجنس الكبيرة من المسلمين يدخل الجنة''

یعنی گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان جنت میں داخل ہوگا۔[عمدۃ القاری، ۵۰/۲۳]

ملا علی قاری ایک مقام پر گناہ کبیرہ کے مرتکب کے جنت میں داخل ہونے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وأما من كانت له معصية كبيرة ومات من غير توبة فهو في مشيئة الله تعالى إن شاء عفا عنه وأدخله الجنة، وإن شاء عذبه بالقدر الذي يريده سبحانه ثم يدخل الجنة، فلا يخلد في النار أحد مات على التوحيد ولو عمل من المعاصي ما عمل

یعنی وہ شخص جو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو اور بغیر توبہ کے مر گیا تو وہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے اگر وہ چاہے تو معاف کرے اور اسے جنت میں داخل کرے اور اگر چاہے تو عذاب دے جس قدر وہ چاہے پھر جنت میں داخل کرے البتہ جو توحید پر مراوہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا اگرچہ گناہ کئے ہوں''

[مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، کتاب الایمان، ۷۴/۱]

شارح بخاری مفتی شریف الحق امجدی فرماتے ہیں:

"ایمان لانے کے بعد اگر گناہ صادر ہو تو بھی وہ جنت کا مستحق ہے یا تو اللہ کی رحمت سے بغیر جہنم میں گئے ہوئے یا بطور سزا جہنم میں کچھ دن جانے کے بعد پھر ضرور جنت میں جائے گا۔ اس کا حاصل یہ کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے آدمی کافر نہیں ہوتا۔"

[نزہۃ القاری شرح بخاری، ۵۲۵/۵]

شرح زرقانی علی الموطامیں ہے:''فالمؤمن العاصی لابد من دخوله الجنة یعنی گنہگار مومن کا جنت میں داخلہ لازمی ہے۔''[۴۳۸/۴]

الحاصل: سنی مومن ہے اور مومن جنت میں رہے گا خواہ نیک ہو یا گنہگار۔ لہٰذا زید کا قول اصول شرع کے خلاف ہے زید پر لازم ہے توبہ کرے اور آئندہ اس طرح کے جملوں کا استعمال نہ کرے۔

ھٰذا ماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ

تقدیر کی تین قسمیں ہیں
مفتی اقتدار خاں نعیمی کا تقدیر کی تین قسموں سے انکار کا تفصیلی جواب

فتوی ۱۲۶ مسئولہ: محمد اشفاق رضا قادری نظامی، بلڈنگ نمبر 10، روم نمبر 001، کپاڑیا نگر، سی۔ ایس۔ ٹی۔ روڈ، کرلا ممبئی ۱۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان ذی الاحترام درج ذیل مسئلہ میں
بہارِ شریعت میں تقدیر کی 3 قسمیں بیان کی گی ہیں، جب کہ تفسیر نعیمی میں مفتی اقتدار خان نعیمی لکھتے ہیں کہ بہارِ شریعت نے جلد 1، صفحہ 6 پر اور اُنکی دیکھا دیکھی بعض جُہلَا نے جو یہ لکھا کہ حضور سیدنا غوث اعظم اسی کو فرماتے ہیں ''میں قضائے مبرم کو رد کر دیتا ہوں'' اسی کی نسبت حدیث میں ارشاد ہے "بیشک دعا قضائے مبرم کو ٹال دیتی ہے۔" یہ بات قطعا درست نہیں ہے۔ حضور غوث پاک کا فرمان اِن لفظوں میں کہیں ثابت نہیں۔
مزید فرماتے ہیں کہ بہارِ شریعت کی یہ بات تو قصیدہ غوثیہ شریف کے بھی خلاف ہے (قصیدہ کی عبارت کا حوالہ بھی دیا ہے انہوں نے) صاحبِ بہارِ شریعت کا ایسی من گھڑت بات فرما کر پھر مبرم کی تقسیم کرنا، یہ تقسیم بھی کہیں ثابت نہیں، اسی لیے یہی کہنا صحیح ہے کہ بہارِ شریعت کی یہ بات سِرے سے غلط ہے۔[تفسیر نعیمی، جلد16، صفحہ174-175)] اس تضاد کا برائے مہربانی تسلی بخش حل اور تفصیلی جواب ارشاد فرمادیں کہ قضا کی 2 قسمیں ہیں یا پھر 3؟

الجواب

تقدیر کی تین ہی قسمیں ہیں جیسا کہ بہار شریعت میں درج ہے۔ بلکہ خود مفتی اقتدا احمد خاں صاحب جنہوں نے اپنے والد گرامی کے وصال کے بعد گیارہویں پارے کے ربع آخر سے تفسیر نعیمی پر کام کیا اور اٹھارہ جلدیں پوری فرمائیں۔ سولہویں جلد میں تقدیر کی تین قسموں کا انکار کیا اور دو قسمیں بیان فرمائیں۔ حالانکہ تیرہویں جلد میں آیت کریمہ ''یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ'' کی تفسیر میں تقدیر کی تین قسمیں کچھ اس طرح کی ہیں لکھتے ہیں:
''علمائے اسلام فرماتے ہیں کہ تقدیر کائنات تین قسم کی ہے۔ تقدیر معلق جو الٰہی فیصلہ کسی دوسری چیز سے منسوب ہو جائے جیسے اگر ایسا ہو تو ایسا ہو گا۔ تقدیر مبرم منسوب۔ تقدیر مبرم غیر منسوب (محکم)۔ پہلی دو تقدیریں دعا التجا فریاد اور سفارش سے بدل جاتی ہیں تیسری نہیں بدلی جاتی نہ دعا سے نہ سفارش سے۔[سورہ رعد، صفحہ ۴۱۳]

نیز ان کے والد گرامی مفتی احمد یار خاں نعیمی علیہ الرحمہ مشکوٰۃ کی شرح میں باب الایمان بالقدر کی تشریح میں تقدیر کی تین قسمیں کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

"تقدیر تین قسم کی ہے (۱) مبرم (۲) مشابہ مبرم (۳) معلق

پہلی قسم میں تبدیلی ناممکن ہے۔ دوسری خاص محبوبوں کی دعا سے بدل جاتی ہے اور تیسری عام دعاؤں اور نیک اعمال سے بدلتی رہتی ہے۔ [مرأت المناجیح شرح مشکوۃ المصابیح ۱/ ۹۰ باب القدر] مزید اسی کتاب میں حدیث پاک:

"قد کتبه الله علیك رفعت الاقلام وجفت الصحف" کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تقدیر تین قسم کی ہے۔ مبرم، معلق اور معلق مشابہ مبرم۔

[مرأت المناجیح شرح مشکوۃ المصابیح ۷/ ۱۱۸، باب التوکل والصبر]

علاوہ ازیں حضور مجدد الف ثانی نے بھی تقدیر کو تین قسموں پر منقسم فرمایا ہے اور سرکار غوث پاک کے فرمان عالیشان کو تیسری قسم یعنی معلق شبیہ مبرم میں داخل فرمایا ہے جو عام اولیائے کرام کی نظروں میں مبرم ہے مگر اولیائے کاملین کو اس کی تعلیق علم الٰہی میں معلوم ہے۔ فرماتے ہیں:

"قضا بر دو قسم است قضاء معلق و قضاء مبرم در قضاء معلق احتمال تغییر و تبدیل است۔ و در قضاء مبرم تغییر و تبدیل را مجال نیست۔ قال الله سبحانه و تعالیٰ: "مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ" ایں در قضاء مبرم است۔ و در قضاء معلق می فرماید "یَمْحُوا اللهُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْکِتٰبِ"

حضرت قبلہ گاہی ام قدس سرہ می فرمودند کہ حضرت سید محی الدین جیلانی قدس سرہ در بعضی از رسائل خود نوشتہ اند کہ در قضاء مبرم ہیچ کس را مجال نیست کہ تبدیل بدہد مگر مرا کہ اگر خواہم آنجا ہم تصرف بکنم وازیں سخن تعجب بسیار می کردند واستبعاد می فرمودند وایں نقل مدتہا در خزینۂ ذہن ایں فقیر بود تا آنکہ حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ بایں دولت عظمی مشرف ساخت روزے در صدد دفع بلیہ بودم کہ بہ بعضی از دوستاں نامزد شدہ بود و دراں وقت التجا و تضرع و نیاز و خشوع تمام داشتم ظاہر شد کہ در لوح محفوظ قضاء ایں امر معلق بامرے نیست و مشروط بشرطے نہ یک گونہ یاس و ناامیدی دست داد و سخن حضرت سید محی الدین قدس سرہ بیاد آمد مرۃ ثانیہ باد ملتجی و متضرع گشت و راہ عجز و نیاز پیش گرفتہ متوجہ شد بمحض فضل و کرم ظاہر ساختند کہ قضاء معلق بر دو گونہ است قضائے است کہ تعلیق اورا در لوح محفوظ ظاہر ساختہ اند و ملائکہ را بر اں اطلاع دادہ و قضائیکہ تعلیق او نزد خدا است جل شانہ وبس و در لوح محفوظ صورت قضاء مبرم دارد ایں قسم اخیر از قضاء معلق نیز احتمال تبدیل دارد در رنگ قسم اول از انجا معلوم شد کہ سخن سید مصروف بامنقسم اخیر است کہ صورت قضاء مبرم دارد نہ بقضاء کہ بحقیقت مبرم است کہ تصرف و تبدیل دراں محالست عقلاً و شرعاً کما لایخفیٰ والحق کہ کم کسے را بر حقیقت آں قضاء اطلاع است فکیف کہ در انجا تصرف نماید و بلیہ کہ متوجہ آں دوست شدہ بود دراں قسم اخیر یافت و معلوم شد کہ حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ دفع آں بلیہ فرمود۔"

یعنی تقدیر کی دو قسمیں ہیں تقدیر مبرم اور تقدیر معلق،

تقدیر معلق میں تبدیلی کی گنجائش ہے اور تقدیر مبرم میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا میرے یہاں بات نہیں بدلتی یہ تقدیر مبرم میں ہے۔ اور تقدیر معلق کے سلسلے میں فرماتا ہے اللہ جو چاہے مٹاتا اور ثابت کرتا ہے۔ اور اصل لکھا ہوا اسی کے پاس ہے۔ میرے حضرت قبلہ گاہی قدس سرہ فرماتے تھے:

کہ حضرت سید محی الدین جیلانی قدس سرہ نے اپنے بعض رسائل میں تحریر فرمایا ہے: کہ تقدیر مبرم میں کسی شخص کو مجال نہیں کہ بدل دے مگر مجھے ہے کہ کہ اگر میں اس میں بھی چاہوں تو وہاں بھی تصرف کروں اور اس بات سے بہت تعجب فرماتے اور سمجھ سے بالاتر بتاتے۔ یہ بات مدتوں فقیر کے ذہن کی تجوری میں رہی۔ یہاں تک کہ اللہ پاک نے اس عظیم دولت سے مشرف فرمایا۔ ایک دن ایک بلا کو جو کسی دوست کے حق میں مقرر ہو چکی تھی دور کرنے کے درپے ہوا اس وقت بڑی التجا، عاجزی، نیاز اور مکمل خشوع کیا تو ظاہر ہوا کہ لوح محفوظ پر اس امر کی قضا کسی چیز پر معلق نہیں اور کسی شرط پر مشروط نہیں، اس طرح بڑی ناامیدی حاصل ہوئی۔ اور حضرت سید محی الدین جیلانی قدس سرہ کی بات یاد آئی دوبارہ پھر التجا اور تضرع کیا اور عجز و نیاز کے ساتھ متوجہ ہوا تب محض اللہ کے فضل اور کرم سے ظاہر ہوا کہ قضاء معلق کی دو قسمیں۔ ہیں ایک یہ کہ اس کی تعلیق لوح محفوظ میں ظاہر ہے اور فرشتے اس پر مطلع ہیں۔ اور ایک وہ اللہ کے نزدیک معلق ہے اور لوح محفوظ میں قضاء مبرم کی صورت میں ہے۔ قضاء معلق کی یہ آخری قسم بھی پہلی قسم کی طرح تبدیلی کا احتمال رکھتی ہے۔ یہیں سے معلوم ہوا کہ حضرت سید (غوث پاک) کی بات اسی اخیر قسم پر موقوف ہے۔ جو قضاء مبرم کی صورت رکھتی ہے نا کہ قضاء مبرم حقیقی پر۔ اس لئے کہ اس میں تبدیلی عقلاً و شرعاً محال ہے جیسا کہ پوشیدہ نہیں۔ اور حق یہ ہے کہ کم ہی لوگوں کو اس قضاء کی حقیقت کی اطلاع ہے تو اس میں تصرف کیسے کرے۔ اور وہ آفت جو اس دوست پر پڑی وہ اسی اخیر قسم سے پائی۔ اور معلوم ہوا کہ اللہ پاک نے اس مصیبت کو دور فرما دیا ہے۔

[مکتوبات امام ربانی: جلد ۱ ص ۲۵۱، ۲۵۰، مکتوب دوصدوہفتدہم، ۲۱۷]"

حضور اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے بھی تقدیر کی تین قسمیں مانی ہیں اور سرکار غوث پاک کے قول مبارک کو معلق شبیہ مبرم میں داخل فرمایا ہے۔ آپ اپنے والد گرامی علامہ نقی علی خاں علیہ الرحمہ کی کتاب مستطاب "احسن الوعاء لآداب الدعاء" کی درج ذیل عبارت

'قضا دو قسم ہے مبرم کہ جف القلم بما هو كائن اس کا بیان ہے اور معلق کہ 'مايعمر من معمر ولاينقص من عمره' اس کا نشان' (فصل دہم، ص۶۹) کے ضمن میں فرماتے ہیں:

"بعض اشخاص کو قول حضور پر نور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں کہ سب اولیاء قضاء معلق کو روکتے ہیں اور میں قضائے مبرم کو رد فرماتا ہوں او کما قال رضی اللہ تعالیٰ عنہ شبہہ گزرتا ہے کہ قضائے مبرم کیوں کر قابل رد ہو سکتی ہے؟

اقول۔ شاید ان صاحبوں کو حدیث ابی الشیخ فی کتاب الثواب عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ پہنچی کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

'اكثر من الدعاء فان الدعاء يرد القضاء المبرم' دعا بکثرت مانگ کہ دعاء قضائے مبرم کو رد کر دیتی ہے۔

حدیث ابن عساکر عن نمیربن اوس مرسلا وحدیث الدیلمی عن ابی موسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ موصولاً کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

'الدعاء جند من اجناد اللہ مجند یرد القضاء بعد ان یبرم'

دعا اللہ تعالیٰ کے لشکروں سے ایک لام باندھا لشکر ہے کہ قضا کو رد کر دیتا ہے بعد مبرم ہونے کے۔ تحقیق اس مقام کی یہ ہے کہ قضائے مُعَلَّق دو قسم ہے:

ایک مُعَلَّق مَحْض جس کی تعلیق کا ذکر لوحِ محو واثبات یا صُحُفِ ملائکہ میں بھی ہے، عام اولیاء جن کے علوم اس سے مُتَجاوز نہیں ہوتے ایسی قضا کے دفع پر دعا کی ہمت فرماتے ہیں کہ انہیں بوجہ ذکرِ تعلیق اس کا قابلِ دفع ہونا معلوم ہوتا ہے۔

دوسری مُعَلَّق شَبِیہِ بِالْمُبْرَم کہ علمِ الٰہی میں تو مُعَلَّق ہے مگر لوحِ محو واثبات و دفاترِ ملائکہ میں اس کی تعلیق مذکور نہیں، وہ ان ملائکہ اور عام اولیاء کے علم میں مُبْرَم ہوتی ہے،

مگر خواص عبادُ اللہ جنہیں امتیازِ خاص ہے، بالہامِ ربانی بلکہ برؤیت مقامِ اَرفع حضرت مُخْدَع اس کی تعلیقِ واقعی پر مطلع ہوتے ہیں اور اس کے دفع میں دعا کا اِذن پاتے ہیں، اور یا عام مؤمنین جنہیں اَلواح وصحائف پر اطلاع نہیں حسب عادت دعا کرتے ہیں اور وہ بوجہ اس تعلیق کے جو علم الٰہی میں تھی مندفع ہو جاتی ہے، یہ وہ قضائے مُبْرَم ہے جو صالح رد ہے، اور اسی کی نسبت حضورِ غوثیت کا ارشادِ اَمجد۔ ولہٰذا فرماتے ہیں "تمام اولیاء مقامِ قدر پر پہنچ کر رک جاتے ہیں سوا میرے، کہ جب میں وہاں پہنچا میرے لیے اس میں ایک رَوزن (روشندان) کھولا گیا جس سے داخل ہو کر 'نزعت اقدار الحق بالحق للحق'

میں نے تقدیراتِ حق سے حق کے ساتھ حق کے لیے منازَعت کی۔ مرد وہ ہے جو منازَعت کرے نہ وہ کہ تسلیم۔"

[ذیل المدعاء لاحسن الوعاء، فصل دہم، ۷۰، ۶۹]

مفتی شریف الحق امجدی شارح بخاری نے بھی اپنی کتاب نزہۃ القاری شرح بخاری میں حدیث جبرئیل کی شرح میں تقدیر کی تین قسمیں بیان کی ہیں اور غوث پاک کے فرمان عالیشان کو تیسری قسم میں داخل فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

"قضا کی تین قسمیں ہیں مبرم حقیقی جو علم الٰہی میں کسی چیز پر معلق نہیں۔ معلق محض ملائکہ کے صحیفوں میں جس کا معلق ہونا ظاہر فرما دیا گیا ہو۔ معلق شبیہ مبرم صحف ملائکہ میں جس کی تعلیق مذکور نہیں مگر وہ علم الٰہی میں معلق ہے۔ مبرم حقیقی کی تبدیل محال ہے اگر محبوبان بارگاہ اس بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں تو انہیں اس سے روک دیا جاتا ہے۔ مثلاً فرشتے قوم لوط پر عذاب لے کے آئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلاۃ والسلام نے بآں قرب واختصاص بہت کچھ عرض ومعروض کی یہاں تک کہ ان کی عرض ومعروض کو قرآن کریم نے مجادلے سے تعبیر فرمایا ارشاد ہے۔ يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ۔ ابراہیم ہم سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگا۔ مگر چونکہ یہ عذاب مبرم حقیقی تھا اس لئے نہ رکا۔ قضاء معلق اولیائے کرام کی دعاؤں ان کی توجہ اعمال حسنہ سے ٹل جاتی ہے۔ معلق شبیہ مبرم تک عامہ اولیائے کرام کی رسائی نہیں اکابر کی ہے۔ جو ان کی دعائے توجہ سے ٹل جاتی ہے۔ حضور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ نے اسی کو فرمایا: انی ارد القضاء بعد ما ابرم۔

[، کتاب الایمان۔ ۳۲۰/۱، ۳۱۹]

شارح صحیح مسلم علامہ غلام رسول سعیدی شرح مسلم میں تقدیر کی تفصیلی بحث کرتے ہوئے اخیر میں لکھتے ہیں:
”جن مشائخ اور اکابر صوفیا کی عبارات میں یہ مذکور ہے کہ ان کی دعاء سے قضاء مبرم ٹل جاتی ہے اس کی یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ اس سے مراد مبرم اضافی ہے حقیقی مبرم نہیں ہے۔ مبرم اضافی سے یہ مراد ہے کہ حقیقت میں وہ قضاء معلق ہے لیکن ان سے کم درجہ کے مشائخ کی دعا سے وہ قضاء نہیں ٹل سکتی تھی اس لئے ان کے اعتبار سے وہ مبرم تھی اور جو قضاء حقیقۃً مبرم ہو وہ اٹل ہے اس کو کوئی نہیں ٹال سکتا اور وہی اللہ تعالیٰ کا علم ازلی ہے۔[شرح صحیح مسلم، کتاب الایمان: ۱/۲۹۸]
آخر میں ہم یہاں علامہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ کی ”المعتقد المنتقد“ اور حضور اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی ”المستند المعتمد“ کے حوالے سے تقدیر اور سرکار غوث پاک کے فرمان عالی شان سے متعلق تفصیلی بحث کو نقل کر دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ پھر کسی شک وشبہہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اور اہل سنت کے اذہان مطمئن ہو جائیں۔ معتقد میں ہے:
”القضاء على ضربين مبرم و معلق فالأول لا يتغير، والثاني يمكن تغيره و منه ما عناه سلطان العارفين سيدى عبد القادر الجيلانى قدس سره الربانى بقوله فى القضية "إنما الرجل من يعترض للقضاء فيرده" إذ المعلق قد يغيره الله بلا واسطة فلا بدع أن يرده بها إكراما لأوليائه و منه ما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يرد القضاء إلا الدعاء و نحوه كذا فى الكنز وادعاء رد القضاء المبرم باطل“
یعنی تقدیر کی دو قسمیں ہیں مبرم اور معلق پہلی نہیں بدلتی اور دوسری کا بدلنا ممکن ہے۔ اور سلطان العارفین سید عبد القادر جیلانی قدس سرہ الربانی نے اپنے قول کہ مرد حق تو وہ ہے جو قضاء کے آڑے آئے اور اسے ٹال دے‘ سے جو مراد لیا ہے وہ اسی قسم سے ہے۔ اس لئے کہ اللہ معلق کو بغیر واسطہ بدل دیتا ہے تو اولیاء کرام کی تکریم کے لئے بدلنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قضاء کو کوئی چیز رد نہیں کرتی مگر دعاء، اور اس کے ہم معنی ارشادات اسی قبیل سے ہیں۔ ایسا ہی کنز میں ہے۔ اور قضاء مبرم کے رد کا دعوی باطل ہے۔[المعتقد المنتقد: ص۵۷]
اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے علامہ موصوف علیہ الرحمہ کی عبارت پر درج ذیل حاشیہ نگاری فرمائی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:
”أقول أخرج أبو الشيخ فى كتاب التواب عن أنس بن مالك رضى الله تعالى عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم أكثر من الدعاء ,فإن الدعاء يرد القضاء المبرم. و أخرج الديلمى فى مسند الفردوس عن أبى موسى الأشعرى تعالى عنه و ابن عساكر عن نمير بن أوس الأشعرى مرسلا كلاهما عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: الدعاء جند من أجناد الله مجند يرد القضاء بعد أن يبرم.
و تحقيق المقام على ما ألهمنى الملك العلام أن الأحكام الإلهية التشريعية كما تأتى على وجهين مطلق عن التقييد بوقت كعامتها مقيد به
كقوله تعالى: فَإِنْ شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِى الْبُيُوتِ حَتَّى يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللهُ لَهُنَّ سَبِيلًا فلما نزل حد الزنا قال صلى الله عليه وسلم خذوا عنى قد جعل الله لهن سبيلا ,الحديث رواه مسلم و غيره عن عبادة رضى الله تعالى عنه و المطلق يكون فى علم الله مؤبدا أو مقيدا, و هذا الأخير هو الذى ياتيه النسخ فيظن أن الحكم تبدل, لأن المطلق يكون ظاهرة

التابید حتی سبق إلی بعض الخواطر أن النسخ رفع الحکم. وإنما ھو بیان مدتہ عندنا, وعند المحققین کذلک الأحکام التکوینیة سواء بسواء, فمقید صراحة کأن یقال لملک الموت علیہ الصلوۃ والسلام: أقبض روح فلان فی الوقت الفلانی إلا أن یدعو فلان, و مطلق نافذ فی علم اللہ تعالی و ھو المبرم حقیقة, و مصروف بدعاء مثلا, و ھو المعلق الشبیہ بالمبرم, فیکون مبرما فی ظن الخلق, لعدم الإشارة إلی التقیید, معلقا فی الواقع, فالمراد فی الحدیث الشریف ھو ھذا, أما المبرم الحقیقی فلا راد لقضائہ و لا معقب لحکمہ وإلا لزم الجھل تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا, فاحفظ ھذا, فلعلک لا تجدہ إلا منا, و باللہ التوفیق.''

یعنی میں کہتاہوں کہ ابو الشیخ نے کتاب الثواب میں انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں 'دعابکثرت مانگ کہ دعاء قضائے مبرم کورد کردیتی ہے' دیلمی نے مسند الفردوس میں ابوموسی اشعری سے اورابن عساکر نے نمیر ابن اوس سے مرسلا دونوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' دعااللہ تعالیٰ کے لشکروں سے ایک لشکرہے سازوسامان والاجو قضاکو مبرم ہونے کے بعد ٹال دیتاہے۔ اوراس مقام کی تحقیق جو مجھ پرملک علام نے الہام فرمائی وہ یہ ہے کہ احکام الٰہیہ تشریعیہ جیسا کہ آگے آئیں گے دووجہوں پرہیں۔ مطلق جس میں کسی وقت کی قید نہیں جیسے عام احکام۔ دوسری وہ کہ وقت کے ساتھ مقید ہو جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان 'پھر اگر وہ گواہی دیدیں توعورتوں کوگھرمیں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت اٹھالے یااللہ ان کی کچھ راہ نکالے' جب قرآن میں زنا کی حد نازل ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایامجھ سے لو بیشک اللہ نے ان عورتوں کے لئے سبیل مقرر فرمائی الحدیث،اس حدیث کو مسلم وغیرہ نے عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ اور مطلق علم الٰہی میں یاتو موبد ہوتاہے (یعنی ہر زمانے کے لئے) یاپھر مقید (یعنی خاص زمانہ کے لئے) یہی اخیر حکم ہے وہ جس میں نسخ آتاہے اور گمان یہ ہوتاہے کہ حکم بدل گیااس لئے کہ مطلق کا ظاہر موبد ہوتاہے یہاں تک کہ کچھ اذہان کی طرف اس خیال نے سبقت کی کہ نسخ حکم کو اٹھادینے کانام ہے۔ ہمارے اور محققین کے نزدیک وہ حکم کی مدت بیان کرناہے۔ اوراحکام تکوینیہ بھی اسی طرح برابرہیں (یعنی دوقسموں پرہیں) تومقید جو صراحت کے ساتھ ہے جیسے ملک الموت علیہ الصلوۃ والسلام سے کہاجائے کہ فلاں کی روح فلاں وقت قبض کرے مگر یہ کہ اگر فلاں اس کے حق میں دعاکرے تو قبض نہ کرے۔ اور مطلق جو علم الٰہی میں نافذہے اوروہ مبرم حقیقی ہے۔ اوروہ جو موقوف ہے دعاء سے مثلاًوہ معلق شبیہ مبرم ہے۔ وہ مخلوق کے گمان میں مبرم ہے تعلیق مذکورنہ ہونے کے سبب حالانکہ وہ واقع میں (کسی شرط پر) معلق ہے۔ اور حدیث شریف میں (مبرم سے) یہی مراد ہے۔ اوررہامبرم حقیقی تووہ یہاں مراد نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی قضاء کو کوئی ٹالنے والا نہیں اوراس کو کوئی باطل کرنے والا نہیں ورنہ جہل باری لازم آئے گا۔ اوراللہ پاک ہے اس سے بلند وبالاہے۔ اسے یادرکھو کہ شاید یہ تمہیں ہمارے علاوہ کسی سے نہ ملے۔ اوراللہ یہ توفیق دینے والاہے۔''

[المستند المعتمد بناء نجاة الابد: ص ۵۷]

فائدہ: علمانے تقدیر کی دوقسمیں بیان کی ہیں بعض نے تین اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ اس لئے کہ جنہوں نے دوبیان کی ہیں انہوں نے مطلقاً تقدیر کی قسمیں بیان کی ہیں۔ اور جنہوں نے تین بیان کی ہیں انہوں نے بھی تقدیر کی دوہی قسمیں بیان

کیں البتہ ان دو قسموں میں سے ایک قسم معلق کی دو قسمیں بیان کیں تو اس طرح تقدیر کی تین قسمیں ہو جاتی ہیں۔ تقدیر کی دو قسمیں کہی جائیں مبرم اور معلق اور معلق کی دو قسمیں معلق محض اور معلق شبیہ مبرم تب بھی وہی بات ہوئی اور تقدیر کی تین قسمیں اس طرح بیان کی جائیں مبرم معلق معلق شبیہ مبرم۔ تب بھی وہی بات ہوئی۔

جیسا کہ مجدد الف ثانی نے تقدیر کی دو ہی قسمیں بیان فرمائیں مگر بعد میں معلق کی دو قسمیں کر دیں جس سے صاف ہو گیا کہ تقدیر کی تین قسمیں ہیں۔ اور اسی طرح حضور اعلیٰ حضرت نے اور مفتی اقتدار احمد خاں نعیمی نے سرکار غوث پاک کے فرمان عالیشان کی تردید میں قصیدہ غوثیہ کا یہ شعر نقل فرمایا ہے

ولو القیت سرّی فوق میتٍ لقام بقدرۃ المولیٰ تعالیٰ

اور اس سے جو مفہوم اخذ کیا ہے اس پر کچھ لکھنا بے سود ہے اور خوامخواہ اوراق کو سیاہ کرنا ہے۔ اس لئے کہ اس فرمان عالیشان اور اس شعر کے مفہوم میں زمین وآسمان کا فرق ہے واللہ اعلم مفتی صاحب نے اس سے جو سمجھا وہ کیوں سمجھا؟۔

الحاصل: تقدیر کی تین قسمیں ہیں (۱) مبرم (۲) معلق (۳) معلق شبیہ مبرم۔ اور سرکار غوث پاک کا فرمان مبارک اسی اخیر قسم میں داخل ہے۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

رمضان کی پندرہ تاریخ شب جمعہ میں دھماکہ کی شرعی حیثیت

فتوی ۱۲۷ مسئولہ: (مولانا) محمد صادق رضا نعیمی، قصبہ سوار، مرادآباد۔ ۵؍ رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں

عوامی سطح پر یہ بات بڑی تیزی کے ساتھ پھیلتی جارہی ہے کہ اس سال رمضان کی پندرہ تاریخ کو رات میں کوئی چیخ سنائی دے گی اور صبح کو ایک دھماکہ ہوگا، وہابیہ اعلیٰ حضرت کے حوالے سے یہ بات لوگوں میں بیان کرر رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس طرح کی کسی بھی بات سے صاف انکار بھی کرر ہے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس دھماکہ کی کوئی حقیقت ہے اور کیا اعلیٰ حضرت نے اسے بیان فرمایا ہے نیز کیا اس کا حدیث وغیرہ میں کہیں ثبوت ملتا ہے، تفصیل کے ساتھ جواب مرحمت فرمائیں اور عند اللہ ماجور ومثاب ہوں۔

الجواب

غیب کی خبریں دینے والے پیغمبر آخر الزماں کی بیان کردہ ہر پیشن گوئی مبنی بر حقیقت ہے۔ مومن کو اس پر ایمان رکھنا لازم ہے، سوال میں درج خبر بھی نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشن گوئیوں میں سے ایک ہے۔ بلاشبہہ یہ حقیقت ہے کہ جس سال کثرت سے زلزلے، کثرت سے برف باری۔ اور رمضان کی پندرہ تاریخ کو جمعہ ہوگا اس سال رمضان کی پندرہ تاریخ کو شب جمعہ میں دھماکہ اور صبح کو ایک چیخ سنائی دے گی۔ اس سال زلزلے آئے اور کچھ علاقوں میں برف باری بھی ہوئی مگر کثرت

سے نہیں۔ ہاں البتہ رمضان کی پندرہ جمعہ کو ہی ہے۔ بالفرض یہ مان لیں کہ اس سال زلزلے اوراولے کی کثرت رہی اور رمضان کی پندرہ بھی جمعہ کو ہے، تو یہ ضروری نہیں کہ وہ دھماکہ اور چیخ جس کا ذکر نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسی سال ہوں، بلکہ بس امکان ہے اس سال بھی ہوسکتے ہیں اور آئندہ سالوں میں بھی، ہاں ہونا ضرور ہے۔

اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور مبارک میں بھی ایسا ہوا اور پھر اس سلسلے میں آپ سے استفتا کیا گیا جس کا اطمینان بخش جواب آپ نے عنایت فرمایا ہم یہاں استفتا اور فتوی دونوں ذکر کرتے ہیں تاکہ مسئلہ صاف ہو جائے۔

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جمعہ کو رمضان المبارک میں کوئی ہیبت ناک بات آنے والی ہے جس کی نسبت حضور کی طرف بعض آدمیوں نے کی ہے کہ مولوی صاحب نے ایسا فرمایا کہ جمعہ کی رات کو ایک ہیبت ناک آواز آئے گی۔

الجواب: آئے گی مگر یہ نہ کہا تھا کہ اسی رمضان آئے گی۔ جب آئے گی تو وہ رمضان ہی ہوگا جس کی پندرھویں جمعہ کو ہوگی۔ اس سال زلزلے کثرت سے ہوں گے۔ اَولے کثرت سے پڑیں گے۔ پندرھویں شبِ رمضان شب جمعہ ایک دھماکہ ہوگا صبح کی نماز کے بعد ایک چنگھاڑ سنائی دے گی۔ حدیث میں آیا کہ اس تاریخ کو نمازِ صبح پڑھ کر گھروں کے اندر داخل ہو جاؤ اور کواڑ بند کرلو۔ گھر میں جتنے روزن ہوں بند کرلو۔ کان بند کرلو۔ پھر آواز سنو تو فوراً اللہ عزوجل کے لیے سجدہ میں گرو اور کہو "سبحٰن القدوس سبحٰن القدوس ربنا القدوس" جو ایسا کرے گا نجات پائے گا جو نہ کرے گا ہلاک ہوگا۔

یہ حدیث کا مضمون ہے۔ اس میں یہ تعیین نہیں کہ کس سنہ میں ایسا ہوگا۔ بہت رمضان گزر گئے جن کی پہلی جمعہ کو تھی اور ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی گزریں گے۔ ہاں جو خبر دی ہے ہونے والی ضرور ہے جب کبھی ہو۔ اللہ تعالیٰ سے خوف و امید ہر وقت رکھنا چاہیے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔" [فتاوی رضویہ قدیم، ۱۲/ ۱۶۰، ۱۵۹]

حضور اعلیٰ حضرت نے اپنے فتوی میں حدیث پاک کی روشنی میں واقعہ مذکورہ کو ثابت کیا ہے، ہم ذیل میں اس حدیث پاک کو مکمل نقل کر دیتے ہیں تاکہ مومن کے لئے راحت اور وہابیہ کے لئے آفت ہو جائے۔ مذکورہ واقعہ سے متعلق مسند شاشی میں درج ذیل حدیث موجود ہے:

"حدثنا إسحاق بن إبراهيم قال: نا أحمد بن الحسن، نا نعيم بن حماد، نا أبو عمر، عن ابن لهيعة، حدثني عبد الوهاب بن حسين، عن محمد بن ثابت، عن أبيه، عن الحارث، عن عبد الله، عن النبي، صلى الله عليه وسلم قال: إذا كان صيحة في رمضان فإنها تكون معمعة في شوال، وتميز القبائل في ذي القعدة، وتسفك الدماء في ذي الحجة والمحرم وما المحرم -يقولها ثلاثا- هيهات هيهات يقتل الناس فيها هرجا هرجا قال: قلنا: وما الصيحة، يا رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: صلى الله عليه وسلم هذه تكون في نصف من رمضان يوم جمعة ضحى، وذلك إذا وافق شهر رمضان ليلة الجمعة تكون هدة توقظ النائم، وتقعد القائم، وتخرج العواتق من خدورهن في ليلة جمعة سنة كثيرة الزلازل والبرد، فإذا وافق رمضان في تلك السنة ليلة جمعة فإذا صليتم الفجر يوم جمعة في النصف من رمضان -فادخلوا بيوتكم، وسدوا كواكم، ودثروا أنفسكم، وسدوا آذانكم، فإذا أحسستم بالصيحة فخروا لله سجدا، وقولوا سبحان القدوس، سبحان القدوس، ربنا القدوس؛ فإنه من فعل ذلك نجا، ومن ترك هلك"

یعنی حدیث بیان کی ہم سے اسحاق بن ابراہیم نے انہوں نے کہا خبر دی ہم کو احمد بن حسن نے انہیں نعیم بن حماد نے انہیں ابو عمر نے وہ روایت کرتے ہیں ابن لھیعہ سے انہوں نے کہا مجھ سے حدیث بیان کی عبد الوہاب بن حسین نے وہ محمد بن ثابت سے وہ اپنے والد سے وہ حارث سے وہ عبد اللہ (ابن مسعود) سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ماہ رمضان میں چیخ بلند ہوگی تو فتنے پیدا ہوں گے شوال میں اور ذیقعدہ میں قومیں منتشر ہو جائیں گی، اور ذی الحجہ و محرم میں خون ریزی ہوگی۔ اور رہا محرم یہ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا افسوس افسوس۔ لوگ اس ماہ میں گروہ در گروہ قتل کئے جائیں گے۔ (حضرت عبد اللہ ابن مسعود) نے کہا کہ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ صیحہ، کیا ہے؟

فرمایا یہ نصف رمضان کو جمعہ کے دن صبح کو ہوگی۔ اور جب رمضان کا مہینہ جمعہ کی رات کے مطابق ہوگا تو ایک دھما کہ ہوگا جو سوتے کو جگا دے گا، کھڑے کو بٹھا دے گا اور عورتوں کو پردوں سے نکال دے گا، جمعہ کی رات میں اس سال زلزلے اور برف باری کثرت سے ہوگی۔ تو جب اس سال رمضان جمعہ کی رات کے مطابق ہو تو نماز فجر ادا کر و جمعہ کے دن پندرہ رمضان کو اور اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ اور اپنے روشندان بند کر لو اور اپنے آپ کو چھپالو اور اپنے کانوں کو بند کر لو پس تم جب احساس کر واس چیخ کا تو اللہ کے لئے سجدہ ریز ہو جاؤ اور کہو سبحان القدوس، سبحان القدوس، ربنا القدوس، تو جس نے ایسا کیا اس نے نجات پائی اور جس نے اسے ترک کیا وہ ہلاک ہوا۔

[مسند شاشی، ۲/۲۶۲ رقم الحدیث ۸۳۷]

یہ حدیث پاک مسند شاشی کے علاوہ، امام نعیم بن حماد مروزی کی کتاب الفتن [۱/۲۲۸، رقم الحدیث ۶۳۸]
شیخ علاء الدین بن حسام الدین المتقی الہندی کی کنز العمال [۱۴/۵۶۹، رقم الحدیث ۳۹۶۲۷]
اور علامہ جلال الدین سیوطی کی جامع الاحادیث [۹۵/۳۷، رقم الحدیث ۴۰۱۱۰] میں بھی موجود ہے۔

بالجملہ: مذکورہ بالا واقعہ حدیث شریف سے ثابت ہے لہٰذا وہابیہ کا شور وغل مچانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔
نیز ہم یہاں یہ بھی باور کرا دیں کہ اس حدیث شریف کو موضوع و باطل اور من گھڑت کہنا بھی سراسر بے انصافی ہوگی۔
کیوں کہ یہ حدیث اپنے رواۃ کے معیار کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ نا کہ موضوع و من گھڑت اور باطل۔
اور جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف حدیث حدیث ہی ہے اور باب فضائل، ترغیب اور ترہیب وغیرہ میں مقبول ہے۔

الحاصل:۔ حدیث پاک کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر اس سال یہ تینوں علامتیں پائی گئیں یعنی کثرت سے زلزلے اور کثرت سے اولے باری اور رمضان کی پندرہ کو جمعہ کا دن ہونا، تو اس سال بھی رمضان کی پندرہویں شب میں دھما کہ اور صبح کو چنگھاڑ والا واقعہ واقع ہو سکتا ہے۔ اللہ ہمیں اس سے نجات عطا فرمائے اور ہم سب اہل سنت کو اپنے حبیب پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طفیل اپنا حفظ وامان عطا فرمائے۔

آمین بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

فتوی ۱۲۸

رمضان کی مبارکباد دینا

مسئولہ: عبد الرحمن منشی، غازی آباد: ۹ر رمضان ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین درج ذیل مسئلہ میں
کہ لوگ رمضان آتے ہی مبارک باد دینا شروع کر دیتے ہیں ان کا یہ عمل شرعاً کیسا ہے؟ جواب دیں اور ثواب پائیں۔

الجواب

رمضان المبارک کی مبارکباد دینا جائز ہے۔ اوراس کی اصل حدیث میں ملتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''أتاكم رمضان شهر مبارك فرض الله عليكم صيامه، تفتح فيه أبواب السماء، وتغلق فيه أبواب الجحيم، وتغل فيه مردة الشياطين، لله فيه ليلة خير من ألف شهر من حرم خيرها فقد حرم''

یعنی تمہارے پاس رمضان کامبارک مہینہ آیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں تم پر روزے فرض کئے۔ اس مہینہ میں آسمان کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں۔ سرکش شیطانوں کو طوق پہنادئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

[سنن کبریٰ للنسائی: ج۳ص۹۶، فصل، فضل شہر رمضان]

اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری لکھتے ہیں:

''وظاهره الإخبار أي كثرخيره الحسي والمعنوي، كما هو مشاهد فيه، ويحتمل أن يكون دعاء أي جعله الله مباركا علينا وعليكم، وهو أصل في التهنئة المتعارفة في أول الشهور بالمباركة، ويؤيد الأول قوله - صلى الله عليه وسلم - اللهم بارك لنا في رجب وشعبان وبلغنا رمضان إذ فيه إيماء إلى أن رمضان من أصله مبارك فلا يحتاج إلى الدعاء ، فإنه تحصيل الحاصل، لكن قد يقال: لا مانع من قبول زيادة البركة''

یعنی اس حدیث سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس ماہ میں حسی اور معنوی طور پر بھلائی زیادہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اس کا مشاہد بھی ہے۔ اوراس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دعا ہے کہ اللہ ہمارے اور تمہارے لیے اس ماہ کو مبارک فرمائے۔ اور مہینوں کی ابتدا میں مروجہ تہنیت کے لیے یہ اصل ہے۔ پہلے قول کی تائید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ہوتی ہے کہ ''اے اللہ ہم پر رجب اور شعبان میں برکت نازل فرما اور ہمیں رمضان تک پہنچا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رمضان اپنے اصل کے اعتبار سے مبارک ہے وہ دعا کا محتاج نہیں۔ اس کے لیے دعا کرنا تحصیل حاصل ہے۔ البتہ کہا گیا ہے کہ برکت کی زیادتی کے قبولیت میں یہ مانع نہیں ہے۔ [مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح: کتاب الصوم، ج۴ص۳۹۴]

الحاوی للفتاوی میں ہے: ''أخرج الأصبهاني في الترغيب عن سلم ان الفارسي قال: (خطب رسول الله صلى الله عليه وسلم في آخر يوم من شعبان فقال: أيها الناس إنه قد أظلكم شهر عظيم، شهر مبارك، شهر فيه ليلة خير من ألف شهر)الحديث قال ابن رجب: هذا الحديث أصل في التهنئة بشهر رمضان''

یعنی اصبہانی نے ترغیب میں حضرت سلمان فارسی سے تخریج کی کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری دن فرمایا: اے لوگو! تم پر ماہ عظیم ماہ مبارک (رمضان المبارک) نے سایہ کیا۔ یہ ایسا مہینہ ہے جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ ابن رجب نے کہا کہ یہ حدیث رمضان کی مبارکباد دینے کے سلسلے میں اصل ہے۔

[الحاوی للفتاوی: ۱/ ۹۳]

الحاصل: رمضان المبارک کی مبارکباد دینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصل حدیث پاک سے نکلنے کے سبب اسے سنت کہا جاسکتا ہے۔

عالمہ عورت کا مائک میں قرآن شریف تلاوت کرنا یا تقریر کرنا کہ آواز مردوں تک جائے، جائز نہیں

فتوی ۱۲۹ مسئولہ: صفدر علی وجے نگر کاشی پور۔ ۲۹/ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں

کیا عالمہ عورت مائک میں تقریر کرسکتی ہے یا قرآن پاک کی تلاوت کرسکتی ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

عالمہ عورت اگر عورتوں کے درمیان تقریر یا قرآن سنانے کے لئے مائک کا استعمال کرے تو جائز ہے۔ لیکن مائک کی آواز اس قدر ہی ہو کہ بس عورتیں ہی سنیں غیر محرم مردوں کے کانوں تک آواز نہ پہنچے کیوں کہ عورت کی آواز عورت ہے۔ جس طرح عورت کو غیر محرم مردوں سے خود کو چھپانے کا حکم دیا گیا اسی طرح آواز کو بھی چھپانے کا حکم ہے۔

حضور اعلیٰ حضرت ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

"ناجائز ہے کہ عورت کی آواز بھی عورت ہے اور عورت کی خوش الحانی کہ اجنبی سے محل فتنہ ہے"

[فتاوی رضویہ قدیم، ۹/ ۱۲۲]

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"عورت کا خوش الحانی سے بآواز پڑھنا کہ نامحرموں کو اس کے نغمہ کی آواز جائے حرام ہے۔ نوازل امام فقیہ ابو اللیث میں ہے:

''نغمة المرأة عورة'' (عورت کی آواز عورت ہے) کافی امام ابو البرکات نسفی میں ہے:

''لاتلبی جهرالان صوتها عورة'' (عورت بلند آواز سے تلبیہ نہ پڑھے اس لیے کہ اس کی آواز عورت ہے)

امام ابو العباس قرطبی کی کتاب السماع پھر بحوالہ علامہ علی مقدسی امداد الفتاح علامہ شرنبلالی پھر ردالمحتار علامہ شامی میں ہے:

لانجیزلهن رفع اصواتهن ولا تمطیطها ولا تلیینها و تقطیعها لما فی ذٰلك من استمالة الرجال الیهن وتحریك الشهوات منهم، ومن هذا لم یجزان تؤذن المرأة

(یعنی عورتوں کو اپنی آوازیں بلند کرنا، انھیں لمبا اور دراز کرنا، ان میں نرم لہجہ اختیار کرنا اور ان میں تقطیع کرنا (یعنی کاٹ کاٹ کر تحلیل عروض کے مطابق) اشعار کی طرح آوازیں نکالنا، ہم ان سب کاموں کی عورتوں کو اجازت نہیں دیتے اس لئے کہ ان سب باتوں میں مردوں کا ان کی طرف مائل ہونا پایا جائے گا۔ اور ان مردوں میں جذبات شہوانی کی تحریک پیدا ہو گی۔ اس وجہ سے عورت کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اذان دے)" [فتاوی رضویہ، ۱۴۸/۹، ۱۴۷]

یہ حکم شرعی اس وقت ہے کہ عالمہ عورت نے جان بوجھ کر یہ جانتے ہوئے تقریر کے دوران مائک کا استعمال کیا ہو کہ مائک کی آواز مردوں کے کانوں تک جا رہی ہے۔ اور اگر اس عالمہ کو اس کا علم نہیں تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

فتوی ۱۳۰ غیر مقلدین کے ساتھ تعلقات اوران کی حمایت جرم ہے

مسئولہ: جعفر حسین موضع بابر کھیڑا یوایس نگر اترا کھنڈ۔ ۱۸/ربیع الغوث ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں

بستی میں ایک شخص غیر مقلد بنام اہلحدیث ہے۔ بستی اس کا بائکاٹ کرنا چاہتی ہے مگر کچھ خاندان والے جو اپنے آپ کو سنی صحیح العقیدہ کہلاتے ہیں وہ ہر طرح سے اہلحدیث کے ساتھ ہیں وہ بائکاٹ میں بستی کے ساتھ نہیں ایسے لوگوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب

غیر مقلدین اپنے عقائد کفریہ کے سبب گمراہ و مرتد ہیں۔ فتاوی رضویہ میں ہے:

"غیر مقلدین وہابیہ پر بوجوہ کثیرہ الزام کفر ہے" [فتاوی رضویہ جدید، ۲۴۹/۲۰]

لہٰذا ان کی حمایت کرنا ان کے ساتھ میل جول رکھنا ان سے تعلقات بنائے رکھنا ان کا ساتھ دینا اور مسئلہ شرعی پر عمل نہ کرنا یقینا بہت بڑا جرم ہے۔ غیر مقلدین مرتد گمراہ ظالم ہیں ایسے ظالموں کا ساتھ دینے والوں سے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"من مشى مع ظالم ليعينه وهو يعلم أنه ظالم، فقد خرج من الإسلام"

جو شخص جان بوجھ کر ظالم کی مدد کو چلا وہ اسلام سے نکل گیا۔ [المعجم الکبیر للطبرانی، ۲۲۷/۱]

شعب الایمان للبیہقی میں ہے:

"من مشى مع ظالم يقويه وهو يعلم أنه ظالم فقد خرج من الإسلام"

جس شخص نے ظالم کا ساتھ یہ جانتے ہوئے دیا کہ وہ ظالم ہے وہ اسلام سے نکل گیا [۱۲۶/۱۰]

علامہ مناوی شرح جامع صغیر میں اسلام سے نکلنے کا مطلب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"هذا مسوق للزجر والتهويل والتهديد أو المراد خرج عن طريقه المسلمين أو المراد إن استحل الظلم والمعاونة عليه"

یہ بیان روکنے ڈرانے دھمکانے کے لئے ہے یا اس سے مراد مسلمانوں کے طریقہ سے خارج ہونا ہے یا مراد یہ ہے اگر ظلم

کو حلال جانا اور اس پر مدد کی تو اسلام سے خارج ہو جائے گا۔[فیض القدیر، ۲۲۹/۶]

ملا علی قاری اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

''ای من کمال الایمان'' مطلب یہ کہ جس نے ظالم کا ساتھ دیا وہ اسلام سے نکل گیا یعنی اس کا ایمان کامل نہیں ہے۔

[مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح، باب الظلم،]

ایک اور حدیث پاک میں ظالم کی مدد کرنے والوں سے متعلق یوں ارشاد ہوا:

''من أعان ظالما بباطل ليدحض به حقا، فقد برء من ذمة الله و ذمة رسوله۔ صلى الله عليه وسلم''

جس نے ظالم کی باطل کے معاملہ میں مدد کی تاکہ باطل کے ذریعہ حق کو غلط ثابت کرے تو وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ سے بری ہے۔[مجمع الزوائد، ۲۰۵/۴]

فتاوی عالمگیری کتاب الشہادات میں ہے:

الاعانة على المعاصى والفجور والحث عليها من جملة الكبائر۔

گناہوں اور برائیوں پر مدد کرنا اور اکسانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔[جلد ۴۵۱/۳]

لہٰذا گاؤں والوں پر لازم ہے کہ اس گناہ کبیرہ کے مرتکب نہ بنیں۔ بلکہ فرمان الٰہی پر عمل کرتے ہوئے بدمذہبوں سے قطع تعلق کریں اللہ پاک فرماتا ہے:

وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ

اور جو کہیں تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آنے پر ظالموں کے پاس نہ بیٹھ۔[کنز الایمان پارہ ۲۸، سورہ انعام آیت ۶۸]

اور فرماتا ہے ''ولا تعاونوا على الاثم والعدوان'' گناہ اور زیادتی پر باہم مدد نہ دو۔[پارہ ۶ سورہ مائدہ آیت ۲]

اور اگر پھر بھی گاؤں والے حکم شرع پر عمل پیرا نہیں ہوتے تو پھر عذاب الٰہی کا انتظار کریں اللہ پاک فرماتا ہے:

''وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ''

اے مسلمانو! بدمذہبوں کی طرف نہ جھکو نہیں تو تم کو جہنم کی آگ چھوئے گی۔[پارہ ۱۲، سورہ ہود آیت ۱۱۳]

الحاصل: غیر مقلدین بدمذہب و بددین ہیں جو لوگ ان کی حمایت میں اہل سنت کی مخالفت کر رہے ہیں مجرم و سخت گنہگار ہیں۔ ان پر لازم ہے کہ فوراً ان وہابی بدمذہبوں سے دور ہو جائیں اور ان کے خلاف اہل سنت کا ساتھ دیں۔

ھٰذا ما عندی والعلم عند الله تعالىٰ و رسوله صلى الله عليه وسلم

فتوی ۱۳۱　زمین پر ناجائز قبضہ حرام ہے

مسئولہ: عابد حسین محلہ گنج کاشی پور۔ ۱۲؍رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں

زید نے بکر کی زمین پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے بکر نے وہ زمین ایک غیر مسلم سے خریدی تھی۔ زید کے پاس اس کی رجسٹری بھی

ہے، سرکاری طور پر وہ اس زمین کا مالک ہے۔ مگر زید نے اس زمین پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اور وہ زمین خالی کرنے تیار نہیں ہے ازروئے شرع زید کے بارے میں کیا حکم ہے بیان فرمائیں۔

الجواب

حدیث شریف میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''من اخذ من الارض شیئاً بغیرحقه خسف به یوم القیامة الیٰ سبع ارضین

یعنی جس شخص نے کسی کی تھوڑی سی زمین بھی ناحق لے لی قیامت کے دن زمین کے ساتویں طبقے تک دھنسایا جائے گا۔

[بخاری، کتاب المظالم، باب إثم من ظلم شیئا من الأرض]

اور فرمایا: ''من ظلم قید شبر من الأرض طوقه من سبع أرضین''

یعنی جس نے ظلما کسی کی زمین ہتھیائی تو اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔

[بخاری شریف، باب ائم من ظلم شیئا من الارض، کتاب، کتاب المظالم والغصب]

مزید فرمایا:

''أیما رجل ظلم شبرا من الأرض، کلفه الله أن یحفره حتی یبلغ سبع أرضین، ثم یطوقه یوم القیامة حتی یفصل بین الناس''

یعنی جو شخص ایک بالشت زمین ناحق لے لے اللہ تعالیٰ اسے تکلیف دے گا کہ اس زمین کو کھودے ساتویں طبقے کے آخر تک۔ پھر قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالے گا یہاں تک کہ تمام مخلوق کا حساب کتاب ختم ہو کر فیصلہ فرما دیا جائے۔

[صحیح ابن حبان، کتاب الغصب، ۵۶۸/۱۱]

ناحق زمین دبانے والے سے متعلق اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

''ذرا من دو من نہیں بیس پچیس ہی سیر مٹی کے ڈھیلے گلے میں باندھ کر گھڑی دو گھڑی لئے پھرلے۔ اس وقت قیاس کرے کہ اس ظلم شدید سے باز آنا آسان ہے یا زمین کے ساتویں طبقوں تک کھود کر قیامت کے دن تمام جہاں کا حساب پورا ہونے تک گلے میں، معاذاللہ یہ کروڑوں من کا طوق پڑنا اور ساتویں زمین تک دھنسا دیا جانا، والعیاذ باللہ تعالیٰ''

[فتاوی رضویہ قدیم، ۲۴۰/۸]

لہٰذا زید پر لازم وضروری ہے کہ فورا بکر کی زمین خالی کرے اور زید سے معذرت طلب کرے۔ اور خود کو عذاب الٰہی سے بچائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

زنا گناہ کبیرہ ہے بغیر ثبوت شرعی کسی کو زنا کا مرتکب قرار دینا حرام ہے

فتوی ۱۳۲ مسئولہ: محمد عادل رضا احمد نگر بلاسپور رامپور۔ ۲۳/ذوالقعدہ ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مندرجہ ذیل مسائل میں کہ

(۱) زنا کے ثبوت کا اسلامی طریقہ کیا ہے؟

(۲)امام صاحب پر زنا و چوری کی تہمت لگانا کیسا ہے؟
اور تہمت لگانے والے اور ان کی تائید و تصدیق کرنے والوں کا شرعی حکم کیا ہے؟
(۳)لوگوں کو بھڑکانے، جھوٹی افواہ پھیلانے والے، کسی امام کو امامت سے ہٹوانے کے لئے اس کی پیٹھ پیچھے برائی کرنے والوں کا شرعی حکم کیاہے؟
(۴)جن امام صاحب پر تہمت لگی ان کی امامت کا کیا حکم ہے؟
(۵)کیاہر قسم کا گناہ توبہ سے معاف ہو جاتا ہے؟؟
(۶)توبہ کا طریقہ کیاہے؟؟
قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔ آپکی بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب

(ا) زنا شرعاً اشد کبائر سے ہے۔ زنا کے مرتکب پر حد لازم ہے۔
جس طرح زنا جرم وگناہ ہے اسی طرح کسی کو بلا ثبوت شرعی زنا کا مرتکب قرار دینا بھی سخت گناہ اور حد شرعی قذف کا موجب ہے۔ زنا کے ثبوت کے لیے شرعاً دو طریقے ہیں۔
ایک یہ کہ کسی بھی شخص کو زنا کا مرتکب قرار دینے کے لیے چار عینی گواہ ہوں۔ اور وہ بھی اس طرح کہ چاروں گواہوں نے ایک وقت میں زانی وزانیہ کو اس حالت میں دیکھا ہو جیسے سرمہ دانی میں سلائی۔ دوسرا یہ کہ زانی ازخود اپنے گناہ کا اقرار کرلے۔ اور اگر اس ثبوت شرعی کے بغیر کسی نے کسی کو زنا کا مرتکب قرار دیا، زنا کی تہمت لگائی تو شرعاً وہ خود حد قذف کا مستحق ہو جائے گا۔
بدایۃ المبتدی میں ہے:
’’الزنا یثبت بالبینۃ والإقرار فالبینۃ أن تشہد أربعۃ من الشہود علی رجل أو امرأۃ بالزنا وأذا شہدوا یسألہم الإمام عن الزنا ما ہو وکیف ہو وأین زنی ومتی زنی وبمن زنی فإذا بینوا ذلک وقالوا رأیناہ وطئہا فی فرجہا کالمیل فی المکحلۃ وسأل القاضی عنہم فعدلوا فی السر والعلانیۃ حکم بشہادتہم والإقرار أن یقر البالغ العاقل علی نفسہ بالزنا أربع مرات فی أربعۃ مجالس من مجالس المقر کلما أقر ردہ القاضی فإذا تم إقرارہ أربع مرات سألہ عن الزنا ما ہو وکیف ہو وأین زنی وبمن زنی فإذا بین ذلک لزمہ الحد‘‘
یعنی زنا دلیل اور اقرار سے ثابت ہوتا ہے۔ دلیل یہ کہ چار گواہ کسی مرد یا عورت پر زنا کی گواہی دیں۔ اور جب وہ گواہی دیں تو ان سے قاضی زنا کے بابت معلوم کرے کہ زنا کیاہے؟ اور وہ کیسے ہوا؟ کہاں ہوا؟ کب ہوا؟ کس سے ہوا؟ تو جب وہ اس کو بیان کردیں اور کہیں کہ ہم نے مرد کو عورت کے ساتھ اس کے فرج میں وطی کرتے اس طرح دیکھا جیسے سرمہ دانی میں سلائی۔ اب قاضی ان کے بارے میں معلومات کرے پس اگر وہ خفیہ اور اعلانیہ طور پر عادل ثابت ہوں تو ان کی گواہی سے حکم

صادر کرے۔اوراقرار سے کہ بالغ عاقل اپنے آپ اپنے زنا کا اقرار کرے، چار مرتبہ چار مختلف مجالس میں۔اور جب جب وہ اقرار کرے قاضی اس کورد کر دے۔ البتہ جب اس کا اقرار چار مرتبہ پورا ہو جائے تو پھر قاضی اس سے زنا کے بارے میں معلوم کرے کہ وہ کیا ہے؟ اوروہ کیسے ہوا؟ کہاں ہوا؟ کس سے ہوا؟ تو اگر وہ بیان کر دے تو اس پر حد لازم ہو جائے گی۔"

[بدایۃ المبتدی، جلد ۱ ص ۱۰۴،

فتاوی عالمگیری میں بھی یہی لکھا ہے عبارت ملاحظہ ہو:

"ویثبت الزنا عند الحاکم ظاهرا بشهادة أربعة يشهدون عليه بلفظ الزنا لا بلفظ الوطء والجماع كذا في التبيين.إذا شهد أربعة على رجل بالزنا في مجلس واحد فالقاضي يسألهم عن الزنا ما هو، وأين يزني، فإذا بينوا ما هو زنا حقيقة وقالوا: رأيناه أدخل كالميل في المكحلة. الآن يسألهم عن كيفية الزنا ثم إذا بينوا كيفية الزنا يسألهم عن الوقت، ثم إذا بينوا وقتا لا يصير العهد به متقادما يسألهم عن المزني بها، ثم يسألهم عن المكان ثم إذا بينوا المكان والقاضي يعرفهم بالعدالة يسأل المشهود عليه عن إحصانه فإن قال: أنا محصن.... يجب رجمه، وإن قال: أنا غير محصن. ولم يشهد الشهود على إحصانه جلد... ويثبت الزنا بإقراره كذا في البحر الرائق"

یعنی حاکم کے پاس زنا ظاہراً چار گواہوں کی گواہی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لفظ زنا سے نا کہ وطی اور جماع سے، گواہی دیں ایسا ہی تبیین میں ہے۔جب چار لوگ گواہی دیں کسی مرد پر زنا کی ایک ہی مجلس میں تو قاضی ان سے زنا کے بارے میں معلوم کرے کہ وہ کیا ہے؟ اور کہاں زنا ہوا؟ تو جب وہ زنا کی حقیقت کو بیان کر دیں اور کہیں کہ ہم نے دیکھا مرد کو کہ اس نے دخول کیا جیسے سرمہ دانی میں سلائی۔تو اب ان سے کیفیت زنا کی بابت دریافت کرے۔تو جب وہ زنا کی کیفیت بیان کر دیں تو ان سے وقت پوچھے تو جب وہ وقت بیان کریں جس کو زیادہ زمانہ نہ گزرا ہو، تو ان سے جس عورت کے ساتھ زنا ہوا اس کے بارے میں پوچھے پھر ان سے جگہ کے بارے میں معلوم کرے تو جب وہ جگہ بتا دیں اور قاضی ان کی عدالت کی پہچان کر لے پھر اس مرد سے جس پر گواہی دی گئی معلوم کرے کہ وہ محصن (شادی شدہ، بیوی سے دخول کرنے والا، پاک دامن) ہے یا نہیں؟
اگر وہ اقرار کرے کہ میں محصن ہوں تو اس پر رجم (یعنی سنگسار کرنا) واجب ہے۔اور اگر وہ کہے میں محصن نہیں اور اس پر گواہ بھی نہ ہوں تو اس کو کوڑے مارے جائیں۔اور زانی کے اقرار سے بھی زنا ثابت ہوتا ہے ایسا ہی بحر الرائق میں ہے۔"

[فتاوی عالمگیری، جلد ۲ ص ۱۴۳، کتاب الحدود، الباب الثانی فی الزنا]

مذکورہ بالا عبارات سے پتہ چلا کہ کسی کو زانی ثابت کرنے کے لیے اس شخص کا از خود زنا کا اقرار یا پھر چار عینی، عادل گواہوں کی گواہی لازم ہے۔

(۲) بغیر ثبوت شرعی کسی کو زنا کا مرتکب قرار دینے والے اور ان کی تائید و تصدیق کرنے والے شرعاً سخت مجرم و گنہگار قرار ہیں اور وہ حد شرعی قذف یعنی اسی اسی کوڑے کے مستحق ہیں۔اور یہ قرآنی فیصلہ ہے۔رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهٰدَةً اَبَدًا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔

اور جو پارسا عورتوں کو عیب لگائیں پھر چار گواہ معائنہ کے نہ لائیں تو انہیں اسّی کوڑے لگاؤ اور ان کی کوئی گواہی کبھی نہ مانو اور وہی فاسق ہیں۔[ترجمہ قرآن مع ترجمہ کنزالایمان، پارہ ۱۸، سورہ نور، آیت ۴]

اس آیت کے تحت صدرالافاضل فرماتے ہیں:

"اس آیت سے چند مسائل ثابت ہوئے۔

جو شخص کسی پارسا مرد یا عورت کو زنا کی تہمت لگائے اور اس پر چار معائنہ کے گواہ پیش نہ کر سکے تو اس پر حد واجب ہو جاتی ہے اسی ۸۰ کوڑے۔ آیت میں محصنات کا لفظ خصوصِ واقعہ کے سبب سے وارد ہوا یا اس لئے کہ عورتوں کو تہمت لگانا کثیر الوقوع ہے۔ اور ایسے لوگ جو زنا کی تہمت میں سزایاب ہوں اور ان پر حد جاری ہو چکی ہو مردود الشہادۃ ہو جاتے ہیں، کبھی ان کی گواہی مقبول نہیں ہوتی۔ پارسا سے مراد وہ ہیں جو مسلمان مکلّف آزاد اور زنا سے پاک ہوں۔

زنا کی شہادت کا نصاب چار گواہ ہیں۔ حدِ قذف مطالبہ پر مشروط ہے جس پر تہمت لگائی گئی ہے اگر وہ مطالبہ نہ کرے تو قاضی پر حد قائم کرنا لازم نہیں۔"[تفسیر خزائن العرفان، پارہ ۱۸، سورہ نور، آیت ۴]

دوسرے مقام پر یہ حکم ہوا:

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓىِٕكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ

اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے تو جب گواہ نہ لائے تو وہی اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔

[القرآن مع ترجمہ کنزالایمان،، پارہ ۱۸، سورہ نور، آیت ۱۳]

فتاوی عالمگیری میں ہے:

لا تقبل الشهادة على الزنا إلا شهادة أربعة أحرار مسلمين كذا في شرح الطحاوي. إن شهد على الزنا أقل من أربعة بأن شهد واحد أو اثنان أو ثلاثة لا تقبل الشهادة ويحد الشاهد حد القذف عند علمائنا - رحمهم الله تعالى''

یعنی زنا پر چار آزاد مسلمانوں کی گواہی مقبول ہے۔ ایسا ہی شرح طحاوی میں ہے۔ اگر چار گواہوں سے کم ایک یا دو یا تین گواہوں نے گواہی دی تو گواہی مقبول نہ ہوگی۔ اور گواہ پر ہمارے علما اللہ ان پر رحم فرمائے، کے نزدیک حد قذف واجب ہوگی۔

[فتاوی عالمگیری، جلد ۲ ص ۱۴۳، کتاب الحدود، الباب الخامس فی الشہادۃ علی الزنا والرجوع عنہا]

الغرض جو ثبوت شرعی کے برخلاف کسی پر زنا کی تہمت لگائے اس کے لیے شرعاً سزا حد قذف یعنی اسی کوڑے کی مار ہے۔ البتہ ہندوستان میں چونکہ حدود شرع پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا اس لیے امام صاحب پر زنا کا الزام لگانے والوں پر لازم ہے توبہ کریں اور امام صاحب سے معافی طلب کریں۔ ورنہ وہ سخت عذاب کے مستحق ہوں گے۔

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"سخت حرام قطعی گناہ کبیرہ ہے، ایسی تہمت رکھنے والا اللہ تعالیٰ کے بڑے عذاب کا مستحق ہوتا ہے، اللہ عزّوجل نے حکم فرمایا کہ ایسے شخصوں کو اسی کوڑے مارو۔ اور ان کی گواہی کبھی نہ سنو۔ اور وہ فاسق ہیں۔ یہاں کوڑے تو نہیں لگا سکتے لہذا اسی قدر

کریں کہ جب تک وہ تہمت رکھنے والا مجمع میں توبہ نہ کرے اور صاف صاف اس اپنی ناپاک گفتگو سے باز نہ آئے اس وقت تک مسلمان اس سے ملنا جلنا، اس کے پاس اٹھنا بیٹھنا، اس کی شادی بیاہ میں شریک ہونا، اپنی شادی بیاہ میں اسے شریک کرنا یک قلم چھوڑیں، کہ وہ اس تہمت کے اٹھانے سے ظالم ہے۔ اور ظالم کے پاس بیٹھنے کو قرآن مجید میں منع فرمایا۔

اور ایسی تہمت کا ثبوت کسی گواہی سے ہر گز نہیں ہو سکتا جب تک چار مرد نمازی پرہیز گار ثقہ متقی جو نہ کوئی گناہ کبیرہ کرتے ہوں نہ کسی گناہ صغیرہ پر اصرار رکھتے ہوں نہ کوئی بات خلافِ مروّت چھچھورے پن (جیسے سر بازار کھانا کھانا یا شارع عام پر سب کے سامنے پیشاب کرنا) کی کرتے ہوں، ایسے اعلیٰ درجہ کے متقی مہذب بالاتفاق ایک وقت ایک مکان میں اپنی آنکھ سے دیکھنا بیان کریں کہ ہم نے اس کا بدن اس کے بدن کے اندر خاص اس طرح دیکھا جیسے سرمہ دانی میں سلائی، اگر ان امور سے ایک بات بھی کم ہو گی مثلاً گواہ چار سے کم ہوں یا چوتھا شخص اس اعلیٰ درجہ کا نہ ہو یا ہوں تو سب اعلیٰ درجہ کے اور چار پانچ نہیں بلکہ دس بیس مگر ان میں مرد تین ہی ہوں باقی عورتیں یا کچھ گواہ آج کا واقعہ بیان کریں کچھ کل کا، یا کچھ کہیں ہم نے اس مکان میں دیکھا کچھ کہیں دوسرے میں، یا یہ سب باتیں جمع ہوں اور تین گواہ صاف صاف یہ بھی گواہی دے چکے ہوں کہ ہم نے اس کا ذکر اس کی فرج داخل میں اسی طرح دیکھا جیسے سرمہ دانی میں سلائی، مگر چوتھا اتنا کہے میں نے اس کا برہنہ ذکر اس کی برہنہ فرج کے منہ پر رکھا دیکھا مثلاً نصف حشفہ تک اندر کیا ہوا دیکھا، تو ان سب صورتوں میں یہ گواہیاں مردود اور وہ تہمت باطل اگرچہ اس قسم کی سو دو سو گواہیاں گزریں اصلاً ثبوت نہ ہو گا۔ بلکہ تہمت کرنے والے زنا کی گواہی دینے والے خود ہی سزا پائیں گے"

[فتاوی رضویہ جدید۔ج ۱۳ ص ۶۱۵، ۶۱۴]

حضور صدرالشریعہ فرماتے ہیں:

"قرآن کریم کے ارشادات سے معلوم ہوا کہ جب تک چار گواہ نہ پیش کرے اسی (۸۰) کوڑے کا مستحق ہے۔ لہٰذا صورت مستفسرہ میں یہ گواہ ضرور قاذف ہیں اور حد قذف کے مستحق۔ مگر حد زنا یا حد قذف قائم کرنا بادشاہ اسلام یا اس کے نائب کا کام ہے کما صرح بہ الامام صدرالشریعہ، اور جہاں نہ بادشاہ اسلام ہو نہ اس کا نائب وہاں حدود کون جاری کرے۔ بلکہ ہندوستان میں اگر کوئی ایسا کرے تو خود ماخوذ ہو۔ اور حکومت کی جانب سے سزا پائے۔"[فتاوی امجدیہ،ج ۲ ص ۳۲۰،]

مزید فرماتے ہیں:

"اب کہ حاکم شرع نہیں کہ حد حکم شرعی جاری کرے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایسے بے جا اور بے ثبوت لگانے والوں کی حسب مقدور پوری سزا کریں۔ اور جب تک توبہ نہ کریں اور اس شخص سے معافی نہ چاہیں ان کو بند کریں۔"

[مرجع سابق، ص ۳۲۲]

علاوہ ازیں امام صاحب پر چوری کا الزام لگایا گیا ہے تو اس کے لیے بھی دو ثبوتوں میں سے کسی ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔ یا تو چوری کرنے والا خود چوری کا اقرار کرلے۔ یا دو عادل گواہ اس کی چوری پر گواہی دے دیں۔

فتاوی عالمگیری میں ہے: ''السرقة إنما تظهر بأحد الأمرين إما بالبينة، أو بالإقرار''

چوری گواہ یا اقرار دونوں میں سے کسی ایک سے ثابت ہوتی ہے۔"[فتاوی عالمگیری، کتاب السرقۃ، ۱۷۱/۲]

اور بغیر ثبوت شرعی چوری کا الزام لگانا سخت حرام اور قابل تعزیر جرم ہے۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''من قذف مسلما..... یا سارق وھولیس بسارق..... عزر''

یعنی کسی نے کسی مسلمان کو چور کہاحالانکہ وہ چور نہیں ہے تو کہنے والا مستحق تعزیر ہو گا۔"

[مرجع سابق، الباب السابع فی حدالقذف والتعزیر، ص۱۶۸]

لہٰذا امام صاحب کو بغیر ثبوت شرعی چور بتانے والے سخت گنہگار ہیں۔ ان کو چاہئے کہ امام صاحب کی دل آزاری کی ہے ان سے معافی طلب کریں اور جن لوگوں کے سامنے امام صاحب پر الزام تراشیاں کی ہیں ان کے سامنے اپنی بات کی تکذیب بھی کریں نیز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کریں۔ ورنہ عذاب شدید کے مستحق ہوں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''من قال فی مؤمن مالیس فیه أسکنه الله ردغة الخبال حتی یخرج مما قال''

یعنی جس نے کسی مومن کے بارے میں کوئی ایسی بات کہی جو اس میں نہیں تھی تو اللہ اس کا ٹھکانہ جہنمیوں کی گندگیوں میں بنائے گا یہاں تک کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات سے توبہ کرے۔[سنن ابوداؤد، ۳۰۵/۳، کتاب الاقضیہ]

مزید ارشاد فرماتے ہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم:

''من آذی مسلما فقد آذانی ومن آذانی فقد آذی الله ومن آذی الله یوشك أن یهلکه''

یعنی جس نے کسی مسلمان کو تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ تعالیٰ کو تکلیف دی۔ جس نے اللہ تعالیٰ کو تکلیف دی تو اللہ عنقریب اسے ہلاک فرمائے گا۔[فیض القدیر، ۱۹/۶]

فتاوی شامی میں ہے:

''لو قال بهتانا فلا بد أیضا أن یرجع إلی من تکلم عندهم ویکذب نفسه''

اگر بہتان باندھا تو یہ بھی ضروری ہے کہ جن سے بات کی ان کے پاس جائے اور اپنی بات کی تکذیب کرے۔

[ردالمحتار، ۴۱۰/۶، کتاب الاقضیہ، فصل فی البیع۔]

حضور صدرالشریعہ فرماتے ہیں:

"بہتان کی صورت میں توبہ کرنا اور معافی مانگنا ضروری ہے بلکہ جن کے سامنے بہتان باندھا ہے ان کے پاس جاکر یہ کہنا ضرور ہے کہ میں نے جھوٹ کہا تھا جو فلاں پر میں نے بہتان باندھا تھا"[بہار شریعت حصہ ۱۶، ۵۳۸]

(۳) لوگوں کو بھڑکا کر، جھوٹی افواہوں سے اور امام صاحب کی غیبت کرکے امام صاحب کو امامت سے ہٹانے کا کام سخت گناہ اور باعث عذاب شدید ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ، فساد تو قتل سے بھی سخت ہے۔"[ترجمہ قرآن کنزالایمان پارہ ۲ سورہ بقرہ آیت ۲۷۲]

حدیث شریف میں ہے:

''إن أحبكم إلى الله عزوجل أحاسنكم أخلاقاً، وإن أبغضكم إلى الله عزوجل المشاؤون بالنميمة، المفرقون بين الإخوان''

اللہ تعالیٰ کو تم میں سے بہتر اخلاق والے پسند ہیں۔اور غیبت کرنے اور مسلمان بھائیوں کے درمیان تفریق کرنے والے ناپسند ہیں"

[الترغيب والترهيب لقوام السنة، ۲۴۲/۳]

دوسری حدیث پاک میں ہے:وَشِرَارُ عِبَادِ اللهِ الْمَشَّاؤُونَ بِالنَّمِيمَةِ، الْمُفَرِّقُونَ بَيْنَ الْأَحِبَّةِ

بدترین لوگ وہ ہیں جو غیبت کرتے ہیں اور احباب کے درمیان تفریق پیدا کرتے ہیں۔[مجمع الزوائد لهيثمي، ۹۳/۸]

(۴) جب امام صاحب پر کوئی جرم شرعاً ثابت نہ ہو، تو ان کی امامت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بلکہ اگر وہ شرعاً مجرم قرار نہ پائیں تو ان کو امامت سے معزول کرنا بھی جائز نہ ہو گا۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"اگر واقع میں امام اول نہ وہابی ہے نہ غیر مقلد نہ دیوبندی نہ کسی قسم کا بد مذہب، نہ اس کی طہارت یا قرآت یا اعمال وغیرہ کی وجہ سے کوئی وجہ کراہت، بلاوجہ اس کو معزول کرنا ممنوع ہے۔ حتی کہ حاکم شرع کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا۔ ردالمحتار میں ہے:

''ليس للقاضي عزل صاحب وظيفة بغير جنحة''یعنی بلاوجہ شرعی قاضی بھی امام کو معزول نہیں کر سکتا"

[فتاوى رضويه قديم، ۲۴۱/۳]

(۵) ہر گناہ توبہ سے معاف نہیں ہوتا۔ وہ گناہ جن کا تعلق بندوں سے ہے وہ بغیر ان کے معاف کئے صرف توبہ سے معاف نہیں ہوتے۔ درر الحکام میں ہے:

''كسائر حقوق الآدميين وكحد القذف لا يزول بالتوبة''

یعنی آدمیوں کے جملہ حقوق اور حد قذف توبہ سے ختم نہیں ہوتے۔"[درر الحكام شرح غرر الاحكام، ج ۱ ص ۳۰۰]

بحر الرائق میں ہے:

''حق تعلق به حق العبد فلا يسقط بالتوبة كسائر حقوق الآدميين وكحد القذف لا يزول بالتوبة''

وہ حق جس کا تعلق بندے سے متعلق ہے وہ توبہ سے ساقط نہیں ہوتے جیسے انسانوں کے جملہ حقوق اور حد قذف توبہ سے زائل نہیں ہوتے۔"[بحر الرائق، ۱۳۶/۵]

در مختار میں ہے:''حق عبد لا يزول بالتوبة''یعنی بندہ کا حق فقط توبہ سے ختم نہیں ہوتا۔"[الدر المختار، ۲۳۲/۴]

(۶) اور توبہ کے طریقہ کے حوالے سے اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"سچی توبہ اللہ عزوجل نے وہ نفیس شیء بنائی ہے کہ ہر گناہ کے ازالہ کو کافی ووافی ہے۔ کوئی گناہ ایسا نہیں کہ سچی توبہ کے بعد باقی رہے یہاں تک کہ شرک وکفر، سچی توبہ کے یہ معنی ہیں کہ گناہ پر اس لئے کہ وہ اس کے رب عزوجل کی نافرمانی تھی نادم وپریشان ہو کر فوراً چھوڑ دے اور آئندہ کبھی اس گناہ کے پاس نہ جانے کا سچے دل سے پورا عزم کرے، جو چارہ کار اس کی تلافی کا اپنے ہاتھ میں ہو بجالائے، مثلاً نماز روزے کے ترک یا غصب، سرقہ، رشوت، ربا سے توبہ کی تو صرف آئندہ کے لئے ان

جرائم کا چھوڑ دینا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو نماز روزے ناغہ کئے ان کی قضا کرے، جو مال جس جس سے چھینا، چرایا، رشوت، سود میں لیا انھیں اور وہ نہ رہے ہوں تو ان کے وارثوں کو واپس کر دے، یا معاف کرائے، پتانہ چلے تو اتنا مال تصدق کر دے اور دل میں نیت رکھے کہ وہ لوگ جب ملے اگر تصدق پر راضی نہ ہوئے اپنے پاس سے انھیں پھیر دوں گا۔ شرح فقہ اکبر میں ہے:

قد نصوا على ان اركان التوبة ثلثة الندامة على الماضي والاقلاع في الحال والعزم على عدم العود في الاستقبال هذا ان كانت التوبة فيما بينه وبين الله كشرب الخمر واما ان كانت هما فرط فيه من حقوق الله كصلوٰة وصيام وزكوٰة فتوبته ان يندم على تفريطه اولا ثم يعزم على ان لايعود ابداء ولو بتاخير صلاة عن وقتها ثم يقضى مافاته جميعا وان كانت مما يتعلق بالعباد فان كانت من مظالم الاموال فتتوقف صحة التوبة منها مع ماقدمناه في حقوق الله تعالىٰ على الخروج عن عهدة الاموال وارجاء الخصم بان يتحلل عنهم ايردها اليهم اوالى من يقوم مقامهم من وكيل او وارث وفي القنية رجل عليه ديون لاناس لايعرفهم من غصوب اومظالم اوجنايات يتصدق بقدرها على الفقراء على عزيمة القضاء ان وجدهم مع التوبة على الله تعالىٰ فيعذر انتهى وان كانت المظالم في الاعراض كالقذف والغيبة فيجب في التوبة فيها مع قدمناه في حقوق الله تعالىٰ ان يخبرا صحابها بما قال من ذٰلك ويتحلل منهم فان تعذر ذٰلك فليعزم على انه متى وجدهم تحلل منهم فان عجزبان كان ميتا فليستغفر الله والمرجو من فضله وكرمه ان يرضى خصمائه من خزائن احسانه فانه جواد كريم رؤف رحيم۔ اھ ملتقطا۔

اہل علم نے تصریح فرمائی ہے کہ توبہ کے ارکان تین ہیں۔

(۱) گزشتہ جرم پر ندامت یعنی نادم وشرمسار ہونا

(۲) موجودہ طرز عمل کو درست رکھنا اور گناہ کا ازالہ و بیخ کنی کرنا

(۳) آئندہ کے لئے گناہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرنا، یہ اس وقت کا کام ہے جبکہ توبہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہو، جیسے شراب نوشی، لیکن اگر اس نے حقوق اللہ میں کوتاہی کی اور ان سے توبہ کرنا چاہے جیسے نماز، روزے اور زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی میں غفلت اور کوتاہی کی تو اس کے لئے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کوتاہی پر نادم ہو پھر پختہ ارادہ کرے کہ آئندہ ان کی ادائیگی میں غفلت سے کام نہیں لے گا اور انھیں ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ پھر تمام ضائع کردہ حقوق کی قضا کرے اور اگر ضائع کردہ حقوق کا تعلق بندوں سے ہو تو صحت توبہ اس پر موقوف ہے جس کو ہم نے پہلے حقوق اللہ کے ضمن میں بیان کر دیا ہے کہ اس کی صورت میں اموال کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا اور مظلوم کو راضی کرنا ضروری ہے جن کا مال غصب کیا گیا، وہ انھیں واپس کیا جائے یا ان سے معاف کرایا جائے اور وہ متعلقہ افراد موجود اور بقید حیات نہ ہوں تو ان کے ورثاء متعلقین اور قائم مقام افراد و وکلاء کے ذریعے اموال کی واپسی اور معافی عمل میں لائی جائے، قنیہ میں ہے اگر کسی شخص پر لوگوں کے قرضہ جات مثلاً غصب، مظالم، اور جنایات کی قسم سے ہوں اور توبہ کرنے والا ان متعلقہ افراد کو نہیں جانتا پہچانتا تو اتنی مقدار فقراء ومساکین میں قضا کی نیت سے خیرات کر دے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنے کے باوجود اگر ان افراد کو کہیں پالے تو ان سے معذرت کرے (یعنی ان سے معافی مانگے) اگر مظالم کا تعلق عزت وغیرہ سے ہو جیسے کسی گمراہ کو گالی دینا، غیبت کرنا، تو ان

میں وجوب توبہ اس شرط سمیت جو ہم نے حقوق اللہ کے ضمن میں بیان کئے ہیں یہ ہے کہ جو کچھ اس نے ان کے بارے میں کہا انھیں اس جرم پر اطلاع دے اور ان سے معافی مانگے، اگر یہ مشکل ہو تو پختہ ارادہ کرلے کہ جب بھی انھیں پائے گا تو ضرور معذرت کرے گا، اگر اس طریقہ سے بھی عاجز ہو جائے یعنی مظلوم وفات پا گیا ہو تو پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگے، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے قوی امید ہے کہ وہ مظلوم مرحوم کو اپنے جو د واحسان کے خزانوں میں سے دے کر راضی کردے گا اور دونوں میں صلح کرادے گا کیوں کہ وہ بے حد سخی، کرم کرنے والا۔ انتہائی شفقت فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

[فتاوی رضویہ جدید، جلد ۲۱ ص ۱۲۲، ۱۲۱]

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب و رسولہ اعلم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

فتوی ۱۳۳ — داڑھی کی توہین بڑا جرم ہے

مسئولہ: وسیم احمد شیخ زادے گلڑیا کاشی پور۔ ۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ

زید نے بکر سے دوران گفتگو کہا کہ آپ کی داڑھی نہیں ہے آپ تو میری داڑھی کے بال کے برابر بھی نہیں ہیں تو بکر نے پلٹ کر جواب دیا کہ تمہاری داڑھی میرے جھانٹوں کے بال کے برابر نہیں ہے (معاذ اللہ) یہ جملہ بکر نے کئی بار بہت سے لوگوں کے سامنے کہا جب بکر سے کہا گیا کہ آپ نے داڑھی کے بارے میں ایسا کہا ہے تو بکر نے کہا کہ میں یہ بات اب بھی کہہ رہا ہوں۔ بکر کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ بیان فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

''جزوا الشوارب وارخوا اللحی خالفوا المجوس''

مونچھیں کترواؤ اور داڑھیاں بڑھنے دو آتش پرستوں کی مخالفت کرو۔ [صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ باب خصال الفطرۃ]

داڑھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت دائمی اور مسلمانوں کا شعار ہے اور از روئے شرع اسلامی شعار یا نبی کی سنت کے ساتھ استہزاء ناجائز وحرام بلکہ کفر ہے۔

بکر نے اگر سنت اور اسلامی شعار کے استہزاء وتوہین کی نیت سے یہ قبیح جملہ بولا ہے تو بلاشبہ بکر کافر ہو گیا۔ اس پر توبہ، تجدید ایمان، تجدید نکاح اور تجدید بیعت لازم وضروری ہے۔ اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"داڑھی کے ساتھ استہزاء بھی ضرور کفر ہے۔ زید کا ایمان زائل اور نکاح باطل اور عذر جہل غلط وعاطل کہ زید نہ کسی دور دراز پہاڑ کی تلی کا رہنے والا ہے نہ ابھی تازہ ہندو سے مسلمان ہوا ہے کہ اسے نہ معلوم ہو کہ داڑھی شعار اسلام ہے۔ اور شعار اسلام سے استہزاء اسلام سے استہزاء ہے" [فتاوی رضویہ جدید، ۲۱/۲۱۵]

اور اگر بکر نے زید سے بغض کے سبب یہ سخت جملہ بولا ہے اور اس کا مقصد نبی کی سنت یا اسلامی شعار کا مذاق اڑانا نہیں تھا تب

بھی بکر پر توبہ لازم وضروری ہے۔ نیز زید سے معافی بھی مانگنی لازم ہے۔شارح بخاری مفتی شریف الحق امجدی فرماتے ہیں:
"داڑھی کے لئے یہ گندے الفاظ اگر اس لئے استعمال کئے جائیں کہ یہ سنت رسول ہے یا اسلامی شعار ہے تو ضرور کفر ہے۔ لیکن یہاں قرائن اس پر شاہد ہیں کہ کہنے والے نے صرف اپنے مخاطب کی داڑھی کو کہا ہے .... عمر پر توبہ بھی فرض ہے اور زید سے معافی مانگنی بھی۔" مزید فرماتے ہیں:
داڑھی کی توہین اس نیت سے کرنا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اسلام کے شعار میں سے ہے تو کفر ہے۔ لیکن لڑائی جھگڑے میں پکڑ لینا، نوچ لینا یا داڑھی کو لے کر کوئی سخت کلمہ کہنا کفر نہیں حرام ضرور ہے"

[فتاوی شارح بخاری، ۳۵۸/۲،۳۵۷]

فتوی ۱۳۴ ذکر کی محفلوں میں خلاف شرع حرکات جائز نہیں

مسئولہ:(مولانا) محمد فخر عالم فیضی بسکھاروی۔۱۶صفر المظفر ۱۴۳۶ھ

کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ زید ذکر کی محفل کرتا ہے اور اس میں ایک دوسرے کو مارنا پیٹنا بھی جاری رکھتا ہے۔اور کبھی کبھی مسجد میں وہ اور اس کے احباب دوڑنے لگتے ہیں۔ابھی حال میں کسی مزار پر سے موم بتی لائی گئی ہے اب ذکر کے وقت اس کو جلاتے ہیں اور ایک آدمی اس موم بتی کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر سب کے ارد گرد گھومتا ہے، اور سب لوگ اس کی لو کو اپنے ہاتھ سے حرکت دے کر اپنے بدن پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ازروئے شرع یہ اعمال کیسے ہیں عربی عبارت کا ترجمہ بھی کر دیجئے گا جس سے لوگوں کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

الجواب

محفل ذکر اچھی بات ہے کار ثواب ہے۔ البتہ اس میں ایک دوسرے مسلمان کو مارنا پیٹنا غیر مناسب عمل ہے۔حدیث پاک میں ہے من آذی مسلما فقد آذانی، ومن آذانی فقد آذی اللہ۔
یعنی جس نے کسی مسلمان کو ناحق تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ کو ایذا دی۔

[المعجم الاوسط للطبرانی، ۶۰/۴]

یوں ہی مسجد اللہ کا گھر ہے اس کا ادب واحترام ہر حال میں لازم وضروری ہے اس میں دوڑ بھاگ کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے:
"وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا اُولٰٓىٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآىٕفِیْنَ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ"
اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لئے جانے سے اور ان کی ویرانی میں کوشش کرے ان کو نہ پہنچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب۔[ترجمہ کنز الایمان، پارہ ۱ سورہ بقرہ آیت ۱۱۴]

اور موم بتی والا عمل قدرے ہنود سے مشابہہ ہے اس لئے اس سے احتراز ضروری ہے۔ حدیث پاک میں آیا:
''من تشبہ بقوم فھومنھم''
یعنی جو شخص کسی قوم سے مشابہت رکھے وہ انہیں میں سے ہے۔[سنن ابو داؤد،۴/۴۴]۔
الحاصل: استفتاء میں ذکر کے علاوہ مذکورہ اعمال کسی بھی طرح اسلامی تعلیمات سے میل نہیں کھاتے ایسے اعمال کرنے والوں پر لازم ہے کہ توبہ کریں اور آئندہ مسجد میں اس طرح کے غیر شرعی اعمال کرنے سے باز آئیں۔
واللہ تعالیٰ اعلم و رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کے حوالے سے چند مسائل

فتوی ۱۳۵ مسئولہ: محمد معظم عارف قادری رضوی کولکاتا۔ ۱۲؍ صفر المظفر ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین ان مندرجہ ذیل سوالات کے بارے میں کہ
ایک گاؤں میں موئے مبارک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو رہی تھی۔ عوام اہل سنت پوری تعظیم اورادب کے ساتھ آکر زیارت کر رہے تھے۔اور نعت ودرود وسلام پڑھا جارہا تھا۔ اسی درمیان ایک عالم آکر اعلانیہ عوام کے بیچ میں موئے مبارک کے سامنے آکے موئے مبارک کی سند طلب کرتے ہیں اور عوام کو خطاب کرتے ہیں کہ میں موئے مبارک کی تحقیق کررہاہوں یہ غلط نکلاتو آپ سب گنہگار ہوں گے اورایمان بھی جاسکتاہے۔اس سے عوام میں ایک فتنہ پھیل گیااور موئے مبارک کے سامنے اس عالم نے حجت کی اور موئے مبارک کی کوئی تعظیم نہ کی۔ بلکہ حجت کے دوران اس نے موئے مبارک کو اپنے پیٹھ کے پیچھے بھی کیااور پورے ماحول کو بگاڑ دیا۔ اس کے کچھ دیر بعد اس نے اعلانیہ یہ بولا کہ میں نے سند مانگی تو سند نہیں دی گئی جب کہ سند ان کو پہلے ہی پڑھ کر سنائی گئی تھی اور سند ان کے ہاتھ میں دی گئی تھی۔
سوال یہ ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کی تعظیم کے لئے کیا تحقیق ضروری ہے؟
اور جو کچھ اس عالم دین نے کیا وہ شریعت کی روشنی میں کہاں تک درست ہے؟ اگر عالم صاحب شریعت اور تعلیمات اکابر اہل سنت کے خلاف ہیں تو ان پر کیا حکم ہوگا اور عوام کو ان کو اپنی دینی مجلسوں میں بلانا اوران سے رابطہ رکھنا کیسا ہوگا؟

الجواب

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہر چیز لائق تعظیم وتکریم ہے۔ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہر شی سے افضل واعلیٰ ہے اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب اشیا بھی ہر شی سے افضل واعلیٰ ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک یااور دیگر ماثر متبرکہ مقدسہ معظمہ مکرمہ مطہرہ کی تعظیم ہر مومن بندہ پر لازم وضروری ہے۔ کیوں کہ ان تبرکات کی تعظیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعظیم ہے۔اور مومن کے لئے یہ دنیاومافیھاسے زیادہ محبوب ہونا چاہئے۔ بخاری شریف میں امام ابن سیرین سے مروی کہ انہوں نے حضرت عبیدہ سے کہا کہ ہمارے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک ہے جو ہمیں حضرت انس یاان کے گھر والوں سے ملاہے تو حضرت عبیدہ نے فرمایا:

''لأن تكون عندی شعرة منه أحب إلی من الدنيا وما فيها
یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک مجھے دنیا اور دنیا کی ہر شی سے زیادہ محبوب ہے۔''

[كتاب الوضوء، باب الماء الذی يغسل به شعر الإنسان]

شفاشریف میں ہے:

''ومن إعظامه وإكباره إعظام جميع أسبابه، وإكرام مشاهده وأمكنته من مكة والمدينة، ومعاهده وما لمسه صلى الله عليه وسلم أو عرف به.
یعنی حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے تمام متعلقات کی تعظیم اور آپ کے نشانات اور مکہ مکرمہ ومدینہ منورہ کے مقامات اور آپ کے محسوسات اور آپ کی طرف منسوب ہونے کی شہرت والی اشیاء کا احترام یہ سب حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی تعظیم وتکریم ہے۔'' [شفاشریف، ج ۲ ص ۲۶، الباب الثالث فی تعظیم أمره ووجوب توقيره وبره، الفصل السابع إعزاز ماله من صلة بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم من امكنة ومشاهد]

ملاعلی قاری اس عبارت کی شرح کرتے ہوے فرماتے ہیں:

''المراد جميع ما ينسب إليه ويعرف به صلى الله عليه وسلم
یعنی مراد اس سے وہ تمام اشیاہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اور آپ سے پہچانی جاتی ہوں۔

[شرح الشفا لملا علی قاری، ج ۲ ص ۹۸]

لب لباب یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کوئی بھی چیز ہو موجب تعظیم وتکریم ہے۔ اس کے لئے کسی سند کی ضرورت نہیں ہے بلکہ شہرت ہی کافی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی عالم صاحب کا سند طلب کرنا اور یہ کہنا کہ میں اس کی تحقیق کررہاہوں عالم صاحب کی جہالت کی طرف اشارہ کررہاہے۔ ان کو معلوم ہوناچاہئے کہ
مسلمانوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پاک کی نسبت سے موئے مبارک یاکسی اور شی کامشہور ہوناکافی ہوتاہے، اس کے لئے کسی سند کی ضرورت نہیں اور اس کی تحقیق بھی لازم وضروری نہیں ہے۔ بلکہ اس کی تحقیق کا بہانہ بناکر اس تبرک سے برکتیں حاصل نہ کرنا سخت محرومی وکم نصیبی ہے۔ اور بغیر تحقیق کے تحقیق کے نام پر لوگوں کی عقیدتوں کو مجروح کرکے ان کی دل آزاری نیز ان سے بدگمان ہوناخود ایک بہت بڑاگناہ ہے۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:
''فی الواقع آثار شریفہ حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے تبرک سلفاوخلفازمانہ اقدس حضور پرنور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے آج تک بلانکیر رائج ومعمول اور باجماع مسلمین مندوب ومحبوب بکثرت احادیث صحیحہ بخاری ومسلم وغیرہماصحاح وسنن وکتب حدیث اس پر ناطق۔ جن میں بعض کی تفصیل فقیر نے کتاب البارقة الشارقة علی مارقة الشارقة میں ذکر کی۔ اور ایسی جگہ ثبوت یقینی یاسند محدثانہ کی اصلاحاجت نہیں۔ اس کی تحقیق وتنقیح کے پیچھے پڑنا اور بغیر اس کے تعظیم وتبرک سے بازرہنا سخت محرومی کم نصیبی ہے۔ ائمہ دین نے صرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے اس شے کامعروف ہوناکافی سمجھاہے۔'' [فتاوی رضویہ جدید ج ۲۱ ص ۴۱۲]

اور فرماتے ہیں:

"اور اس سے اجل واعظم وارفع واکرم حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کا موئے مطہر ہے۔ مسلمانوں کا ایمان گواہ ہے کہ ہفت آسمان وزمین ہرگز اس ایک موئے مبارک کی عظمت کو نہیں پہنچتے۔ اور ابھی تصریحات ائمہ سے معلوم ہولیا کہ تعظیم کے لئے نہ یقین درکار ہے نہ کوئی خاص سند بلکہ صرف نام پاک سے اس شے کا اشتہار کافی ہے۔ ایسی جگہ بے ادراک سند تعظیم سے باز نہ رہے گا مگر بیمار دل پر ازار دل جس میں نہ عظمت شان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بروجہ کافی نہ ایمان کامل اللہ عزوجل فرماتا ہے:

"ان يك كاذبا فعليه كذبه وان يك صادقا يصبكم بعض الذي يعدكم۔ اگر یہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اس پر، اور اگر سچا ہے تو تمھیں پہنچ جائیں گے بعض وہ عذاب جن کا وہ تمھیں وعدہ فرماتا ہے۔ اور خصوصا جہاں سند بھی موجود ہو پھر تو تعظیم واعزاز وتکریم سے باز نہیں رہ سکتا مگر کوئی کھلا کافر یا چھپا منافق" [مرجع سابق ص ۴۱۵]

الحاصل: عالم صاحب کا اس طرح لوگوں کو موے مبارک کی زیارت وتعظیم سے باز رکھنا اور خود باز رہنا یقینا بڑا جرم ہے۔

اولا تو اس مقدس موئے مبارک کی سند موجود ہے اور اگر سند نہ بھی ہوتی تب بھی مسلمانوں کے درمیان اس کی شہرت ہی کافی تھی۔ پھر بھی عالم صاحب نے اس طرح تحقیق کا بہانہ بناکر نہ خود موئے مبارک کی تعظیم وتکریم کرکے فیوض وبرکات حاصل کئے اور نہ ہی عوام اہل سنت کو اس سے صحیح طور مستفیض ہونے دیا۔ عالم صاحب پر لازم ہے کہ توبہ کریں اور آئندہ ایسی حرکات شنیعہ سے باز رہیں۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ خاص موئے مبارک کی توہین کا ارادہ نہ ہو صورت استفتا سے یہی ظاہر ہے۔

اور اگر خاص موئے مبارک کی توہین کا ارادہ تھا تو توبہ کے ساتھ تجدید ایمان، تجدید نکاح، تجدید بیعت بھی لازم وضروری ہے۔ کیوں کہ موئے مبارک کی توہین کفر ہے اور ایسے شخص پر جنت حرام ہے۔ امام فخر الدین رازی علیہ الرحمہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں: "من طعن في شعرة من شعراتك يكفر

جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کو مطعون کرے اس کی تکفیر کی جائے گی۔" [سورہ بینہ آیت ۶]

فتاوی قاضی خاں میں ہے:

"قال بعض العلماء لو قال لشعر النبي شعير فقد كفر وعن أبي حفص الكبير من عاب النبي بشعرة من شعراته الكريمة فقد كفر۔

بعض علمانے فرمایا کہ اگر نبی کے موئے مبارک کو شعیر تصغیر کے ساتھ کہا تو کافر ہو گیا۔ اور ابو حفص کبیر سے مروی کہ جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں میں ایک بال کی بھی توہین کی تو وہ کافر ہو گیا۔" [فتاوی قاضی خاں جلد ۴ ص ۲۰۳]

حدیث شریف میں ہے "من آذى شعرة من شعري فالجنة عليه حرام"

یعنی جس نے میرے موے مبارک کو تکلیف دی اس پر جنت حرام ہے۔ [کنز العمال]

ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

ساز والی نعتیں پڑھنا اور سننا جائز نہیں
گالی کسی کو بھی دینا جائز نہیں

فتوی ۱۳۶

مسئولہ: صفدر علی محلہ وجے نگر کاشی پور۔ ۷ار ربیع النور ۱۴۳۵ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں

کہ جلوس محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں زید نے بکر سے پوچھا کہ یہ نعت جو چل رہی ہے کہ سونڑا آیا یہ کسی مولانا نے ہی تو لکھی ہو گی یا پڑی ہو گی تو اس پر زید نے جواب دیا کہ ہری پگڑی والوں نے گانڈ مرائی ہے۔ پھر پوچھا کہ ہری پگڑی تو اوروں نے بھی باندھ رکھی ہے تو زید نے جواب دیا کہ دعوت اسلامی والوں نے تو زید کا نعت لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو یا دعوت اسلامی والوں کے لئے اس طرح کا جملہ بولنا جبکہ زید امام بھی ہے اور نماز بھی پڑھاتا ہے۔ لہٰذا حضرت سے گزارش ہے کہ جواب عنایت فرمائیں کہ زید کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ اور ایسا کہنے والے مسلمان کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟

قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں اور عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہوں فقط۔

الجواب

صورت مسئولہ میں جس نعت کا ذکر کیا گیا ہے 'سونڑا آیا' یہ نعت ساز نما انداز میں پڑھی گئی ہے اور باتفاق علما اس طرح نعت وغیرہ پڑھنا ناجائز ہے۔ دف یا سارنگی کی آواز کے ساتھ قرآن، نعت وغیرہ پڑھنے کو علما نے سخت حرام لکھا ہے۔ بلکہ ملا علی قاری نے تو کفر تک لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

''من قرء القرآن علی ضرب الدف والقضیب یکفر قلت ویقرب منه ضرب الدف والقضیب مع ذکر اللہ تعالیٰ ونعت المصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم''

یعنی جس نے دف اور بانسری پر قرآن پڑھا وہ کافر ہے۔ اور میں کہوں گا کہ اسی کے قریب اس کا بھی حکم ہے جو اللہ تعالیٰ کا ذکر اور نعت مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دف اور بانسری کے ساتھ کرے۔

[شرح فقہ اکبر فصل فی القراءۃ والصلاۃ، ص ۲۵۰]

یہ نعت اگرچہ دف یا سارنگی کی ضرب پر نہیں پڑھی گئی مگر اس کے سننے پر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ اس میں دھن کا استعمال کیا گیا ہے، آلات لہو کا استعمال ہوا ہے۔ اسی سبب سے علما نے اس کو بھی ناجائز و حرام قرار دیا ہے۔ حضور تاج الشریعہ مفتی محمد اختر رضا خاں ازہری دامت برکاتہم القدسیہ اپنے ایک فتوی میں ساز نما انداز میں پڑھی جانے والی نعتوں کا حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آج کل ایک مخصوص قسم کے ذکر کا رواج عام ہو رہا ہے جس میں حلق سے ایک مخصوص آواز جو مشابہ دف ہے صاف سنی جاتی ہے بلکہ بیان کرنے والوں نے یہ بات بھی بیان کی ہے کہ مائک کو دونوں ہونٹوں کے درمیان یا بالکل قریب کر کے اس

طرح ذکر کرتے ہیں کہ مزامیر کے مثل آواز پیدا ہوتی ہے بارہا کیسٹ سنی گئی اور دف جیسی آواز صاف سنائی دی ....یہ لوگ بتکلف ایسی آوازیں جو مشابہ سازو مماثل دف ہوں نکالتے ہیں ....اگر یہ قصدا ہے تو تلہی ہے جو مطلقا حرام ہے اور اگر ایسی آواز منھ سے بلا قصد نکلتی ہے تو وہ صورت لہو کے مشابہ ہے لہٰذا اس سے بھی گریز چاہئے۔"[فتاوی نورانی:ص۸]

اور یہ نعت نہ کسی عالم نے لکھی ہے اور نہ پڑھی اور نہ اسے اس انداز میں پڑھنا کسی عالم کے نزدیک جائز ہے۔اور یہ حقیقت ہے کہ اس طریقہ سے نعتیں پڑھنے کا انداز دعوت اسلامی کے افراد نے ایجاد کیا ہے جو سراسر شریعت کے خلاف ہے۔

لیکن سوال میں درج گالی اگر واقعی زید نے دی ہے اور سائل اپنے قول میں سچا ہے تو زید کا اس طرح دعوت اسلامی والوں کو گالی دینا ازروئے شرع جائز نہیں۔اس لئے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق و گناہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''سباب المسلم فسق''،کسی مسلمان کو گالی دینا فسق ہے۔[صحیح البخاری کتاب الآداب باب ماینہی عن السباب]

لہٰذا زید پر لازم ہے کہ توبہ کرے اور آئندہ اس طرح کے نازیبا کلمات زبان پر نہ لائے۔اور اگر زید توبہ نہ کرے تو پھر اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا ازروئے شرع جائز نہیں ہے۔ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ۔

فتوی ۱۳۷ کسی پر بہتان تراشی جائز نہیں

مسئولہ: محمد فخر عالم فیضی بسکھاروی، مقیم حال فیجی۔۴؍رمضان المبارک ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان شرع متین کہ زاہدہ کا یہ کہنا کتنا صحیح کہ بکر کی بیوی عالیہ جادو کرتی ہے اور محمود کو جادو کے ذریعہ قتل کر رہی ہے۔اپنے دعوے میں وہ کہتی ہے کہ فلاں فلاں عالم اور پیر سے جب معلوم کیا کہ عالیہ کے بارے میں مجھے بتائیں کہ وہ کیسی ہے کیا وہ محمود کو بذریعہ جادو تکلیف دیتی ہے اس پر ان علما اور پیر نے اپنی طرف سے عالیہ کو جادوگر بتایا۔دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس کے بیان میں کتنی صداقت ہے کیا اس کے بیان پر یقین کیا جاسکتا ہے؟اگر نہیں تو اس کے بارے میں حکم شرع کیا ہے؟

علمائے کرام کا اس طرح کسی مومن یا مومنہ پر بہتان لگانا شرعا کیسا؟اور جن علما یا پیر نے اس طرح کی بات کی ہے ان کے بارے میں شرع کا کیا حکم ہے؟قران واحادیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں زاہدہ کا عالیہ پر جادو کرانے کا الزام لگانا اگر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ہے تب تو مسموع ہے،اور عالیہ مجرمہ وگنہگار ہے۔اور اگر زاہدہ بغیر ثبوت شرعی کے صرف کسی پیر یا مولانا کے کہنے کے سبب عالیہ پر جادو کرانے کا الزام لگا رہی ہے تو زاہدہ اور اس کے ساتھ وہ مولانا اور پیر سب کے سب مجرم وگنہگار ہیں۔کیوں کہ شریعت میں کسی مومن یا مومنہ پر الزام لگانا،بہتان باندھنا سخت حرام اور بڑا جرم ہے۔قرآن مقدس میں ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا

اور جو ایمان والے مردوں اور عورتوں کو بے کئے ستاتے ہیں انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ اپنے سر لیا۔

[ترجمہ کنز الایمان، سورہ احزاب پارہ ۲۸ آیت ۵۸]

حضرت ابوہریرہ سے مروی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''أتدرون ما الغيبة، قالوا: الله ورسوله أعلم، قال: ذكرك أخاك بما يكره قيل أفرأيت إن كان في أخي ما أقول، قال: إن كان فيه ما تقول، فقد اغتبته، وإن لم يكن فيه فقد بهته''

تمہیں معلوم ہے غیبت کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کی، اللہ ورسول خوب جانتے ہیں۔ ارشاد فرمایا: غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا اس چیز کے ساتھ ذکر کرے جو اسے بری لگے۔ کیا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ موجود ہو جو میں کہتا ہوں تو؟ فرمایا: "جو کچھ تم کہتے ہو، اگر اس میں موجود ہے تبھی تو غیبت ہے۔ اور اگر تم ایسی بات کہو جو اس میں نہ ہو تو یہ بہتان ہے۔

[صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والادب، باب تحریم الغیبة]

حضرت عبد اللہ ابن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''من قال في مؤمن ما ليس فيه أسكنه الله ردغة الخبال حتى يخرج مما قال''

جس نے کسی مومن کے بارے میں کوئی ایسی بات کہی جو اس میں نہیں تھی تو اللہ اس کا ٹھکانہ جہنمیوں کی گندگیوں میں بنائے گا یہاں تک کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات سے توبہ کرے۔ [سنن ابوداؤد، ۳/۳۰۵، کتاب الاقضیہ]

لہٰذا زاہدہ اور اس کے ساتھ ان مولانا اور پیر پر لازم ہے کہ فوراً توبہ کریں۔ اور زاہدہ کی دل آزاری کی ہے اسے تکلیف پہنچائی ہے اور کسی مومن و مومنہ کو تکلیف پہنچانا بھی ایک بڑا جرم ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''من آذى مسلما فقد آذاني ومن آذاني فقد آذى الله ومن آذى الله يوشك أن يهلكه''

جس نے کسی مسلمان کو تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ تعالیٰ کو تکلیف دی۔ جس نے اللہ تعالیٰ کو تکلیف دی تو اللہ عنقریب اسے ہلاک فرمائے گا۔ [فیض القدیر، ۶/۱۹]

اس لئے عالیہ سے معافی بھی مانگیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ جن کے سامنے بہتان تراشی کی ہے ان کے سامنے اعتراف جرم بھی لازم وضروری ہے۔ فتاوی شامی میں ہے:

''لو قال بهتانا فلا بد أيضا أن يرجع إلى من تكلم عندهم ويكذب نفسه''

اگر بہتان باندھا تو یہ بھی ضروری ہے کہ جن سے بات کی ان کے پاس جائے اور اپنی بات کی تکذیب کرے۔

[ردالمحتار، ۶/۴۱۰، کتاب الاقضیہ، فصل فی البیع۔]

حضور صدر الشریعہ فرماتے ہیں:

"بہتان کی صورت میں توبہ کرنا اور معافی مانگنا ضروری ہے بلکہ جن کے سامنے بہتان باندھا ہے ان کے پاس جا کر یہ کہنا ضرور ہے کہ میں نے جھوٹ کہا تھا جو فلاں پر میں نے بہتان باندھا تھا" [بہار شریعت حصہ ۱۶، ۵۳۸]

الحاصل: بغیر ثبوت شرعی کے عالیہ پر جادو کرانے کا الزام لگانے والے زاہدہ، مولانا، اور پیر سب مجرم وسخت گنہگار ہیں۔ ان پر توبہ واستغفار لازم ہے۔ اور عالیہ سے معافی طلب کرنا بھی ضروری ہے۔ ساتھ ہی جن جن لوگوں کے سامنے

عالیہ کی برائی کی ہے اوراس پر بہتان باندھا ہے ان سب کے سامنے اپنا جھوٹ بیان کرنااورعالیہ کی صفائی پیش کرنا بھی لازم ہے۔اوراگر ایسانہیں کرتے توعذاب الٰہی کاانتظار کریں۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ

بے شک تیرے رب کی گرفت بہت سخت ہے۔[ترجمہ کنزالایمان،سورہ بروج،پارہ ۳۰،آیت ۱۲]

ھٰذا ماعندی والعلم عنداللہ تعالیٰ

غیر عالم خود کو عالم بتائے، جھوٹ بولے، قوم میں انتشار پیدا کرے وہ کسی مذہبی عہدہ کا اہل نہیں ہے

فتوی ۱۳۸

مسئولہ: محمد رفیق خاں، محمد عارف، محمد فیضان، سانویر
ضلع اندور مدھیہ پردیش۔۲۶؍ شعبان المعظم ۱۴۳۹ھ

حضور مفتی صاحب قبلہ

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔اللہ سے دعاگو ہوں کہ اللہ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے آمین۔

حضور میرے کچھ سوالات ہیں قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرماکر اللہ کے یہاں اجر عظیم کے مستحق ہوں۔

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان ذوی الاحترام ایسے شخص کے بارے میں جو کہ غیر عالم ہے جیسا کہ تحقیق سے معلوم ہوا۔علاوہ ازیں وہ شخص ایک مدرسہ میں جاکر عالم کی نقلی سند بنوالایا ہے۔اور وہ شخص کھلم کھلا جھوٹ بھی بولتا ہے۔اور نقلی سند کے ذریعہ علمائے کرام اور علاقائی لوگوں کو فریب دے رہا ہے کہ میں عالم حافظ اور قاری ہوں۔

وہ اپنے فائدے کے لیے قوم کو لڑانا چاہتا ہے اوراس پر پولیس نے ایف آئی آر درج کرکے اس کو مجرم بھی قرار دیا ہے۔ایسا جھوٹا شخص جو عوام کو دھوکا دے رہا ہے اس کے بارے میں شریعت کیا حکم دیتی ہے۔لہٰذا گزارش ہے کہ شریعت کی روسے مفصل جواب عنایت فرمائیں۔تاکہ عوام کو مطلع کیا جاسکے۔

لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ

۱۔کیا ایسا شخص کسی مدرسے کا ناظم ہوسکتا ہے؟

۲۔کیا ایسے شخص کی امامت درست ہے؟

۳۔کیا ایسے شخص کو چندہ دینا درست ہے؟

۴۔کیا ایسا شخص کو قاضی بنانا صحیح ہے؟

۵۔کیا ایسے شخص کو اپنے نام کے آگے شہر قاضی لگانا درست ہے؟

۶۔اجرت نکاح کا پیسہ مسجد، مدرسہ، قبرستان ومجاور کو دینا درست ہے؟

قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔عین نوازش ہوگی۔

الجواب

شخص مذکور کے بارے میں جو باتیں درج کی گئی ہیں وہ اگر مبنی بر حقیقت ہیں تو پھر شخص مذکور از روے شرع فاسق و مجرم ہے۔
اس کا خود کو عالم کہنا جب کہ وہ عالم نہیں اور قاضی شہر کہلوانا یہ ایک بڑا جرم ہے۔
حضور اعلیٰ حضرت اسی طرح کے ایک جاہل نما عالم کا حکم بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:
”زید جاہل کا اپنے آپ کو مولوی صاحب کہنا دونا گناہ ہے کہ اس کے ساتھ جھوٹ اور جھوٹی تعریف کا پسند کرنا بھی شامل ہوا۔
قال اللہ عزوجل:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

[القرآن الکریم۔سورہ آل عمران آیت ۱۸۸]

(اللہ عزوجل نے فرمایا) ہر گز نہ جانیو تو انہیں جو اِتراتے ہیں اپنے کام پر اور دوست رکھتے ہیں اسے کہ تعریف کئے جائیں اس بات سے جو انہوں نے نہ کی تو ہر گز نہ جانیو انہیں عذاب سے پناہ کی جگہ میں اور اُن کے لئے دکھ کی مار ہے۔
معالم شریف میں عکرمہ تابعی شاگرد عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں منقول۔

يفرحون باضلالهم الناس وبنسبة الناس اياهم الى العلم وليسوا باهل العلم۔
خوش ہوتے ہیں لوگوں کو بہکانے اور اس پر کہ لوگ انہیں مولوی کہیں حالانکہ مولوی نہیں۔“

[فتاوی رضویہ قدیم جلد نہم نصف اول۔ص ۹۶]

اور رہا معاملہ جعلی سند حاصل کرنے کا تو سند سے کوئی عالم نہیں بنتا عالم ہونے کے لیے علم دین کا حصول لازم وضروری ہے سند نہیں۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:
”سند حاصل کرنا تو کچھ ضرور نہیں، ہاں باقاعدہ تعلیم پانا ضرور ہے مدرسہ میں ہو یا کسی عالم کے مکان پر، اور جس نے بے قاعدہ تعلیم پائی وہ جاہل محض سے بدتر، نیم ملا خطرۂ ایمان ہو گا۔“ [فتاوی رضویہ قدیم جلد نہم نصف دوم۔ص ۳۰۸]
الحاصل: شخص مذکور غیر عالم ہوتے ہوئے خود کو عالم کہنے اور جھوٹ بولنے کے سبب فاسق ہے۔ اور فاسق شرعاً امامت، منصب قضا وغیرہ کسی دینی عہدے کا اہل نہیں ہوتا بلکہ شرعاً وہ واجب الاہانت ہوتا ہے۔
تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق میں ہے:
”الفاسق..... وجب عليهم اهانته شرعاً“ یعنی لوگوں پر از روئے شرع فاسق کی توہین ضروری ہے۔

[۲/ ۱۵۷، باب الاحق بالامامۃ]

فتاوی شامی میں ہے:

”الفاسق فقد عللوا كراهة تقديمه بانه لايهتم بامردينه وبان فی تقديمه للامامة تعظيمه وقد وجب عليهم اهانته

شرعاً''
یعنی فاسق کو (امامت کے لئے) آگے بڑھانا مکروہ ہے۔ چونکہ وہ دینی معاملات کا اہتمام نہیں کرتا اس کو امامت کے لئے آگے بڑھانے میں اس کی تعظیم ہے حالانکہ مسلمانوں پر اس کی توہین شرعاً واجب ہے۔ [باب الامامة، ۲۹۹/۲]

امام طحطاوی فرماتے ہیں:

''إمامة الفاسق مكروهة تحريما''، یعنی فاسق کی امامت مکروہ تحریمی ہے۔ [۳۰۲، فصل فی بیان احق بالامامة]

اور فاسق کی امامت کے مکروہ تحریمی ہونے کی وجہ امداد الفتاح شرح نور الایضاح میں یہ بیان کی گئی ہے:

''كره إمامة الفاسق العالم لانه لايهتم لامردينه ولان في تقديمه للامامة تعظيمه وقدوجب إهانته شرعا''
یعنی فاسق عالم کی امامت مکروہ ہے اس لئے کہ وہ اپنے دینی معاملات کا اہتمام نہیں کرتا اور اس لئے کہ اس کو امامت کے لئے آگے بڑھانے میں اس کی تعظیم ہے حالانکہ از روئے شرع اس کی توہین واجب ہے۔

[ص ۳۴۲ فصل فی بیان احق بالامامة]

جھوٹے امام کی امامت کے متعلق حضور مفتی اعظم ہند فرماتے ہیں:

''وہ شخص اگر ایسا جھوٹا مشہور ہو چکا ہو علی الاعلان جھوٹ بولنے کا عادی ہو چکا ہو تو فاسق معلن ہے۔ اس کے پیچھے نماز گناہ ہے۔ اسے جب تک توبہ نہ کرے امام نہ بنایا جائے۔ [فتاوی مصطفویہ۔ص ۳۱۹]

بحر العلوم فرماتے ہیں:

''امام علی الاعلان جھوٹ بول کر فاسق ہو گیا جب تک وہ توبہ نہ کرے اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی اس کو امام بنانا گناہ اور بشرط استطاعت اسے امامت سے علیحدہ کرنا ضروری [فتاوی بحر العلوم ۴۲۶/۱]

لہٰذا شخص مذکور اپنی حرکات شنیعہ کے سبب سخت فاسق ہے۔ اس پر لازم ہے کہ اپنے گناہوں سے علی الاعلان توبہ کرے۔ اور جب تک وہ توبہ نہ کرے اس کو مدرسہ کا ناظم بنانا، امام بنانا، قاضی بنانا جائز نہیں۔ کیوں کہ اس میں اس کی تعظیم ہے اور فاسق کی تعظیم شرعاً جائز نہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ رہا اسے چندہ دینا تو وہ چندہ اگر مدرسہ کو جاتا ہے تو کوشش کی جائے کہ براہ راست مدرسہ کو چندہ دیا جائے۔ اور اگر یقین ہو کہ چندہ مدرسہ میں واقعی پہنچ جائے گا تو چندہ دینے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔ پھر بھی مدرسہ کے ذمہ داروں سے بات کر کے اس کو توبہ پر مجبور کیا جائے اور اگر توبہ نہ کرے تو اسے مدرسہ و مسجد سے بلکہ ہر معظم منصب سے ہٹانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

اور آخری سوال کا جواب یہ ہے کہ اجرت نکاح کی رقم نکاح خواں اس کی مرضی سے یا وہ جسے دے تب تو بلاشبہ مسجد، مدرسہ قبرستان وغیرہ میں لگائی جا سکتی ہے۔ ورنہ نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مسجد میں چپل پہن کر جانا، مسجد میں لوڈو کھیلنا، مسجد کا چندہ کھانا ناجائز و حرام ہے قرآن شریف، تراویح اور خطبہ نکاح سے متعلق مسائل

فتوی ۱۳۹ مسئولہ: صوفی محمد یامین قصبہ دتیانہ ضلع ہاپوڑ یوپی: ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۰ھ

باسمہ تعالیٰ: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و شرح متین مسئلہ ذیل کے بارے میں

(۱) جو امام جوتی چپل پہن کر سب جگہ گھومتا ہو یعنی بیت الخلا یا پیشاب گھر میں پہن کر جاتا ہو اور انہیں جوتیوں کو پہن کر مسجد کی چھت پر گھومتا ہو۔ منع کرنے پر سینہ زوری منہ زوری کرے مسجد کے اندر مقتدیوں کی نہ مانتا ہو کیا یہ جائز ہے؟

(۲) کلام پاک پڑھ کر ممبر رسول پر پہلی دوسری سیڑھی پر بغیر غلاف کے قرآن رکھنا جائز ہے؟

(۳) مسجد کی زمین پر نماز ہوتی ہو کیا اس زمین پر مدرسہ بنانا جائز ہے؟ کیا مسجد کی چٹائیوں کو مدرسہ میں استعمال کرنا جائز ہے؟

(۴) مسجد کے اندر طالب علم بچوں کا لوڈو گیند بلا، گلی ڈنڈا، کنچے کھیلنا جائز ہے؟

(۵) کلام پاک تراویح سنانے میں بغیر بسم اللہ کے شروع کرنا کیا جائز ہے؟

(۶) جو امام مسجد کے چندے کا اعلان کرے اور آنے والا امداد کا پیسہ امام کھائے کیا اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟

(۷) نکاح کا خطبہ بیٹھ کر پڑھنا درست ہے؟

الجواب

(۱) صورت مسئولہ میں امام مذکور مسجد کی بے ادبی کا مرتکب ہے۔ کیوں کہ نجاست آلود چپلیں پہن کر مسجد میں جانا مسجد کو آلودہ کرنا ہے اور یہ مسجد کی بے حرمتی و بے ادبی ہے۔ مسجد میں گندگی لے کر جانا شرعاً ناجائز ہے۔ بحر الرائق میں ہے: ''لا یجوز إدخال النجاسة المسجد''، یعنی مسجد میں نجاست کا داخل کرنا جائز نہیں ہے۔

[بحر الرائق شرح کنز الدقائق: ج۲ ص۳۷]

فتاوی عالمگیری میں مسجد کی پندرہ حرمتوں کا ذکر کیا گیا ہے اس میں ایک مسجد کو نجاست سے پاک رکھنا بھی ہے۔ عبارت یہ ہے:

''أن ینزهه عن النجاسات''، یعنی مسجد کو گندگی سے صاف رکھنا۔ [فتاوی عالمگیری: باب فی آداب المسجد والقبلہ، ج۵ ص۳۲۱]

اور خاص چپل پہن کر جانے کو بحر الرائق اور فتاوی شامی میں بے ادبی قرار دیا گیا ہے۔ بحر الرئق کی عبارت یہ ہے:

'' دخول المسجد متنعلا من سؤ الأدب''، یعنی مسجد میں چپل پہن کر جانا بے ادبی ہے۔ [نفس فتوی]

فتاوی شامی میں عمدۃ المفتی کے حوالے سے ہے: '' دخول المسجد متنعلا من سؤ الأدب''

یعنی مسجد میں چپل پہن کر داخل ہونا بے ادبی ہے۔ [رد المحتار علی الدر المختار: ج۱ ص۶۵۷، مطلب فی احکام المسجد]

فتاوی عالمگیری میں مسجد میں چپل پہن کر داخل ہونے کو مکروہ لکھا گیا ہے: '' دخول المسجد متنعلا مکروہ، کذا فی السراجیة''، یعنی مسجد میں چپل پہن کر داخل ہونا مکروہ ہے۔ ایسا ہی سراجیہ میں ہے۔ [نفس فتوی]

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”ولہٰذا ائمہ دین نے تصریح فرمائی کہ استعمال جوتیاں پہنے ہوئے مسجد جانا بے ادبی ومکروہ ہے“[فتاوی رضویہ جدید: ج۷ص۳۱۷]

امام مذکور اگر اس حرکت سے باز نہ آئے تو اسے امامت سے چھٹی دے دی جائے۔ شریعت کے معاملات میں لاپروا شخص کو امام بنانے کی شرعاً اجازت بھی نہیں ہے۔

(۲) ممبر پر اس طرح قرآن شریف رکھنا ناجائز تو نہیں البتہ اس میں بے ادبی کا احتمال ہے۔ اس لیے اس سے احتراز چاہئے۔

(۳) اگر زمین مسجد کے لیے وقف ہو چکی ہے تو اس میں مدرسہ نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ ہاں البتہ تمامیت مسجد سے قبل مسجد کے ساتھ مدرسہ جو عام طور پر ہوتا ہے وہ بنایا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ وہ مصالح مسجد کے زمرے میں شامل ہے۔ لیکن مسجد نہ بنا کر اس میں مدرسہ بنا دینا ہر گز جائز نہیں ہے کیوں کہ وقف جس مقصد کے لیے وقف ہو اس کے غیر سے اسے تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

ولا یجوز تغییر الوقف عن ھیئتہ فلا یجعل الدار بستانا ولا الخان حماما ولا الرباط دکانا‘‘

یعنی وقف کو اس کی ہیئت سے بدلنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا مکان کو باغ اور سرائے کو حمام اور اصطبل کو دکان نہیں بنایا جائے گا۔

[فتاوی عالمگیری، کتاب الوقف، جلد ۲ ص ۴۹۰]

فتاوی شامی میں ہے: ’’الواجب ابقاء الوقف علی ما کان علیہ دون زیادۃ‘‘ وقف کا باقی رکھنا بغیر کمی وزیادتی کے واجب ہے۔[ردالمحتار، کتاب الوقف، ج ۶ ص ۵۸۸]

اور مسجد کی چٹائیاں مسجد کے علاوہ مدرسہ یا کہیں اور استعمال کرنا ناجائز ہے۔

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت اسی طرح کے ایک جواب میں فرماتے ہیں :

”دونوں صورتیں حرام ہیں مسجد جب تک آباد ہے اس کا مال نہ کسی مدرسے میں صرف ہو سکتا ہے نہ دوسری مسجد میں، یہاں تک کہ اگر ایک مسجد میں سو چٹائیاں یا لوٹے حاجت سے زیادہ ہوں اور دوسری مسجد میں ایک بھی نہ ہو تو جائز نہیں کہ یہاں کی ایک چٹائی یا لوٹا دوسری مسجد میں دے دیں۔ درمختار میں ہے:

اتحد الواقف والجھۃ وقل مرسوم بعض الموقوف علیہ جائز للحاکم، ان یصرف عن فاضل الوقف الاخر الیہ لانھما حینئذ کشیء واحد وان اختلف احدھما بان بنی رجلان مسجدین او رجل مسجدا ومدرسۃ ووقف علیھما اوقافا لایجوز لہ ذلک۔

دو وقفوں کا واقف بھی ایک ہو اور ایک ہی چیز پر وقف ہوں، ان میں ایک کی آمدنی کم ہو جائے تو حاکم کو جائز ہے کہ دوسرے وقف کی بحث سے اس پر خرچ کرے اس لئے کہ اس حالت میں وہ دونوں گویا ایک ہی چیز ہیں، اور اگر واقف دو ہوں یا جدا جدا چیزوں پر وقف ہوں جیسے دو شخصوں نے دو مسجدیں بنائیں یا ایک شخص نے ایک مسجد اور ایک مدرسہ بنایا اور ان پر جائدادیں وقف کیں تو اب حاکم کو بھی جائز نہیں کہ ایک کا مال دوسرے میں صرف کرے۔

ردالمحتار میں ہے: المسجد لایجوز نقل مالہ الی مسجد اخر۔ جائز نہیں کہ ایک مسجد کا مال دوسری مسجد کو لے جائیں۔“

[فتاوی رضویہ جدید، ۲۸۱/۱۶]

(۴) لوڈو، کنچے اور دوسرے کھیل لھوولعب میں شامل ہیں۔ اور اس طرح کے سب کھیل مکروہ ہیں۔ امام اہل سنت فرماتے ہیں
”اسی طرح ہر کھیل اور عبث فعل جس میں نہ کوئی غرضِ دین نہ کوئی منفعتِ جائزہ دنیوی ہو سب مکروہ وبیجا ہیں کوئی کم کوئی زیادہ۔ درمختار میں ہے:

وکرہ کل لھولقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کل لھو المسلم حرام الاثلثۃ ملاعبتہ باھلہ وتادیبہ لفرسہ ومناضلتہ بقوسہ۔ ہر کھیل مکروہ ہے اس لئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: مسلمان کا ہر کھیل حرام ہے سوائے تین کے، خاوند کا اپنی اہلیہ سے کھیلنا، اپنے گھوڑے کو شائستگی سکھاتے ہوئے اس سے کھیلنا، اپنی کمان کے ساتھ تیر اندازی کرنا۔

ردالمحتار میں ہے:

کل لھو ای کل لعب وعبث فالثلثۃ بمعنی واحد کما فی شرح التاویلات

ہر لھو یعنی کھیل اور بے فائدہ کام۔ پس تینوں ہم معنٰی ہیں، جیسا کہ شرح تاویلات میں ہے“[فتاوی رضویہ جدید: ج ۲۴ ص ۷۸]

لہٰذا اس طرح کے کھیل کھیلنا اور وہ بھی مسجد میں ہر گز جائز نہیں ہے۔ ان طلبا کو اس حرکت شنیعہ سے سختی سے روکا جائے۔

(۵) تراویح ہو یا کوئی اور نماز اس میں سورہ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔ اور بعد فاتحہ اگر کوئی سورت ملائے تو پڑھنا مستحب ہے۔ اگر کسی نے بسم اللہ ترک کر دی تو کوئی حرج نہیں۔ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”سورہ فاتحہ کی ابتداء میں تو تسمیہ پڑھنا سنّت ہے اور بعد کو اگر سورت یا شروع سورت کی آیتیں ملائے تو ان سے پہلے تسمیہ پڑھنا مستحب ہے پڑھے تو اچھا نہ پڑھے تو حرج نہیں“[فتاوی رضویہ جدید: ج ۶ ص ۱۹۱]

(۶) مسجد کا چندہ نمازیوں نے مسجد کے لیے دیا ہے تو اسے مسجد میں ہی استعمال کرنا جائز ہے۔ اسے اپنے استعمال میں لانا بلاشبہ ناجائز وحرام ہے۔ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

چندہ کی رقم چندہ دہندگان کی ہے اس رقم کو ان کے مقصد کے علاوہ میں صرف کرنا یا خود رکھ لینا یا ان سے چھیننا ناجائز وحرام ہے قرآن پاک میں مسلمانوں کا مال ناحق کھانے سے رب نے منع فرمایا۔ رب فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبٰطِلِ

(اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھاؤ)[ترجمہ کنز الایمان، پارہ ۵ سورہ نساء آیت ۲۹]

(۷) نکاح کا خطبہ کھڑے ہو کر پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ البتہ بیٹھ کر بھی پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”اگرچہ خطبہ میں مطلقاً افضل قیام ہے کہ آواز بھی دور پہنچتی ہے اور باعث توجہ حاضرین بھی ہوتا ہے۔...... اور خطبہ نکاح نفل ہی ہے تو بیٹھ کر بھی مضائقہ نہیں“[فتاوی رضویہ جدید: ج ۱۱ ص ۲۲۲]

فتوی ۱۴۰ — نکاح کے نذرانہ پر نکاح پڑھانے والے کا حق ہے

مسئولہ: محمد نسیم خاں گرام اکبر آباد، تھانہ ٹانڈہ ضلع رام پور۔ ۲۸، جمادی الاولیٰ، ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں

ہمارے گاؤں میں ایک ہی مسجد تھی۔ ابھی چند دنوں قبل ایک اور مسجد گاؤں میں تعمیر ہو گئی ہے۔ اس نئی مسجد کے منتظمین کا کہنا ہے کہ پرانی مسجد کے امام صاحب جو بھی نکاح پڑھائیں گے اور اس کا جو بھی نذرانہ انہیں ملے گا یا جو بھی دولھا مسجد میں نفل پڑھنے آئے گا اور وہ امام صاحب کو نذرانہ پیش کرے گا اس میں سے آدھا نئی مسجد کے امام صاحب کو دینا ہو گا۔ حالانکہ اس بات سے لوگ متفق نہیں ہیں۔ شریعت کا اس تعلق سے کیا حکم ہے؟ بیان فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں نئی مسجد کے امام صاحب کو پرانی مسجد کے امام صاحب کے نکاح یا دولھا وغیرہ سے ملی ہوئی رقم سے کچھ لینے کی اجازت نہیں ہے۔ پرانی مسجد کے امام صاحب سے لوگ نکاح پڑھوا کر جو نذرانہ دیتے ہیں، یا مسجد میں دولھا کے ذریعہ جو نذرانہ انہیں ملتا ہے، وہ انہیں امام صاحب کا حق ہے۔ اس میں سے آدھے پیسے دوسرے امام صاحب کے لئے دینے کی شرط لگانا باطل ہے۔ نکاح لوگ جس سے چاہیں پڑھوائیں انہیں حق حاصل ہے۔ اور جو امام نکاح پڑھائے اس کے حق نکاح خوانی میں کسی ایسے کو جس نے نکاح پڑھایا ہی نہیں، شریک کرنا عقل وشرع دونوں کے خلاف ہے۔ حضور صدر الشریعہ فرماتے ہیں:

”نکاح خواں کو اجرت نکاح خوانی لینا جائز ہے۔ مگر اجرت اس وقت لے سکتا ہے جب اس نے نکاح پڑھایا بھی ہو ورنہ بغیر عمل گھر بیٹھے ہوئے اجرت ہر گز نہیں لے سکتا۔ بلکہ یہ بھی ضرور نہیں کہ یہی لوگوں کے نکاح پڑھائے۔ نکاح کرنے والوں کو اختیار ہے جس سے چاہیں پڑھوائیں۔ اور اگر اس قاضی نے جبراً اجرت لی تو گناہ وحرام ہو گا۔ قال اللہ تعالیٰ:

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ وَتُدْلُوا۟ بِهَآ إِلَى ٱلْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا۟ فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَٰلِ ٱلنَّاسِ بِٱلْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ

(اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لئے پہنچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر کھا لو جان بوجھ کر)“ [فتاوی امجدیہ، جلد ۳ صفحہ ۲۷۶]

الحاصل: نئی مسجد کے امام صاحب کا پرانی مسجد کے امام صاحب کے نکاح وغیرہ سے ملی رقم میں کوئی حق نہیں ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

فتوی ۱۴۱ — جن گن من ترانہ پڑھنے کا حکم

مسئولہ: محمد وصی خاں ازہری محلہ کٹورا تال کاشی پور۔ ۲۱/ ذوالقعدہ ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں

حکومت اترپردیش کی طرف سے مدارس اسلامیہ میں قومی ترانہ ”جن گن من ادھی نایک جے“ ہے کو ہی پڑھنے کا فرمان

جاری کیا گیا ہے۔ لیکن مرکز اہل سنت بریلی شریف سے قاضی شہر حضرت علامہ عسجد میاں صاحب قبلہ نے اخبارات کو دئے گئے اپنے بیان میں صاف طور پر اس کو خلاف شرع بتایا ہے اور مسلمانوں کو اسے نہ پڑھنے اور اس کی جگہ
''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' پڑھنے کی تاکید کی ہے۔
اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا حضور عسجد میاں کا یہ بیان لائق عمل ہے؟
کیا ہمیں جن گن من ترانہ نہیں پڑھنا چاہئے؟ برائے کرم جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب

مرکز اہل سنت بریلی شریف سے حضور عسجد میاں صاحب قبلہ کا بیان یقیناً لائق عمل ہے۔
ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے یہاں ہر مذہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ اور انہیں ان کے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کا مکمل حق حاصل ہے۔ ان کے مذہبی امور میں دخل اندازی کی قانونی طور پر قطعاً اجازت نہیں ہے۔ ہمارے علمائے اہل سنت کے نزدیک جن گن من ترانہ پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس میں شرعاً کئی خامیاں ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:
(۱) یہ ترانہ رویندر ناتھ ٹائیگور کا جارج پنجم کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔ اور جارج پنجم ایک انگریز کافر اور ظالم حاکم تھا۔
اور اسلام میں کسی کافر کی تعریف درکنار کسی فاسق وظالم خواہ مسلمان ہی ہو اس کی تعریف بھی ناجائز وحرام بلکہ بعض علماء کے نزدیک کفر تک قرار دی گئی ہے۔ حدیث پاک میں ہے:
''إذا مدح الفاسق غضب الرب تعالى، واهتزله العرش''
یعنی جب کسی فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ عزوجل غضب فرماتا ہے اور اس کی وجہ سے عرش الٰہی کانپ جاتا ہے۔
[شعب الایمان للبیہقی ج۴ ص ۲۳۱، باب فی حفظ اللسان]
حدیث مذکور کی تشریح میں ملا علی قاری رحمہ اللہ الباری رقم طراز ہیں:
''وقال الطيبي: اهتزاز العرش عبارة عن وقوع أمر عظيم وداهية دهياء; لأن فيه رضا بما فيه سخط الله وغضبه، بل يقرب أن يكون كفرا .... وإذا كان هذا حكم من مدح الفاسق، فكيف بمن مدح الظالم''
طیبی نے کہا عرش کا ہلنا کنایہ ہے بڑے واقعہ اور سخت مصیبت سے اس لئے کہ اس میں ایسی چیز سے راضی ہونا ہے جس میں اللہ کی ناراضگی اور اس کا غضب ہے بلکہ قریب ہے کہ وہ کفر ہو.... اور جب فاسق کی تعریف کرنے والے کا یہ حکم ہے تو پھر ظالم کی تعریف کرنے والے کا حکم کیسا ہو گا؟۔[مرقاۃ المفاتیح، کتاب الآداب، باب حفظ اللسان، ۸۹/۹]
شیخ محقق علی الاطلاق حضرت عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ القوی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:
''چوں مدح کردہ میشود در خشم می آید بروردکار تعالیٰ واہتزلہ العرش و می جنبد و می لرزد از جہت مدح فاسق عرش واہتز از عرش یا محمول بر ظاہر است یا کنایت است از وقوع امر عظیم زیرا کہ مدح فاسق راضی شد نست بچیزی کہ دروی ناخوشنودی وبے رضائے حق است تعالیٰ بلکہ نزدیک است کہ موجب کفر باشد''

یعنی جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اوراس کا عرش کانپ جاتا ہے۔ فاسق کی تعریف سے عرش کا ہلنا یا تو ظاہر پر محمول ہے یا یہ کسی بڑی بات کے واقع ہونے سے کنایہ ہے۔ اس لئے کہ فاسق کی تعریف پر راضی ہونا ایسی چیز ہے جس میں اللہ پاک کی عدم رضا اور ناراضگی ہے بلکہ قریب ہے کہ یہ موجب کفر ہو۔

[اشعۃ اللمعات فارسی، باب حفظ اللسان والغیبت ج ۴ ص ۴۴]

ملا علی قاری اور شیخ محقق کے نزدیک فاسق کی تعریف قریب الکفر ہے تو بھلا کافر کی تعظیم کیوں کر کفر نہ ہو گی۔

حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"کفار ومشرکین کی ایسی تعظیمیں کفر ہیں، ان کی جے پکارنا، ان کے مرنے یا جیل جانے پر ہڑتال اور اس پر وہ اصرار، اور جو مسلمان نہ مانے اس پر وہ ظلم واضرار کمال تعظیم کفار اور باعث دخول نار وغضبِ جبار، وحسب تصریحاتِ ائمہ موجب کفر و اکفار، فتاوٰی ظہیریہ واشباہ والنظائر وتنویر الابصار ودر مختار میں ہے:

لوسلم علی الذمی تبجیلا یکفر لان تبجیل الکافر کفر ''

(اگر کسی نے ذمی کو احتراماً سلام کہہ دیا تو یہ کفر ہے کیوں کہ کافر کی تعظیم کفر ہوتی ہے) فتاوی امام ظہیر الدین ومختصر علامہ زین مصری وشرح تنویر مدقق علائی میں ہے: لوقال لمجوسی یا استاذ تبجیلا کفر (اگر کسی نے مجوسی کو تعظیماً "یا استاد" کہا تو اس سے وہ کافر ہو جائے گا)" [فتاوی رضویہ قدیم ۶/ ۱۰]

(۲) رویندر ناتھ نے یہ ترانہ جارج پنجم کے لئے نہیں بلکہ اپنے معبودوں کے لئے لکھا تھا۔ تب بھی مسلمانوں کو اس کا پڑھنا حرام ہو گا کیوں کہ مسلمان صرف ایک خدا پر ایمان رکھتا ہے اور وہ بس اللہ کی ذات ہے۔ کسی اور مذہب کے معبود کی تعریف و تعظیم اسے دائرہ اسلام سے خارج کر دے گی۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"کفار کے مذہبی جذبات اور ان کے دیوتاؤں اور پیشواؤں کو عزت دینا صریح کلمہ کفر ہے"

[فتاوی رضویہ قدیم ۶/ ۱۲۶، ۱۲۵]

(۳) اگر کہا جائے کہ یہ ترانہ اللہ پاک ہی کے لئے لکھا گیا ہے۔ تب بھی اسے پڑھنے کی اجازت نہیں ہو گی کیوں کہ اس میں کئی ایسے جملے ہیں جو اللہ کی شان کے خلاف ہیں۔ خاص کر لفظ جے، کہ اس کا استعمال اغیار اپنے معبودوں کے لئے کرتے ہیں۔ یہ لفظ ان کا مذہبی شعار بن چکا ہے۔ اور جو لفظ کسی دوسرے مذہب کا شعار بن جائے اس کا استعمال معبود برحق کے لئے تو الگ بات کسی مسلمان کے لئے بھی جائز نہیں ہو گا۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

"جے جو کافر بولتے ہیں جیسے گاندھی وغیرہ کی یا عام ہنود کی، یہ بحکم فقہائے کرام کفر ہے، در مختار وغیرہ میں ہے:

تبجیل الکافر کفر ' (کافر کی تعظیم کفر ہے۔ یونہی جو نام کا مسلمان حد کفر تک پہنچ گیا ہو اس کی جے کا بھی یہی حکم ہے، اور مسلمان کی جے بولنا بھی منع ہے کہ کفار سے مشابہت ہے۔"

[فتاوی رضویہ جدید، ۱۵/ ۲۶۸]

مزید فرماتے ہیں:

”جے بولنا طریقہ کفار ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسلم فرماتے ہیں:
من تشبہ بقوم فھو منھم۔ جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کرلی وہ انہیں میں سے ہے۔ پھر اگر معبودان کفار کی جے ہے تو کفر ہے اور اگر کافروں کی ہے تو فقہائے کرام اسے بھی کفر فرماتے ہیں“ [فتاوی رضویہ جدید، ۶۷۵/۱۴]

اور فرماتے ہیں:

”حرام حرام سخت حرام، جے بولنا ہنود کا شعار ہے اور ہندو لیڈر کی جے پکارنا بحکم فقہائے کرام خود کفر ہے۔“

[فتاوی رضویہ جدید، ۶۸۰/۱۴]

شارح بخاری فرماتے ہیں:

یہ دونوں لفظ بولنا ہندؤں کا شعار ہے۔ یہ لفظ جب کوئی بولتا ہے تو اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ بولنے والا ہندو ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ اس قسم کے الفاظ استعمال کریں۔“ [فتاوی شارح بخاری، جلد ۲/۴۶۳]

الحاصل: ہندوستانی مسلمان وں پر غیر شرعی ترانہ کی پابندی مذہب میں بے جامداخلت ہے جس کی اجازت کسی بھی صورت میں نہیں دی جاسکتی۔ بریلی شریف سے اس تعلق سے جو قدم اٹھایا گیا ہے مسلمانوں کو چاہئے کہ کھل کر تائید کریں ورنہ وہ دن دور نہیں کہ مدارس اسلامیہ میں غیر مذہبی کفریہ رسمیں اور پوجا پاٹ وغیرہ کی بھی پابندی لازمی قرار دے دی جائے۔ مدارس اسلامیہ کے ذمہ دار حضرات اور دانشوران قوم بریلی شریف کی اس آواز سے آواز ملا کر اپنی مذہبی آزادی پر قدغن لگانے والوں کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے کی کوشش کریں اور مذہبی امور میں کسی طرح کی بھی مداخلت نہ برداشت کرنے کا پیغام عام کریں۔

علاوہ ازیں یوم آزادی کو مسلمان تزک واحتشام کے ساتھ منائیں۔ اپنا قومی سہ رنگی جھنڈا لہرائیں۔ مٹھائیاں تقسیم کریں۔ جائز قومی ترانے پڑھیں۔ شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنے وطن کی محبت کا اظہار کریں۔ جنگ آزادی میں قربان ہونے والوں کو یاد کریں۔ مسلم شہیدوں کو ایصال ثواب کریں۔ علامہ فضل حق خیر آبادی، علامہ کفایت اللہ کافی مرادآبادی، علامہ رضا علی خاں بریلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا عنایت کاکوروی اور دیگر علمائے اہل سنت قدست اسرارھم، کی انگریزوں کے خلاف وطن کی خاطر دی گئی قربانیوں کو اجاگر کریں۔ اور اللہ پاک کی بارگاہ میں دہشت گرد اور وطن دشمن طاقتوں کے شر سے وطن اور اہل وطن کی حفاظت کی دعا کریں۔ امن وآشتی اور پیار محبت کا پیغام عام کریں۔

ھٰذا ما عندی والعلم اتم عند اللہ تعالیٰ

فتوی ۱۴۲ — بھنوئیں تراشنے کا شرعی حکم

مسئولہ: نوشاد رضا برکاتی: بڑودرا گجرات۔ ۲۳؍محرم ۱۴۳۹ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں
آج کل عورتیں ابرو کے بال سیٹ کراتی ہیں دھاگہ وغیرہ سے ان بالوں کو اکھیڑا جاتا ہے، کیا شرعاً اس کی اجازت ہے۔

اگر شوہر کو خوش کرنے کے لئے ایسا کریں تو کیا کچھ گنجائش ہوگی۔ دلائل کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

حدیث شریف میں ہے:

’’رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لعن الله المتنمصات، الى آخر الحديث‘‘

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی لعنت بال اکھاڑنے والیوں پر۔[سنن نسائی]

فتاوی شامی میں ہے:

’’لعله محمول على ما إذا فعلته لتتزين للأجانب، وإلا فلو كان في وجهها شعرينفر زوجها عنها بسببه، ففي تحريم إزالته بعد، لأن الزينة للنساء مطلوبة للتحسين، إلا أن يحمل على ما لا ضرورة إليه لما في نتفه بالمنماص من الإيذاء وفي تبيين المحارم إزالة الشعر من الوجه حرام إلا إذا نبت للمرأة لحية أو شوارب فلا تحرم إزالته بل تستحب اهـ، وفي التتارخانية عن المضمرات: ولا بأس بأخذ الحاجبين وشعر وجهه ما لم يشبه المخنث اهـ ومثله في المجتبى‘‘

یعنی بال اکھاڑنے کی حرمت کا حکم شاید کہ غیر مردوں کے لیے زینت کے طور پر اکھاڑنے پر محمول ہے۔ ورنہ تو اگر عورت کے چہرہ پر بال ہوں جو شوہر کی نفرت کا موجب ہوں تو ان کے دور کرنے کی حرمت میں بُعد ہے۔ کیوں کہ عورتوں کے لیے زینت خوبصورتی کے لیے مطلوب ہے۔ البتہ اس کی حرمت کو بلاضرورت اکھاڑنے پر محمول کیا جائے، کیوں کہ آلہ سے اسے اکھاڑنے میں تکلیف ہے۔ اور تبیین المحارم میں ہے کہ چہرہ کے بال دور کرنا حرام ہے مگر جب کہ عورت کے داڑھی یا مونچھ نکل آئے تو اس کا دور کرنا حرام نہیں ہے بلکہ مستحب ہے۔

اور تتارخانیہ میں مضمرات کے حوالے سے ہے کہ بھنوؤں اور چہرہ کے بالوں کے چن لینے میں کوئی حرج نہیں جب کہ ہجڑے سے مشابہت نہ ہو۔ اور اسی کے مثل مجتبیٰ میں ہے۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

’’ولا بأس بأخذ الحاجبين وشعر وجهه ما لم يتشبه بالمخنث كذا في الينابيع.‘‘

بھنویں اور چہرے کے بال چن لینے میں کوئی حرج نہیں جب کہ ہجڑے سے مشابہت نہ ہو۔ ایسا ہی ینابیع میں ہے۔

حاشیہ طحطاوی میں ہے:

’’ولا بأس بأن يأخذ شعر الحاجبين وشعر وجهه ما لم يتشبه بالمخنثين ومثله في الينابيع والمضمرات‘‘

ابرو کے اور چہرے کے بال چن لینے میں کوئی حرج نہیں جب کہ ہجڑوں سے مشابہ نہ ہو۔ یوں ہی ینابیع اور مضمرات میں ہے۔

الحاصل: بھنوؤں کے بال بلاضرورت نوچنا شرعاً جائز نہیں۔ ہاں البتہ اگر بھنویں اس قدر گھنی ہو جائیں کہ شوہر انہیں ناپسند کرے یا ان بھنوؤں سے چہرہ کا حسن کم ہوتا محسوس ہو جو شوہر کے لیے موجب نفرت ہو تو انہیں بس بقدر ضرورت جس سے حسن میں اضافہ ہو اور شوہر کی دل جوئی کا سبب بنے تراشنے اور سیٹ کرانے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے۔ بشرطیکہ اس طرح کرنے میں ہجڑوں سے مشابہت نہ ہوتی ہو ورنہ اس کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔ ھٰذا ما عندی والعلم عند الله تعالیٰ۔

احکام وراثت

زندگی میں جائداد اولاد میں برابر برابر تقسیم کرنا چاہئے

فتوی ۱۴۳ مسئولہ: حافظ مستقیم، محلہ گنج چونا گلی کاشی پور۔ ۲۹؍ربیع النور، ۱۴۳۷ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین درج ذیل مسئلہ میں

زید کے چار لڑکے ہیں تو اپنی جائداد میں سے ان سب کو برابر حصہ دینا ہوگا یا جیسے چاہے کم زیادہ دے سکتا ہے شریعت کا کیا حکم ہے؟ آگاہ فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ سب کو برابر دیا جائے یہی بہتر ہے۔ ہاں اگر کوئی دینی فضیلت رکھتا ہو یا ماں باپ کا زیادہ فرماں بردار اور باادب ہو تو اسے زیادہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ سب کو چھوڑ کر بس ایک کو ہی دینا صحیح و نافذ ہو گا مگر ایسا کرنا گناہ ہے۔ فتاوی قاضی خاں میں ہے:

''اجمعوا علی ان لاباس بتفضیل بعض الاولاد علی البعض فی المحبة لان المحبة عمل القلب و ذلك غیر مقدور.... لو وهب رجل شيئا لأولاده في الصحة وأراد تفضيل البعض في ذلك على البعض لا رواية لهذا في الأصل عن أصحابنا، و روى عن أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - أنه لا بأس به إذا كان التفضيل لزيادة فضل في الدين، فإن كانا سواء يكره و روى المعلى عن أبي يوسف، رحمه الله تعالى - أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوى بينهم يعطى للابنة مثل ما يعطى للابن... رجل وهب فی صحته كل المال للولد جاز فی القضاء ويكون آثما فيما صنع''

یعنی محبت میں بعض اولاد کو بعض پر فضیلت دینے میں کوئی حرج نہ ہونے پر اجماع ہے، اس لئے کہ محبت دل کا معاملہ ہے اور اس پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ اگر کسی آدمی نے حالت صحت میں اپنی اولاد کو کچھ دیا اور بعض کو بعض سے زیادہ دینے کا ارادہ کیا اس سلسلہ میں ہمارے اصحاب سے اصل میں کوئی روایت نہیں ہے اور ابو حنیفہ اللہ ان پر رحم فرمائے، سے روایت کیا گیا کہ اگر یہ زیادتی دین میں فضیلت کے سبب ہو تو کوئی حرج نہیں ہے اور اگر وہ برابر ہوں تو زیادتی مکروہ ہے معلی نے ابو یوسف سے روایت کیا کہ بعض کو زیادہ دینے میں کوئی حرج نہیں جب کہ اس سے دوسرے کو نقصان پہنچانا مقصد نہ ہو اور اگر ضرر رسانی کا ارادہ ہو تو برابر برابر دے۔ نیز لڑکی کو لڑکے کے برابر دیا جائے، ایک شخص نے اپنی صحت میں تمام مال ایک ہی کو دے دیا تو قضاءً جائز ہے البتہ وہ ایسا کرنے کے سبب گنہگار ہو گا۔ [فتاوی قاضی خاں، فصل فی هبة الوالد لولده، ۱۸۹/۴]

فتاوی ہندیہ میں بھی ایسا ہی ہے۔

فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

''وان كان بعض اولاده مشتغلا بالعلم لا بالكسب فلا بأس بأن يفضله على غيره وعلى جواب المتاخرين لاباس بان يعطى من اولاده من كان متادباً''

یعنی اگر اولاد میں سے کوئی علم میں مشغول ہو نا کہ کمانے میں تو اسے اس کے ماسوا سے زیادہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے

اور متاخرین کے جواب کے مطابق باادب اولاد کو زیادہ دئے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

[فتاوی تاتارخانیہ، ج ۱۴ ص ۴۶۳، کتاب الھبۃ الفصل الھبۃ من الصغیر]

ردالمحتار میں ہے: ''التنصیف بین الذکر والأنثی أفضل''

یعنی مرد وعورت دونوں کو آدھا آدھا دینا افضل ہے۔ [ردالمحتار مع الدالمختار، کتاب الھبۃ، ۱۲/۲۰۷]

اعلی حضرت فرماتے ہیں:

''مذہب مختار پہ اولی تسویہ ہاں اگر بعض اولاد فضل دینی میں بعض سے زائد ہو تو اس کی ترجیح میں اصلا باک نہیں''

[فتاوی رضویہ قدیم، ۵۹/۸]

مزید فرماتے ہیں:

''نفاذ کے لئے اگر کوئی شخص غیر مجبور اپنی ساری جائداد اپنے ایک ہی بیٹے کو دیدیے اور باقی اولاد کو کچھ نہ دے تو یہ تصرف بھی قطعاً صحیح ونافذ ہے اگرچہ عند اللہ گنہگار ہوگا گنہگاری کو عدم نفاذ تصرف سے کچھ علاقہ نہیں'' [مرجع سابق، ص ۲۱]

الحاصل: اپنی زندگی میں اپنی جائداد اپنے سارے بچوں کو برابر دیناہی بہتر ہے۔ ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

زندگی میں لڑکے اور لڑکیوں میں جائداد برابر تقسیم کرنا چاہئے

فتوی ۱۴۴ مسئولہ: عبد المجید قاضی باغ کاشی پور۔ ۱۸ر رجب المرجب ۱۴۳۷ھ

میں عبد المجید بن عبد الحمید اپنی زمین کا بٹوارہ اپنے پانچ لڑکوں اور تین لڑکیوں میں کرنا چاہتا ہوں لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ شریعت کے مطابق جو طریقہ ہو اس کے حساب سے آپ بیان فرمادیں بہت مہربانی ہوگی۔

الجواب

شریعت کا حکم یہ ہے کہ جو شخص اپنی زمین وغیرہ جائداد اپنی زندگی میں بانٹے تو لڑکی اور لڑکے سب کو برابر برابر دے۔ کسی کو زیادہ کسی کو کم دینا یا بعض کو دینا اور بعض کو بالکل محروم کرنا ازروئے شرع منع ہے۔ ہاں اگر کوئی دینی فضیلت رکھتا ہو یا ماں باپ کا زیادہ فرمانبردار اور باادب ہو تو اسے زیادہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ سب کو چھوڑ کر بس ایک کو ہی دینا یا لڑکیوں کو چھوڑ کر صرف لڑکوں کو دینا صحیح ونافذ ہوگا مگر ایسا کرنا گناہ ہے۔

فتاوی قاضی خاں میں ہے:

''اجمعوا علی ان لاباس بتفضیل بعض الاولاد علی البعض فی المحبة لان المحبة عمل القلب وذلك غیر مقدور.... لو وهب رجل شيئا لأولاده في الصحة وأراد تفضيل البعض في ذلك على البعض لا رواية لهذا في الأصل عن أصحابنا، وروى عن أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - أنه لا بأس به إذا كان التفضيل لزيادة فضل في الدين، فإن كانا سواء يكره وروى المعلى عن أبي يوسف، رحمه الله تعالى - أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوى بينهم يعطي للابنة مثل ما يعطي للابن... رجل وهب في صحته كل المال للولد جاز في القضاء ويكون آثما فيما صنع''

یعنی محبت میں بعض اولاد کو بعض پر فضیلت دینے میں کوئی حرج نہ ہونے پر اجماع ہے، اس لئے کہ محبت دل کا معاملہ ہے اوراس پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ اگر کسی آدمی نے حالت صحت میں اپنی اولاد کو کچھ دیااور بعض کو بعض سے زیادہ دینے کاارادہ کیااس سلسلہ میں ہمارے اصحاب سے اصل میں کوئی روایت نہیں ہے اورابو حنیفہ اللہ ان پر رحم فرمائے، سے روایت کیا گیا کہ اگر یہ زیادتی دین میں فضیلت کے سبب ہوتو کوئی حرج نہیں ہے اوراگر وہ برابر ہوں توزیادتی مکروہ ہے۔ معلی نے ابویوسف سے روایت کیاکہ بعض کوزیادہ دینے میں کوئی حرج نہیں جب کہ اس سے دوسرے کونقصان پہنچانا مقصدنہ ہو۔اوراگر ضرر رسانی کاارادہ ہوتو برابر برابر دے۔ نیزلڑکی کولڑکے کے برابر دیاجائے، ایک شخص نے اپنی صحت میں تمام مال ایک ہی کودے دیاتو قضاءً جائزہے البتہ وہ ایسے کرنے کے سبب گنہگار ہوگا۔

[فتاوی قاضی خاں، فصل فی هبة، الوالدلولده، ۱۸۹/۴]

فتاوی ہندیہ میں بھی ایساہی ہے۔

ردالمحتار میں ہے ''التنصیف بین الذکر والأنثی أفضل''

یعنی مردوعورت دونوں کو آدھا آدھا دینا افضل ہے۔ [ردالمحتار مع الدالمختار، کتاب الهبة، ۲۰۷/۱۲]

حضور اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''زندگی میں جو اولاد پر تقسیم کی جائے اس میں بیٹا بیٹی دونوں برابر رکھے جاتے ہیں اکہرے دوہرے کا تفاوت بعد موت ہے''

[مرجع سابق، جلد ۱۰ ص ۳۹۵]

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: ''مذہب مختار پہ اولی تسویہ ہاں اگر بعض اولاد فضل دینی میں بعض سے زائد ہو تو اس کی ترجیح میں اصلاباک نہیں'' [فتاوی رضویه قدیم، ۵۹/۸]

مزید فرماتے ہیں ''نفاذ کے لئے اگر کوئی شخص غیر مجوراپنی ساری جائداداپنے ایک ہی بیٹے کو دیدے اور باقی اولاد کو کچھ نہ دے تو یہ تصرف بھی قطعاً صحیح ونافذ ہے اگرچہ عند اللہ گنہگار ہوگا گنہگاری کو عدم نفاذ تصرف سے کچھ علاقہ نہیں''

[مرجع سابق، ص ۶۱]

الحاصل: اپنی زندگی میں اپنی جائداد اپنے سارے بچوں کو برابر برابر دے یہی شریعت کا حکم ہے اور مومن کے لئے شریعت پر عمل کرنے ہی میں بھلائی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اولاد پر جائداد برابر برابر تقسیم کرنا چاہئے کسی ایک کو چھوڑ دینا جائز نہیں

فتوی ۱۴۵ مسئولہ: ناصر حسین منگلا روڈ گولر گھٹی رام نگر اتراکھنڈ۔ ۷/ محرم الحرام ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں

زید کے والد کے پاس ایک مکان ہے جس میں زید کے چھ بھائیوں کا حصہ ہے۔ لیکن والد صاحب اس میں زید کو حصہ نہیں دینا چاہتے اور صاف انکار کررہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ میں نے تیرا حصہ دے دیا ہے۔ جس مکان میں تو رہتا ہے۔ حالانکہ

زید جس مکان میں رہتاہے وہ مکان اس کی پھوپھی کا تھاجو کہ زید کی پھوپھی نے اپنی زندگی میں ہی زید کے نام کردیاتھا۔اورابھی بھی زید کے نام میں ہی ہے۔اورنام کرنے کی وجہ یہ تھی کہ زید نے اپنی پھوپھی کی تقریباً۱۵ر سال خدمت کی۔توانھوں نے وہ مکان اپنی خوشی سے زید کے نام کردیا۔لیکن زید کے والد نے ابھی تک اپنی جائداد سے زید کو کچھ نہیں دیا۔کیاوالد کی جوموجودہ جائداد ہے اس میں زید کا حصہ بنتاہے یانہیں؟

شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔اور عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب

اگر کوئی اپنی جائداداپنی زندگی میں اپنے بچوں کے درمیان تقسیم کرے توحکم شرع یہ ہے کہ برابربرابر تقسیم کرے کسی کوزیادہ دیناکسی کوکم دیناکسی کوبالکل ہی محروم کردینابیٹوں کودینابیٹیوں کوچھوڑدیناشریعت میں اس کی اجازت نہیں ہے۔

بخاری شریف میں نعمان بن بشیر سے مروی وہ فرماتے ہیں:

''أعطاني أبي عطية، فقالت عمرة بنت رواحة: لا أرضى حتى تشهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، فأتى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: إني أعطيت ابني من عمرة بنت رواحة عطية، فأمرتني أن أشهدك يا رسول الله، قال: أعطيت سائر ولدك مثل هذا، قال: لا، قال: فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم، قال: فرجع فرد عطيته''

میرے والد نے مجھ کوعطیہ دیاتوعمرہ بنت رواحہ نے کہاکہ میں راضی نہیں ہوں جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ نہ بنالیاجائے۔تووہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیاکہ میں نے اپنے عمرہ بنت رواحہ والے بیٹے کوایک عطیہ دیاہے انہوں نے مجھ سے آپ کو گواہ بنانے کو کہاہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاکہ کیاتم نے اپنی سب اولاد کواسی طرح دیاہے۔عرض کیا،نہیں۔توفرمایاصلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ سے ڈرواوراپنی اولاد کے درمیان انصاف کرو۔تووہ واپس ہوئے اوراپناعطیہ واپس لے لیا۔[بخاری شریف،باب الإشهاد في الهبة]

البتہ اولادمیں سے کوئی ایک دینی اعتبار سے زیادہ فضیلت رکھتاہویاماں باپ کازیادہ فرمانبردار ہوتواسے زیادہ دینے میں کوئی حرج نہیں لیکن سب کوچھوڑکربس ایک ہی کودینایاسب کودینامگرایک کوچھوڑدیناازروے شرع گناہ ہے۔

فتاوی قاضی خاں میں ہے:

''اجمعواعلی ان لاباس بتفضيل بعض الاولادعلى البعض في المحبة لان المحبة عمل القلب وذلك غيرمقدور.... لووهب رجل شيئا لأولاده في الصحة وأراد تفضيل البعض في ذلك على البعض لا رواية لهذا في الأصل عن أصحابنا، وروى عن أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - أنه لا بأس به إذا كان التفضيل لزيادة فضل في الدين، فإن كانا سواء يكره وروى المعلى عن أبي يوسف، رحمه الله تعالى - أنه لا بأس به إذا لم يقصد به الإضرار، وإن قصد به الإضرار سوى بينهم يعطي للابنة مثل ما يعطي للابن... رجل وهب في صحته كل المال للولد جاز في القضاء ويكون آثما فيما صنع''

یعنی محبت میں بعض اولاد کوبعض پرفضیلت دینے میں کوئی حرج نہ ہونے پراجماع ہے،اس لئے کہ محبت دل کامعاملہ ہے

اوراس پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ اگر کسی آدمی نے حالت صحت میں اپنی اولاد کو کچھ دیا اور بعض کو بعض سے زیادہ دینے کا ارادہ کیا اس سلسلہ میں ہمارے اصحاب سے اصل میں کوئی روایت نہیں ہے اور ابو حنیفہ اللہ ان پر رحم فرمائے، سے روایت کیا گیا کہ اگر یہ زیادتی دین میں فضیلت کے سبب ہو تو کوئی حرج نہیں ہے اور اگر وہ برابر ہوں تو زیادتی مکروہ ہے معلی نے ابو یوسف سے روایت کیا کہ بعض کو زیادہ دینے میں کوئی حرج نہیں جب کہ اس سے دوسرے کو نقصان پہنچانا مقصد نہ ہو اور اگر ضرر رسانی کا ارادہ ہو تو برابر برابر دے۔ نیز لڑکی کو لڑکے کے برابر دیا جائے، ایک شخص نے اپنی صحت میں تمام مال ایک ہی کو دے دیا تو قضاءً جائز ہے البتہ وہ ایسے کرنے کے سبب گنہگار ہوگا)[فتاوی قاضی خاں، فصل فی هبة، الوالدلولده، ۱۸۹/۴]

فتاوی ہندیہ میں بھی ایسا ہی ہے۔

اعلی حضرت فرماتے ہیں:

''نفاذ کے لئے اگر کوئی شخص غیر مجبور اپنی ساری جائداد اپنے ایک ہی بیٹے کو دیدے اور باقی اولاد کو کچھ نہ دے تو یہ تصرف بھی قطعاً صحیح ونافذ ہے اگرچہ عند اللہ گنہگار ہوگا گنہگاری کو عدم نفاذ تصرف سے کچھ علاقہ نہیں''[فتاوی رضویہ قدیم، ۲۱/۸]

الحاصل: اپنی زندگی میں اپنی جائداد اپنے سارے بچوں کو برابر دینا ہی حکم شرع ہے۔

رہا معاملہ پھوپھی کی جائداد کا تو اس کا والد کی جائداد سے کیا تعلق ہے، وہ زید کو اس کی پھوپھی نے خدمت گزاری سے خوش ہو کر دی ہے اس پر زید کا حق ہے۔ اس کا والد کے جائداد کے بٹوارے سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ لہٰذا زید کے والد کو چاہئے کہ وہ اپنے سارے بچوں کی طرح زید کو اس کا حصہ دیں تا کہ شرعی گرفت سے محفوظ، اور آخرت میں جواب دہی سے بچ جائیں۔

ھٰذا ماعندی والعلم عند اللہ تعالیٰ

شوہر نے جس زمین کا بیوی کو مالک بنادیا وہ بیوی کے انتقال کے بعد متوفیہ کے وارثین میں حساب شرع تقسیم ہوگی

فتوی ۱۴۶ مسئولہ: محمد کلام محلہ علی خاں کاشی پور۔ ۲۰؍ رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ

مفتی صاحب عرض یہ ہے کہ آپ کے پاس تین یا چار سوال پیش کئے جارہے ہیں ان سوالوں کے جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں دینے کی زحمت کریں۔

(۱) ایک شخص نے زمین خریدی اور رجسٹری اپنی بیوی کے نام کرائی ہاؤس ٹیکس بھی اسی عورت کے نام چلتا آرہا ہے اس لحاظ سے قانوناً تو زمین کا مالکانہ حق بیوی کو حاصل ہے اس بارے میں شریعت کیا کہتی ہے؟

(۲) اس بیوی سے تین بیٹیاں پیدا ہوئیں کچھ عرصہ بعد بیوی مر گئی بیٹیاں شادی شدہ ہیں ان کی ماں کو بھی مرے ہوئے ۳۵ سال ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں ان تین بیٹیوں کو شریعتاً مالکانہ حق حاصل ہے یا نہیں؟ اور کچھ عرصہ بعد اسی شخص نے دوسری شادی کی جو کہ وہ بھی تین بچوں کی ماں ہے نکاح کے وقت یہ بات طے ہوئی کہ ایک بچہ جو کہ نو ۹ مہینہ کا تھا جب یہ دوسال کا ہو جائے گا تو اسے واپس بھیج دیا جائے گا۔ حالات ایسے بنے کہ اس بچے کے دادا ختم ہو گئے تو اس بچہ کو نا تو کوئی لینے

آیا اور نا ہی واپس بھیجا گیا۔ بچہ پرورش پا کر تیس سال کا ہو گیا۔ ایسے حالات میں اس شخص کو جس کی پہلی بیوی کی تین بیٹیاں ہیں رجسٹری بھی انہیں بیٹیوں کی امی کے نام ہے۔ اب اس شخص کی دوسری بیوی بھی مر گئی دوسری بیوی کے نام اس شخص نے کچھ نہیں کیا کوئی پراپرٹی نہیں اس شخص کو اس بچے کے نام پہلی بیوی کی جو جائداد ہے اس میں سے کچھ بھی کرنے کے لئے حق حاصل ہے یا نہیں؟ ان سوالوں کے جواب اپنے پیڈ پر دیں آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔

الجواب

(۱) صورت مسئولہ میں اگر اس شخص نے زمین اپنی بیوی کے قبضہ میں دیدی تھی تو ازروئے شرع وہ زمین اس عورت کی ملکیت ہے جو اس کے انتقال کے بعد اس کے وارثین کو حسب فرائض تقسیم کی جائے گی۔ حضور اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

”پہلی عورت کا مہر اور وہ زمین کہ اس کے نام کر دی تھی جبکہ اسے پورا قبضہ دے دیا ہو اور وہ عملہ بھی جبکہ اسی کے لئے بنا ہو اس عورت کے وارثوں کا ہے جن میں شوہر بھی اور عورت کے پسر و دختر، اور اگر مادر پدر ہوں تو وہ بھی“

[فتاوی رضویہ قدیم، ۱۱۹/۸]

اور صرف رجسٹری کرانے اور ہاؤس ٹیکس اس کے نام ہو جانے سے ازروئے شرع ملکیت ثابت نہیں ہو گی۔ جب تک کہ عورت نے اس پر قبضہ نہ کیا ہو۔ اعلیٰ حضرت اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

”تمامی ہبہ کے لئے واہب کا موہوب لہ کو شے موہوب پر قبضہ کاملہ دلانا شرط ہے.... اگر شخص مذکور نے وہ جائداد اپنے پسر کو تحریری خواہ زبانی ہبہ کر دی اور بشرائط و معانی مذکورہ پسر کو قبضہ کاملہ دلا دیا تو وہ جائداد خاص اس پسر کی ملک ہو گئی دیگر ورثہ کا اس میں استحقاق نہ رہا، اور اگر ہبہ نہ تھا نرا اقرار ہی اقرار تھا کہ اسے دے دوں گا، یا ہبہ زبانی خواہ تحریری کیا مگر قبضہ نہ دیا تو وہ قبضہ کاملہ نہ تھا اگرچہ پسر نے بعد موت پدر قبضہ کاملہ کر لیا ہو تو ان صورتوں میں وہ جائداد بدستور ملک پدر پر باقی رہی“

[فتاوی رضویہ قدیم، ۵۴/۸]

(۲) اس عورت کے انتقال کے بعد صرف اس کی تینوں بیٹیاں مالک نہیں ہوں گی بلکہ متوفیہ عورت کی وہ زمین شریعت کے مقرر کردہ فرائض کے حساب سے تقسیم ہو گی اس میں بیٹیوں کے علاوہ شوہر جس نے وہ زمین اس عورت کو ہبہ کی تھی عورت کے انتقال کے بعد چوتھائی زمین کا حقدار ہو گا۔

قرآن مجید میں ہے:

”وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ“

اور تمہاری بیبیاں جو چھوڑ جائیں اس میں سے تمہیں آدھا ہے اگر ان کی اولاد نہ ہو۔ پھر اگر ان کی اولاد ہو تو اُن کے ترکہ میں سے تمہیں چوتھائی ہے جو وصیت وہ کر گئیں اور دَین نکال کر۔ [کنز الایمان، پارہ ۴ سورہ نساء آیت ۱۲]

اور بقیہ زمین بیٹیوں کو ملے گی۔ یعنی زمین کے چار حصہ ہوں گے ایک حصہ اس شخص کا اور باقی بیٹیوں کا اس شخص کا حصہ اس

کے انتقال کے بعد اس کے وارثین میں تقسیم ہوگا جن میں پہلی بیوی کی تین بیٹیاں بھی ہیں اور دوسری بیوی بھی۔ البتہ اس دوسری بیوی کی موت چونکہ اس شوہر کی زندگی میں ہوگئی لہٰذا وہ عورت اپنے شوہر کی جائداد کی حقدار نہیں رہی۔ اور دوسری بیوی کی دوسرے شوہر سے جو اولاد ہے اسے بھی اس جائداد میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ نہ اس شخص کی پہلی بیوی کے ترکہ سے کچھ ملے گا اور نا ہی اس شخص کے ترکہ سے۔

الحاصل: زید اگر دونوں بیویوں کے بعد انتقال کر چکا ہے اور بیٹیوں کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں چھوڑا تو اب ساری زمین تینوں بیٹیوں میں تقسیم ہوگی۔ اور اگر زندہ ہے تو زمین سے چوتھائی حصہ لینے کا حقدار ہے۔ باقی زمین بیٹیوں کی ہے۔ اور دوسری بیوی کا دوسرے شوہر سے جو لڑکا ہے صورت مسئولہ میں اس کا اس زمین میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

واللہ اعلم جلّ جلالہ و رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

فتوی ۱۴۷ — وارثین میں ایک کروڑ اسی لاکھ روپے کی تقسیم

مسئولہ: ۱۰/ جمادی الاولی ۱۴۳۸ھ

زید کا انتقال ہوگیا اس نے ایک بیوی تین بھائی اور تین بہنیں چھوڑیں، اور جائداد میں ایک کروڑ اسی لاکھ روپے چھوڑے۔ شریعت کی روشنی میں کس کو کتنا حصہ ملے گا اس کا جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں بیوی کو پیتالیس لاکھ۔ تینوں بہنوں کو پندرہ پندرہ لاکھ۔
تینوں بھائیوں کو تیس تیس لاکھ روپے ملیں گے۔

فتوی ۱۴۸ — ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے کی تقسیم

مسئولہ: زاہد رضا چندوسی۔ ۳/ رجب ۱۴۳۹ھ

زید کا انتقال ہوا اس نے ایک بیوی تین بیٹے اور چار بیٹیاں چھوڑیں اور ترکہ میں ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے چھوڑے ہیں برائے کرم کوئی مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

صورت مسئولہ میں زید کے ترکہ کے کل (۸۰) حصے ہوں گے۔ جس میں سے (۱۰) زید کی بیوی کو اور تینوں بیٹوں میں ہر بیٹے کو چودہ (۱۴) چودہ (۱۴) حصے۔
اور ہر بیٹی کو سات (۷) سات (۷) حصے ملیں گے۔
یعنی زید کی بیوی کے حصے میں
(۱۵۶۲۵۰۰) روپے۔
اور ایک لڑکے کے حصہ میں
(۲۱۸۷۵۰۰) روپے۔

تو اس طرح تینوں لڑکوں کے حصہ میں آئے (۶۵۶۲۵۰۰) روپے۔
ایک لڑکی کی حصہ میں (۱۰۹۳۷۵۰) روپے۔
اس طرح چاروں لڑکیوں کے حصہ میں آئے (۴۳۷۵۰۰۰) روپے۔
اس طرح کل رقم تقسیم ہوئی (۱۲۵۰۰۰۰۰) روپے۔

فتوی ۱۴۹ وارثین میں پچیس ہزار کی تقسیم

مسئولہ: حافظ رضوان چونا گلی مسجد کاشی پور۔ ۶/رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
زید کا انتقال ہوا جس میں انہوں نے اپنے پیچھے اولاد میں سے پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں چھوڑیں اور اپنی اہلیہ کو چھوڑا اور ملکیت میں پچیس ہزار چھوڑے۔ تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس رقم سے ہر ایک کو کتنا حصہ بنتا ہے۔ بیان فرمادیں۔ بینوا وتوجروا

الجواب

صورت مسئولہ میں جائداد کے کل ایک سو بیس (۱۲۰) حصے ہوں گے۔ جس میں سے پندرہ (۱۵) حصے مرحوم کی بیوی کو ملیں گے۔ اور ستر (۷۰) حصے پانچوں لڑکوں کو اس طرح کہ ہر لڑکے کو چودہ (۱۴) حصہ ملیں گے۔ پانچوں لڑکیوں کو پینتیس (۳۵) حصے ملیں گے۔ مطلب ہر لڑکی کو سات (۷) حصے ملیں گے۔ تو اب رقم کا حساب کچھ اس طرح ہو گا۔
پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) روپے میں سے بیوی کو تین ہزار ایک سو پچیس (۳۱۲۵) روپے ملیں گے۔
چودہ ہزار پانچ سو تراسی (۱۴۵۸۳) روپے تینتیس (۳۳) پیسے پانچوں بیٹوں کو ملیں گے۔
اس طرح کہ دو ہزار نو سو سولہ روپے (۲۹۱۶) چھیاسٹھ (۶۶) پیسے ہر لڑکے کو ملیں گے۔
سات ہزار دو سو اکیانوے (۷۲۹۱) روپے چھیاسٹھ (۶۶) پیسے پانچوں بیٹیوں کو ملیں گے۔ مطلب ہر لڑکی کو ایک ہزار چار سو اٹھاون (۱۴۵۸) روپے
تینتیس (۳۳) پیسے ملیں گے۔ باقی بچا ایک (۱) پیسہ۔

فتوی ۱۵۰ زمین کا بٹوارا، اس کو ائرفٹ کے حساب سے

مسئولہ: نثار احمد مدر کالونی کاشی پور۔ ۲۰/ربیع النور ۱۴۴۰ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلہ میں
محمد اسرار اور محمد شمشاد دو بھائیوں کی (۵۲۰۰) اسکوائرفٹ زمین تھی۔ چھوٹے بھائی شمشاد کا انتقال ہو گیا جس نے ایک بیوی اور دو لڑکے چھوڑے۔ شمشاد کی بیوی نے دوسری جگہ نکاح کر لیا اور شمشاد کے دونوں لڑکے بڑے بھائی محمد اسرار کی پرورش میں رہنے لگے۔ پھر کچھ سالوں بعد محمد اسرار کا بھی انتقال ہو گیا۔ محمد اسرار نے بیوی، دو لڑکے اور تین لڑکیاں چھوڑیں۔ اب

بڑے بھائی کی بیوی اوران کے لڑکوں کا کہنا ہے کہ ہمارے چچازاد بھائیوں کا اس جائداد میں کوئی حق نہیں ہے۔اس پوری زمین کے ہم مالک ہیں لہٰذا چھوٹے بھائی شمشاد کے لڑکوں کا اس جائداد میں حصہ ہے یا نہیں ؟اور ہے تو کتنا حصہ کس کا ہے ؟جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب

صورت مسئولہ میں ذکر کردہ زمین کے دونوں بھائی حق دار تھے۔اس لیے اس زمین سے دونوں کے وارثین کو حصہ ملے گا۔مطلب یہ ہے کہ مرحوم محمد اسرار اور مرحوم محمد شمشاد کے حصے کی زمین ان کے بیوی بچوں کو ملے گی۔

اگر زمین واقعی دونوں کی ملکیت تھی اور دونوں اس زمین کے برابر کے حصہ دار تھے تو2600/ اسکوائرفٹ محمد اسرار کی ہوئی اور2600/ اس کوائرفٹ محمد شمشاد کی ہوئی۔اوراس طرح 2600/ اسکوائرفٹ مرحوم محمد اسرار کے بیوی بچوں کو اوراسی قدر مرحوم محمد شمشاد کے بیوی بچوں کو ازروئے شرع ملے گی۔تواب شرعاًمرحوم محمد شمشاد کی کل جائداد کے 16/حصے ہوں گے۔جن میں سے مرحوم شمشاد کی بیوہ بیوی کو دو(2)حصے۔اور دونوں بیٹوں کو چودہ(14)حصے ملیں گے۔یعنی ہر ایک لڑکے کو7/7/حصے ملیں گے۔

ذکر کردہ زمین کے اعتبار سے یوں تقسیم ہوگی۔

مرحوم محمد شمشاد کی بیوہ بیوی کو325/اسکوائرفٹ اور ایک لڑکے کو1137.50\،اسکوائرفٹ۔

اوردوسرے لڑکے کو1137.50\،اسکوائرفٹ۔

یوں ہی مرحوم محمد اسرار کی ذکر کردہ جائداد یعنی2600/اسکوائرفٹ میں سے درج ذیل حساب سے بٹوارا ہوگا۔

مرحوم محمد اسرار کی جائداد کے آٹھ(8)حصے ہوں گے۔مرحوم محمد اسرار کی بیوہ بیوی کو ایک(1)حصہ اور دونوں لڑکوں کو چار(4)حصے یعنی ہر ایک کو دو(2)دو(۲)حصے۔اور باقی تینوں حصے تینوں لڑکیوں کو یعنی ہر ایک کو ایک(1)ایک(1)حصہ ملے گا۔

ذکر کردہ زمین کے اعتبار سے درج ذیل تقسیم ہوگی۔

مرحوم محمد اسرار کی بیوہ بیوی کو.325. اسکوائرفٹ،دونوں لڑکوں میں سے ایک کو650،اسکوائرفٹ۔اوردوسرے کو بھی 650،اسکوائرفٹ۔تینوں لڑکیوں میں سے ایک کو.325. اسکوائرفٹ،دوسری کو.325. اسکوائرفٹ،اوریوں ہی تیسری کو بھی.325.اسکوائرفٹ۔

علاوہ ازیں مرحوم محمد اسرار کے بیوی بچوں کا اپنے چچازاد بھائی اور چچی کا حق نہ دینا شرعاً گناہ ہے۔اگر وہ ان کا حق ماریں گے تو سخت مجرم وگنہگار مستحق عذاب نار ہوں گے۔ان پر لازم ہے کہ اپنی چچی اور چچازاد بھائیوں کا حصہ انہیں دیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

تمت بالخیر بتوفیق اللہ تعالیٰ وبوسیلۃ سیدنا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

مآخذ و مراجع

القرآن الکریم

(الف)

احکام القرآن، أحمد بن علي أبو بکر الرازي الجصاص الحنفي (۳۷۰ھ)
اشعۃ اللمعات، شیخ عبد الحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ)
الاشباہ والنظائر علی مذہب ابی حنیفۃ النعمان، لابن نجیم المصری (۹۷۰ھ)
اصول الشاشی، اسحاق بن ابراہیم خراسانی شاشی (۳۲۵ھ)
اصول السرخسی، محمد بن أحمد السرخسي (۴۸۳ھ)
امداد الفتاح شرح نور الایضاح، حسن بن عمار الشرنبلالی (۱۰۶۹ھ)
اثمار الہدایہ شرح ہدایہ اردو، سمیر الدین قاسمی

(ب)

البحر الرائق، امام زین الدین بن ابراہیم بن نجیم (۹۷۰ھ)
بدائع الصنائع، علاء الدین ابو بکر مسعود کاسانی (۵۸۷ھ)
البدایہ والنہایہ، أبو الفداء إسماعیل بن عمر بن کثیر (۷۷۴ھ)
البحر المحیط في أصول الفقہ، بدر الدین الزرکشی (۷۹۴ھ)
بدایۃ المبتدی، علی بن أبي بکر بن عبد الجلیل الفرغاني المرغیناني (۵۹۳ھ)
بنایہ شرح ہدایہ، امام بدر الدین ابو محمد عینی (۸۵۵ھ)
بہار شریعت، صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی (۱۳۶۷ھ)

(ت)

تفسیر قرطبی ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی (۶۷۱ھ)
تفسیر مدارک التنزیل وحقائق التأویل، أبو البرکات عبد اللہ النسفي (۷۱۰ھ)
تفسیر القرآن العظیم لابن أبي حاتم (۳۲۷ھ)
تفسیر روح البیان، اسمعیل حقی (۱۱۲۷ھ)
تفسیر مظہری، قاضی ثناء اللہ پانی پتی نقشبندی (۱۲۲۵ھ)
تفسیر در منثور، عبد الرحمن بن أبي بکر، جلال الدین السیوطي (۹۱۱ھ)
تفسیرات احمدیہ شیخ احمد بن ابو سعید المعروف ملاجیون (۱۱۳۰ھ)
تفسیر خزائن العرفان صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مرادآبادی (۱۳۶۷ھ)
تفسیر نعیمی مفتی احمد یار خاں نعیمی (۱۳۹۱ھ)
ترجمہ کنز الایمان امام احمد رضا محدث بریلوی (۱۳۴۰ھ)
تبیین الحقائق امام فخر الدین عثمان بن علی زیلعی (۷۴۳ھ)
تحفہ اثنا عشریہ، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (۱۲۳۹ھ)
تکمیل الایمان، شیخ عبد الحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ)
تعلیق المجد علی موطا محمد، عبد الحي بن محمد عبد الحلیم انصاری لکھنوی (۱۳۰۴ھ)

تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، یوسف ابو الحجاج المزی (۷۴۲ھ)
الترغیب والترہیب لقوام السنۃ، اسماعیل بن محمد اصبہانی الملقب بقوام السنۃ (۵۳۵ھ)
تاریخ بغداد، حافظ ابو بکر الخطیب البغدادی (۴۶۳ھ)
التاج المکلل محمد صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی (۱۳۰۷ھ)

(ج)

الجوہرۃ النیرۃ شیخ ابو بکر بن علی بن ابو المفاخر (۵۶۵ھ)
جامع العلوم والحکم، عبد الرحمن بن شہاب الدین ابن رجب (۷۹۵ھ)
جامع مسانید الامام الاعظم، ابی المؤید الخوارزمی (۶۶۵ھ)
جمع الوسائل فی شرح الشمائل، شیخ علی بن سلطان محمد القاری (۱۰۱۴ھ)
جواہر الفقہ، مفتی شفیع دیوبندی

(ح)

حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار شیخ سید احمد طحطاوی (۱۳۰۲ھ)
حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ایضاً
حبیب الفتاوی مفتی محمد حبیب اللہ نعیمی (۱۳۹۵ھ)
الحاوی للفتاوی علامہ جلال الدین عبد الرحمن سیوطی (۹۱۱ھ)

(د)

در مختار علاء الدین محمد بن علی حصکفی (۱۰۸۸ھ)
درر الحکام شیخ محمد بن فراموز ملا خسرو (۸۸۵ھ)
دلیل الطالب الی ارجح المطالب محمد صدیق حسن بھوپالی (۱۳۰۷ھ)

(ر)

ردالمحتار علی الدر المختار، علامہ سید محمد امین الشہیر بابن عابدین الشامی (۱۲۵۲ھ)

(س)

سنن ابو داؤد، امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی (۲۷۵ھ)
سنن ترمذی، امام ابو عیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی (۲۷۹ھ)
سنن نسائی، امام ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب نسائی (۳۰۳ھ)
سنن ابن ماجہ، امام ابو عبد اللہ محمد بن زید ابن ماجہ (۲۷۳ھ)
سنن کبری، شیخ ابو بکر احمد بن حسین بیہقی (۴۵۸ھ)
سنن دار قطنی، شیخ ابو الحسن علی بن عمر دار قطنی (۳۸۵ھ)
سیرۃ ابن ہشام، عبد الملک بن ھشام (۲۱۳ھ)
سیرت مصطفی، علامہ عبد المصطفی اعظمی (۱۴۰۶ھ)
سوانح کربلا، صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی (۱۳۶۷ھ)
سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ، ناصر الدین البانی (۱۴۲۰ھ)

(ش)

شعب الایمان، شیخ احمد بن حسین ابو بکر بیہقی (۴۵۸ھ)
شرح نووی علی المسلم، شیخ یحییٰ بن شرف نووی (۶۷۶ھ)
الشہاب الثاقب، حسین احمد مدنی (۱۳۷۶ھ)
شرح فتح القدیر، امام کمال الدین محمد بن عبد الواحد ابن الھمام (۸۶۱ھ)
شرح زرقانی علی الموطا، علامہ محمد بن عبد الباقی زرقانی (۱۱۲۲ھ)
شرح الشفا، شیخ علی بن سلطان محمد القاری (۱۰۱۴ھ)
شرح فقہ اکبر، ایضا۔

(ص)

صحیح بخاری، امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری (۲۵۶ھ)
صحیح مسلم، امام مسلم بن حجاج قشیري (۲۶۱ھ)
صحیح ابن حبان، علامہ محمد بن حبان تمیمی دارمی (۳۵۴ھ)
صدیقہ کائنات، فیض عالم صدیقی

(ض)

الضعفاء والمتروکین، علامہ جمال الدین ابو الفرج ابن جوزی (۵۹۷ھ)
الضعفاء الکبیر، علامہ ابو جعفر محمد بن عمرو عقیلی (۳۲۲ھ)
ضعیف اَبی داود، ناصر الدین البانی (۱۴۲۰ھ)
ضعیف سنن الترمذی، ایضا

(ط)

طبقات المدلسین، حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ)

(ع)

العقود الدریہ فی تنقیح الفتاوی علامہ سید محمد امین الشہیر بابن عابدین الشامی (۱۲۵۲ھ)
العبر فی خبر من غبر، شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن احمد ذہبی (۷۴۸ھ)
شمس الدین أبو عبد اللہ محمد بن أحمد بن عثمان بن قَایْماز الذهبي (المتوفى:748ھ)
عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی (۸۵۵ھ)
العطایا النبویۃ فی الفتاوی الرضویہ، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی (۱۳۴۰ھ)

(غ)

غنیۃ المستملی، ابراہیم بن محمد حلبی کبیری (۹۵۶ھ)
غمز عیون البصائر، شیخ احمد بن محمد حموی (۱۰۹۸ھ)

(ف)

الفتح الکبیر للسیوطی علامہ جلال الدین عبد الرحمن سیوطی (۹۱۱ھ)
فواتح الرحموت علامہ عبد العلي محمد بن نظام الدین لکھنوی

فتح المغیث، شمس الدین ابو الخیر سخاوی (۹۰۲ھ)
فتح الباری شرح بخاری، حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ)
فتح الباری شرح بخاری شیخ عبد الرحمن بن رجب حنبلی (۷۹۵ھ)
فیض القدیر حافظ محمد عبد الرؤوف مناوی (۱۰۳۱ھ)
فیصلہ جات شرعی کونسل بریلی شریف، مفتی یونس رضا مونس اویسی
فتاوی قاضی خاں علامہ حسن بن منصور قاضی خاں (۵۹۲ھ)
فتاوی بزازیہ شیخ محمد بن محمد الکردری الشہیر بالبزازی (۸۲۷ھ)
فتاوی نوازل فقیہ ابو اللیث نصر بن محمد سمرقندی (۳۷۵ھ)
فتاوی حدیثیہ احمد بن محمد بن حجر ہیتمی (۹۴۷ھ)
فتاوی عالمگیری جماعت علماء اہل سنت ہندوستان
فتاوی عزیزی، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (۱۲۳۹ھ)
فتاوی رضویہ امام احمد رضا محدث بریلوی (۱۳۴۰ھ)
فتاوی صدر الافاضل، علامہ سید محمد نعیم الدین مرادآبادی (۱۳۶۷ھ)
فتاوی مصطفویہ، مفتی اعظم ہند محمد مصطفی رضا خاں بریلوی (۱۴۰۲ھ)
فتاوی مفتی اعظم، ایضا۔
فتاوی امجدیہ صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی (۱۳۶۷ھ)
فتاوی شارح بخاری مفتی شریف الحق امجدی اعظمی (۱۴۲۱ھ)
فتاوی بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی (۱۴۳۴ھ)
فتاوی عبد الحی ابو الحسنات علامہ عبد الحی لکھنوی (۱۳۰۴ھ)
فتاوی فیض الرسول،، فقیہ ملت مفتی جلال الدین امجدی (۱۴۲۲ھ)
فتاوی فقیہ ملت، ایضا۔
فتاوی بحر العلوم، مفتی عبد المنان اعظمی
فتاوی شرعیہ، ادارہ شرعیہ بہار دار الافتاء
فتاوی مرکز تربیت افتاء، مفتی فیض محمد قادری
فتاوی نعیمیہ مفتی اقتدار احمد خاں
فتاوی رشیدیہ مولوی عبد الرشید گنگوہی (۱۳۲۳ھ)
فتاوی دار العلوم دیوبند، دار الافتاء دیوبند

(ق)

القراءۃ خلف الامام للبخاری، امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری (۲۵۶ھ)
قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار، علامہ محمد عبد الحلیم لکھنوی (۱۲۸۵ھ)
القول المقبول فی عظمۃ قول اللہ والرسول، مؤلفہ مفتی محمد صاحبداد خاں

(ک)

کنز العمال في سنن الاقوال والافعال، شیخ علاء الدین علي بن حسام الشھیر بالمتقی الہندی (۹۷۵ھ)

الشفا بتعریف حقوق المصطفی، أبو الفضل القاضي عیاض بن موسی (۵۴۴ھ)
کتاب الآثار، ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری (۱۸۲ھ)
الکامل فی التاریخ، أبو الحسن علي بن أبي الکرم محمد بن محمد جزری (۶۳۰ھ)

(ل)

لمعات التنقیح شرح مشکاۃ المصابیح، شیخ عبد الحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ)

(م)

منح الروض الازہر فی شرح الفقہ الاکبر، ایضا
المعتقد المنتقد، سیف اللہ المسلول علامہ فضل رسول بدایونی (۱۲۸۹ھ)
المستند المعتمد بناء نجاۃ الابد، امام احمد رضا محدث بریلوی (۱۳۴۰ھ)
مشکوۃ شریف، امام محمد بن عبد اللہ خطیب تبریزی (۷۴۱ھ)
مجمع الزوائد، حافظ علی بن ابو بکر ہیثمی (۸۰۷ھ)
مسند شاشی، أبو سعید الھیثم بن کلیب الشاشی (۳۳۵ھ)
مسند احمد، أبو عبد اللہ أحمد بن محمد بن حنبل شیبانی (۲۴۱ھ)
المعجم الکبیر للطبرانی شیخ سلیمان بن احمد طبرانی (۳۶۰ھ)
المعجم الصغیر للطبرانی، ایضا
المعجم الاوسط للطبرانی، ایضا
المصنف في الأحادیث والآثار، ابو بکر بن ابی شیبہ (۲۳۵ھ)
المستدرک علی الصحیحین، محمد بن عبد اللہ حاکم نیساپوری (۴۰۵ھ)
موطا امام محمد، امام محمد بن حسن شیبانی (۱۸۹ھ)
موطا امام مالک، امام مالک بن انس مدنی (۱۷۹ھ)
میزان الاعتدال، حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ)
مرقاۃ المفاتیح، شیخ علی بن سلطان محمد القاری (۱۰۱۴ھ)
مراۃ المناجیح شرح مشکاۃ المصابیح، مفتی احمد یار خاں نعیمی (۱۳۹۱ھ)
مظاہر حق جدید شرح مشکوۃ لمولوی قطب الدین، عبد اللہ جاوید غازی پوری
مراقی الفلاح، حسن بن عمار شرنبلالی (۱۰۶۹ھ)
ملتقی الابحر، ابراہیم بن محمد حلبی کبیری (۹۵۶ھ)
مبسوط سرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی (۴۸۳ھ)
مجمع الانہر، شیخ عبد الرحمن بن سلیمان کلیبولی (۱۰۷۸ھ)
محیط برہانی، برہان الدین محمود بن احمد مرغینانی بن مازہ (۶۱۶ھ)
معین المفتی والسائل، ابو الحسنات علامہ عبد الحی لکھنوی (۱۳۰۴ھ)
المسلک المتقسط فی المنسک المتوسط، شیخ علی بن سلطان محمد القاری (۱۰۱۴ھ)
مکتوبات امام ربانی، مجدد الف ثانی احمد سرہندی (۱۰۳۴ھ)
ملفوظات عزیزی، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (۱۲۳۹ھ)

ملفوظات اعلی حضرت، مفتی اعظم محمد مصطفی رضا خاں (۱۴۰۲ھ)
ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور

(ن)

نزہۃ القاری شرح بخاری مفتی شریف الحق امجدی اعظمی (۱۴۲۱ھ)
النیر الشہابی علی تدلیس الوہابی، امام احمد رضا محدث بریلوی (۱۳۴۰ھ)
نور الایضاح، شیخ حسن بن عمار الشرنبلالی (۱۰۶۹ھ)
النتف فی الفتاوی للسغدی
نور الانوار، احمد بن سعید ملا جیون (۱۱۳۰ھ)

(ہ)

ہدایہ شیخ برہان الدین علی بن ابو بکر مرغینانی (۵۹۳ھ)

مطبوعات نعیمی

ہند و پاک سے شائع ہونے والی مصنف کی اب تک کی مطبوعات

شمار	اسمائے کتب	صفحات
۱	سیرت رسول عربی ﷺ تاریخ کے آئینے میں	۴۶
۲	انبیائے کرام گناہ سے پاک، اعلیٰ حضرت (تخریج وغیرہ)	۲۴
۳	دفع الخمامہ عن احادیث العمامہ (احادیث عمامہ پر شبہات کا ازالہ)	۹۲
۴	معراج المؤمنین	۳۱
۵	رکعات نماز کا ثبوت احادیث نبوی اور فقہ حنفی کے آئینے میں	۱۱۹
۶	حق کی پہچان، صدرالافاضل (تخریج وغیرہ)	۳۱
۷	فیضان رحمت، صدرالافاضل (تخریج وغیرہ)	۱۶۸
۸	مقالات صدرالافاضل	۶۰۸
۹	مکاتیب صدرالافاضل	۲۴۸
۱۰	ثبت نعیمی عربی، صدرالافاضل (تحقیق وغیرہ)	۱۱۲
۱۱	اسانید صدرالافاضل، اردو (ترجمہ وغیرہ)	۱۳۶
۱۲	فتوحات رضویہ	۱۵۲
۱۳	تصوف کے بدلتے رنگ	۶۴
۱۴	حجاز مقدس پر نجدی تسلط اسباب ونتائج	۶۲۴
۱۵	تاج الشریعہ کی جدید تحقیقات کے اصولی مباحث	۲۴
۱۶	سبطینی اشکالات پر برکاتی جوابات	۶۴
۱۷	فتاوی اتراکھنڈ (پہلی جلد)	۴۰۴

ڈاک سے کتابیں منگانے کے لیے پہلے صفحہ پر دیے گئے موبائل اور وہاٹس ایپ نمبر سے رابطہ کریں۔

مشاہیر علما کے تاثرات

مفتیٔ اعظم اتر اکھنڈ محب گرامی مفتی محمد ذوالفقار صاحب نعیمی زیدت معالیہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں جہان علم وادب ۔فقہ وافتاء ۔اورلوح وقلم میں آپ کی خدمات عالیہ کی پذیرائی کسی سے مخفی نہیں ہے ۔آپ کے فتاوی کا دوسرا مجموعہ اشاعت کو تیار ہے اور منظر شہود پر آنے کو پر تول رہا ہے ۔فقہ و فتاوی کے حوالے سے ملک کے معتمد ومستند علماء کرام وفقہاء عظام کا آپ کو اعتماد حاصل ہے ۔فتاوی اتر اکھنڈ کی پہلی جلد اور دوسری جلد میں شامل کئی قدآور ونامور شخصیات کے تاثرات اس پر شاہد ہیں ۔انہیں تاثراتی گلستان سے چند علمائے متبحرین کے اہم اقتباسات ہم یہاں نقل کررہے ہیں ،تاکہ موصوف کی علمی وقعت ۔ادبی گہرائی ۔فقہی بصیرت ۔فنی ندرت ۔سخن پروری ۔احقاق حق وابطال باطل کی طلعت باری اور قلمی نگارشات وخدمات کے آفتاب عالم تاب کا ادراک ہو سکے ۔

جامع معقول ومنقول حضرت علامہ مفتی شبیر حسن رضوی شیخ الحدیث جامعہ روناہی فیض آباد

"فتاوی اتر اکھنڈ عزیز القدر وقیم حضرت مولانا مفتی محمد ذوالفقار خان سلمہ المولی المنان کی تصنیف وتالیف ہے ۔عزیزم ایک ذی علم عالم دین ہیں ۔فتوی نویسی وکار افتاء بہت ہی مشکل کام ہے جس میں موصوف سلمہ نے بہت ہی محنت ومشقت عرق ریزی سے کام لیا ہے ۔احقاق حق وابطال باطل میں کوئی رعایت نہیں کی ہے ۔یہی علمائے ذوی الاحترام مخلصین مفتیان عظام کی شان ہوتی ہے ۔

مقدام العلما حضرت علامہ سید شاہد میاں قاضی شہر رامپور

محب محترم ذی المجد والکرم ذی الطبع السلیم والفکر القویم اخی فی الدین حضرت مولانا مفتی محمد ذوالفقار خان نعیمی سلمہ المنان وحفظہ الرحمن اہلسنت و جماعت کی ایک عظیم مرکزی درسگاہ جامعہ نعیمیہ دیوان بازار مرادآباد کے ہونہار ،ہوشیار ،ذی شعور وباکردار ،وقت اور حالات کے نباض احوال زمانہ سے واقف کار ،نوجوان عالم وفاضل ہیں ،ساتھ ہی محقق ومدقق ،مورخ ومفکر ،ادیب وصحافی ،مصنف ومولف ،خطیب ومتاثر ،صالح مصلح ہادی ومہدی اور ذی استعداد وباصلاحیت مستند ومعتمد مفتی بھی ہیں ۔نعیمیات پر زبردست کام کررہے ہیں اردو وفارسی اور عربی تینوں زبانوں پر اچھا عبور ہے ۔ان کا علمی اور تحقیقی کام دیکھ کر دل مسرور ہوتا ہے ۔موصوف کا علم حاضر ،ذہن رسا ،دماغ تازہ اور قلم رواں دواں ہے ۔

استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مفتی صالح صاحب قبلہ شیخ الحدیث جامعۃ الرضا بریلی شریف

"حضرت مولانا مفتی ذوالفقار صاحب نعیمی ایک اچھے عالم دین ووقیع مفتی ہیں اور بڑی علمی عملی خوبیوں کے جامع ہیں ،گویا جواں سالی میں شیخ کبیر ہیں ۔حسن افتا ،کثرت مطالعہ ،زودنویسی ،ملت کی خیر خواہی وغیرہ وصفات حمیدہ سے متصف ہیں ۔"

ماہر علم وفن حضرت علامہ مفتی محمد سلیمان صاحب قبلہ زیب مسند افتاء جامعہ نعیمیہ مرادآباد

"حضرت علامہ مفتی محمد ذوالفقار خاں نعیمی فاضل جامعہ نعیمیہ دیوان بازار مرادآباد نے درجہ تخصص سے اعلی کامیابی جامعہ سے حاصل کی ۔اور اول نمبر پر دستار افتاء سے نوازے گئے ۔

ماہر اصول وفروع حضرت علامہ قاضی شہید عالم صاحب قبلہ شیخ الحدیث جامعہ نوریہ رضویہ بریلی شریف

فاضل نوجوان حضرت مولانا مفتی ذوالفقار خان صاحب نعیمی ایک بالغ نظر عالم ،باریک بین مفتی اور کثیر المطالعہ فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی فعال اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں ۔موصوف کے فتاوی کا مجموعہ باصرہ نواز ہوا ۔دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی ،اس نوعمری میں ہی موصوف نے اس منزل کو پالیا ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے کسی ماہر فقیہ کے زیر سایہ ایک طویل مدت تک مشاقی کی ضرورت پڑتی ہے ۔

تاج الفقہا حضرت علامہ مفتی اختر حسین صاحب قبلہ زیب مسند افتاء وتدریس دار العلوم محمد اشاعی بستی

عزیز مکرم جناب مفتی محمد ذوالفقار خان نعیمی صاحب زید مجدہ نسل نو میں بہت سی خوبیوں کی بنا پر اپنا الگ نشان عزت ووقار رکھتے ہیں ۔اور حرکت وعمل ،جہد مسلسل ،سعی پیہم اور متواتر کوشش وجانفشانی کے اعتبار سے ایک مینار رکھتے ہیں ۔حسن صوری ومعنوی کا خوشنما گلدستہ ہیں ،علم وحلم اور تونگری وتواضع کا بہتر امتزاج موصوف کی شکل میں دیکھا جاسکتا ہے ۔

ماہر درسیات حضرت علامہ مولانا عاقل صاحب صدر المدرسین منظر اسلام بریلی شریف

محب مکرم فاضل نوجوان حضرت مولانا محمد ذوالفقار صاحب نعیمی دام ظلہ دینی لگن ،مذہبی حمیت ،علمی فکر جیسے اوصاف جلیلہ میں اپنے ہم عصر نوجوان علماء میں انفرادی شخصیت کے حامل ہیں ۔مولانا موصوف کا کردار وعمل اور ان کی مسلکی خدمات کا وسیع دائرہ ان کیلئے مشعل راہ ہے ۔یہ جہاں رہتے ہیں دینی کام میں لگے رہتے ہیں بلکہ شب وروز ان کی انتھک کوششوں سے میدان عمل ہموار کرتے ہیں ،ان کی تمام تر کد وکاوش ،محنت وجانفشانی کا محور مسلک اعلی حضرت کی نشر واشاعت ہے ۔

(مفتی) مقصود عالم فرحت ضیائی ۔فخر از ہر دار الافتاء برانچ ہاسپیٹ بلہاری کرناٹک